پارۂ پنجم

معالم القرآن

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ادارۂ تعلیماتِ قرآن

سیالکوٹ، پاکستان

نام —— معالم القرآن
موضوع —— تشریح وتفسیر
ملکیت —— ادارہ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ
تالیف —— حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب الصدیقی الکاندھلوی
عناوین —— ۳۲۳
آیات —— ۲۴
طابع —— محمد شریف قاسمی
تزئین و آرائش —— سید انور حسین نفیس رقم، لاہور
کتابت —— محمود احمد، گوجرانوالہ
ناشر —— قاری عبدالرحمان، ایم اے
صفحات —— ۶۲۴
تاریخ اشاعت —— شوال المکرم ۱۳۹۰ھ مطابق ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء
مطبع —— معارف پریس، لاہور

قیمت ۹۰/- ~~۲۵~~ روپے صرف

ملنے کا پتہ

دارالعلوم الشہابیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ شہر، (پاکستان)

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی پانچویں جلد کو جس میں اُمت کے سیاسی مسائل کی عکاسی ہے قابلِ صد احترام جناب الحاج عبدالغنی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ گوجرانوالہ کے نام منسوب کرتا ہوں، جن کی اسلامی خدمت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریادلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ موصوف کے اس جذبہ کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے سعادتِ دارین کا ذریعہ بنائے۔

عبدالرحمان قاری ایم اے
ناظم ادارۂ تعلیماتِ قرآن،
دارالعلوم الشہابیہ، سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

باسمہٖ تعالیٰ

معالم القرآن کی چوتھی جلد محرم الحرام ۹۰ھ مطابق جنوری ۸۹ء کو شائع ہوئی تھی، آج پورے چھ ماہ کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

اگرچہ اس بار کام میں ایک ہنگامی رکاوٹ سے دوچار ہونا پڑا اور پورے دو ماہ تفسیر کا کام زیر رہا لیکن اس غیر ارادی تعطل کے باوجود الحمدللہ پانچویں جلد مکمل ہو گئی۔ رکاوٹ سے میری مراد زمانہ اسیری ہے۔ اوّل سیالکوٹ جیل اور پھر بہاولپور جیل۔ مورخہ ۲۵ مارچ بعد از نماز جمعہ ایک پر ہجوم جلوس میں مجھے گرفتار کیا گیا، مورخہ ۶ اپریل کو انتظامیہ نے فرضی روئداد مقدمہ تیار کر کے مجھے تین ماہ قید اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنادی۔ اسی روز رات کے و بجے مجھے اور میرے پندرہ ساتھیوں کو بہاولپور جیل روانہ کر دیا گیا۔

جیل جانے کی یہ سعادت پاکستان میں احیائے اسلام کے لیے حاصل ہوئی۔ بنانے والوں نے پاکستان اسلام کے نام پر بنا تو لیا مگر انگریز کی ذہنی غلامی کی وجہ سے انگریز کے ورثہ کفر و مادیت سے ابھی تک پاکستان کو نجات نہیں ملی۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ اس کے زوال کے بغیر پاکستان میں دین و اخلاق کا عروج اور اسلام کی دعوت کا پھلنا اور پھولنا مشکل ہے، یہ صرف کسی ایک شعبۂ زندگی اور کسی ایک جماعت کی اسلام کے نظامِ حیات سے روگردانی کا سوال نہیں۔ سوال ایک پوری تہذیب، ایک مستقل نظامِ فکر اور ایک عالمگیر دعوت کا ہے جو نبوت کے علم و عمل، اس کی تعلیمات اور ان کے نتائج و اثرات کے بالکل منافی ہے۔

خیر یہ داستان طویل ہے اس کی تفصیلات تو انشاءاللہ مجوزہ کتاب "سیالکوٹ جیل سے بہاولپور

جیل تک،، میں آپ پڑھیں گے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حالات کی غلط کروٹ الحمدللہ تفسیر کے کام پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ ۳ مئی،، مر کو رہائی ہوئی اور ۴ مئی ۱۹۷۶ء سے پھر کام شروع کر دیا۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادہ کرنے کا موقعہ ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابوبکر بن العربی مالکی	عارضۃ الاحوذی
۲۔ مفتی احمد یار خاں	کنز العرفان
۳۔ الشیخ ابوعلی الفضل بن الحسن الطبرسی	مجمع البیان
۴۔ شیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی	تہذیب الاحکام
۵۔ " " "	الاستبصار
۶۔ الشیخ ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی الرازی	الفروع من الکافی
۷۔ الحافظ ابومحمد علی بن حزم الظاہری	المحلی
۸۔ الامام علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاشانی	بدائع الصنائع
۹۔ الشیخ عبدالعزیز محدث دہلوی	تحفہ اثنا عشریہ
۱۰۔ امام مالک بن انس	المدونۃ الکبریٰ
۱۱۔ ابوجعفر الصدوق محمد بن علی بن بابویہ القمی	من لا یحضرہ الفقیہ

ان کے علاوہ میں نے خاص مسائل کی تحقیق کے لیے اس جلد میں مولانا محمد مالک کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ دار العلوم کراچی، اور مولانا عبدالرشید نعمانی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ سے بھی خط و کتابت کے ذریعے استفادہ کیا ہے، فجزاھم اللہ عنی خیر الجزاء،

اصل یہ ہے کہ میں تو بکھری ہوئی دولت کو یکجا کر رہا ہوں ورنہ اپنی ذات کی حد تک حال یہ ہے کہ:

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم　　　در حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

یہ احباب کی پر خلوص دعاؤں کا صدقہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے مجھے اس کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور احباب ہی سے میری درخواست ہے کہ وہ اللہ کی جناب میں اس عظیم کام کی تکمیل کے لیے دعا کریں۔ عالم اسباب میں میرے علم اور جسم کی کمزوریاں اس راہ میں ہر قدم پر آڑے آتی ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے:

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم　　　بقی الذین حیاتھم لا تنفع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مُقَدَّمہ

سورۃ انبیاء میں اللہ سبحانہ نے قرآن کا یہ چہرہ پیش کیا ہے لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم اس کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے اس طرح فرمایا ہے کہ "ہم نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب اس میں تمہارا ذکر ہے"۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف، شفاف، سچا، وفادار، دیانتدار آئینہ ہے۔ جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا ہے۔ معاشرے میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کر سکتا ہے۔ کیوں قرآن انسانوں کے اخلاق و اوصاف بیان کرتا ہے اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں۔ فیہ ذکرکم یعنی اس کتاب میں تمہارا بیان ہے۔ تمہارے حالات و اوصاف مذکور ہیں جیسا کہ بہت سے علماء نے سمجھا ہے۔ سلف قرآن کو ایک زندہ بولنے والی اور زندگی سے لبریز کتاب تصور کرتے تھے ان کے نزدیک قرآن کوئی تاریخی اور آثارِ قدیمہ کی چیز نہ تھی جس کا زندہ لوگوں سے بدلتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانیت کے ان بے شمار لامحدود نمونوں جو ہر زمان و مکان میں موجود رہتی ہیں کوئی تعلق نہ ہو۔ ہمارے اسلاف اپنے اخلاق و اوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے۔ ہر چیز ان کے سامنے روشن اور عیاں تھی۔ وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اسی عجیب و غریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق و اطوار کی سچی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے اور بہت آسانی سے خود کو اس کتاب میں پا جاتے تھے اور پہچان لیتے تھے۔ اگر ذکرِ خیر ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور اگر کچھ اور ہوتا تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ اس آیت کی تلاوت

پر مجھے سیدنا احنف بن قیس کا ایک واقعہ یاد آیا حضرت احنف بن قیس کبار تابعین میں سے ہیں، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، کے مخصوص ترین اصحاب میں ان کا شمار ہے، علم میں ضرب المثل تھے، مگر اس کے باوجود جب غصہ ہو جاتے تو ان کی غیرت و حمیت میں جوش آجاتا، لوگ کہتے تھے کہ جب احنف کو غصہ آتا ہے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں غضب ناک ہو جاتی ہیں۔ یہ واقعہ میں نے ابو عبداللہ محمد بن النصر المروزی (متوفی ۲۷۵ھ) کی تصنیف "قیام اللیل" میں پڑھا ہے مصنف امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت احنف بن قیس تشریف فرما تھے کہ انھوں نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو چونک پڑے اور فرمایا، ذرا قرآن مجید لانا میں اپنا ذکر تلاش کر دوں اور معلوم کروں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس سے مشابہ ہوں۔

قرآن مجید کھولا تو اس آیت پر نظر پڑی جس میں کچھ لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:

رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے تھے، اور اوقات سحر میں بخشش مانگا کرتے تھے اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا تھا۔

(الذاریات - ۱۷-۱۹)

پھر یہ آیت گزری

ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں، (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف و اُمید سے پکارتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔

(السجدہ - ۱۶)

پھر ان کے سامنے ایک گروہ آیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے عجز وادب سے کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

(الفرقان - ۶۴)

پھر ان کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے:

جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(آل عمران - ۱۳۴)

پھر ان کے سامنے کچھ نمونے آئے جن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

اور دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو، اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

(الحشر۔ ۹)

پھر یہ سامنے آئی۔

اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(الشوریٰ ۳۷، ۳۸)

پھر رک گئے اور فرمایا اے اللہ یہاں تو میں اپنے آپ کو نہیں پا رہا ہوں اور دوسری جگہ تلاش کرنا شروع کیا تو ایک جماعت کا تذکرہ دیکھا۔

ان کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو غرور کرتے تھے اور کہتے تھے بھلا ہم ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں (الصف۔ ۳۵، ۳۶)

پھر ان کا ذکر گزرا:

اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے خوش ہو جاتے ہیں۔

(الزمر۔ ۴۵)

پھر ان حضرات کا تذکرہ سامنے آیا جن سے سوال کیا جائے گا:

(سوال ہوگا) تم دوزخ میں کیوں پڑے وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے اور اہلِ باطل کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ موت آ گئی۔ (المدثر ۴۲، ۴۷)

پھر ٹھہر گئے اور فرمایا: اے اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے براءت ظاہر کرتا ہوں اس کے بعد ورق الٹتے رہے اور تلاش کرتے رہے آخر کار جب اس آیت پر نظر پڑی:

اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں انہوں نے اچھے اور برے

عملوں کو ملا جلا دیا تھا، قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توبہ فرمائے بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ (التوبہ - ۱۰۲)

تو فرمانے لگے " خدا رندا ! میں انہی لوگوں میں سے ہوں۔

آئیے ہم بھی اپنا ذکر اور اپنی تصویر پوری دیانتداری اور سنجیدگی سے قرآن میں تلاش کریں قرآن بشیر بھی ہے اور نذیر بھی، صالحین کے ساتھ کفار و مشرکین کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے۔ قرآن افراد اور جماعتوں دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔

ارشاد ہے :

اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دُنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے، اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے خوف کر۔ تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

(البقرہ ۲۰۴، ۲۰۶)

پھر اس کے بعد ارشاد ہے :

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور خدا بندوں پر بہت مہربان ہے۔ (البقرہ ۲۰۷)

ایک جماعت کا ذکر اس طرح ہے :

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔ (المائدہ ۵۴)

ایک دوسری جماعت کا تذکرہ اس طرح ہے :

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں، جو اقرار انہوں نے خدا سے کیا تھا اس کو

پسح کر دکھایا تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

(الاحزاب ۲۳)

شکر اور احسان شناسی کی ترغیب دلاتے ہوئے قرآن انبیاء اور ان کے متبعین کا ذکر کرتا ہے اور ناشکری، احسان فراموشی، غدر اور حسن سلوک کا جواب بدسلوکی سے دینے کی مذمت کرتے ہوئے اور اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے:

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔ (ابراہیم ۲۸)

اور اس کی مثال ایک بستی سے دیتا ہے جس نے خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیا اور جس کے افراد اپنی خوشحالی پر اترانے لگے، ارشاد ہے:

اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی ہر طرف سے رزق با فراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے خدا کی ناشکری کی تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھا دیا۔

(النحل ۱۱۲)

یہ انسانی اور اخلاقی نمونے جو قرآن نے مختلف ناموں سے پیش کیے ہیں کہیں کسی مطلق العنان فرمانروا کے نام سے مثلاً فرعون، کہیں کسی سرکش وزیر یا امیر کے نام سے مثلاً ھامان، کہیں کسی متکبر اور بخیل سرمایہ دار کے نام سے مثلاً قارون، کہیں کسی ظالم و جابر قوم کے نام سے مثلاً عاد، کہیں کسی مشہور اور ماہر صنعت کے نام سے مثلاً ثمود، یہ تمام لازوال انسانی نمونے ہیں جو کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں اور یہ تمام نمونے انسانی فطرت کے مختلف کمزور پہلوؤں اور گوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان افراد اور جماعتوں کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صفائی کے ساتھ کہا ہے کہ جو بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا اور ان کو اپنا رہنما اور قائد تسلیم کرے گا اس کا انجام بھی وہی ہو گا جو ان افراد اور جماعتوں کا ہوا۔

جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے اور خدا کا حکم مقرر ہو چکا ہے۔

(الاحزاب ۳۸)

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

پارۂ پنجم ایک نظر میں

صفاتِ الٰہی

رحمت الٰہی ۲۵، ۲۹، ۶۴، ۱۰۰، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۲۹۔

علم وخبیر ۲۶، ۳۲، ۳۵، ۳۹، ۴۲، ۷۰، ۹۲، ۹۴، ۱۰۴، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۴۷۔

نرمی کرنا اور معاف کرنا۔ ۲۶، ۲۷، ۴۳، ۴۸، ۶۴، ۹۹، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۶، ۱۲۹۔

اللہ سبحانہٗ کی قوت، قدرت، اختیار، احاطہ اور غلبہ ۳۰، ۵۶، ۱۰۸، ۱۳۳۔

اللہ کی ذات حاکمیت، اقتدار، پادشاہی۔ ۴۷۔

اللہ کی ذات کارساز، ولی، مددگار اور وکیل ہے ۴۵، ۸۱، ۱۳۲

اللہ کی ذات بصیر ہے ۳۲، ۵۸، ۸۶

اللہ کی ذات دانائی اور حکمت والی ہے ۲۴، ۲۶، ۵۶، ۹۲، ۱۰۴، ۱۳۰۔

اللہ کی ذات وسعتوں والی ہے ۱۳۰۔

اللہ کی ذات سننے والی ہے ۵۸۔

اللہ کی ذات مالک ہے ۱۳۲۔

توحید الوہیت و ربوبیت

رسالت و نبوت

دستوری قواعد

صحابہ کا چہرہ

اسلامی شعائر

اجتماعی قوانین

اخلاقی قوانین

مالیاتی قوانین

عرب میں دستور تھا کہ یتیم لڑکی اگر خوبصورت اور مالدار ہوتی تو سرپرست بطمع زر خود نکاح کر کے اسے نقصان پہنچاتا یا دوسرے سے نکاح کر دیتا مگر اس شرط پر کہ مال کا

سیاسی قوانین

دفاعی قوانین

آخرت کی زندگی

نفاق کا چہرہ

معاشرتی قوانین

ایمان واسلام

فوجداری قوانین

اصطلاحاتِ قرآنیہ

احصان: یہ لفظ لغت میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے، حریت، عفت، تزوج اسلام اور قید میں رکھنا، قرآن میں احصن جس موقعہ پر آیا ہے وہاں منکوحہ بنانے کے معنے میں ہے اور اور قید سے بھی یہاں قیدِ نکاح مراد ہے۔ اسی سے محصنات کا لفظ ہے جو اُن عورتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی کی قیدِ نکاح میں ہوں۔ نیز یہ لونڈیوں کے مقابل لفظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس صورت میں اس کا اطلاق حرائراد شریف زادیوں پر ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ ان دونوں معنے میں آیا ہے۔ احصان کی قیدِ نکاح کو سفاح سے ممتاز کرنے کے لیے نکاح کا اصل مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ احصان پایا جاتے۔ قرآن نے احصان کی قید لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا۔

اجور: اجر کی جمع ہے۔ مزدوری، ثواب، مہر، بدلہ کے معنے میں آتا ہے۔ عورتوں کے لیے نکاح میں مال اور مہر کی شرط لگانے سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اکراہ یا توارث کے ان امکانات کا بالکل سدِ باب ہو جائے جن کی طرف چوتھے پارے میں اشارات گزر چکے۔ اگرچہ اس کا بہت کچھ سدِ باب رحم کے رشتوں کو حرام قرار دینے سے بھی ہو گیا تھا۔ لیکن قیدِ مہر سے اس کو اور بھی مسدود کر دیا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ نکاح کے معاملے کو ایک سنجیدہ معاہدے کی حیثیت حاصل ہو جائے اسے لڑکوں کا

کھیل نہ بنایا جائے جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی شرط ہو اور اس ادائے مال کی حیثیت محض ایک تبرع اور احسان کی نہ ہو بلکہ ایک فریضہ کی ہو تاکہ اگر وہ مذکور نہ بھی ہو پھر بھی لازماً مضمر سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی کے اعتبار سے اس کی ادائیگی واجب قرار پائے قانوناً اور عرفاً ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا جب تک وہ سو بار سوچ کر اس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ان مصالح سے نکاح میں اجر کی شرط ضروری ہوئی ہے۔

اراءت ربانی: یہ لفظ قرآن میں اس وحی کے لیے بھی آیا ہے جو انبیاء کو خواب میں ہوتی ہے جیسا کہ سورۃ انفال میں ہے اور اس رہنمائی کے لیے بھی آیا ہے جو فہم و فراست کے ذریعے اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوتی ہے یعنی وحی کتابی کے اصول و کلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت کے ذریعے نبی جو فیصلے کرتا ہے یہ اللہ کی جانب سے آتا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ اے پیغمبر کتاب کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعے جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو بھی سمجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلامی قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

استمتاع: اس کا مادہ متع ہے۔ اسی سے تمتع، استمتاع اور متعہ آتے ہیں۔ استمتاع کے معنے ہیں طلب تمتع یعنی دیر تک نفع اٹھانا۔ عربی میں بولتے ہیں استمتع الرجل بولدہ یعنی آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا۔ اس لیے استمتاع کے لغوی معنے صرف فائدہ اٹھانے کے ہیں نہ کہ تعلقات زناشوئی کے۔ اور متعہ کے معنے ایسی عورت سے فائدہ اٹھانے کے ہیں جسے تم اپنی بنا کر ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ دیکھو لسان العرب یا جیسا کہ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا تھا کہ مال کی مقررہ مقدار اسے دے گا اور مقررہ وقت تک اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ استمتاع عام ہے اور متعہ بلغت میں خاص معنے میں استعمال ہوا ہے۔ بڑے چھوٹے انسان کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا اور باپ کا بیٹے سے فائدہ اٹھانا استمتاع ہے۔ لسان العرب میں زجاج کی رائے نقل کی ہے کہ اس آیت میں استمتاع کو متعہ کے

معنے میں لے کر کچھ لوگوں نے لغت سے نادانی کی وجہ سے سنگین غلطی کی ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ آیت متعہ کے موضوع پر نازل ہوئی ہے۔ قطعاً غلط ہے اور اس سلسلے میں عبداللہ بن مسعود کی روایت ایک من گھڑت افسانہ ہے۔ نیز وہ یہ روایت اہل سنت کی کتابوں میں درج ہے کیونکہ آیت کی یہ تشریح نظم قرآنی کے خلاف ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ

"ہر تفسیر کہ خلاف نظم قرآنی باشد گو روایت صحیح بکنند مسموع و مقبول نیست۔"

یہ درست ہے کہ متعہ عرب میں رائج تھا اس لیے اگر نزول حکم قرآنی سے پہلے حضور انور نے کسی جنگ میں اس کی اجازت دی ہو تو وہ دوسری بات ہے اجازت نزول حکم سے پہلے کی ہے۔ جب قرآن نازل ہو گیا تو روایات میں ممانعت بھی آگئی۔ اب اجازت کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شراب کے متعلق کسی روایت کو پیش کرے۔ یہ بداخلاقی نہیں تو اور کیا ہے؟

الامانات: امانت کی جمع ہے۔ یہ لفظ قرآن کی اصطلاح میں وسیع معنے میں بولا جاتا ہے۔ افعال، اعمال، اخلاق، معاملات، اموال سب پر حاوی ہے۔ ابن الاثیر نے نہایہ میں تصریح کی کہ امانت کا لفظ طاعت، عبادت، ودیعت، ثقہ اور امان پر بولا جاتا ہے۔ شارحین قرآن کی تشریح کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی بات زمخشری نے کشاف میں اور دوسری بات محدث ابن جریر نے تفسیر میں لکھی۔ اور وہ امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا فرض ہے۔ ایمان اور امانت دونوں کا مادہ امن ہے اسی لیے طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں ہے۔ اور اسی لیے ارشاد ہے کہ امانت لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے یعنی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے یا مال و دولت تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھے بلکہ ہر مالی، سیاسی، قانونی، تمدنی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔

آیت انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض والجبال میں امانت سے تمام مفسرین کے نزدیک تکلیف شرعی مراد ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر موضح القرآن میں فرماتے ہیں:

امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر، آسمان و زمین وغیرہ میں اپنی خواہش کچھ نہیں ہے یا ہے تو وہ ہی ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ انسان میں خواہش اور ہے اور حکم اس کے خلاف ہے اس پرائی چیز یعنی حکم کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے اس کا انجام یہ کہ منکروں کے قصور پر پکڑا جائے اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے۔ اب بھی حکم ہے کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کردے تو بدلہ دینا پڑ جائے اور بے اختیار ہو جائے تو کچھ نہیں۔

امانی ۱۔ جھوٹی آرزوئیں خیالات کے انداز سے۔ ٹھہرائی ہوئی امیدیں بروزن افاعیل تشدید یا بر ہے۔ امنیۃ کی جمع جس کے معنے کسی ٹھہرائی ہوئی تمنا کے ہیں۔ بعض مفسرین نے امانی کے معنے جھوٹی باتوں کے اور بعض نے بغیر سمجھے بوجھے پڑھ لینے کے بیان کیے ہیں۔ چونکہ جھوٹی بات میں ایک بے حقیقت چیز کا ٹھہرانا ہوتا ہے اور بے سمجھے بوجھے پڑھنا اندازے پر چلنا ہوتا ہے اس لیے یہ دونوں معنے بھی امنیہ سے مراد ہو سکتے ہیں ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی میں یہی معنے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہودی اپنی کتاب کی اصل حقیقت سے تو واقف نہیں ہیں کہ اس میں ان کو کیا تعلیم دی گئی ہے۔ بس ان کے ذہن میں کچھ تمنائیں اور خواہشات ہیں جو اگرچہ بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں لیکن ان کے علماء کی غلط تعلیم سے ان کے اندر دبی رچی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی کتاب کو انہی خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کتاب ان کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتی بلکہ صرف ان کی ان خواہشات کی سند تصدیق عطا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ قرآن حکیم نے ان کی اس قسم کی بعض آرزوؤں کا حوالہ دیا ہے۔ قرآن نے ان آرزوؤں کی حیثیت کو بھی واضح کیا ہے کہ ان کی یہ تمام آرزوئیں محض یہود اور ان کے علماء کے ذہن کی تخلیقات ہیں۔ ان کو اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

استنباط: اس کا مادہ نبط ہے اور نبط البیر کے معنے کنوئیں کو کھود کر پانی نکالنے کے ہیں اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی بات کی تہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت کو پانے کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اسی سے مجتہدین کا استنباط ہے جب وہ اپنے فہم اور اجتہاد

سے مخفی معنے نکال لیتے ہیں اس لیے صاحب تاج العروس نے استنباط کے معنے استخراج لکھے ہیں یعنی ایک بات کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکالنا۔ استنباط کے لغوی معنے تو یہی ہیں کہ ایک بات کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکالنا مگر اصطلاحاً اس سے مراد اجتہاد ہے یعنی یہ معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کرنا کہ مسئلہ زیر بحث اسلام کا حکم یا اس کا منشا کیا ہے۔ بعض لوگ غلطی سے استنباط کو بالکل آزادانہ رائے کے استعمال کے معنے میں لیتے ہیں، حالانکہ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ اسلام میں اصل قانون قرآن و سنت ہے۔ انسان جو قانون سازی بذریعہ استنباط کرتے ہیں وہ لازماً یا تو اصل قانون سے ماخوذ ہونی چاہیے یا پھر ان حدود کے اندر ہونی چاہیے جن میں وہ استعمال رائے کی آزادی دیتا ہے اس سے بے نیاز ہو کر جو استنباط کیا جاتے وہ نہ اسلامی استنباط ہے اور نہ اسلام کے قانونی نظام میں اس کا کوئی مقام ہے۔ یہاں اولی الامر کے ساتھ استنباط کا لفظ بتا دیا کہ قرآن اسلامی حکومت میں اولوالامر کے اندر کس قسم کے اوصاف کا خواہاں ہے۔ اولوالامر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں قرآن و سنت کا اتنا علم ہو کہ جس سے آدمی نہ صرف جزوی احکام اور ان کے مواقع سے واقف ہو بلکہ شریعت کے کلیات اور اس کے مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اس کو ایک طرف یہ معلوم ہو کہ انسانی زندگی کی اصلاح کے لیے قانون اسلامی کی مجموعی اسکیم کیا ہے اور دوسری طرف یہ جانے کہ اس مجموعی اسکیم میں زندگی کے ہر شعبے کا کیا مقام ہے۔ اسلام اس کی تشکیل کن خطوط پر کرنا چاہتا ہے اور اس کی تشکیل میں اس کے پیش نظر مصالح کیا ہیں۔

اولوالامر: اولو جمع ہے اس کا واحد نہیں لیکن بعض ذو کو اس کا واحد کہتے ہیں۔ اس کے معنے والا اس کا مونث ذات بمعنی والی آتا ہے۔ اس کی جمع اولات آتی ہے۔ الامر کے معنے حکم کے ہیں اور اس کے معنے کام، معاملہ حالت بھی ہیں۔ امر بمعنی حکم ہی سے امارت بمعنے حکومت آتا ہے جیسے ولایت اور سیاست، جب یہ حکم کے معنے میں ہو تو اس کی جمع اوامر آتی ہے اور دوسرے معنے میں ہو تو جمع امور آتی ہے۔ امر بمعنے حکم کے لیے آمر اور مامور ضروری ہیں۔ آمر میں وجاہت اور مامور میں طاعت امر کا تقاضا ہے۔ اولوالامر کون ہیں۔ اس میں اچھی خاصی قیل و قال ہوتی ہے۔ حافظ ابن

القیم نے اعلام میں لکھا ہے کہ ایک روایت میں عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، الحسن البصری، ابو العالیہ، عطاء بن ابی رباح، الضحاک اور مجاہد کہتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد علماء ہیں۔ ابو ہریرہ اور ایک روایت میں عبداللہ بن عباس، ایک روایت میں زید بن اسلم السدی اور مقاتل کہتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد حکام وفرمانروا ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امراء کی طاعت بھی اسی وقت ضروری ہے جب وہ نبوت کے علم وعمل کے مطابق حکم دیں، اگر یہ خود عالم نہ ہوں تو امراء کی طاعت علماء کی طاعت کے تابع ہے کیونکہ طاعت تو معروف میں ہوتی ہے اور نبوت کے علم کی ہوتی ہے جیسے علماء کی طاعت، رسول کی طاعت کے تابع ہے ایسے ہی امراء کی طاعت علماء کی طاعت کے تابع ہے اور کیونکہ اسلامی نظام کا قوام علماء اور امراء سے وابستہ ہے اس لیے ان دونوں کی طاعت ناگزیر ہے۔ ان ہی دو طبقوں کا بناؤ سنوار اور بگاڑ پورے عالم کے فساد وصلاح کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں۔

انسانی زندگی میں یہ دونوں قسمیں ہی مدار صلاح و فساد ہیں۔ ان کی درستگی سے جہاں درست اور ان کے بگاڑ سے جہاں بگڑ جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے عہد اول میں علماء ہی امراء ہوتے تھے۔ غیر علماء کو امارت سپرد نہ کی جاتی تھی اس لیے وہاں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ طاعت کس کی ہو بعد کو زمانہ استبداد میں جب اسلام ناآشنا اقتدار پر جبراً قابض ہو گئے اور علماء کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو یہ سوال ابھر آیا کہ امراء اگر علماء نہ ہوں تو ان کے اوامر کی بھی بجا آوری ضروری ہے۔ اسلامی نظام میں ہر شعبۂ زندگی میں سربراہی کے لیے اسلام آشنائی ناگزیر ہے۔

اخلاص: میر سید شریف نے لکھا ہے کہ اخلاص کے معنے لغت میں طاعات میں دکھاوا نہ کرنا اور اصطلاح میں اخلاص نام ہے ہر ملاوٹ کے شائبہ سے دل کو صاف رکھنا، اور علامہ الشیخ محمد اعلی التھانوی نے صوفیاء سے اخلاص کی تعریف یہ نقل کی ہے، اخلاص یہ ہے کہ تمام حرکات، سکنات، اٹھنا، بیٹھنا، کردار و گفتار اور زندگی کی ساری کروٹیں اللہ کے لیے ہوں۔

اور حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین شرح منازل السائرین میں عارف ہروی سے یہ تعریف نقل کی ہے کہ اخلاص کہتے ہیں عمل کو ہر ملاوٹ سے پاک وصاف کر دینے کو۔ اخلاص کی حقیقت مقرر کرنے میں تعبیرات مختلف ہیں لیکن مآل سب کا ایک ہے۔

قرآن میں ان تمام آیات پر غور کرنے سے جن میں اخلاص کا مطالبہ ہے۔ دو باتیں بالکل بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اخلاص اللہ کے لیے ہو اور دوسرے یہ کہ دین میں ہو۔ ان آیات کو غور سے پڑھیے الا للہ الدین الخالص فاعبد اللہ مخلصاً لہ الدین، قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین۔ قل اللہ اعبد مخلصا لہ دینی و ادعوہ مخلصین لہ الدین، دعوا اللہ مخلصین لہ الدین، وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ ان آیات میں اللہ کے لیے دین میں اخلاص کو بتایا گیا ہے۔ دین کا لفظ قرآن حکیم میں کئی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ مذہب و شریعت، قانون، اطاعت اور جزا، یہاں اخلاص کے ساتھ لفظ دین اطاعت کے معنے میں آیا ہے۔ دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کردے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

تراضی : آپس میں ایک دوسرے سے خوش ہونا، اسلام میں یہ لین دین اور کاروبار کی آزادی کا بہت بڑا پروانہ ہے۔ اس معاملہ میں قرآن نے اساسی اور بنیادی شرط لین دین کے لیے لین دین کرنے والوں کی باہمی رضامندی کو قرار دیا ہے۔ یعنی دین میں یہ وہ اہم بنیادی شرط ہے کہ کبھی بھی اس سے الگ ہوکر کسی لین دین کے جواز کا تصور نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے یہاں معاملات میں جواز کی شرط تراضی قرار دی ہے لیکن تبرعات و صدقات میں حلت کی بنیادی شرط طیب نفس بتائی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے قاعدۃ العقود نامی کتاب میں تفصیل پیش کی ہے۔ لین دین میں رضامندی جانبین کی جیسے یہ آیت بطور شرط بتادی ہے ایسے ہی تبرعات میں طیب نفس کی شرط پر یہ آیت رہنما ہے فان طبن لکم عن شیء منہ نفسا دیکھئے جلد چہارم معالم القرآن نوٹ نمبر ۶ سورۂ نساء۔

تفضیل بعض علی بعض : اللہ نے کچھ کو کچھ پر برتری عطا فرمائی ہے۔ یہاں یہ بات محذوف ہے کہ برتری کس چیز میں دی ہے۔ قرآن نے نوعِ انسانی کی اس خصوصیت کا مختلف پیرایوں میں تذکرہ کیا ہے کہیں تفضیل بعض علی بعض کے عنوان سے کہیں رفع بعض

فوق بعض کے الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو تمام کائنات کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے فرق مراتب پر ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ صفات کے تفاوت کا اگر یہ تماشا دُنیا میں نہ ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوقلمونیوں سے جو بھرا ہوا نظر آتا ہے نہ ہوتا مقصد یہ ہے کہ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں بلکہ براہ راست اللہ کا کام ہے۔ اور جس طرح یہ قدرت کا کارنامہ ہے اسی طرح تفاوت صفات کی وجہ سے افرادِ انسانی میں مدارج و مراتب کا جو فرق پیدا ہو گیا ہے یہ بھی کسی دوسرے کا نہیں بلکہ صاف لفظوں میں کہہ دیا فضل اللہ بعضھم علی بعض بہر حال صفاتی و کمالاتی تفاوت کا جو قانون انسانی افراد میں پایا جاتا ہے یہی قرآن کی اصطلاح میں تفضیل بعض علی بعض ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کیا ہے کہ بعض افراد کو بعض پر اللہ نے برتری اور فضیلت بخشی ہے لیکن یہ بات کہ کن باتوں میں فضیلت بخشی ہے اسے ابہام و اطلاق ہی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اتنے مختلف الجہات وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی۔ مگر صفاتی تفاوت کے اس قدرتی قانون کے زیرِ اثر انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر نتیجۃً جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہو گئی اس کے لیے قرآن میں دوسری جگہ فی الرزق کی جو تصریح کر دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی لحاظ سے انسانی افراد میں مدارج کا فرق اسی پر مبنی ہے۔

توفیق ، وفق سے بنا ہے دو چیزوں کے درمیان مطابقت کا نام ہے۔ اتفاق اور موافقت اسی سے بنا ہے۔ جب اسلام نے طاقت پکڑ لی اور یہود کی مدینے میں سیاسی طاقت کمزور ہو گئی تو مسلمانوں کو قرآن نے ہدایت دی کہ اب منافقین کے بارے میں اپنی روش بدلیں یعنی ان لوگوں کے بارے میں جو دم تو بھرتے ہیں اسلام کا لیکن اسلام کے سیاسی نظام کو نہیں مانتے چنانچہ مسلمانوں نے ان کا قدم قدم پر محاسبہ شروع کر دیا۔ منافقین اس صورت حال سے پریشان ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ کر دربارِ نبوت میں آتے اور قسمیں کھا کر آپ کو یقین دلاتے کہ وہ یہودیوں سے جو سیاسی ربط و ضبط اور جوڑ توڑ اب تک رکھتے تھے وہ صرف اس لیے تھا کہ اس سے مسلمانوں

اور یہودیوں میں کچھ موافقت ہو جائے۔ اس طرح یہاں آیت میں لفظ توفیق، وفاق کے معنے میں ہے۔ صوفیا اور عرفا کی اصطلاح میں توفیق ۱۳ مشاہد میں سے ایک مشہد ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ سبحانہ بندہ کو خود بندے کے حال پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی نگرانی کرے۔ اس کا مقابل خذلان آتا ہے یعنی بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا۔ لکھا ہے کہ توفیق اگر آتی ہے تو اللہ کا فضل اور احسان ہے۔ اور اگر خذلان ہو تو یہ اس کی حکمت اور عدل ہے۔ آیتِ قرآنی میں لفظ توفیق ان معنے میں نہیں ہے۔

تزکیہ: اس کے لفظی معنے پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں۔ قرآن میں اس لفظ کو ان معنے میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے۔ یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کرکے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے۔ سورہ والشمس میں ہے قد افلح من زکٰھا وقد خاب من دسّٰھا بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو صاف ستھرا کر لیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اسے مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔ دوسری جگہ ہے قد افلح من تزکّٰی بلاشبہ وہ کامیاب ہے جو پاک ہو گیا۔ ان آیتوں سے اندازہ ہو گا کہ قرآن پاک میں اس تزکیہ کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خصوصیت قرار دی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں۔ ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف اور ستھرا بنائیں۔

تحیۃ: حیاہ تحیۃ کے اصل معنے کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ اسی سے دعائیہ کلمات "حیاک اللہ" ہے جس کے معنے ہیں اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ سلام میں چونکہ معنوی اعتبار سے زیادہ ہمہ گیری اور وسعت تھی اس لیے السلام علیکم کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس آیتِ قرآنی میں قرآن ہی کی دوسری آیت فسلموا علی انفسکم کی وجہ سے تحیت سے سلام مراد ہے وفیہ الدلالۃ علی انہ قد ارید بہ السلام لفظ سلام شعار ہونے کی وجہ سے گویا مومن و کافر کے درمیان ایک علامتِ فارقہ بن گیا۔ اور اس کو نبوت نے

اہمیت دی ہے کہ افشائے سلام میں تعارف عدم تعارف کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ یوں تو اسلام میں بہت سی عمومی چیزیں ہیں لیکن سلام کو رواج دینے کی عرب کے اس ماحول میں زیادہ اہمیت محسوس کی گئی جہاں شب و روز کی قتل و خون ریزی نے انسان کو ایسا خوفزدہ بنا دیا تھا کہ جب کوئی اجنبی شخص کسی سے ملتا تو وہ اس کو موت کا ایک فرشتہ نظر آتا قرآن نے یہ تعلیم دی کہ خوف و ہراس کا دور ختم ہوا اب سلامتی اور امن کا زمانہ آگیا اس کا اعلان کرنے کے لیے لفظ سلام مقرر کیا تاکہ پہلی ملاقات میں یہ بات صاف ہو جائے کہ اب تمہارے لیے صدائے موت نہیں بلکہ پیغام سلامتی ہوں۔ اس لفظ کو چلتے پھرتے اس کثرت سے استعمال کرنے کا حکم دیا کہ خوف دنیا کے پردے سے اُٹھ جائے۔

تغییر: اس کے معنے بدل دینے کے ہیں اللہ کی بناوٹ کو بدل دینا دو طرح کا ہے ایک حسی دوسرے معنوی، حسی یہ کہ مردوں کو خصی کر دیا جائے، کانوں کا کاٹنا، آنکھوں سے اندھا کر دینا، ناکوں کا کاٹ دینا اور وہ تمام تعزیریں جو اپنے وقت میں ظالم حکمران اور جبابرہ کرتے تھے۔ عبداللہ ابن عباس اور انس بن مالک فرماتے ہیں کہ آیتِ قرآنی کا منطوق یہی تغییر حسی ہے اور عبداللہ ابن عباس سے یہ روایت بھی کہ آیتِ قرآنی کا منطوق تغییر حسی نہیں تغییر معنوی ہے یعنی اس فطرۃ اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً توحید دینِ فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کر دیا۔ قرآن میں دوسرے مقام پر توحید کو دینِ فطرت اور دینِ قیم سے تعبیر کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اللہ نے اسی پر لوگوں کو پیدا کیا ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے لا تبدیل لخلق اللہ ہمارے نزدیک آیتِ قرآنی کا منطوق بھی ہے۔ تغییرِ حسی یعنی وہ ساری چیزیں جو فطرۃ اللہ کی تبدیلی کے حکم میں اس کا مدلول ہیں۔

جبت: سے مراد اعمالِ سفلیہ مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل، جفر، فال گیری نجوم اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے امام راغب لکھتے ہیں۔ جبت اور جبس اس دھودں کو کہتے ہیں جو کسی کام کا نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ تا سین ہی کا بدل ہے۔ نیز ہر وہ چیز جس کو خدا کے سوا پوجا جائے

جبت کہلاتی ہے اور جادو اور کاہن کو بھی جبت کہتے ہیں۔ اصل میں جبت کے معنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عمر جبت کے معنے جادو بتلاتے ہیں عکرمہ کہتے ہیں کہ جبت حبشی زبان میں شیطان کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ امام طبری نے مجاہد سے جادو اور سعید بن جبیر سے جادوگر اور قتادہ سے شیطان اور ابن عباس سے بُت کے معنے نقل کیے ہیں۔ امام ابن جریر طبری کا فیصلہ اس سلسلہ میں نہایت صاف ہے جس سے ان تمام مختلف اقوال میں توفیق ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں:

> جبت اور طاغوت سے وہ جنس مراد ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کی جائے خواہ وہ بُت ہو یا شیطان، آدمی ہو یا جن اس میں جادوگر اور کاہن بھی آجاتے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں حضرت قبیصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

> میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ پرندوں کو اُڑا کر نیک فال لینا اور فال بد نکالنا اور رمالوں کا خط کھینچنا جبت میں داخل ہے۔

دیۃ : یہ اصل میں ودیٰ یدی کا مصدر ہے۔ مقتول کے بدلہ میں جو خون بہا ادا کیا جاتا ہے اس کا نام دیت ہے۔ دیت میں سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم دینے پڑتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے زمانہ میں کرنسی کے لحاظ سے دو ہزار سات سو چالیس روپے تخمینہ بتایا ہے۔

زکوٰۃ : ستھرائی، پاکیزگی، زکوٰۃ، تزکیہ سے اسم ہے۔ علامہ زمخشری تفسیر سورہ مومنین میں لکھتے ہیں، زکوٰۃ ذات اور معنی دونوں کے درمیان مشترک اسم ہے۔ ذات تو نصاب کی وہ مقدار ہے جس کو زکوٰۃ دینے والا نکال کر دیتا ہے اور معنی زکوٰۃ دینے والے کا فعل ہے جس کا نام تزکیہ ہے۔ اور سورۂ کہف میں زکوٰۃ کے معنے گناہوں سے پاک و صاف ہونے کے بتائے ہیں اور علامہ ناصر بن عبدالسید مطرزی المغرب فی ترتیب المعرب میں رقمطراز ہیں۔ «زکوٰۃ کے معنے تزکیہ کے ہیں۔ ارشاد ہے والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون (اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں) پھر زکوٰۃ مال کی

اس مقدار کا نام پڑ گیا کہ جو فقیروں کے لیے نکالی جاتی ہے اور ترکیب طہارت کو بتلاتی ہے اور کچھ کے خیال میں اس کے معنے زیادتی کے ہیں اور یہی ظاہر ہے اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں، اصل میں زکوٰۃ وہ افزونی ہے جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لیے کہا گیا کہ اس میں برکت کی اُمید ہوتی ہے یا اس لیے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی اور صفائی کی اہمیت اسلام میں کس قدر ہے یہ دل کی پاکی رُوح کی صفائی اور نفس کی طہارت نبوت کا اصل مقصد ہے، انسانوں کی روحانی ونفسانی بیماریوں کے بڑے حصے کا سبب تو اللہ سے خوف ورجا اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا سبب ماسوی اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسباب دُنیا سے دل کا تعلق زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب کچھ صحابہ سے عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا اور پھر ان کی صداقت کی بنا پر خدا نے ان کو معاف کر دیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن نے کہا خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک و صاف بنا دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ راہ خدا میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دُور ہو جاتا ہے

سفاح : سفح کے لغوی معنے بہانے کے ہیں اور سفاح کے معنے ہیں عورت کا مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں رہنا اور صحیح طور پر ان کا عقد نہ ہونا، جس کے معنے عیاشی اور بدکاری کے ہیں اس لیے کہ اس میں بھی عورت اور مرد دونوں محض لذت گیری کو مقصد بنا کر اپنا مادہ منی برباد کرتے ہیں۔ قرآن میں محصنین کی قید غیر مسافحین اور محصنات کی قید غیر مسافحات لگا کر نکاح اور سفاح میں امتیاز قائم کیا ہے۔ یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا پورا کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے۔

سکاریٰ : سکر سے جس کے معنے مست ہونے کے ہیں۔ یہ جمع تکسیر ہے یا اسم جمع۔ امام تاج الدین ابو محمد بن مکتوم قیسی حنفی نحوی الدر اللقیط میں لکھتے ہیں۔ سکاریٰ مضموم کے

بارے میں علماء کو اختلاف ہے کہ آیا یہ جمع تکسیر ہے۔ سیبویہ نے تکسیر صفات کے بیان میں کہا ہے اور کبھی بعض صفات کی فعالٰی کے وزن پر بھی آتی ہے۔ چنانچہ بعض سُکاریٰ اور عُجالیٰ بولتے ہیں۔ فعالٰی کے جمع ہونے پر یہ سیبویہ کی صاف تصریح ہے اور استاذ ابوالحسن بن الباذش کو وہم ہو گیا جو انہوں نے سیبویہ کی طرف یہ نسبت کر دی کہ یہ اسم جمع ہے، نیز یہ کہ ابنیہ کے سلسلے میں سیبویہ نے اس کو بیان بھی کیا ہے۔ ابن الباذش کا بیان ہے کہ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایسے وزن پر آیا ہے جس پر کبھی کوئی جمع آتی ہی نہیں ہے حالانکہ ابنیہ کے سلسلے میں سیبویہ کی اس کے سوا کوئی تصریح نہیں کہ وہ جمع تکسیر ہے چنانچہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ فعالٰی کا وزن اسم میں ہوتا ہے جیسے حباریٰ سمانیٰ کباریٰ اور صفت نہیں ہوتا۔ ہاں صرف اس صورت میں کہ اس کے وزن پر واحد کی تکسیر کر لی جائے جیسے عجالیٰ سکاریٰ اور کسالیٰ میں اور سیرافی نے اس بارے میں دونوں قول بیان کیے ہیں اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ جمع تکسیر ہے اور سیبویہ کا کلام اسی کا مؤید ہے۔ اور امام ابن جنی فرماتے ہیں۔ اور سُکاریٰ بالضم، ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مفرد غیر مکسّر ہے جیسا کہ حباریٰ، سمانیٰ اور سُلامیٰ ہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مکسّر ہو اور ان الفاظ میں سے ہو جو کہ فعالٰی کے وزن پر آتے ہیں جیسے عراق اور رخال مگر اتنی بات ہے کہ الف مقصورہ لگا کر اسے مونث بنا دیا گیا ہے۔

اور امام ابوبکر الجصاص سکاریٰ پر رقمطراز ہیں کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ سکر سے اس آیت میں کیا مراد ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ابراہیم اور قتادہ نے شراب کا نشہ بتایا ہے اور ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے خاص طور پر نبیذ کا نشہ مراد ہے۔ صحیح تاویل یہ ہے کہ یہاں شراب کا نشہ مراد ہے اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ سونے والے کو اور جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہو اسے سکران نہیں کہا جاتا۔ شراب میں مست کو فی الواقع سکران کہتے ہیں اس لیے لفظ کو حقیقت پر محمول کرنا ضروری ہے اور بغیر قرینہ کے مجازی معنے پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ وہ سبب نزول ہے جس کے پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

شُحّ : خود غرضی، کنجوسی، بخل، حرص۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی ادائے حقوق میں تنگدلی کا مظاہرہ کرے۔ یہ چیز ہر حال میں بُری ہے لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے بُری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی۔ اس وجہ سے اس کا اچھا یا بُرا ہونا ایک امرِ اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے لیکن اکثر طبائع پر اس کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ شح وہ بخل ہے جس میں حرص ہو اور عادت بن گیا ہو۔ اُردو میں اس کے لیے خود غرضی کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ یہ مصدر ہے اس کا فعل باب عَلِمَ، ضَرَبَ اور نَصَرَ تینوں باب سے آتا ہے۔

شُہداء : شہید کی جمع ہے گواہ، شاہد، نگران، احوال کہنے والا، اقرار کرنے والا، امام راغب نے لکھا ہے کہ "شہید" شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی علامہ ابو السعادات مبارک ابن الاثیر جزری النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں رقمطراز ہیں:

> حق تعالیٰ کے اسماء میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں۔ فعیل فاعل کے معنی میں مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور امور باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور امور ظاہرہ کی طرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔

اور شرع میں "شہید" وہ شخص ہے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہو۔

شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی موضح القرآن سورۃ نساء میں زیر آیت ومن یطع اللہ والرسول الآیۃ فرماتے ہیں:

> "نبی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے وحی آدمی یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام کہہ جائے اور "صدیق" وہ کہ جو وحی میں آوے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور "شہید" وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا صدق آیا

کہ اس پر جان دیتے ہیں اور نیک بخت (صالح) وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے۔"

اس معنی میں شہید کا اشتقاق آیا۔ "شہادۃ" سے ہی یا "مشاہدۃ" سے یا "شہود" سے نیز "فعیل" بمعنی "فاعل" ہے یا "مفعول" ہے۔ اسی پر علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن سہیلی نے الروض الانف میں نفیس بحث لکھی ہے جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے: فرماتے ہیں:

یہ اسم "شہادۃ" سے ماخوذ ہے یا "مشاہدۃ" سے، اگر "شہادۃ" سے ہے تو شہید بمعنی "مشہود" ہے یعنی اس کے حق میں جنت کی شہادت دی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "شہادۃ" ہی سے ماخوذ ہو اور "فعیل" بمعنی "فاعل" ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وتکونوا شھداء علی الناس یعنی تم لوگوں پر گواہی دو گے اور یہ چیز گو ساری امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے بارے میں عام ہے پر شہداء کے لیے یہ نام اولیٰ ہے کیونکہ وہ صدیقین وانبیاء کے پیچھے ہی ہیں، اللہ سبحانہ فرماتا ہے فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء، سو شہید کے معنی میں یہ دو وجہیں تو جب ہیں کہ اس کو شہادۃ سے مشتق قرار دو۔"

اور اگر "مشاہدۃ" سے ماخوذ ہو تب بھی "فعیل" بمعنی "فاعل" ہے کہ "شہید" ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کرتا اور اللہ کے ان فرشتوں کا معائنہ کرتا ہے جنہیں اور کوئی نہیں دیکھتا اور "مشاہدۃ" سے بمعنی "مفعول" بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی بایں معنی کہ فرشتے اس کے قبض اور اس کی روح کے عروج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ان سب وجہوں میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ یہی ہے کہ "فعیل" بمعنی "مفعول" ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ اس کے لیے جنت کی شہادت دی گئی ہے یا نبی علیہ السلام کی اس کے لیے شہادت ہو گی چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ ھٰؤلاء الذین اشھد علیھم (یہ وہ لوگ ہیں

جن پر میں گواہی دوں گا) پس یہ وجہ بحیثیت حدیث کے بھی قوی ہے اور بلحاظ عربیت ایک اور وجہ سے بھی وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شہدار کا ذکر کیا تو فرمایا والمراۃ تموت بجمع شہید (اور عورت کہ زچگی سے مرے شہید ہے) اور شہیدۃ نہیں فرمایا اور دوسری روایت میں ہے کہ والنفساء شہید یجرھا جنینھا بسررہ الی الجنۃ (نفاس والی عورت شہید ہے اسے اس کا بچہ اپنے نال سے جنت کی طرف کھینچے گا) پھر شہیدۃ نہیں فرمایا اور فعیل جب مونث کی صفت ہو تو ھا اسی وقت میں نہ ہو گی جبکہ وہ بمعنی مفعول ہو جیسے امرأۃ قتیل اور جریح ہیں اور اگر بمعنی فاعل ہو تو مونث ھا کے ساتھ آئے گی جیسے امرأۃ علیمۃ اور رحیمۃ وغیرہ ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ شہید بمعنی مشہود (جس کے لیے گواہی دی گئی ہو) اور مشہود علیہ (جس پر گواہی دی گئی ہو) اور یہ لغت سے تو استقراء صحیح اور حدیث سے استنباط بدیع ہے۔

شکر: شکر کرنا، احسان ماننا، قدر پہچاننا۔ شکر یشکر کا مصدر ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کشر کا بدلا ہوا ہے جس کے معنے کھولنے کے ہیں اور کفر اس کی ضد ہے جس کے معنے نعمت کے بھلانے اور اس کے چھپانے کے ہیں دابۃ شکور وہ جانور ہے جو اپنی فربہی سے اپنے مالک کی رکھوالی کا پتہ دے رہا ہو اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عین شکری ہے یعنی وہ چشمہ جو کہ پر ہو۔ اس اعتبار سے اپنے منعم کے ذکر سے اوقات کے پر ہو جانے کا نام شکر ہے۔ علامہ بغوی مجد الدین فیروز آبادی کی بصائر ذوی التمیز فی لطائف کتاب اللہ العزیز ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں ناقل ہیں "شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے اول شاکر کی مشکور کے لیے فروتنی، دوسرے اس سے محبت کرنا، تیسرے اس کی نعمت کا معترف ہونا، چوتھے اس نعمت کی بنا پر اس کی ثنا کرنا، پانچویں اس نعمت کو ایسی جگہ استعمال میں نہ لانا جہاں وہ ناپسند کرے۔ یہ پانچ باتیں شکر کی اساس ہیں اور ان پر اس کی بنیاد ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو شکر کے قواعد میں سے

ایک قاعدہ مختل ہو گیا۔ شکر کے بارے میں جس نے بھی کلام کیا ہے اس کا کلام ان ہی امور کی طرف راجع ہے۔ شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنے چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے ہماری زبان پر کفران نعمت کا لفظ استعمال میں ہے اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرماں برداری کی جائے۔ اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شکر ایمان کی جزو، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے۔

شقاق : مخالفت، مقابلہ اپنے دوست کی شق کو چھوڑ کر دوسری شق میں ہونا باب مفاعلت کا مصدر ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسی البحرالمحیط میں فرماتے ہیں۔ شقاق مصدر ہے شاق کا جیسے ضارب ضرابا خالف خلافا بولتے ہیں اور اس کے معنے عداوت رکھنے اور مخالفت کرنے کے ہیں۔ اس کی اصل شق سے ہے یعنی یہ ایک شق میں ہوا اور ایک شق میں، شق طرف کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مشقۃ سے ماخوذ ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک اس چیز کا خواہش مند ہوتا ہے جو دوسرے کو شاق ہو۔ رسول کے مقابلے میں مشاقہ کے معنے ہیں۔ رسول کے مقابل میں اپنی ایک پارٹی کھڑی کرنے کی کوشش کرنا۔

صلاۃ : نماز، دعا، رحمت، قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ صلوٰۃ بغیر اضافت ہے واو کے ساتھ مرقوم ہے، یہ لفظ کے مفخم ہونے کی بنا پر ہے جیسے کہ لفظ زکوٰۃ ہے، صلوٰۃ تصلیہ سے اسم ہے۔ امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں :

بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں، بولا جاتا ہے صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب وان کان صائما فلیصل (جب تم میں سے کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو

قبول کر لینا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنی چاہیے ، یعنی دعوت کرنے والے کے حق میں دعا کرے اور وصلّ علیھم ان صلاتك سکن لھم (اور دعا دے ان کو بے شک تیری دعا ان کے لیے آسودگی ہے) یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ (وہ رحمت بھیجتے ہیں رسول پر اے ایمان والو رحمت بھیجو اس پر) وصلوٰت الرسول (اور دعائیں یعنی رسول کی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر صلاۃ کا مطلب حقیقت میں ان کو سراہنا ہے ۔ ارشاد ہے ۔ اولٰئك علیھم صلوٰت من ربھم ورحمۃ (ایسے لوگوں پر ہی شاباشیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی) اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ کے وہی معنی ہیں جو آدمیوں کی طرف سے صلاۃ کے ہیں یعنی دعا کرنا اور مغفرت چاہنا ، ارشاد ہے : ان اللہ و ملٰئکتہ یصلون علی النبی (اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر)

اور وہ " صلاۃ " کہ جو عبادت مخصوصہ ہے (یعنی بمعنی نماز) اس کی اصل بھی دعا ہی ہے جس طرح کہ کسی شے کو اس کے بعض اجزاء کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں اسی طرح یہ عبادت یعنی نماز بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی (کہ دعا پر مشتمل ہے) نماز ان عبادات میں سے ہے کہ جس سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی ، گو اس کی صورتیں ہر شریعت کے اعتبار سے یکے بعد دیگرے مختلف رہیں اسی لیے وارد ہے ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً (بے شک یہ نماز ہی مسلمانوں پر بقید وقت فرض ہے) اور بعض علماء نے کہا ہے کہ صلاۃ کی اصل صلو ہے ان کا بیان ہے کہ صلّی الرجل کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ صلو کو کہ جو حق تعالیٰ کی سلگائی ہوئی آگ ہے اپنے اوپر سے دفع کر دیا اور صلّی کی بنا مرّض کی طرح ہے کہ جو ازالہ مرض کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

نیز عبادت خانہ کو بھی صلاۃ کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ کنائس یہود (یہودیوں کے عبادت خانے) صلوات سے موسوم ہیں ، ارشاد ہے لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد (تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں) اور ہر وہ مقام کہ جہاں حق تعالیٰ نے " فعل صلوۃ " پر مدح فرمائی ہے یا اس پر رغبت دلائی ہے وہاں لفظ اقامت مذکور ہے جیسے والمقیمین الصلوٰۃ (اور آفرین ہے نماز پر قائم رہنے والوں کو) واقیموا الصلوٰۃ (اور قائم کرو نماز) حالانکہ مصلین منافقین

کے سوا اور کسی کو نہیں کہا، چنانچہ فرمایا فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون
(پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو نماز سے بے خبر ہیں) ولا یاتون الصلوٰۃ الا وھم
کسالیٰ (اور نہیں آتے نماز کو مگر جی ہارے) لفظ اقامہ کو خاص طور پر اس لیے لایا گیا
کہ اس امر پر تنبیہہ ہو جائے کہ نماز پڑھنے کا مقصد اس کے حقوق وشرائط کی بجا آوری
ہے نہ کہ مجرد ہیئت کذائی کا ادا کر دینا۔ اس لیے مروی ہے کہ ان المصلین کثیر والمقیمین
قلیل (نمازی تو بہت ہیں نماز کے حقوق وشرائط ادا کرنے والے تھوڑے ہیں)

صالح :۔ نیک، اچھا، بھلا، صلاح سے جس کے معنے نیک ہونے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ
واحد مذکر، صُلحاء جمع، امام راغب لکھتے ہیں :

"صلاح فساد کی ضد ہے یہ دونوں اکثر استعمال میں افعال کے ساتھ مخصوص ہیں
قرآن مجید میں صلاح کہیں تو فساد کے مقابل لایا گیا ہے اور کہیں سیئہ کے۔ ارشاد ہے
خلطوا عملاً صالحاً و اٰخر سیئاً (ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد) اور
لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے
بعد) اور الذین امنوا وعملوا الصلحٰت تو بہت مقامات پر ہے۔"

صدیق :۔ بہت سچا صدق سے بروزن فعیل، مبالغہ کا صیغہ ہے۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ
صدیق وہ کہ جو جی آوے اس کا جی خود ہی اس پر گواہی دے۔ امام راغب رقمطراز ہیں :
صدیق وہ ہے جس سے بکثرت صدق ظاہر ہو۔ اور کہا گیا ہے بلکہ اس کو کہا جاتا ہے
جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اور بعض کہتے ہیں جس سے سچائی کے خوگر ہونے کی وجہ سے
جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو، اور بعض کا بیان ہے کہ جو قول و اعتقاد میں راستی پر ہو اور
اس کا کردار صدق ثابت کرے۔ ارشاد ہے۔ واذکر فی الکتاب ابراھیم
انہ کان صدیقا نبیاً ۔ صدیق وہ ہے جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ ہی کم ہو جیسا
کہ میں نے الذریعہ الی مکارم الشریعہ میں بیان کیا ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں
کہ صدیق میں صدوق سے زیادہ مبالغہ ہے اور صدوق میں صادق سے زیادہ اس لیے
صدق کے مراتب میں سب سے بلند ترمرتبہ صدیقیت ہے اور صدیقیت نام ہے کمال
اخلاص کے ساتھ رسالت کے لیے کمال انقیاد کا۔

عُدوان :۔ ظلم، ستم، زیادتی، یہ عدا یعدو کا مصدر ہے۔ امام ابوبکر عزیزی سجستانی لکھتے ہیں۔

عدوان کے معنے تعدی اور ظلم کے ہیں۔ آیت فلا عدوان الا علی الظالمین کے معنے یہی ہیں اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں " وہ عدوان کہ جس کی ابتدا کرنی ممنوع ہے اس آیت میں مراد ہے ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان لیکن جو عدوان کہ بدل کے طور پر ہو اور جس کا اس شخص کے ساتھ برتنا ہے جو اس کی پہل کر چکا ہے وہ اس آیت میں مراد ہے فلا عدوان الا علی الظالمین علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں عدوان کے معنے عدالت کو نظر انداز کرنے میں حد سے تجاوز کرنے کے لکھے ہیں۔ فلا عدوان الا علی الظالمین کے معنے ہیں دارو گیر نہیں مگر ظالموں پر اور بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ عدوان کے معنے ہیں بری طرح حد سے گزر جانے کے، خواہ یہ بات قوت و استعداد میں ہو یا فعل میں یا حال میں اور اسی معنے میں ارشاد ہے ومن یفعل ذالک عدوانا الخ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس پر مبسوط بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ عدوان یہ ہے کہ جس کی اصل بھی حرام ہے اور زیادتی بھی عدوان کی دو قسمیں ہیں ایک اللہ کے حق میں عدوان اور دوسرے بندوں کے حقوق میں عدوان اللہ کے حق میں عدوان کی مثال یہ ہے کہ منکوحہ اور مملوکہ کے علاوہ محرمات سے جنسی تعلقات قائم کرنا، ارشاد ہے فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ھم العادون۔ اور ایسے ہی ہر وہ چیز جس کی مقررہ مقدار مباح کی گئی ہو اس میں زیادتی عدوان ہے۔

عقد :- تاج المصادر میں عقد کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں گرہ و بیع بستن و سوگند خوردن و پیمان کردن۔ اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں " عقد کے معنے ہیں کسی چیز کے اطراف کو باہم جمع کر دینا اس کا استعمال اجسام کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے عقد الحبل اور عقد البناء اور بطور استعارہ معانی کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے عقد البیع اور عقد العہد اور تاج العروس میں ہے۔ " ائمہ اشتقاق نے جو کچھ اس بارے میں تصریح کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں حلّ کی ضد ہے جس کے معنے کھولنے کے ہیں۔ بعد کو اس کا استعمال لین دین اور دیگر معاملات میں بھی ہونے لگا۔ ازاں بعد اس کو یقین کی پختگی اور اعتقاد جازم کے لیے بھی بولا جانے لگا۔ آیت قرآنی والذین عقدت ایمانکم میں عقد یمین سے مراد عقد موالات ہے۔ عقد موالات یہ ہے کہ ایک شخص اگر کسی مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہے اور دونوں

باہم دوستی کا عہد و پیمان کر لیتے ہیں اور وراثت اور خون بہا کے لیے عہد کر لیتے ہیں۔ اگر اس مسلم کا اور کوئی وارث نہ ہو تو اس معاہدے کی بنا پر اس کی وراثت مسلمان کو ملے گی اور اس کی نسبت بھی مسلمان خاندان کی طرف ہو گی۔ اسی عقد موالات کی بنا پر امام بخاری کو جعفی، امام ابن ماجہ کو ربعی اور امام ابوحنیفہ کو تیمی کہتے ہیں۔

قوام : یہ قام یقوم سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اصل میں قام بالامر کے معنے کسی کام میں محنت کرنے کے ہیں اور اس کی ضد قعد عن الامر آتی ہے یعنی کسی کام میں محنت نہ کرنا، اسی سے قائم صفت کا صیغہ اور قوام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قسط کے معنے عدل و انصاف کے ہیں۔ اس آیت میں قوامین بالقسط لاکر بتایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ عدل و انصاف پر جمنے والے اور اس کے قائم کرنے میں خوب محنت کرنے والے ہو جاؤ یعنی یہ کام بہت زیادہ کرو اور ہمیشہ کرو۔ زمخشری نے اس کے معنے لکھے ہیں۔ مجتہدین فی اقامۃ العدل حتی لا تجوروا یعنی انصاف قائم کرنے میں محنت کرنے والے ہو جاؤ تاکہ تم ان پر ظلم نہ کرو۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں مواظبین علی العدل مجتہدین فی اقامتہ یعنی انصاف پر ہمیشہ قائم رہنے والے اور اس کے قائم کرنے میں محنت کرنے والے ہو جاؤ اور علامہ آلوسی صاحب روح المعانی میں فرماتے ہیں، اے اہل ایمان تم اپنے سارے معاملات میں عدل و انصاف پر جمنے والے اور اس میں بھرپور محنت کرنے والے ہو جاؤ اور محدث محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں، تمہارا اخلاق اور تمہاری تحریر میں انصاف کو قائم کرنا ہونا چاہیے۔ اور حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ اللہ سبحانہ اہل ایمان کو حکم دے رہا ہے کہ وہ انصاف کو قائم کرنے والے بن کر رہیں اور ادھر ادھر نہ ہوں اور نہ انصاف کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ کریں اور نہ ان کو انصاف کے مقام سے کوئی چیز ہٹاتے بلکہ انصاف میں ایک دوسرے کے مددگار بن کر رہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے نبوت کے علم و عمل کی صورت میں جو حق و عدل تمہیں عطا کیا ہے اب تمہارا ہر قول و فعل، افکار و اعمال اور احوال اسی ترازو میں تلے ہوتے ہونے چاہئیں اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو دنیا میں قائم کرنے والے بنو

قول بلیغ : اثر کرنے والی بات، بلاغت والی بات بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ بلاغت مصدر ہے، کسی شے کے بلیغ ہونے کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ وہ شے بذاتہٖ بلیغ ہو

یعنی زبان اور لغت کے اعتبار سے درست ہو۔ معنے مقصود کے مطابق ہو، اور حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہو۔ ان تینوں اوصاف میں سے اگر ایک وصف بھی کم رہا تو بلاغت میں نقصان لیے گا، دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ یعنی جس سے کہا جائے دونوں کے اعتبار سے بلیغ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کو اس خوبی سے ادا کرے کہ جس سے کہا جارہا ہے وہ اس کو مان لے۔ آیت قرآنی قل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً میں قول بلیغ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کر جائے۔ یعنی اب ان کو نصیحت کا انداز کان کھولنے والا اور دل میں دھنسنے والا ہونا چاہیے۔ یہ بہرے اور پلید لوگ ہیں۔ اس وجہ سے کریمانہ اندازِ نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ورنہ قرآن نے آدابِ گفتگو میں قول لین، قول حسن، قول سدید اور قول معروف کی ہدایت کی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی اسی ہدایت کے مطابق کریمانہ انداز میں بات فرماتے لیکن منافقین حضور اقدس کی اس کم النفسی کے نااہل تھے اور نہ قدردان بلکہ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے، اس وجہ سے یہاں یہ ہدایت ہوئی کہ اب ان کے ساتھ زیادہ نرمی برتنے کا موقعہ نہیں ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ان کو مؤثر انداز میں تنبیہ کی جائے۔

قتلِ خطاء: غلطی اور خطاً سے قتل کرنے والوں کی سزا یہاں جو بتائی گئی ہے وہ جُرم کے مطابق اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ سزا میں قصاص اس لیے تجویز نہیں کیا گیا کہ اس قاتل نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ نادانستگی میں اس سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس نے گولی چلائی شکار سمجھ کر مگر وہ نکلا آدمی، گولی لگ جانے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ وہ جانور نہیں آدمی ہے یا وہ نشانہ پر گولی لگا رہا تھا اور اتفاق سے وہ بھٹک کر کسی آدمی کے لگ گئی اور وہ مر گیا، اور معاف اس وجہ سے نہیں کیا کہ گو غلطی سے ایسا ہوا مگر انسانی جان اس کے فعل سے ضائع ہوئی جس سے ملک و قوم کا بھی نقصان ہوا اور اس کے ورثہ کا بھی۔ دونوں پہلوؤں کا لحاظ کر کے سزا یہ مقرر کی گئی کہ وہ قاتل خطاً غلام یا لونڈی آزاد کرے اور اس کے حامی و مددگار اور وہ خود دونوں مل کر دیت ادا کریں۔ اس سزا میں قاتل کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ آئندہ سے خوب دیکھ بھال کر اور پوری احتیاط کے ساتھ اس طرح کے موقعوں پر کوئی قدم اٹھائے اور اس کے

حامیوں کو بھی ہدایت ہو گئی کہ وہ اپنے آدمیوں کی پوری نگرانی کریں۔ یوں تو قانون کی عام کتابوں میں قتل کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں لیکن صاحبِ عنایہ نے نقل کیا ہے کہ امام اعظم قتل کی تین ہی صورتیں بتاتے ہیں، عمداً، شبہ عمداً اور خطأً۔ قتل عمد کا تو مطلب یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر ہتھیار یا ہتھیار جیسی چیز سے اس شخص کو قتل کر ڈالے جس کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ خطا کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ غلطی ارادے میں ہو اس طرح کہ ایک چیز کو شکار گمان کر کے نشانہ بنایا لیکن وہ آدمی نکل آیا، دوسرے یہ کہ غلطی فعل میں ہو اور وہ یہ کہ خاص نشانہ پر گولی چلائی اور بہک کر وہ کسی آدمی کو لگ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ قتلِ خطا میں قاتل کے قصد و نیت اور عمل میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

قصر: علامہ علی بن محمد خازن بغدادی لکھتے ہیں، لغت میں قصر کے معنے تضییق یعنی تنگی کرنے کے ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ قصر کے معنے ہیں کسی چیز کا اس کی اصل سے ملا دینا، ابن الجوزی نے قصر کی تفسیر نقص یعنی کمی کے ساتھ کی ہے اور میں نے اہل تفسیر و لغت میں سے کسی کو اُن کا ہمنوا نہیں پایا اور بعض نے کہا ہے کہ قصر الصلاۃ کے معنے یہ ہیں کہ بموجب رخصت نماز کی بعض رکعتوں یا بعض ارکان کو ترک کر کے نماز کو قصیر (کوتاہ) کر لیا جائے۔ اسی وجہ سے آیت میں جو نماز کا قصر مذکور ہے اس کی تفسیر میں دو قول ذکر کیے ہیں ایک یہ کہ تعداد رکعات میں قصر ہے یعنی چار رکعت کی نماز کو دو رکعت کر لینا، دوسرے یہ کہ قصر سے مراد نماز کی ادائیگی میں تخفیف کرنا ہے بایں طور کہ رکوع و سجود کی جگہ اشارے پر اکتفا کر لی جائے۔ خازن پہلے قول کو اصح بتاتے ہیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ فتح الرحمٰن میں رقمطراز ہیں "مشہور آنست کہ ایں آیت در صلاۃ مسافر نازل شدہ است و خوف قیدِ اتفاقی است و آنچہ نزد بندہ رجحان یافتہ آنست کہ ایں آیت در صلاۃ خوف نازل شدہ است و سفر قید اتفاقی است و مراد از قصر قصر در کیفیت رکوع و سجود است کہ بایمائے ادا تواں کرد نہ در کمیت رکعات واللہ اعلم۔ صحیح مسلم میں حضرت عمر سے روایت ہے کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قصرِ نماز میں خوف کی قید کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ بغیر خوف کے بھی نماز میں قصر ہے اور یہ اللہ کی طرف سے صدقہ ہے اس کو قبول کرنا چاہیے۔ نیز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر، اور صحابہ کرام نے سفر میں بحالتِ امن بھی

قصر کیا معلوم ہوا کہ قصر کی مشروعیت خوف پر موقوف نہیں ہے۔

لمس: اسی سے ملامستہ آیا ہے اس کے معنے چھونے کے ہیں، عورتوں کو چھونا جنسی تعلقات کے لیے کنائی زبان ہے۔ قرآن کی عادت یہی ہے کہ اس قسم کی باتوں کے لیے وہ مجاز و استعارے کی زبان اختیار کرتا ہے تاکہ مدعا ظاہر ہو جائے اور شرم کا پردہ بھی پڑا رہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردے میں بیان کیے گئے ہیں جیسے یہاں اولا مستم النساء یا تم نے عورتوں کو چھویا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ خدا شرمیلا ہے اسی لیے اس نے جنسی تعلقات کو کنایۃً لمس کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ قرآن نے اس کے لیے اور جو الفاظ اختیار کیے ہیں۔ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں مثلاً ھن لباس لکم و انتم لباس، یا نساؤکم حرث لکم یا وقد افضی بعضکم الی بعض۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب کے لیے بھی قرآن نے کنایۃً لفظ غائط استعمال کیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں او جاء احد منکم من الغائط چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لیے استعارۃً اس سے پاخانہ مراد لیا گیا، اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لفظ پاخانہ بھی اردو زبان میں ایک استعارہ ہے جس کی اصل پائین خانہ ہے۔ چونکہ پاخانے عموماً مکانوں کے کنارے پر بنائے جاتے ہیں اس لیے استعارۃً ان کو پائین خانہ کہا گیا۔ پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پاخانہ ہو گیا، اور کثرت استعمال سے اس میں استعارے کی نشان باقی نہ رہی۔

لی لسان: لی مصدر ہے لوی یلوی کا جیسا کہ طی مصدر ہے طوی یطوی کا، اس لیے معنے مروڑنے کے ہیں، زبان مروڑنے کے معنے کلام کے الٹ پھیر کرنے اور اس کے معانی میں تحریف کرنے کے ہیں اور یہ معنے بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں کہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اصل لغت میں لوی یلوی کے ہیں رسی بانٹنا اور مروڑنا ہیں، اور لوی لسانہ ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنے امام راغب نے جھوٹ بولنے اور بات بنانے کے لکھے ہیں۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۗ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۗ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں ہاں ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو تمہارے قبضے میں آگئی ہوں، یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازمی کردی گئی ہے[۴۵]۔ ان عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں جن کو مال خرچ کر کے اپنے نکاح میں لاؤ بشرطیکہ نفس پرستی تمہارا مقصد نہ ہو[۴۶]۔ پھر جن عورتوں سے تم نے

ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھایا ہے تو تمہیں ان کے مہر کی رقم بطور فرض کے ادا کر دینی چاہیئے۔[47] اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد اگر باہمی رضامندی سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔[48]

محرمات کی تکمیل اور نکاح کی ترغیب

محرمات کی فہرست کا بقیہ اور ازدواجی زندگی کی ناگزیر شرطیں اس آیت میں بتائی جا رہی ہیں۔ محرمات میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو شادی شدہ ہوں۔ اب تک جو محرمات بیان کی گئی ہیں یہ ہیں،

۱۔ تمہارے باپ دادا کی منکوحہ
۲۔ تمہاری مائیں
۳۔ تمہاری بیٹیاں
۴۔ تمہاری بہنیں
۵۔ تمہاری پھوپھیاں
۶۔ تمہاری خالائیں
۷۔ تمہاری بھتیجیاں
۸۔ تمہاری بھانجیاں
۹۔ تمہاری رضاعی مائیں
۱۰۔ تمہاری رضاعی بہنیں

۱۱۔ تمہاری خوشدامنیں

۱۲۔ تمہاری بیویوں کی لڑکیاں

۱۳۔ تمہارے بیٹوں کی بیویاں

۱۴۔ دو بہنوں کا جمع کرنا

۱۵۔ شادی شدہ عورتیں

یہ پندرہ محرمات ہیں، ان میں سے سات بلحاظ نسب ہیں اور سات دیگر وجوہ سے، جو سات بلحاظ نسب ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اوّل بلحاظِ ولادت اس میں دو ہی قسم آتی ہیں مائیں اور بیٹیاں۔ دوم بلحاظ اخوت یہ پانچ ہیں اپنی بہن، باپ کی بہن، ماں کی بہن، بھائی کی بیٹی، بہن کی بیٹی۔ نسب کے علاوہ دیگر وجوہ حرمت یہ ہیں دودھ مائیں، دودھ بہنیں، بیویوں کی مائیں، بیویوں کی پہلی بیٹیاں بشرطیکہ ان بیویوں سے خلوت صحیح ہو چکی ہو۔ بیٹوں کی بیویاں، باپوں کی بیویاں اور دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا اور شادی شدہ عورتیں۔ ان تعلقات کی حرمت قائم کر کے ان کو صنفی میلان سے اس قدر پاک کر دیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں۔ آخر میں یہ پابندی بھی لگا دی ہے کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں اور اس سے پہلے آیت ۱۵ میں بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضا اور کارخانہ قدرت کے مقرر کردہ طریقہ کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضروری تھا۔ یہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا اور کہہ دیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں کھلے بندوں بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم و مسلم ہو جائے کہ فلاں مرد و عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

۴۵۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں ہاں ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازمی کر دی گئی ہے۔

محرمات کو ذکر فرما کر آخر میں اب ان عورتوں کی حرمت بیان فرمائی ہے۔ جو کسی کے نکاح میں ہوں یعنی جو عورت کسی کے نکاح میں ہو اس کا نکاح کسی اور سے نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ بذریعہ

طلاق یا بعد وفات زوج نکاح سے جدا نہ ہو جائے۔ اور عدتِ طلاق یا عدتِ وفات پوری نہ کرے اس وقت تک کوئی اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوئی عورت خاوند والی تمہاری ملک میں آ جائے تو وہ اس حکم حرمت سے مستثنیٰ ہے اور وہ تم پر حلال ہے گو اس کا خاوند زندہ ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی اور اس کی صورت یہ ہے کہ کافر مرد اور کافر عورت میں باہم نکاح ہوا اور مسلمان دار الحرب میں زندہ موجود ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی۔ اب سب محرمات کو بیان فرما کر آخر میں تاکید فرمادی ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس کی پابندی تم پر لازم ہے [1]

اس آیت میں احصان اور ملک یمین تشریح طلب ہیں

احصان کیا ہے؟

محصنات احصان سے بنا ہے۔ احصان لغت میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ حریت، عفت، تزوج، اسلام، قید میں رکھنا، قرآن میں چار معنے میں آیا ہے۔ تزوج یعنی شادی جیسے اس آیت میں عفت جیسے محصنین غیر مسافحین، حریت جیسے من لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات اور اسلام جیسے فاذا احصن۔

اس آیت میں محصنات کا لفظ ان عورتوں کے لیے بولا گیا ہے جو کسی کی قیدِ نکاح میں ہوں۔ اصل مادہ حصن ہے جس کے معنے قلعہ کے ہیں اور جمع حصون آتی ہے۔ قرآن میں ہے مانعتھم حصونھم من اللہ اور اسی سے تحصن ہے جس کے معنے قلعہ بند ہونے کے ہیں اور اسی سے تجاوز کر کے ہر قسم کے تحفظ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے درع حصینۃ یعنی زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے۔ حصان، وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچاتا ہے۔ اور حصنت المراۃ کے معنے پاکدامن اور عفیفہ ہونا ہیں اسی سے عفیف اور پاکدامن عورت کو حصان کہتے ہیں۔ شادی ہو جانے کے بعد عورت شوہر کی حفاظت میں آ جاتی ہے اس لیے محصنہ کہلاتی ہے اور نیز شادی شدہ عورت اپنے آپ کو شوہر کے لیے محفوظ کر لیتی ہے اس لیے محصنہ کہلاتی ہے۔ مشہور امام لغت ثعلب کہتے ہیں کہ محصنہ صاد کے زیر کے ساتھ پاکدامن کو اور صاد کے زبر کے ساتھ شادی شدہ کو کہتے ہیں۔

اس آیت میں جمہور سلف اور خلف (جن میں فقہ کے چاروں امام بھی داخل ہیں) کے نزدیک

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

محصنات سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں۔
یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ جبکہ المحصنات خود جمع مونث ہے تو اس کے بعد النساء کا اضافہ کیوں کیا گیا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ چونکہ محصنات مشترک المعنے لفظ ہے اس سے پاکدامن عورتیں یا مسلمان عورتیں دونوں مراد ہو سکتی ہیں اس لیے من النساء کا اضافہ کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ زوجیت کا علاقہ بالذات قابل احترام ہے خواہ وہ مسلمان عورتیں ہوں یا کافر، آزاد ہوں یا مملوکہ۔
آیت کا مطلب یہ ہے کہ شوہر والی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے سوائے ان شادی شدہ عورتوں کے جو لڑائی کے قیدیوں میں سے تمہارے قبضہ میں آگئی ہوں ان کے سابقہ نکاحوں کا اعتبار نہیں ہے۔
گویا اس میں بتا دیا کہ تمام منکوحہ عورتوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والی ہوں نکاح حرام ہے اور اس طرح دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو صحیح تسلیم کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا جائز نہیں ہے سوائے ایک صورت کے کہ کوئی منکوحہ عورت ملک یمین ہو جائے۔
اس آیت میں اشارۃً یہ بات بھی جتادی ہے کہ ایک عورت کا ایک وقت میں دو مردوں سے ازدواجی تعلق نہیں ہو سکتا۔

ملک یمین کیا ہے

ماملکت ایمانکم کے معنے ہیں وہ جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہوئے۔ یہ عربی کا محاورہ ہے اور اس کے معنے قبضہ میں آنا ہیں۔ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں وہ اسلامی قانون میں ماملکت ایمانکم کہلاتی ہیں۔ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، ان کو کہاں اور کیسے رکھا جائے، یہ بہت معرکہ آرا بحث ہے۔ اس کے متعلق عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا صرف ایک طریقہ ہے یعنی غلام بنا لینا حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اسیران جنگ مرد ہوں یا عورتیں ان کے ساتھ معاملہ کے کئی طریقے مقرر کیے گئے ہیں، منجملہ ان کے ایک غلام بنا لینا بھی ہے۔ قرآن نے دوسرے طریقوں کی پوری قوت کے ساتھ کھول کر نشاندہی کی ہے۔

فاما منًا بعد واما فداء

پھر ان کو یا تو احسان کر کے رہا کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو

یعنی اسیران جنگ کو اگر چھوڑنا چاہو اور ان کے وطن واپس کرنا چاہو تو دو صورتیں ہیں۔ ایک

یہ کہ احسان کر کے بلا معاوضہ رہا کر دو دوسرے یہ کہ فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ ان دونوں صورتوں میں جو صورت اسلامی حکومت کے سربراہ کے خیال میں مفید و مناسب ہو اسے اختیار کر لے۔ اگرچہ مشہور یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بغیر فدیہ کے چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے لیکن فتح القدیر اور شامی وغیرہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ اسیرانِ جنگ کا تبادلہ بھی ایک طریق ہے۔ اگرچہ ایک روایت کے بموجب امام اعظم کے نزدیک یہ جائز نہیں لیکن امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ایک روایت میں امام ابوحنیفہ اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے قیدیوں کا تبادلہ کرنا چاہے تو تبادلہ کر لینا چاہیے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تبادلہ کا ثبوت ملتا ہے۔ مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک بار مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔

غلامی بھی اسیرانِ جنگ کو رکھنے کا ایک طریقہ ہے، لیکن اسلام نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھانا نہ اٹھانا مسلمانوں کے صوابدید پر موقوف ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ اسی پارہ کے دوسرے رکوع میں آئے گی۔

ان ہی قیدیوں میں بعض اوقات عورتیں بھی ہوتی ہیں ان کے لیے بھی یہی تینوں صورتیں ہیں ان کو غلام بنانے کے لیے ضروری ہے کہ

اوّلاً وہ دارِ حرب سے دارِ اسلام میں منتقل ہو جائیں۔ مطلق قیدی بنانے سے کسی مسلمان کے لیے یہ عورتیں حلال نہ ہوں گی۔ اگرچہ امام شافعی کے نزدیک مطلق گرفتاری ہی کا اعتبار ہے لیکن امام ابوحنیفہ اختلاف دارین کو ایک ناگزیر شرط قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی کے خیال میں مطلق گرفتاری سے عورت کا اپنے شوہر سے نکاح ٹوٹ جائے گا مگر امام ابوحنیفہ کی رائے میں گرفتاری سے نہیں بلکہ اختلافِ دارین سے نکاح ٹوٹے گا۔

ثانیاً ان گرفتار ہو کر آنے والی عورتوں کے شوہر دارِ حرب میں ہوں۔ وہ گرفتار ہو کر دارِ اسلام میں نہ آئے ہوں۔ اگر شوہر اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔ امام شافعی اور امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ اگرچہ دونوں میاں بیوی گرفتار ہوئے ہوں ان کا نکاح باقی نہ رہے گا۔

ثالثاً، مالِ غنیمت کی تقسیم شرعی ہوئی ہو۔ اگر مالِ غنیمت کی تقسیم شرعی نہ ہوئی ہو جس کی تفصیلات

انشاء اللہ پارہ دہم کے آغاز میں آئیں گی تو پھر کسی کے لیے حلال نہ ہو گی۔ علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:

ہمارے زمانے میں جو عورتیں مال غنیمت میں آتی ہیں ان میں تقسیم شرعی نہیں ہوتی ہے۔

اور علامہ شامی ہی نے کچھ شوافع کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے،

ان عورتوں سے زناشوئی کے تعلقات جو روم، ترک اور ہند سے درآمد کی جاتی ہیں حرام ہیں۔

علامہ شامی نے وطئ السراری فی زماننا کے عنوان سے تیسری جلد میں بھی اس کی تفصیل دی ہے بہرحال مال غنیمت کی تقسیم شرعی بنیادی اور اہم شرط ہے۔ مال غنیمت کی شرعی تقسیم کے بعد حکومت کی جانب سے باقاعدہ قبضہ ملنا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔

رابعاً: جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں میں صرف ان عورتوں سے ملک یمین کے تعلقات جائز ہیں جن سے نکاح جائز ہے۔ اس موضوع پر ہمارے فقہاء کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ یعنی ملک یمین میں آنے والی عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشرکہ نہ ہو بلکہ مومنہ ہو یا کتابی ہو کہ ان دونوں سے ازدواجی تعلقات جائز ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

جو عورت کافر دارالحرب سے پکڑی ہوئی آئے اس کے حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ایک حیض گزر جائے اور وہ عورت مشرک بت پرست نہ ہو بلکہ اہل کتاب میں سے ہو۔[1]

شیخ الاسلام نے جو بات ارشاد فرمائی ہے۔ یعنی یہ کہ جو عورت جنگ سے گرفتار ہو کر آئے اس کے ملک یمین کے ذریعے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ مشرکہ، مجوسیہ اور بت پرست نہ ہو بلکہ اہل کتاب سے ہو۔ اسلامی قانون کے کسی واقف کار سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور افسوس ہے کہ مولانا مودودی نے اس موضوع کو یہ فرما کر مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں، ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔ بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ا ص ۳۴۰)

حیرت ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو پورے ۱۴ سو سال سے تمام امت کا متفق علیہ ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمارا پورا دینی لٹریچر گواہ ہے کہ اس موضوع پر عطا ابن ابی رباح اور عمرو بن دینار کو چھوڑ کر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ضروری ہے کہ یہاں اس کے بارے میں کچھ اشارات کر دیے جائیں۔

مشرکہ سے تمتع کی ممانعت قرآن سے

قرآن میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے:

ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن ولامۃ مومنۃ خیر من مشرکۃ و لو اعجبتکم ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا ولعبد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم، اولئک یدعون الی النار واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ ویبین آیاتہ للناس لعلھم یتذکرون۔

اور مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو ایک مشرک عورت تمہیں کتنی ہی پسند آئے لیکن مومن عورت اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لے آئیں مومن عورتیں ان کے نکاح میں نہ دی جائیں یقیناً ایک مومن بندہ ایک مشرک مرد سے بہتر ہے۔ اگرچہ بظاہر مشرک مرد تمہیں کتنا ہی پسند آئے۔ یہ لوگ یعنی مشرکین تمہیں دوزخ کی دعوت دیتے ہیں اور اللہ تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت یاب ہو جائیں۔

اس آیت کی تشریح میں علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

نکاح لغت میں عقد اور وطی دونوں معنے میں آتا ہے تو اللہ سبحانہٗ کے اس ارشاد ولا تنکحوا المشرکات سے نکاح اور وطی دونوں حرام ہوتی ہیں۔

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ چونکہ مشرکہ اور مشرک ہلاکت اور دوزخ کے داعی ہیں اس لیے ان کے ساتھ اہل ایمان کو ازدواجی تعلقات نہ پیدا کرنے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ ازدواجی تعلق کا حاصل تمتع اور توالد و تناسل ہے جیسا کہ آگے نساءکم حرث لکم سے اس طرف اشارہ کیا جارہا ہے پھر یہ تمتع اور توالد خواہ ملک نکاح کے ذریعے ہو یا ملک یمین کی راہ سے ہو۔ دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہیے۔ اور چونکہ خود قرآن نے نکاح کے بارے میں اس حکم سے اہل کتاب کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں ہے والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم اس لیے اہل کتاب کی

عورتوں سے نکاح جائز ہے جیسا کہ محققین نے اس آیت کی تشریح میں بتایا ہے۔ تفسیر کی تمام متداول کتابوں میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے۔ قرآن کی روح یہی چاہتی ہے کہ جن عورتوں سے ازدواجی تعلق کی اجازت ہے ان ہی سے ملک یمین کے ذریعے بھی تمتع کی اجازت ہو۔ چنانچہ الجصاص نے اسی رُوحِ قرآنی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے:

> عقلی طور پر فقہا کے درمیان اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ملک یمین کے ذریعے کتابیہ سے تعلقات استوار ہو سکتے ہیں۔ اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ جن عورتوں سے ملک یمین کی بنیاد پر تعلق قائم کیا جا سکتا ہے ان سے نکاح کے ذریعے بھی تعلقات استوار ہو سکتے ہیں۔

مشرکہ سے تمتع کی ممانعت حدیث سے

قرآن کی اس صراحت کے باوجود بیانِ نبوت کی حاجت نہیں ہے جو بات خود قرآن اس زور سے بتا رہا ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ:

> اگرچہ حضور انور نے یہ بات بیان نہیں فرمائی لیکن قرآن عزیز نے اسے کھول کر اس آیت میں بتا دیا ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن

اور حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

> قرآن کے بیان کردہ قانونِ تحریم سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ہر وہ عورت جس سے نکاح حرام ہے اس سے ملک یمین کے ذریعے تمتع بھی حرام ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین والے دن ایک لشکر اوطاس میں روانہ کیا۔ ان کی دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی۔ جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں رہا اور مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت اور قیدی ملے۔ ان قیدیوں میں عورتیں بھی تھیں۔ اہل ایمان کو ان سے تمتع میں اس لیے جھجک رہی کہ یہ شوہروں والیاں تھیں یعنی شادی شدہ تھیں اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی والمحصنات من النساء الا ما ملکت ایمانکم

اس حدیث پر سب نے یہ توضیحی نوٹ لکھا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد جب مسلمان ہو جائیں اور مسلمان ہونے کے بعد ان کی استبراء کی مدت ختم ہو جائے تب حلال ہوں گی۔

اس توضیح میں حافظ ابن حزم بھی ائمہ اربعہ اور دوسرے علماء کے ساتھ ہیں چنانچہ المحلی میں رقمطراز ہیں:

اور سارے علماء سے ہمارا اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بت پرست اور مشرک ملک یمین کے ذریعے اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان نہ ہو جاتے۔

ہاں اس توضیح سے صرف حافظ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو اختلاف ہے۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں اپنا موقف پیش کیا ہے لیکن دوسرے علماء نے ان کا تعاقب کیا ہے۔

بات بھی یہی قرین قیاس ہے نکاح ہو یا ملک یمین عورت اور مرد کے درمیان تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ تعلق ہو تو جہاں اس کا امکان ہے کہ مومن آقا کے اثر سے مشرک عورت پر اور اس کی اولاد پر اسلام کے عقائد اور طرز زندگی کا نقش ثابت ہوگا وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ مشرک مملوکہ کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن آقا بلکہ اس کی نسل تک متاثر ہو جائے گی اور اسلام و کفر کی ایسی ملی جلی زندگی وجود میں آئے گی جس کو قرآن کسی طرح پسند نہیں کرتا۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر میں کافرانہ خیالات کی نشر و اشاعت ہو۔

مملوکہ عورت سے تمتع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی وقتی طور پر جذبات شہوانی کی تسکین کا سامان ہے جو عورت جس کے حصے میں آتی ہے صرف وہی اس کے ساتھ تمتع کر سکتا ہے کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہو گی وہ اس شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی ملک میں وہ عورت ہے۔

ملک یمین سے تمتع اور صحابہ کرام

جو کچھ قرآن کی روح ہے وہی کچھ صحابہ اور تابعین نے سمجھا ہے اور اسی پر انہوں نے عمل کیا ہے۔

عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں بارہ مملوکات ایسی ہیں جن سے تمتع ناجائز ہے ان میں ایک یہ ہے امتك وهي مشركة تمہاری وہ مملوکہ جو مشرکہ ہو۔

موسیٰ ابن ابی عائشہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر اور مرۃ الهمدانی سے دریافت کیا کہ مجھے قیدیوں میں سے ایک کنیز ملی ہے ان دونوں کا جواب یہ تھا کہ:

تم اس سے اس وقت تک تمتع نہیں کر سکتے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے۔

امام محمد بن شہاب الزہری فرماتے ہیں:

اگر مشرکہ عورت کسی کی ملک یمین میں آئے تو اس سے تمتع اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ غسل نہ کرلے، مسلمان نہ ہو جائے اور استبرا نہ ہو جائے۔

امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ہمرکابی میں جہاد میں شریک ہوتے تھے، غنیمت میں سے تقسیم کے بعد جب کسی کے حصہ میں کوئی کنیز آتی تو پہلے اسے غسل کرایا جاتا، پھر اسے اسلام کی تلقین کی جاتی۔ مسلمان ہونے کے بعد اسے نماز کا حکم دیا جاتا بعد ازاں تین ماہ استبرا کے لیے گزارتی۔

ائمہ مجتہدین کی رائے

بحث طویل ہو جائے گی اگر ہم پہلی صدی سے لے کر اس چودھویں صدی تک کے مختلف فقہاء کی تحریریں نقل کریں لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ مسئلہ کہ ملک یمین کے ذریعے تمتع مشرکہ اور بت پرست سے ناجائز ہے فقہ کے چاروں مذاہب میں متفق علیہ ہے۔

مذہب حنفی کی تصریح علامہ کاشانی نے اپنی کتاب بدائع میں اس طرح کی ہے:

اصل اور ضابطہ یہی ہے کہ کسی کافر عورت سے نکاح اور ملک یمین کے ذریعے تمتع جائز نہیں۔ صرف اہل کتاب کی عورتیں یہود و نصاریٰ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن اور لفظ نکاح عقد اور وطی دونوں معنے میں آتا ہے لہٰذا اس آیت کی رو سے دونوں حرام ہیں۔

درمختار میں ہے:

ستارہ پرست سے نہ نکاح جائز ہے اور نہ ملک یمین کے ذریعے تمتع جائز ہے۔

اور یہ ضابطہ بھی صاحب درمختار نے سپرد قلم کیا ہے:

ہمارے نزدیک ضابطہ یہی ہے کہ ہر تمتع جو ملک یمین کے ذریعے درست ہے وہ نکاح کے ذریعے بھی درست ہے اور جہاں ملک یمین کے ذریعے ناروا ہے وہاں نکاح بھی ناجائز ہے۔

فقہ کی تمام متداول کتابوں فتح القدیر، المبسوط، مجمع الانہر، الاختیار لتعلیل المختار، البحر الرائق وغیرہ

میں یہ بحث موجود ہے اور اس میں فقہائے احناف ایک زبان ہیں۔

امام مالک کے مذہب کی توضیح اقرب المالک الی مذہب مالک اور اس کی شرح الشرح الصغیر میں اس طرح کی ہے:

> کافر عورت سے تمتع نکاح اور ملک یمین کے ذریعے حرام ہے ہاں کتابی عورت سے نکاح کیا جا سکتا ہے اور اس سے ملک یمین کے ذریعے تمتع بھی جائز ہے۔

اسی طرح فقہ مالکیہ کی دوسری کتابوں میں تصریحات موجود ہیں اور ان سب کا خلاصہ اور لب لباب یہی ہے کہ کفر کی حالت میں کافر عورت سے ملک یمین کے ذریعے تمتع ناجائز ہے اس سے صرف کتابی عورت مستثنیٰ ہے۔

مذہب شافعی کے سب سے بڑے ترجمان امام نووی ہیں۔ انہوں نے کھلے اور صریح لفظوں میں پوری قوت کے ساتھ امام موصوف کے مذہب کی جو تشریح کی یہ ہے:

> امام شافعی اور ان کے ہمنواؤں کا مذہب یہی ہے کہ گرفتار ہو کر آنے والی مشرک عورتوں سے ملک یمین کے ذریعے تعلقات تمتع صرف اسی وقت جائز ہیں جب کہ وہ مسلمان ہو جائیں جب تک وہ مسلمان نہ ہوں قطعاً حرام ہیں۔

فقہ شافعیہ کی دوسری کتابوں الروضہ اور متن ابی شجاع میں بھی اسی قسم کی تصریحات ہیں۔

حنابلہ کا مذہب علامہ فقیہ الحنابلہ شیخ منصور بن یونس نے الروض المربع میں اس طرح بیان کیا ہے

> جس عورت سے نکاح کے ذریعے تمتع ناجائز ہے اس سے ملک یمین کے ذریعے بھی تمتع حرام ہے کیونکہ جب نکاح ذریعہ تمتع ہونے کی وجہ سے حرام ہے تو تمتع تو بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

علامہ ابن قدامہ نے المغنی شرح مختصر الخرقی میں اسے اور زیادہ کھول کر بیان کیا ہے:۔

> بلاشبہ جن کافر عورتوں سے اہل کتاب کے علاوہ نکاح حرام ہے ان سے ملک یمین کے ذریعے تمتع بھی اکثر اہل علم کے نزدیک حرام ہے ان میں امام مرہ الہمدانی، امام زہری، امام سعید بن جبیر، اوزاعی، ثوری، امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کی یہی رائے ہے۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہی فقہائے امصار اور جمہور علماء کا مسلک ہے اور اس کی مخالفت شاذ کے درجہ میں ہے۔

آخر میں ہم ان اکابر کا بھی مسلک بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ائمہ اجتہاد سے تقلید کا نہیں بلکہ تنقید کا تعلق رکھتے ہیں ان میں سرفہرست حافظ ابن حزم ظاہری کا نام ہے۔ ان کی مشہور کتاب المحلی

ہمارے پیش نظر ہے۔ ان کا موقف اس موضوع پر ائمہ اربعہ سے بھی ایک قدم آگے ہے وہ فرماتے ہیں:

ملک یمین کے ذریعے کسی کافر عورت سے تمتع جائز نہیں ہے اور کتابی عورت کے علاوہ کسی کافر عورت سے ازدواجی تعلق ناجائز ہے۔

گویا ان کی رائے میں کتابی عورت سے نکاح تو ہو سکتا ہے مگر ملک یمین کی بنا پر تمتع نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

قرآن و سنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ کتابی عورت سے ملک یمین کے ذریعے تمتع ہو سکتا ہے۔

اگرچہ یہ بات بہت عجیب ہے کہ نکاح جائز ہو اور ملک یمین کی بنیاد پر تمتع حرام ہو۔ پوری شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں لیکن حافظ ابن حزم نے اس کے عجیب و غریب ہونے کا جس انداز سے دفاع کیا ہے اُسے پڑھیے۔ فرماتے ہیں کہ تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے اور یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی ہے کہ فرض نماز میں نماز مغرب کے علاوہ تین رکعت والی نماز کوئی نہیں ہے۔ بہرحال حافظ ابن حزم اس لحاظ سے ائمہ اربعہ سے ایک قدم آگے ہی ہیں یعنی اہل کتاب سمیت سب کافر عورتوں سے ملک یمین کی بنا پر تمتع کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ کتابی عورت کے بارے میں حافظ ابن حزم کی رائے کو علماء کے یہاں شرف پذیرائی حاصل نہیں ہے۔ امام حسن بصری کو چھوڑ کر پوری اُمت کی علمی طاقت کا اعلان یہی ہے کہ کتابی مملوکہ سے ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز ہے اور بقول الجصاص اس موضوع پر فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ علیٰ ہذا عطاءؒ اور عمرو بن دینار کو چھوڑ کر بقول ابن العربی تمام لوگوں کا، اور بقول ابن قدامہ اکثر اہل علم اور بقول ابن عبدالبر فقہاء امصار اور جمہور علماء کا فیصلہ یہی ہے کہ کتابی عورت کے علاوہ کسی کافر عورت سے ملک یمین کی بنیاد پر تمتع جائز نہیں۔ متاخرین میں سے حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں، محمد بن اسماعیل یمانی نے سبل السلام میں اور نواب صدیق حسن خاں نے جواز کا موقف یہ کہہ کر اختیار کیا ہے کہ غزوۂ اوطاس میں حضور انور نے استبراء کی شرط بیان فرمائی ہے لیکن کسی جگہ اسلام کی شرط کا ذکر نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں، حافظ عینی نے عمدۃ القاری میں، علامہ قرطبی نے تفسیر میں اس کے مدلل اور مفصل جوابات دیے ہیں بہرحال سب کا فیصلہ یہی ہے کہ کافر عورتوں سے کتابی کے علاوہ ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ موضوع کی اس وضاحت کے باوجود مولانا مودودی نے اپنی تفہیم میں یہ بات کیوں کر لکھ دی ہے کہ:

جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصہ میں آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ا ص ۳۴۰)

اگر فی الواقع مولانا کو شوکانی اور حافظ ابن القیم ہی کے موقف کو اپنانا تھا تو یہ بات پہلے مخاطبوں کے سامنے کھل کر آنی چاہیے تھی کہ جمہور کا مسلک یہ ہے تاکہ تفہیم کا قاری کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مولانا کا انداز بیان اپنے قاری کو یہ باور کرا رہا ہے کہ مسئلہ یہی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آخر اس قسم کے دوسرے مسائل میں وہ اس قسم کی تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ البتہ فقہاؔ کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے۔ اگر اس موقعہ پر بھی اختلاف کو بتا دیا جاتا تو تفہیم کا قاری غلط فہمی کا شکار نہ ہوتا۔

خامساً، ملک یمین کی بنا پر تمتع کے جواز کی یہ بھی شرط ہے کہ استبراء ہو جائے۔ استبراء یہ ہے کہ عورت سے اس وقت تک مباشرت نہ کی جائے جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایام ماہواری نہ آ جائیں اور یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے اس سے پہلے مباشرت جائز نہیں ہے اگر وہ حاملہ ہو تو وضع حمل سے پہلے مباشرت حرام ہے۔ چونکہ یہ بات صراحۃً قرآن نے نہیں بتائی تھی اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوطاس کے قیدیوں کے بارے میں خاص طور پر صراحۃً بیان فرما دی کہ

کسی حاملہ عورت سے وضع حمل سے پہلے تمتع نہ کیا جائے اور غیر حاملہ سے بھی اس وقت تک تمتع نہ کیا جائے جب تک حیض نہ آ جائے۔

اس موضوع پر علماء میں دو رائیں نہیں ہیں۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ملک یمین کی بنا پر تمتع کی شرط یہ ہے کہ استبراء ہو جائے۔ اس موضوع پر ایک سے زیادہ ارشاد نبوت آئے ہیں۔

بہر حال لونڈیوں سے تمتع کے بارے میں یہ پانچ شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کے ساتھ لونڈیوں سے تمتع جائز ہے لیکن یاد رہے کہ اسلام غلام بنا کر رکھنے کو صرف جائز قرار دیتا ہے۔ فرض و واجب نہیں بتاتا۔ اس کے ساتھ دو صورتیں اور بھی ہیں کہ فدیہ لے کر رہا کر دے یا بلا فدیہ رہا کر دے۔ قیدیوں سے تبادلہ بھی فدیہ کے حکم میں ہے۔

صحت نکاح کی شرطیں

۴۶۔ ان عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں جن کو مال خرچ کر کے تم اپنے نکاح میں لاؤ بشرطیکہ نفس پرستی تمہارا مقصد نہ ہو۔ یعنی جن عورتوں کی حرمت بیان ہو چکی ان کے سوا سب حلال ہیں

چار شرطوں کے ساتھ اول یہ کہ طلب کرو یعنی زبان سے ایجاب و قبول دونوں طرف سے ہو جائے، دوسرے یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو، تیسرے یہ کہ ان عورتوں کو قید میں لانا اور اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے یعنی ہمیشہ کے لیے وہ اس کی بیوی ہو جائے چھوڑے بغیر کبھی نہ چھوٹے مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو۔ اس سے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہو گیا جس پر اہل حق کا اجماع ہے۔ چوتھی شرط جو دوسری آیتوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ مخفی طور پر دوستی نہ ہو یعنی کم از کم دو مردوں یا ایک مرد دو عورتیں اس معاملہ کی گواہ ہوں۔ اگر دو گواہوں کے بغیر ایجاب و قبول ہو گا تو وہ نکاح نہ ہو گا زنا سمجھا جائے گا[1]

اس آیت میں صحت نکاح کی تین شرطیں بیان کی گئی ہیں۔

صحتِ نکاح کی پہلی شرط

نکاح کے صحیح ہونے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ زبان سے ایجاب و قبول ہو۔ اس شرط کے لیے قرآن نے ابتغاء کی تعبیر اختیار کی ہے، ابتغاء کے معنے تلاش کرنے کے ہیں۔ اس صیغہ کے مخاطب مرد ہیں۔ گویا نکاح کی مانگ اور طلب مرد کا کام ہے جبکہ عورت کا کام صرف قبول کرنا ہے۔ نر و مادہ کے درمیان فاعلیت اور انفعالیت کا فرق زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ یہاں بھی قرآن نے ابتغاء استعمال کر کے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ دونوں میں ایک فاعل اور دوسرا قابل، ایک طالب دوسرا مطلوب ہو۔ چونکہ ابتغاء کی نسبت مردوں کی طرف ہے اس لیے مرد فاعل ہے اور عورت قابل ہے۔ مرد کا کام ایجاب اور عورت کا کام قبول ہے۔

ایجاب و قبول کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ

اولاً ایجاب و قبول دونوں یا دونوں میں سے ایک ماضی کے لفظوں میں ہو یعنی ایسا لفظ جس سے یہ سمجھا جائے کہ نکاح ہو چکا۔

ثانیاً، ایجاب و قبول کے لیے لفظی پیمانہ ہونا چاہیے۔ کردار و فعل کے ذریعے نہ ہو۔ کتابت اور تحریر بھی لفظ کے حکم میں ہے بشرطیکہ کاتب مجلس نکاح میں موجود نہ ہو اور اپنی تحریر دو گواہوں کو سنا دے اور اس پر گواہ بنا لے۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت کو لکھ کر بھیجے کہ میں نے تیرے ساتھ اپنا نکاح کر لیا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور عورت دو آدمیوں کو گواہ بنا کر کہے کہ فلاں شخص کی یہ تحریر آئی ہے لہٰذا میں اس سے نکاح کرتی ہوں تو یہ ایجاب و قبول صحیح ہو جائے گا۔

ثالثاً، ایجاب و قبول اس زبان میں ہو جسے میاں بیوی سمجھتے ہوں۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ عربی زبان میں ایجاب و قبول ہو یا اس زبان میں ہو جسے عاقدین اور گواہ سمجھتے ہوں۔ امام شافعی تو فرماتے ہیں کہ جو شخص لفظ نکاح کہنے پر قادر ہو اس کا نکاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن امام اعظم اس کے لیے عربی کی شرط نہیں لگاتے۔ اس معنے کے لیے جس زبان میں بھی جو لفظ مستعمل ہو اس سے نکاح ہو جائے گا۔

رابعاً، ایجاب و قبول دونوں ایک مجلس میں ہوں۔ اگر میاں بیوی میں سے کوئی یا ان کا وکیل نہ موجود ہو بلکہ ان میں سے کسی نے اپنی تحریر روانہ کی ہو تو وہ تحریر جس مجلس میں پڑھی جائے اسی مجلس میں قبول کا ہونا ضروری ہے۔ مجلس کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب و قبول کے درمیان کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جو ایجاب سے روگردانی کو ظاہر کرتا ہو۔

خامساً، ایجاب و قبول میں باہم مخالفت نہ ہو مثلاً مرد کہے کہ میں تیرے ساتھ ایک سو روپیہ مہر پر نکاح کرتا ہوں اور عورت کہے نکاح تو منظور ہے مگر مہر کی رقم منظور نہیں ہے تو ایسی حالت میں ایجاب و قبول صحیح نہ ہو گا کیونکہ قبول ایجاب کے مخالف ہے۔ ہاں اگر قبول عورت کی جانب سے ہو اور وہ مرد کے مقرر کیے ہوئے مہر سے کم مقدار کو قبول کرے یا قبول مرد کی طرف سے ہو اور وہ عورت کے مقرر کردہ مہر سے زیادہ مقدار کو قبول کرے تو ایسی حالت میں ایجاب و قبول باہم مخالف نہ سمجھے جائیں گے۔

سادساً، ایجاب و قبول کسی وقت پر موقوف یا کسی شرط سے مقید نہ ہوں مثلاً یہ کہے کہ تیرے سے کل کو نکاح منظور ہے یا یہ کہے کہ اگر فلاں کام ہو جائے تو بس میرا تم سے نکاح ہو گیا۔

سابعاً، جس عورت کا نکاح ہو وہ عاقدین کے سامنے متعین ہو۔ عاقدین ان کو کہتے ہیں جو باہم ایجاب و قبول کریں۔ اگر میاں بیوی خود ایجاب و قبول کریں تو وہ ہی عاقدین ہیں۔ اگر میاں بیوی خود ایجاب و قبول نہ کریں بلکہ ان کے وکیل یا ولی ایجاب و قبول کریں تو وکیل اور ولی ہی عاقدین کہلائیں گے عورت کے مقرر کرنے کی ضرورت اس وقت جبکہ عاقدین زوجین نہ ہوں۔

صحتِ نکاح کی دوسری شرط

نکاح کے صحیح ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ یہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو۔ مہر میں دو باتیں شرط ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مال ہو، دوسرے یہ کہ اس مال کی کم از کم مقدار دس درہم ہو ——— پہلی شرط

یعنی مہر کے مال ہونے کی طرف قرآن کی یہ آیت رہنمائی کر رہی ہے اور اسی آیت میں اشارۃً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جو مال نہ ہو اس میں مہر بننے کی صلاحیت نہیں ہے اگر کوئی شخص کسی لونڈی سے شادی کرتا ہے اور اس کی آزادی کو مہر قرار دیتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ آزادی مال نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی کا مذہب ہے لیکن امام احمد سے ایک روایت میں کنیز کی آزادی کو اس کا مہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی روایت کو حافظ ابن القیم نے زادالمعاد میں راجح قرار دیا ہے۔ ایسے ہی سور اور شراب کو بھی بدل مہر نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ یہ دونوں اسلامی قانون میں مال نہیں ہیں۔ ہاں وہ منافع جن کے معاوضہ میں اجرت لینا جائز ہے۔ ان کا شمار مال ہی میں ہوگا اور ان کو مہر قرار دینا صحیح ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا مہر اپنے گھوڑے کی سواری یا اپنے ملازم کی خدمت یا اپنے گھر کی سکونت کو قرار دے تو صحیح ہے کیونکہ ان چیزوں کے مقابلے میں اجرت لینا جائز ہے۔ ایسے ہی بکریوں کا چرانا یا کاشت کر دینا کو بھی مہر بنانا جائز ہے ایسے ہی اگر شوہر اپنی بیوی کے والد کی خدمت کر دینے کو مہر قرار دے تب بھی درست ہے بشرطیکہ بیوی راضی ہو جائے جیسے حضرت شعیب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہا تو یہی مہر مقرر کیا تھا کہ تم میری بکریاں آٹھ برس تک چرا دو۔ اس قصہ کو اللہ سبحانہٗ نے قرآن حکیم میں ذکر فرمایا ہے۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص تعلیم کو مہر قرار دے تو جائز نہیں کیونکہ تعلیم قرآن ان منافع میں سے نہیں جس کے مقابلہ میں اجرت لینا جائز ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ تعلیم قرآن کو مہر قرار دینا جائز ہے۔ وہ صحیح بخاری کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا نکاح کیا اور فرمایا کہ تیرے پاس کچھ ہے اس نے عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی لوہے کی انگوٹھی ہی تلاش کر لا اس نے تلاش کی مگر وہ بھی نہ ملی آپ نے فرمایا کہ اچھا جس قدر قرآن تیرے پاس ہے یعنی تجھے یاد ہے اس کے عوض میں میں نے تیرے ساتھ اس عورت کا نکاح کر دیا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس قدر قرآن تجھے یاد ہے اس کو مہر بنا کر میں نے نکاح کر دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تجھے قرآن کو یاد کرنے کی سعادت حاصل ہے اس بزرگی کے سبب سے تیرے ساتھ نکاح کر دیا۔ اگرچہ بالفعل تیرے پاس مال نہیں ہے۔ یعنی جب اس کے پاس ہوگا مہر دے دے گا۔ اور امام اعظم اس قسم کی احادیث کی توجیہ اس لیے فرماتے ہیں کہ امام اعظم حدیث کی اصطلاحی صحت کے بعد زندگی میں اسے اپنانے کے لیے ایک شرط یہ بھی بتلاتے ہیں کہ وہ حدیث کسی درجہ میں معانی قرآن سے متصادم نہ ہو، اور اس شرط کے عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں اگرچہ قطعی نہیں ہے

لیکن وہ اپنے منطوق میں حتمی اور قطعی ہے۔ اور ایک روایت پر اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ راوی جو کچھ بتا رہا ہے یقیناً یہ الفاظ نبوت ہی ہیں جیکم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

> حدیث میں الفاظ متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور الفاظ کا یہ اختلاف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی روایت بالمعنے ہوتی ہے۔

امام اعظم کا یہ ضابطہ حافظ ابن عبد البر نے اس طرح پیش کیا ہے :

> امام اعظم اخبار آحاد کو اپنے یہاں جمع کردہ حدیثوں اور معانی قرآن پر پیش فرماتے تھے ان حدیثوں میں سے جو اپنے معنے میں منفرد ہوتی تھیں ان کو ترک کر دیتے اور ان کا نام شاذ رکھتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اخبار آحاد اگر معانی قرآن کے خلاف ہوتی تھیں تو آپ کے یہاں درجہ قبولیت نہ ملتا تھا خواہ وہ معانی قرآن ، قرآن کا منطوق ہوں یا مدلول ۔منطوق کی مثال تو یہی مسئلہ ہے ان تبتغوا باموالکم کا منطوق یہی ہے کہ عورتوں کا مہر مال ہونا چاہیے اور بخاری کی حدیث بما معک من القرآن اس سے متصادم ہے اس لیے ابو حنیفہ نے اس کے منہ میں ایسا مطلب ڈال دیا کہ جس سے وہ قرآن سے متصادم نہ ہو یعنی بتایا کہ بما معک میں بار مقابلہ نہیں بلکہ سببیہ ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

مہر کی مقدار

اس آیت میں دوسری شرط یعنی مال کی مقدار مذکور نہیں ہے اسی لیے اس موضوع پر علماء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ علامہ ابن العربی نے عارضۃ الاحوذی شرح ترمذی میں سات آراء لکھی ہیں۔ اور ابو بکر الجصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت علی فرماتے ہیں کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہے۔ یہی امام شعبیؒ، ابراہیم نخعی، ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر، الحسن بن زیاد کی رائے ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دس درہم سے کم بھی مہر ہو سکتا ہے کیونکہ کچھ حدیثوں میں اس سے کم بھی مہر آتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں لوہے کی انگوٹھی کا ذکر آیا ہے۔ حنفیہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ آپ نے لوہے کی انگوٹھی مہر کا کچھ حصہ ادا کرنے کے لیے تلاش کرائی تھی اس لیے نہیں کہ انگوٹھی ہی کو مہر بنانا مقصود تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں دستور تھا کہ مہر کا کچھ حصہ خلوت سے پہلے ادا کرتے تھے۔ حنفیہ کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں حضور انور

نے فرمایا ہے کہ لامھر اقل من عشرۃ دراھم یعنی مہر دس درہم سے کم دُرست نہیں ہے ۔ اس حدیث کو بیہقی نے بسندِ ضعیف اور ابن ابی حاتم نے بقول حافظ ابن حجر عسقلانی بسندِ حسن روایت کیا ہے ۔ یہ مہر کی کم سے کم مقدار ہے ۔ زیادہ مہر کی کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی ۔ جس قدر دینے کی جس شخص میں استطاعت ہو اس قدر باندھ سکتا ہے مگر اچھا یہ ہے کہ بنظرِ اتباعِ سنت ازواجِ مطہرات اور بنات کے مہروں میں سے کوئی مہر اختیار کرے ۔ ہم یہاں نہایت محقق روایات سے ان کا مہر درج کرتے ہیں ۔ دس درہم کا وزن ۳ تولہ ۹ ماشے ، رتی ہے اور رائج الوقت سکہ کے اعتبار سے اس کی قیمت بنتی ہے ۔ احناف کے نزدیک اس سے کم مہر نکاح میں باندھنا جائز نہیں ہے ۔

نقشہ مہر امہات المومنین

نام	مقدار مہر بوزن شرعی	مقدار وزن رائج	قیمت
۱۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ	۱۲ اوقیہ سونا	۱۹ تولہ ۱ ماشہ ۶ رتی	۵۴۶۰۶/۱۲
۲۔ حضرت سودہ	۴۰۰ درہم چاندی	۱۲۲ تولہ ۱۱ ماشے	۱۰۹۳/۷۵
۳۔ حضرت عائشہ	۴۰۰ "	۱۲۲ تولہ ۱۱ ماشے	۱۰۹۳/۷۵
۴۔ حضرت حفصہ	۴۰۰ "	" "	۱۰۹۳/۷۵
۵۔ حضرت ام سلمہ	۱۰ درہم	۳ تولہ ۹ ماشے ، رتی	۲۰/۷۵
۶۔ حضرت زینب	۴۰۰ "	۱۲۲ تولے ۱۱ ماشے	۱۰۹۳/۷۵
۷۔ حضرت ام حبیبہ	۴۰۰ دینار	۱۰۴ تولہ ۱ ماشہ سونا	۶۲۴۵۰/۰۰
۸۔ حضرت میمونہ	۴۰۰ درہم	۱۲۲ تولہ ۱۱ ماشہ	۱۰۹۳/۷۵
۹۔ حضرت جویریہ	۴۰۰ "	" "	۱۰۹۳/۷۵

اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا کا مہر یہ ہے ۔

حضرت فاطمہ	۴۸۰ مثقال چاندی	۱۰۴ تولہ ۲ ماشہ	۱۵۶۲/۵۰

صحتِ نکاح کی تیسری شرط

صحتِ نکاح کی تیسری شرط یہ بتائی ہے کہ عورت کو اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو ۔ وقتی طور پر شہوت رانی کر کے ہیجان نفس کو تسکین دینا پیش نظر نہ ہو ۔ اصل ارشاد میں محصنین غیر مسافحین کے الفاظ آئے ہیں ۔

احصان کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ نکاح اور سفاح میں حد فاصل قائم ہو جائے۔ نکاح کا اصل مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ احصان پایا جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ احصان لغت میں روکنے اور محفوظ کرنے کو کہتے ہیں۔ محفوظ شہر کے لیے مدینہ حصینہ اور مضبوط زرہ کے لیے درع حصینہ بولا جاتا ہے حصان عفیف و پاکدامن عورت کو کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ایک سے زیادہ معنے میں آیا ہے۔ ایک آزادی جیسے آئندہ آیت من لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات میں دوسرے عفاف و پاکدامنی جیسے اس آیت میں محصنات غیر مسافحات تیسرے مسلمان ہونے کے معنے میں جیسے آئندہ آیت فاذا احصن میں چوتھے شادی ہونے کے معنے میں جیسے پہلی آیت والمحصنات من النساء میں۔

اس آیت میں لفظ احصان عفاف اور پاکدامنی کے معنے میں ہے یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے اور زندگی بھر کی رفاقت کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو اللہ سبحانہ اس سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو گو اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کی ہو اور اس کو مال بھی دیا ہو لیکن یہ روح احصان کے خلاف ہے۔ قرآن نے احصان کی شرط لگا کر نکاح کے بنیادی اور اہم مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی قانون میں نکاح کا مقصد اخلاق کی حفاظت اور عفاف ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوع انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے یہاں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا ہے جو نکاح کرتا ہے وہ محصن ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصنہ ہے اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد و عورت کے تعلق میں احصان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر چیز کو قربان کیا جاسکتا ہے مگر کسی دوسری چیز کے لیے اس کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔

مہر کی ادائیگی اور استمتاع

۷۴۔ پھر جن عورتوں سے تم نے ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھایا ہے تو تمہیں ان کے مہر کی رقم بطور فرض ادا کر دینی چاہیے۔ یعنی جس عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد شوہر نے اس سے کسی مدت معین قلیل یا طویل تک نفع بھی حاصل کر لیا کم سے کم یہ کہ ایک ہی دفعہ وطی یا خلوت صحیحہ کی نوبت آتی ہو تو اب

اس عورت کو پورا مہر دینا لازم ہے۔ بغیر عورت کے معاف کیے کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا۔ البتہ جب تک عورت بالکل کام میں نہ آتے اور زوج طلاق دے دے تو مقررہ مہر کا آدھا دینا ہوگا اور اگر عورت نے انتفاع سے پہلے کوئی ایسی بات کی جس سے نکاح ٹوٹ گیا تو شوہر کے ذمہ سے سب مہر اتر جائے گا کچھ دینا نہ پڑیگا۔[1]

پہلی آیت میں نکاح اور شرائطِ نکاح بیان فرمائے تھے اب اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ تم نے جن عورتوں سے نکاح کرکے استمتاع کرلیا ہے تو ان کو پورا مہر دینا تم پر لازم ہوگیا ہے۔ آیت میں اجورھن کے بعد فریضۃ کا لفظ بھی بتانے کے لیے آیا ہے کہ نکاح کے بعد جب خلوت ہو جائے تو پورے مہر کی ادائیگی کرنی پڑے گی۔

اس آیت میں استمتاع سے کچھ لوگوں نے متعہ کا جواز نکالا ہے ضروری ہے کہ یہاں ہم اس موضوع کے مختلف پہلو ناظرین معالم القرآن کی ضیافتِ طبع کی خاطر پیش کریں۔ متعہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جانیں۔

اولاً متعہ لغت اور اصطلاح میں کیا ہے؟۔

ثانیاً، متعہ کے بارے قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ثالثاً، متعہ کے موضوع پر تاریخ عملی اسلام میں کیا ہے؟

رابعاً، متعہ کے متعلق مجتہدین اور فقہا کیا کہتے ہیں؟

متعہ لغت اور اصطلاح میں

لفظ متعہ متع سے مشتق ہے اسی سے متاع ہے جس کے معنے تھوڑے فائدے کے ہیں اور طلاق والی عورت کو جو کپڑوں کا جوڑا دیا جاتا ہے اس کو بھی متعہ اس لیے کہتے ہیں کہ مہر کے مقابلے میں نفع قلیل ہے اسی سے استمتاع ہے اور اس کے معنے ایسا نفع اٹھانا جو طویل وقت کے لیے ہو، عام محاورے میں بولتے ہیں استمتع الرجل بولدہ آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا اس لیے استمتاع کے معنے محض فائدہ اٹھانے کے ہیں نہ کہ تعلقاتِ زناشوئی اور متعہ کے معنے اس طرح بتائے گئے ہیں کہ عورت سے فائدہ اٹھانا جسے تم اپنے لیے ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ دیکھو لسان العرب یا جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے کہ ایک مرد ایک عورت سے شرط کرلیتا کہ مقررہ مال کی مقدار اسے دے گا اور ایک وقت مقرر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تک اس سے فائدہ اٹھائے گا اور جب وہ مقررہ مدت گزر جاتی بغیر طلاق کے اس سے الگ ہو جاتا مطلب یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے کہ استمتاع عام ہے اور متعہ خاص ہے بڑے اور چھوٹے انسانوں کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا استمتاع ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اسی معنے میں استعمال ہے ربنا استمتع بعضنا ببعض، متعہ میں معاملہ نکاح کے لفظوں سے نہیں بلکہ متعہ ہی کے الفاظ میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نکاح موقت میں لفظ نکاح ہی استعمال ہوتا ہے لیکن وقت کی قید ہوتی ہے۔ متعہ اور نکاح موقت میں یہ فرق ابن نجیم نے بیان کیا ہے اور صاحب عنایہ کہتے ہیں کہ نکاح موقت گواہوں کی موجودگی میں مدت مقررہ کے لیے ہوتا ہے اور متعہ میں تمتع کے الفاظ بولے جاتے ہیں لیکن شیخ ابن الھمام کہتے ہیں کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نکاح موقت میں لفظ نکاح اور متعہ میں لفظ تمتع ہوتا ہے۔ موقت میں گواہ ہوتے ہیں اور مدت مقرر ہوتی ہے اور متعہ میں گواہ نہیں ہوتے اور مدت مقرر ہوتی ہے۔

ائمہ اربعہ کے فقہی مدارس پر کام کرنے والوں نے متعہ کی تعریف بھی کی ہے۔ مالکیہ میں سے زرقانی نے نکاح بتعیین مدت کو اور باجی نے نکاح موقت کو متعہ کیا ہے اور اس کو مثال سے اس طرح سمجھایا ہے کہ مسافر شہر میں آئے اور کہے کہ میں واپسی تک تیرے سے شادی کرتا ہوں۔ صنابغیہ میں ابن قدامہ کہتے ہیں کہ نکاح متعہ یہ ہے کہ مرد عورت سے وقت مقرر کے لیے شادی کرے مثلاً یوں کہے کہ میں نے اپنی لڑکی کی تیرے سے ایک ماہ کے لیے شادی کر دی۔

اہل تشیع نے متعہ کی حقیقت یہ بتائی ہے۔ تہذیب الاحکام کتاب النکاح باب متعہ میں ہے کہ متعہ میں نہ گواہوں کی ضرورت ہے اور نہ اعلان کی۔ اور اسی کتاب میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ متعہ کی شرطوں میں مدت اور مہر کا مقرر ہونا ضروری ہے اور فروع جلد ۲ میں یہ بھی اضافہ ہے کہ ان شرطوں میں یہ بھی کہے کہ میں تجھ سے اتنے دنوں کے لیے اتنی رقم پر تیرے ساتھ متعہ کر رہا ہوں۔ اور تہذیب الاحکام کتاب اور فروع الکافی جلد ۲ شروط المتعہ میں متعہ کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ مرد عورت سے کہے کہ میں تیرے ساتھ متعہ کر رہا ہوں کتاب وسنت پر نکاح ہے زنا نہیں اس شرط پر کہ نہ تو میری موت کے بعد میری وارث ہے اور نہ میں تیرا اتنے دنوں کے لیے اتنی اجرت پر اور عدت تیرے لیے ضروری ہے نیز تہذیب الاحکام میں متعہ میں اجرت کی مقدار یہ بتائی ہے کہ ایک درہم اور اس سے کچھ زیادہ سے درست ہے بلکہ من لا یحضرہ الفقیہ میں مٹھی بھر گندم کو بھی کافی قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ متعہ ایک لفظ مشترک ہے جسے بعض اوقات تو نکاح موقت کے معنوں میں بولا جاتا ہے جس میں نکاح کے تمام لوازم ہوتے ہیں جیسے گواہوں کا ہونا، اعلان عام،

مدت نکاح میں میاں بیوی میں سے ایک دوسرے کی وفات پر وراثت پانا وغیرہ ہاں مدت نکاح مقرر ہوتی ہے اور بعض اوقات یہی لفظ متعہ ایسے جنسی رابطہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں نہ گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ اعلان عام کی نہ سلسلہ وراثت اور نہ چار میں شمار ہونا وغیرہ۔

متعہ کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر

قرآن حکیم کے منطوق، مدلول اور مفہوم سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ متعہ قطعاً حرام ہے اس موضوع پر ایک آیت نہیں بلکہ کئی آیتیں ہیں۔

سب سے پہلے قرآن کی یہی آیت احل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین صاف اور صریح طور پر منطوقاً بتا رہی ہے کہ قرآن کے نزدیک متعہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ آیت محرمات کے ذکر کے بعد آئی ہے اور اس میں بتایا ہے کہ ان محرمات کے سوا تمہارے لیے عورتیں حلال کی گئی ہیں یہ مطلب نہیں کہ ان محرمات کے سوا عورتوں کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ اولاً یہ کہ حصول مال کے ذریعہ یعنی مہر کے ساتھ ہو، ثانیاً، ان عورتوں کو اپنی حمایت و حفاظت میں رکھنا ہو یعنی ایک عورت کا ایک سے زیادہ شوہر نہ ہو، ثالثاً یہ کہ صرف شہوت رانی مقصد نہ ہو بلکہ اولاد اور خانگی زندگی پیش نظر ہو۔ اور معلوم ہے کہ متعہ کا مقصد صرف شہوت رانی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو یہ احصان نہیں بلکہ سفاح ہے۔ یہ محض پیشاب کرنے کے لیے ایک پیشاب خانہ کی تلاش ہے جس سے مقصد محض وقتی طور پر مثانہ کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں یہ دو شرطیں محصنین اور غیر مسافحین لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جو عرب جاہلیت میں رائج تھا اور اسی آیت کے بعد والی آیت میں عورتوں کے بارے میں یہ کہہ کر محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان۔ یعنی وہ عورتیں محصنہ ہوں اور بدکار نہ ہوں اور چوری چھپے یاری نہ ہو۔ عورتوں کے ساتھ ان چار شرطوں کے ساتھ صحبت حلال ہوتی ہے۔

قرآن کی دوسری آیت اسی سورت کے آغاز میں آئی ہے یعنی یہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و رباع وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم۔

یہ آیت ببانگ دہل کہہ رہی ہے کہ نکاح چار تک محدود ہے اور معلوم ہے کہ متعہ میں کوئی حد مقرر نہیں ہوتا۔ متعہ والی عورت نہ منکوحہ ہے اور نہ مملوکہ ہے۔ قرآن نے اباحت کو ان دو ہی میں

محدود کیا ہے۔ یعنی قرآن نے عورتوں کے حلال ہونے کی دو ہی صورتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ نکاح کے ذریعے حلال ہوں دوسرے یہ کہ ملک یمین کے ذریعے حلال ہوں اور ان دونوں سے مقصود اولاد ہے کیونکہ عورتوں کو حرث کھیتی کہا ہے کھیت سے مطلوب پیداوار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کھیت کی پیداوار اولاد ہے۔ اور متعہ کا مقصد اولاد نہیں بلکہ وقتی طور پر شہوت رانی ہے۔ اگر شہوت رانی مقصد ہوتا تو اولاد کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا۔ اور اگر شہوت رانی ہی مقصد ہوتی تو عورت حاملہ من الغیر سے صحبت حرام نہ ہوتی۔ بہر حال نکاح ہو یا ملک یمین دونوں سے مقصود اولاد ہے۔ شہوت رانی مقصود نہیں۔ جیسے غذا کھانے سے بدل ما یتحلل مقصود ہوتا ہے اور بھوک محض ایک تقاضے کے درجہ میں ہے ایسے ہی عورتوں سے مقصود اولاد ہے اور شہوت تقاضائے جماع کے لیے ساتھ لگادی گئی ہے بہر حال متعہ والی عورت نہ مملوکہ ہے اور نہ منکوحہ اور چونکہ دونوں میں سے کوئی نہیں اس لیے قرآن کے بتائے ہوئے ضابطہ حلت سے باہر ہے۔

قرآن میں تیسری آیت اٹھارویں پارے کے آغاز میں ہے:

والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ماملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذالک فاولٰئک ھم العادون۔

اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک میں ہیں۔ بس وہ ان کے بارے میں قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہتے ہیں وہ ہی زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس آیت کے آخری فقرے نے مذکورہ بالا دو صورتوں یعنی منکوحہ اور مملوکہ کے سوا خواہش نفس پوری کرنے کی تمام دوسری صورتوں کو حرام کر دیا ہے خواہ وہ زنا ہو یا عمل قوم لوط یا وطی بہائم یا کچھ اور۔ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔ لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا نہ وہ مرد کی وارث ہوتی ہے نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے نہ اس کے لیے عدت ہے نہ طلاق نہ نفقہ، نہ ایلاء اور ظہار اور لعان وغیرہ بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا جب وہ بیوی اور لونڈی دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ان کے علاوہ کچھ اور میں شمار ہوگی جس کے طالب کو قرآن حد سے گزرنے والا قرار دیتا

ہے۔ ان آیات

قرآن میں نہ صرف یہ کہ متعہ کے جواز کا کوئی اشارا نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ان کا رخ اس کی حرمت کی طرف ہے۔ باقی رہا زیرِ تشریح آیت میں لفظ استمتاع سے استدلال تو بہت کمزور استدلال ہے۔ متعہ نہ اس کا منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ استمتاع عام ہے اس کے معنے متعہ کے لینا سنگین غلطی ہے۔ مشہور امام لغت زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ اس آیت کے معنے میں کچھ لوگوں نے بوجہ لغت سے بے خبری کے بڑی سخت غلطی کھائی ہے۔ الفاظِ قرآنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے قید لگادی ہے کہ تم اپنے مال عورتوں پر اس طرح خرچ کرو کہ ان کو قیدِ نکاح میں لانا مقصود ہو اور قیدِ نکاح جب ایک بار عائد ہو جاتی ہے تو اس سے زوجین کی زندگی میں نکلنے کی صورت سوائے طلاق کے اور کوئی قرآن نے نہیں بتائی ہے فما استمتعتم اسی پر تفریع ہے یعنی بطورِ نتیجہ آئی ہے کہ جب تم نے مقررہ مہر کے ساتھ ان سے نکاح کر لیا ہے تو اب چونکہ تم اس سے فائدہ اٹھا چکے ہو اس لیے ان کا پورا مہر ادا کرنا تمہارے ذمہ واجب ہے۔ قرآن نے آیت بالا میں تقسیم بتائی ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات کی دو قسمیں ایک احصان دوسرے مسافحت محصنین غیر مسافحین احصان یعنی نکاح کے مقابلے میں مسافحت یعنی شہوت رانی ہے۔ متعہ کو ہمیں ان دونوں میں سے ایک میں شمار کرنا ہوگا۔ دونوں میں قدرِ مشترک مرد و عورت کا تعلق ہے۔ دونوں میں قرآن نے یہاں حدِ فاصل یہ بتائی ہے احصان میں تعلق ناپیدی ہوتا ہے مسافحت میں وقتی ہوتا ہے۔ احصان میں عورت کے مرد پر کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ مسافحت میں نہیں ہوتے۔ احصان میں اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے مسافحت میں نہیں۔ اس بنا پر متعہ صراحۃً مسافحت میں داخل ہے نہ کہ احصان میں۔ بہرحال یہ کہنا کہ یہ آیتِ قرآنی لفظِ استمتاع کی وجہ سے متعہ کے جواز کو بتا رہی ہے صراحۃً اور علانیہ غلط ہے کیونکہ اس آیت میں منھن کی ضمیر ان عورتوں کی طرف راجع ہے جن سے قرآن نے واحل لکم ما وراء ذالکم میں نکاح کو حلال قرار دیا اور جن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے ان تبتغوا باموالکم تم ان کو اپنے مالوں کے بدلے حاصل کرو بشرطیکہ تم احصان کے طالب ہو بدکاری نہ کرنے والے ہو، اگر قرآن غیر مسافحین کی صراحت کر رہا ہے تو پھر متعہ کی گنجائش کہاں ہے۔ نکاح اور سفاح میں یہی فرق ہے کہ نکاح سے مقصود نسل ہوتا ہے اور زنا کا مقصد محض شہوت رانی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے زنا اور متعہ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اولاد نہ زنا سے مقصود ہوتی ہے اور نہ متعہ سے۔ دونوں کا مقصد شہوت رانی ہے۔ اسی بنا پر متعہ کا دوسرا نام عاریۃ الفرج ہے جیسا کہ استبصار میں بتایا ہے:

میں نے ابوعبداللہ سے دریافت کیا کہ مانگی ہوئی شرمگاہ یعنی عاریۃ الفرج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (استبصار ص ۵، ج ۲)

قرآن نے غیر مسافحین کہہ کر دونوں سے منع کر دیا ہے۔ اور پھر اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ فما استمتعتم کو گزشتہ آیت سے صرف فار کے ذریعے مربوط کیا گیا ہے یعنی اس میں کوئی نیا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ پہلے ہی حکم کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے۔ اگر یہ مستقل حکم ہوتا تو فار کی جگہ واو لاتے۔ اس لیے اس فقرے میں نکاح صحیح کے ذریعے استمتاع اور انتفاع مراد ہے۔ متعہ والے استمتاع اور انتفاع کا یہاں کوئی دور کا بھی اشارا نہیں ہے۔ اگر اس فقرے میں متعہ مراد ہو تو اول کلام اور آخر کلام میں تعارض ہو جائے گا۔ کیونکہ آیت کے پہلے حصے میں تو نکاح اور شرائطِ نکاح کا ذکر ہو اور آخر میں بلا شرط عورتوں سے نفسانی اور شہوانی انتفاع کی اجازت ہو تعالی کلام اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔

متعہ تاریخِ احکام کی روشنی میں

جیسا کہ پہلے بتا آیا ہوں کہ متعہ دو معنے میں بولا جاتا ہے ورنہ تاریخ میں صرف ایک معنے میں بولا گیا ہے اور وہ یہ کہ ایک مدت مقررہ کے لیے گواہوں کی موجودگی میں ولی کی اجازت سے مہر معین کر کے نکاح کیا جائے۔ مقررہ مدت گزرنے پر خود بخود جدائی واقع ہو جائے اور جدائی کے بعد استبرائِ رحم کے لیے ایک بار ایامِ ماہواری کا انتظار کرے تاکہ اختلاط نہ ہو۔ یہ صورت شادی اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھی اسلام آنے کے بعد ایک عرصہ تک جائز رہی۔ اسی کو متعہ کہتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ابتدائِ اسلام میں نکاح متعہ کی رخصت تھی بشرطیکہ ضرورت شدیدہ ہو جیسے مردار اور سور کا گوشت کھانے کی جان بچانے کے لیے رخصت ہے۔ اسی طرح اضطرار کی حالت متعہ کی بھی رخصت تھی۔ حضرت ابن ابی عمرہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابتدائِ اسلام میں اضطرار کی حالت میں متعہ کی رخصت تھی جیسے مردار، دم اور سور کے گوشت کی رخصت ہے لیکن جب بعد میں اللہ سبحانہٗ نے دین کو مستحکم کر دیا تو اس سے بھی منع کر دیا اور صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ کے ساتھ غزوات میں ہوتے تھے اور جوان تھے۔ ہمارے ساتھ عورتیں نہ تھیں۔ ایک دفعہ ہم لوگوں نے رسول اللہ سے کہا کہ اجازت ہو تو ہم لوگ خصی ہو جائیں حضور نے منع فرمایا اور رخصت دی کہ کپڑا دے کر ایک مدت کے لیے نکاح کر لیں۔

مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ اور سلمۃ ابن الاکوع سے بھی رخصت مروی ہے گو اس میں یہ

تشریح نہیں ہے کہ یہ رخصت کس حالت میں تھی مگر ظاہر ہے کہ وہ بھی ضرورت پر محمول ہوگی مگر اس کے بعد یہ رخصت ممنوع ہوگئی۔ اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے سوائے حضرت ابن عباس کہ وہ اضطرار کی حالت میں جواز کا فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں انہوں نے بھی رجوع کر لیا اور سب کی طرح حرام کہنے لگے۔

متعہ کب حرام ہوا؟

اس میں اختلاف ہے کہ متعہ کب حرام ہوا کچھ کہتے ہیں کہ غزوہ خیبر میں کچھ کی رائے ہے کہ عمرۃ القضاء میں، بعض کہتے ہیں کہ فتح مکہ میں اور کچھ کا خیال ہے کہ غزوۂ اوطاس میں اور کچھ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں۔ اس میں غزوۂ اوطاس اور فتح مکہ تو ایک ہی زمانہ ہے، حجۃ الوداع اور عمرۃ القضاء میں ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ ممانعت کی تاکید اور اعلان ہوا اس لیئے اصل اختلاف تو صرف خیبر اور فتح مکہ میں ہے۔ خیبر کے موضوع پر صحیحین میں حضرت علی سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ سے اور اہلی گدھوں کے گوشت سے خیبر میں منع فرمایا۔ یہ حدیث متعدد طریقوں سے مروی ہے لیکن مسلم ہی میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ فتح مکہ کے وقت مکہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی اجازت دی اور تین روز کے بعد منع فرمایا۔ سوال یہ ہے کہ اگر خیبر میں حرام ہوا تھا تو یہ اجازت کیسی تھی؟

خیبر کی ممانعت اور پھر فتح مکہ کے وقت اجازت اور ممانعت اس کی تطبیق میں علماء کی رائے مختلف ہے۔
مازری اور قاضی عیاض کہتے ہیں کہ متعہ خیبر میں حرام ہوا۔ حضرت علی کی روایت ثقات اور مستند لوگوں سے مروی ہے اور عمرۃ القضاء، فتح مکہ یا اوطاس میں جو ممانعت آئی ہے وہ خیبر کی ممانعت کی تاکید ہے مگر امام نووی کہتے ہیں کہ یہ رائے ان تمام بیانات کے خلاف ہے جن میں فتح مکہ کے وقت اجازت دینا مذکور ہے۔
قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضرت علی کی روایت میں حرمت متعہ کا وقت نہیں بتایا گیا بلکہ مطلق رکھا گیا ہے اور وقت صرف اہلی گدھوں کی حرمت کا بتایا گیا۔ متعہ فتح مکہ کے وقت حرام ہوا، خیبر میں حرام نہیں ہوا تھا۔ ابن قیم بھی کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے اور اس پر انہوں نے بڑی بسیط تقریر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کی روایت صحیحین میں بھی ہے اور مسند امام احمد میں بھی ہے۔
صحیحین کے الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ متعہ کی حرمت کا زمانہ خیبر ہے مگر مسند کی روایت کے الفاظ صاف ہیں کہ گدھوں کا گوشت خیبر میں منع ہوا۔ اور متعہ کی حرمت کے وقت میں اطلاق ہے اس کا زمانہ نہیں بتایا گیا لہٰذا متعہ خیبر میں نہیں بلکہ پہلے پہلے فتح مکہ کے وقت حرام ہوا مگر اس تاویل میں صحیحین کی روایت کو ترک کرنا یا اس کے مفہوم صریح کو ترک کرنا پڑتا ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ متعہ پہلے مباح تھا خیبر میں حرام ہوا پھر فتح مکہ کے وقت مباح ہو گیا اور تین روز کے بعد پھر حرام ہو گیا یعنی اباحت اور حرمت دونوں مکرر ہوئیں۔

امام نووی کہتے ہیں کہ یہی مختار اور صحیح ہے مگر امام شافعی خود فرماتے ہیں کہ اس کی نظیر شریعت میں نہیں پائی جاتی۔ جو چیز عند الشرع علی الاطلاق مذموم ٹھہر گئی اور حرام ہونا اس کا بیان کر دیا گیا وہ پھر کیونکر مباح ہو سکتی ہے؟ یا اباحت کسی ضرورت کی وجہ سے ہو گی تو ایسی ضرورت کے وقت، ہمیشہ اس کی اباحت قائم رہنی چاہیے۔ لہٰذا وہ فعل علی الاطلاق حرام نہ ہو گا۔ حالانکہ خود امام شافعی اور دوسرے تمام علماء یہی کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد اب کسی ضرورت سے متعہ مباح نہیں ہو سکتا۔ تمام شبہات اس وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں کہ خیبر کے امتناع کو حرمت شرعی پر محمول کیا جا رہا ہے حالانکہ حضرت علی کی روایت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حرمت کا مفہوم متعین ہو۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضور نے خیبر میں متعہ سے منع کیا لیکن کسی روایت سے پتہ نہیں ملتا کہ یہ امتناع حرمت کی وجہ سے تھا یا مصلحت کی وجہ سے۔ ابن ابی عمرہ کی روایت صریح ہے کہ ابتداء اسلام میں جب رخصت تھی تو وہ بھی رخصتِ عام نہ تھی بلکہ اضطرار کی حالت میں رخصت تھی لہٰذا بلا اضطرار تو اس وقت بھی منع ہی تھا البتہ حضرت علی نے حضرت ابن عباس کے خلاف استدلالاً فرمایا کہ حضور نے خیبر میں متعہ سے منع فرمایا۔ اس سے یہ بے شک معلوم ہوا کہ حضرت علی فتح مکہ سے قبل اس کو منع سمجھتے تھے مگر منع ہمیشہ حرمت ہی کے لیے نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس جواز کا فتویٰ دیتے تھے جیسا کہ حضرت عروہ بن زبیر کی روایت سے جو صحیح مسلم میں ہے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت علی اس کو منع فرماتے تھے لیکن فتح مکہ کے روز حضور نے صاف طور سے متعہ کا حرام مؤبد ہونا بیان کر دیا چنانچہ مسلم میں وہی سیرہ بن معبد کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا یا ایھا الناس انی قد کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللہ قد حرم ذالک الی یوم القیمۃ۔

اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور البتہ خدا نے اس کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے پہلے آپ کو خدا کی طرف سے کوئی حکم نہ ملا تھا۔ خیبر کا امتناع بحکم خداوندی نہ تھا بلکہ خود حضور نے اس فعل کو مکروہ سمجھ کر منع کیا تھا۔ اور ضرورت کے وقت خود اجازت دی تھی۔ فتح مکہ کے وقت جب خدا کا حکم آگیا تو آپ نے متعہ کا منجانب اللہ حرام ہونا بیان کر دیا۔ لہٰذا عمرۃ القضاۃ میں جو امتناع مروی ہے وہ پہلی قسم کے امتناع پر محمول ہو گا اور حجۃ الوداع میں جو امتناع مروی ہے وہ حرمت کا اعلان اور تاکید ہے واللہ اعلم۔

درحقیقت ابتدائے اسلام میں حلال و حرام کے بہت سے احکام بتدریج آئے اور خاص کر ان چیزوں کے بارے میں قانون آہستہ آہستہ اترا جو سوسائٹی کے رگ و ریشہ میں اتری ہوئی تھیں جیسے شراب اور سود کی حرمت کا حکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پندرہ بیس سال کے بعد نازل ہوا۔ ٹھیک اسی طرح متعہ کے بارے میں حکم خداوندی کے نازل ہونے سے زمانۂ جاہلیت کے رسم ورواج کے مطابق لوگ متعہ کیا کرتے تھے اور اب تک اس بارے میں صریح اور واضح حکم نازل نہ ہوا تھا۔ سب سے پہلے خیبر کی لڑائی میں جو ہجرت کا ساتواں سال تھا، حضور پر نور نے متعہ اور لحوم خمر اہلیہ کی حرمت کا اعلان فرمایا جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے باسانید صحیحہ مروی ہے۔

بعد ازیں ۸ھ کے آخر میں جنگ اوطاس کا واقعہ پیش آیا۔ اس میں صرف تین روز کے لیے متعہ کی اجازت ہوئی اور اباحت کے معنے یہ ہیں کہ جن لوگوں نے حسب سابق متعہ ان کو خیبر کی ممانعت کا علم نہ تھا اس بے خبری میں جو متعہ ہوا اس پر کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی لیکن اس کے بعد جب حضور عمرۃ القضائے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تو خانہ کعبہ کے دونوں بازو پکڑ کر فرمایا کہ متعہ قیامت تک کے لیے حرام کیا گیا ہے۔ فتح مکہ کے بعد چونکہ ہزاروں آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان نومسلموں کو چونکہ متعہ کی حرمت کا علم نہ تھا اس لیے ناواقفیت کی وجہ سے رسم جاہلیت کے مطابق انہوں نے مقام اوطاس میں متعہ کر لیا۔ حضور انور کو علم ہوا تو آپ نے باب کعبہ پر کھڑے ہو کر متعہ کی دائمی حرمت کا اعلان کیا۔

غزوۂ تبوک میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عورتوں کو مسلمانوں کے خیمہ کے قریب دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں۔ عرض کیا گیا کہ ان عورتوں سے کچھ لوگوں نے متعہ کیا ہے۔ حضور انور یہ سن کر سخت ناراض ہوئے اور غصہ کی وجہ سے چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور تقریر کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اللہ کی حمد و ثنا کی اور اس کے بعد متعہ سے منع فرمایا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے بعد کبھی متعہ نہیں کیا اور ہمیشہ کے لیے ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ کبھی متعہ نہ کریں گے[1] آپ کی ناراضگی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ متعہ پہلے حرام ہو چکا ہے بلکہ اس کی حرمت سے لوگوں کو دو بار مطلع کر چکے ہیں۔ پہلی بار خیبر میں دوسری بار اوطاس میں اور تیسری بار اس کی حرمت کا تاکیدی اعلان کیا۔ اس کے بعد حجۃ الوداع میں چونکہ مجمع صحابہ موجود تھا اعلان عام فرمایا تاکہ حرمت کا اعلان سب تک پہنچ جائے۔

---

[1] الاعتبار للحازمی

شیعی متعہ کا تصور اور اس کا پس منظر

عرب میں اصل رائج شدہ متعہ کی حد تک آپ کے سامنے بات واضح ہو کر سامنے آچکی ہے آیئے اب اس متعہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جس کے ہمارے دوست اہل تشیع قائل ہیں اور جسے ایران میں صیغہ کہا جاتا ہے۔

ایسا جنسی رابطہ مرد و عورت کے درمیان جس میں نہ گواہ ہوں نہ اعلان عام ہو نہ وراثت ہو اور نہ چار میں اس کا شمار ہو۔ صرف کچھ دے کر کچھ وقت کے لیے یہ کہہ کر کہ تو اتنے میں اتنے وقت کے لیے میرے سے شادی کرلے۔ مثلاً یوں کہے کہ میں تیرے سے دو روز کے لیے منتفع ہوں گا اور تجھے اس کی چار روپیہ اجرت دوں گا۔ یہ چار روپیہ بطور مثال ہیں ورنہ تحفہ الفقیہ میں امام ابو عبد اللہ کے حوالہ سے کہ دو لپ گندم پر بھی متعہ ہو سکتا ہے۔

اس متعہ کا پس منظر یہ ہے کہ یہ ایرانی سوسائٹی کا عمل ہے جس کو عبادت متعہ کہا جاتا ہے اور جس کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں اس کی اصل عرب میں نہیں بلکہ اسلام سے پہلے کے ایران کے ساسانی نظام معاشرت سے لی گئی ہے وہاں شادیاں دو قسم کی ہوتی تھیں۔ ایک مستقل اور ایک عارضی۔ مستقل شادی کے لیے میاں بیوی کے لیے پہلوی زبان میں شود اور زن کے الفاظ استعمال ہوتے تھے لیکن عارضی شادی کی صورت میں شوہر اور بیوی کے لیے میرک اور زیانگ کی قانونی اصطلاحات تھیں۔

(قانون ساسانی جلد ا ص ۳۶)

اس عارضی شادی کے لیے نہ گواہوں کا کہیں ثبوت ملتا ہے اور نہ اس میں عورت کے وارثوں کی اطلاع یا رضا ضروری تھی۔ اس میں نہ وراثت چلتی تھی، نہ طلاق ہوتی تھی اور نہ ہی ازدواج کی اولاد اپنے اصل باپ کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ (قانون ساسانی ج ا ص ۳۹)

ایرانیوں نے مسلمان ہونے کے بعد اسی غیر انسانی رسم کو متعہ کا نام دے کر اپنی ضرورت پوری کرلی۔ نہ متعہ والی عورت کو ان چار میں شمار کیا۔ جن کی قرآن نے اجازت دی ہے چنانچہ محمد بن یعقوب الکلینی رازی لکھتے ہیں کہ:

بکر بن محمد ازدی نے کہا کہ میں نے ابو الحسن سے متعہ کے بارے میں دریافت کیا کہ متعہ والی عورت ان چار میں شمار ہو گی جو نکاح کے لیے قرآن نے حد بتائی ہے فرمایا کہ بالکل نہیں[1]

[1] فروع الکافی کتاب النکاح۔

بلکہ اس کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ:

زرارہ ابن اعین نے دریافت کیا کہ متعہ کرنے کے لیے عورتوں کی حد کیا ہے؟ فرمایا جتنی چاہو کر لو۔[1]

بلکہ اس سے بھی آگے ایک قدم اور بڑھا کر لکھا ہے کہ:

ابو عبد اللہ نے دریافت کیا کہ کیا ممتوعہ ان چار میں سے ہے جن سے نکاح کی قرآن نے اجازت دی ہے فرمایا نہیں بلکہ ستر سے بھی نہیں ہے۔[2]

اور نہ متعہ والی عورت کے لیے وراثت کی قید ہے چنانچہ شیخ طوسی فرماتے ہیں کہ:

امام ابو جعفر فرماتے ہیں کہ متعہ والی نہ خود وارث ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوتا ہے وہ تو کرائے پر لی ہوئی ہے۔[3]

اور ابو جعفر الصدوق القمی فرماتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگو اللہ تعالیٰ نے تین طرح کی شرمگاہیں تمہارے لیے حلال کی ہیں، وہ شرمگاہ جو وارث کی حقدار ہو یہ تو نکاح ہے، دوسری وہ شرمگاہ جو وراثت کی حقدار نہ ہو یہ متعہ ہے اور تیسری وہ جو ملک یمین کے ذریعے حاصل ہو۔[4]

اور نہ متعہ والی عورت کے لیے طلاق کی ضرورت ہے محض مقررہ مدت ختم ہونے سے نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ ابو جعفر محمد بن الحسن طوسی فرماتے ہیں:

محمد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے ابو الحسن سے دریافت کیا کہ متعہ ایک سال کے لیے ہو یا اس سے کم زیادہ فرمایا اجرت بھی مقرر ہو اور مدت بھی مقرر ہو۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا بغیر طلاق کے جدا ہو جائے گی فرمایا ہاں۔[5]

اور نہ متعہ والی عورت کے لیے گواہ اور ولی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ محمد بن یعقوب کلینی فرماتے ہیں،

عبد الملک بن جریج کہتے ہیں کہ چار بیویوں والا جس قدر عورتوں سے چاہے متعہ کرے اس کے لیے ولی اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔[6]

اور نہ ہی اس کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے بلکہ مجوسی عورت سے بھی یہ تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے چنانچہ شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی فرماتے ہیں:

---

[1]،[2] فروع الکافی کتاب النکاح، [3] الاستبصار [4] من لا یحضرہ الفقیہ [5] الاستبصار ج ۲۔ [6] فروع کافی ج ۲۔

ابوعبداللہ فرماتے ہیں کہ مجوسیہ سے متعہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے [1]

بلکہ متعہ کرنے کے لیے یہ تحقیق کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ، چنانچہ شیخ طوسی فرماتے ہیں:

محمد بن راشد کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ سے کہا کہ میں نے ایک عورت سے متعہ کیا تھا میرے جی میں آیا کہ وہ شاید شادی شدہ ہے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے ابوعبداللہ نے کہا کہ تو نے تحقیق ہی کیوں کی؟ [2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ

ابوعبداللہ سے کہا گیا کہ فلاں شخص نے ایک عورت سے متعہ کیا اس سے کہا گیا کہ اس کی تو شادی ہو چکی ہے اس نے دریافت کیا، ابوعبداللہ نے کہا اس نے دریافت ہی کیوں کیا ہے۔ [3]

کہیں متعہ والی عورت کو متاجرہ یعنی کرائے پر لی ہوئی کہا ہے اور کہیں اسے عاریۃ الفرج مانگی ہوئی شرمگاہ بتایا ہے۔ عاریۃ الفرج کی اصل بھی مجوسی نظام معاشرت سے لی گئی ہے۔ ڈنمارک کی کوپن ہاگن یونیورسٹی کے پروفیسر ساسانی نظام معاشرت کے بارے میں لکھتا ہے:

شوہر کو مجاز تھا کہ اپنی بیوی یا بیویوں میں سے ایک کو خواہ وہ بیاہتا بیوی کیوں نہ ہو کسی دوسرے کو جو انقلاب روزگار سے محتاج ہو گیا ہو اس غرض کے لیے دے دے کہ وہ اس سے کسب معاش کے کام میں مدد لے سکے۔ اس عارضی تعلق سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ پہلے شوہر ہی کی سمجھی جاتی تھی [4]

اسی مجوسی رسم نے روایات میں وہ صورت اختیار کر لی جسے عاریۃ الفرج کہتے ہیں۔

بہر حال خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایرانی سوسائٹی کے جس عمل کو آج متعہ کہا جاتا ہے اور کتب شیعہ میں جس کے فضائل بیان کیے گئے ہیں اس کی اصل اسلام سے پہلے کا مجوسی نظام معاشرت ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ متعہ کبھی بھی اسلامی تاریخ میں جائز نہیں ہوا اور نہ ہی اسلام کا نظام اخلاق اس جیسے حیا سوز فعل کی ایک لمحہ کے لیے بھی اجازت دے سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں جس متعہ کا ذکر ہے وہ ایرانی متعہ نہیں جس کی حقیقت سے آپ ابھی ابھی روشناس ہو

---

[1] تہذیب الاحکام ج ۲، [2] [3] تہذیب الاحکام ج ۲، [4] ایران بعہد ساسانیاں مقدمہ تحقیق متعہ ص ۱۰

چکے ہیں۔ اس متعہ کے جواز کا تصور بھی اسلام کے چہرۂ اخلاق پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں جو متعہ جائز تھا اور بعد میں جو حرام ہوگیا۔ وہ ایرانی نہیں بلکہ وہ متعہ تھا جس میں نکاح کے باقی سب وہی قوانین ہیں جو اصلی نکاح دوامی میں ہوتے ہیں جیسے گواہوں کی موجودگی، اعلانِ عام، مدتِ نکاح میں میاں بیوی کی وفات پر ایک دوسرے کی میراث پانا، ہاں صرف مدتِ نکاح متعین ہوتی ہے اور اسی کو نکاح موقت کہتے ہیں لیکن اسلام کے نظامِ حیا و اخلاق نے اسے بھی گوارا نہیں کیا اور اس کو بھی ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا ہے۔

سیدنا علی مرتضیٰ فرماتے ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں اور نکاحِ متعہ کو حرام قرار دیا ہے۔

یہ حدیث صرف صحیحین ہی میں نہیں ہے بلکہ صاحبِ تہذیب الاحکام نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اس بیان کو یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ ان ھذہ الروایۃ وردت مورد التقیہ یہ بات آنحضرت نے بطورِ تقیہ کے فرمائی ہے۔ (تہذیب الاحکام ص ۲۵۱) علامہ طوسی نے یہ توجیہ کرتے ہوئے اس پر غور نہیں فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تقیہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو دلیل میں تصرف ہے اور مدلول کا یہ کہہ کر منہ بگاڑا ہے کہ حدیث میں جس متعہ کا ذکر ہے اس سے نکاح موقت مراد نہیں بلکہ اس سے ایرانی سوسائٹی کا متعہ مراد ہے حالانکہ جس متعہ کو حدیث میں حرام کیا گیا ہے اس سے یہ متعہ نہیں بلکہ وہ متعہ مراد ہے جو عرب سوسائٹی میں رائج تھا کہ کسی عورت سے مدتِ متعینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کی اجرت دے کر الگ کر دیتے تھے۔ اس میں وہ تمام شرائط موجود ہوتیں جو نکاح حقیقی میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام نے اس کو شروع میں جائز رکھا لیکن اسے اسلامی نظامِ معاشرت کے منافی سمجھتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں حرام قرار دیا۔ بہرحال شیعہ حضرات نے متعہ کو عبادت قرار دینے کا جو مسلک اختیار کیا اس کے لیے کتاب و سنت میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صدرِ اول میں صحابہ اور تابعین اور فقہاء میں سے چند بزرگ جس متعہ کے جواز کے قائل ہیں اول تو اس سے یہ ایرانی متعہ مراد نہیں بلکہ وہ عربی متعہ مراد ہے جسے نکاح موقت کہتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ اس عربی متعہ کو بھی صرف اضطرار اور شدید ضرورت کی حالت میں جائز رکھتے تھے ان میں سے کوئی بھی اسے نکاح کی طرح مباحِ مطلق اور عام حالات میں معمول بنا لینے کا قائل نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا مسلک

عبداللہ بن عباس جن کا نام قائلین جواز میں سب سے نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے نے اپنے مسلک

کی توضیح خود ان الفاظ میں کی کہ ما ھی الا کالمیتۃ لا تحل الا للمضطر (یہ تو مردار کی طرح ہے کہ مضطر کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہے) نہ یہ کہ شیعہ مصنفین کی تصریح کے مطابق یہ عابدانہ زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور بہت بڑی بزرگی اور فضیلت والا کام ہے۔ اور عبداللہ بن عباس نے اس فتویٰ سے بھی اس وقت رجوع کر لیا جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ اباحت کی گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ متعہ کرنے لگے ہیں اور ضرورت تک اسے موقوف نہیں رکھتے۔ دراصل عبداللہ ابن عباس کی پیدائش ہجرت سے ایک یا دو سال پہلے ہوئی۔ اور آٹھ نو برس کی عمر تک اپنے والدین کے ساتھ مکہ میں رہے۔ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں جب حضرت عباس نے اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی تو حضرت عبداللہ بن عباس بھی مدینہ منورہ تشریف لائے اور غزوۂ خیبر آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہو چکا تھا اس لیے حضرت ابن عباس کو بذات خود متعہ کے متعلق کوئی علم نہیں ہوا۔ صرف دوسرے صحابہ کی زبانی سنا اور اس بنا پر یہ فتویٰ دیا کہ مجبوری کی حالت میں جیسے مردار اور خنزیر حلال ہو جاتا ہے ایسے ہی مجبوری کی حالت میں متعہ بھی جائز ہے لیکن بعد میں جب حضرت علی نے اور دیگر صحابہ نے متعہ کے بارے میں حرمت سے مطلع کیا تو ابن عباس نے اس سے رجوع کر لیا۔

اس سوال کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ ابن عباس اور ان کے ہم خیال چند گنے چنے اصحاب نے اس مسلک سے رجوع کر لیا تھا یا نہیں تو ان کا مسلک زیادہ سے زیادہ جواز بحالت اضطرار ہو سکتا ہے۔ مطلق اباحت بلا ضرورت تمتع حتیٰ کہ منکوحہ بیویوں کی موجودگی میں بھی ممنوعات سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوق سلیم بھی گوارا نہیں کر سکتا کجا کہ اسے شریعت محمدیہ کی طرف منسوب کیا جائے اور ائمہ اہل بیت کو اس سے متہم کیا جائے۔ خود شیعہ حضرات میں بھی کچھ دوستوں نے متعہ کی شناعت سے گھبرا کر متعہ کو زنا سے تعبیر کیا ہے اگرچہ مولوی محمد حسین نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر المبلغ سرگودھا ستمبر ۶۲ء کا شمارہ ہے اس کے باب الاستفسارات میں یہ پوری تفصیل درج ہے۔

متعہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

متعہ کی حرمت خود قرآن کے اشارات اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات سے ثابت ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اسے حضرت عمر نے حرام کیا درست نہیں ہے۔ حضرت عمر اس حکم کے موجد نہیں تھے بلکہ صرف اسے نافذ کرنے والے تھے۔ چونکہ یہ حکم حضور نے آخر زمانے میں دیا تھا اور عام لوگوں تک نہ پہنچا تھا اس لیے حضرت عمر نے اس کی اشاعت عام کی اور بذریعہ قانون اسے نافذ کیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ

سے صحیح مسلم میں روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضرت صدیق کے عہد میں ایک مٹھی کھجور یا ایک مٹھی ستو پر متعہ کیا کرتے تھے حتیٰ کہ عمر بن الخطاب نے عمرو بن الحرث کے واقعہ کے بعد بالکل منع کر دیا۔ ایک اور حدیث بعض لوگوں نے حضرت عمر سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے میں دو متعے تھے۔ ایک متعہ النسا اور دوسرا متعہ الحج ہم دونوں سے منع کرتے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ حضرت عمر کے امتناع کو تحریم پر محمول نہیں کر سکتے ان میں سے کوئی بھی اس کے منافی نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت فرمایا تھا کہ آج سے اللہ سبحانہٗ نے متعہ کو قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا۔ جن لوگوں نے اس کے بعد بھی متعہ کیا بلاشبہ ان کو فتح مکہ کے اس امتناع کا علم نہ ہوا ہوگا ورنہ وہ اس کے بعد ہرگز ایسا نہ کرتے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ حضرت جابر نے یہ اس لیے کہا کہ ان کو حضور کے منع کرنے کا علم نہ ہوا تھا۔ حضور کو حجۃ الوداع میں اسی لیے اعلان کی ضرورت پیش آئی کہ بہتوں کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی کہ متعہ حرام ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکر یا حضرت عمر کے وقت میں کچھ لوگ اسی دلیل سے متعہ کرتے تھے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ کے زمانے میں کیا ہے۔ حضرت عمر نے زجراً ایسے لوگوں سے کہا کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں لوگ کرتے تھے مگر ہم منع کرتے ہیں یعنی باوجود کرنے پر منع ہو گیا جس سے ہم واقف ہیں حاشا و کلا حضرت عمر کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ جو چیز رسول اللہ کے وقت میں جائز تھی اس کو ہم اپنی رائے سے حرام بناتے ہیں۔ حضرت جابر کا طرز بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے بھی رجوع کر لیا تھا ان کی روایت کے الفاظ لکھ چکا ہوں کہتے ہیں کہ عمرو بن الحرث کے قصہ کے بعد بالکل منع کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے منع کو انہوں نے قبول کیا اور مسلم میں ایک روایت ہے کہ ان کے سامنے ابن عباس اور ابن الزبیر کے اس مسئلہ میں اختلاف کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا کہ عمر نے بعد میں منع کر دیا ہے یعنی انہوں نے عبداللہ بن الزبیر کے خیال کی تائید کی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے ان کو سمجھا دیا کہ متعہ کی ممانعت ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو منسوخ کر دیا اور صحابہ نے قبول کر لیا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں رقمطراز ہیں کہ:

یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ متعہ کی حرمت قرآن مجید کے کسی صریح حکم پر نہیں، بلکہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہے۔ سنت میں اس کی صراحت نہ ہوتی تو محض اس آیت کی بنا پر تحریم کا فیصلہ کر دینا مشکل تھا۔

اس کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ مولانا اپنے مخاطبوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ متعہ کی حرمت سور اور خنزیر کی طرح قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے اور اس شبہ کا سرچشمہ یہ ہے کہ مولانا کو سورہ مومنوں اور سورۃ معارج کی آیات سے استدلال میں تردد ہے وہ فرماتے ہیں:

> یہ استدلال بہت قوی ہے مگر اس میں کمزوری کا پہلو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم فتح مکہ کے سال دیا ہے اور اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حرمت متعہ کا حکم قرآن کی اس آیت میں آچکا تھا جو بالاتفاق مکی ہے اور ہجرت سے کئی سال پہلے نازل ہوئی ہے تو کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے فتح مکہ تک جائز رکھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض آیات سے بعض احکام بطور اشارہ معلوم ہوتے ہیں پھر جب اللہ سبحانہ کا ارادہ ہوتا ہے کہ یہ حکم واضح کر دیا جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی وحی نازل ہو جاتی ہے کہ آپ اس حکم کو لوگوں کے سامنے صاف طور پر بیان کر دیں۔ اس وقت وہ حکم اس آیت سے صراحۃً معلوم ہو جاتا ہے اور عوام و خواص اس کے مکلف بن جاتے ہیں اور جب تک اللہ سبحانہ کو یہ منظور نہیں ہوتا اس وقت تک اس کو واضح اور ظاہر کرنے کی حضور انور پر وحی نہیں آتی۔ اگرچہ خواص اور اذکیا بطور اشارہ اس سے حکم سمجھ لیں مگر عام طور پر عام لوگ اس کے مکلف نہیں ہوتے جیسے حق سبحانہ نے شراب کے موضوع پر مکی زندگی میں فرمایا و تتخذون منہ سکرا و رزقا حسنا یعنی اور بناتے ہو تم انگور سے نشہ والی چیز اور رزق حسن۔ یہ آیت مکی ہے۔ شراب مکہ میں حرام نہ ہوئی تھی پینے والے اس وقت تک بے تکلف پیتے تھے ہجرت کے بعد حرام ہوئی۔ پھر کسی مسلمان نے ہاتھ نہ لگایا تاہم اس مکی آیت میں بھی سکراً کے بعد رزقاً حسناً فرما کر متنبہ فرما دیا کہ جو چیز سکر ہے وہ رزق حسن نہیں۔ اس سے اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ شراب اچھی چیز نہیں بلکہ حرام ہے۔ ایسے ہی مدنی زندگی میں فرمایا فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما اس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے لیکن ان میں لوگوں کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ سمجھدار لوگوں نے بڑا گناہ سمجھ کر شراب چھوڑ دی اور کچھ منافع للناس کی وجہ سے پیتے رہے۔ پھر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کچھ نے چھوڑ دی لیکن کچھ نمازوں کے اوقات علاوہ پیتے حضرت عمر نے دعا مانگی کہ اے اللہ شراب

کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔ قرآن میں یہ قانون نازل ہوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ، اس کے بعد شراب کی حرمت قطعی ہو گئی۔

ٹھیک اسی طرح مکہ میں سب سے پہلے سورۃ معارج میں کہا گیا:

والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ھم العادون۔

اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہاں مگر اپنی منکوحہ یا اپنی مملوکہ سے اپنی حاجت برآری کرتے ہیں ان پر کوئی ملامت نہیں، جو ان دو راہوں کے علاوہ اپنی حاجت برآری کسی اور راہ سے کرتے ہیں وہ قانون شکن ہیں۔

ظاہر ہے کہ ممتوعہ نہ منکوحہ ہے اور نہ مملوکہ ہے۔ اس میں اشارۃً بتا دیا کہ منکوحہ اور مملوکہ کے علاوہ کسی اور سے جنسی تعلقات قائم کرنا قانون کو توڑنا اور عدوان ہے۔ اس کے بعد سورۃ مومنون کی آیات نازل ہوئیں ان میں بھی یہی انداز اختیار کیا۔ وہاں جن اوصاف پر اہل ایمان کے لیے فلاح کو موقوف کیا گیا ہے ان ہی اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی ہے کہ اپنی منکوحہ اور باندی کے سوا کوئی اور راستہ قضائے شہوت کا اختیار نہیں کرتے۔ بعد ازیں مدینے کی زندگی میں زیر تشریح آیت نے یہ بات کھول کر بتائی کہ محصنین غیر مسافحین اس کے ذریعے قرآن نے صراحۃً متعہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور یہ شرط مردوں ہی کے لیے نہیں بلکہ عورتوں کے بارے میں بھی بتائی۔ محصنات غیر مسافحات۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ:

اگر کوئی شخص قرآن کی اس آیت کے سیاق پر پوری طرح غور کرے تو اسے اس میں متعہ کی حرمت صراحۃً معلوم ہو گی۔

پھر اسی بات کو سورۃ مائدہ کے آخر میں جسے وداعی پیغام کہنا چاہیے محصنین غیر مسافحین کا فقرہ دہرا دیا گیا ہے۔ گویا خدا کی وحی نے متعہ کی حرمت پر اب بالکل مہر لگا دی ہے

باہمی رضامندی سے مہر میں کمی یا بیشی

۲۴۔ اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد اگر باہمی رضامندی سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی اگر زوجین مہر مقرر کر لینے کے بعد کسی بات پر راضی ہو جائیں مثلاً عورت اپنی خوشی سے اپنے مہر میں سے کچھ کم کر دے یا مرد اپنی رضامندی سے

مہر مقررہ سے کچھ زیادہ دے تو وہ مختار ہیں اس میں کچھ گناہ نہیں ہے ۔ یہ نہیں کہ مقررہ مہر سے کچھ کم دے یا عورت اس سے کچھ زیادہ لے تو ناجائز ہے ۔ ہاں رضائے باہمی ضرور ہونی چاہیے ۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور ہر طرح کے نفع ونقصان کو خوب جانتا ہے اور جو حکم فرماتا ہے وہ سراسر حکمت آمیز ہوتا ہے اس کی متابعت میں تمہارے لیے دارین کی خوبی اور بہبودی ہے اور مخالفت میں سراسر نقصان ہے [1]

اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ باہم مہر مقرر ہو جانے کے بعد مہر کی مقررہ رقم ایسی کوئی حتمی چیز نہیں کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی بلکہ شوہر اگر چاہے تو اس میں اضافہ کر سکتا ہے اور بیوی اگر چاہے تو اس میں کمی کر سکتی ہے یا پورا مہر معاف کر سکتی ہے ۔ حاصل یہ ہے کہ شوہر کو اختیار ہے کہ نکاح میں جس قدر مہر مقرر ہوا ہے نکاح کے بعد اس کی مقدار بڑھا دے مگر یہ بڑھائی ہوئی رقم اس کے ذمہ اسی وقت واجب الادا ہو گی جبکہ بیوی اسی مجلس میں اس کو قبول کرے ایسے ہی عورت کو بھی اختیار ہے کہ اپنے مہر کا کوئی جزیا کل معاف کر دے ۔ شرط یہ ہے کہ عورت خود معاف کرے ، اس کے ولی کا معاف کرنا معتبر نہ ہو گا چاہے ولی اس کا باپ ہو ۔ اگر کسی نابالغہ لڑکی کا باپ اس کی طرف سے مہر معاف کر دے گا تو یہ صحیح نہ ہو گا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کا مقصد ایسی زندگی ہے جس میں مودت ورحمت اور باہم صلح ورضامندی کی ایسی فضا ہو جو دونوں کے احوال میں درستگی کی راہ پیدا کر سکے اور جس کے ذریعے وہ جماعت ترقی کر سکے جس کے یہ دونوں فرد ہیں ۔

آیت کا یہ مطلب جمہور کی رائے کے مطابق ہے اور یہی صحیح ہے لیکن سدی نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ متعہ کی مدت گزر جانے پر اگر تم باہم رضامندی سے نیا معاملہ کر لو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ باہمی رضامندی سے مدت میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور اجرت میں بھی ۔ یہ امامیہ کی رائے ہے جیسا کہ ابوعلی طبرسی نے مجمع البیان میں تصریح کی ہے لیکن یہ مطلب درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیت کے موضوع کے خلاف ہے ۔ اللہ سبحانہ نے اوّلاً محرمات کو بیان فرمایا اس کے بعد فرمایا ہے واحل لکم ما وراء ذالکم یعنی ان محرمات کے سوا تمہارے لیے اور عورتوں سے ازدواجی تعلق قائم کرنا جائز ہے بشرطیکہ تم ان کے مہر اور نان ونفقہ کی ذمہ داری قبول کر لو ۔ اس شرط سے دوسروں کے لیے تحلیل فروج اور عاریت باطل ہو گئی ۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ محصنین غیر مسافحین یعنی تمہارا پیش نہاد عورتوں سے تعلق میں ان کو اپنی حفاظت میں لینا ہو وہ تمہاری ہو کر رہے صرف قضائے شہوت پیش نظر نہ ہو ۔ اس قید سے بھی ممنوعہ عورت آیت کے مصداق سے

[1] افادات شیخ الاسلام

خارج ہو گئی کیونکہ ایک کی ہو کر نہیں رہتی۔ اس کے بعد ارشاد ہے فما استمتعتم بہ منھن چونکہ تم نے ان منکوحہ عورتوں سے استمتاع کیا ہے اس لیے تم پر ان کا مہر واجب ہو گیا ہے اسے تمہیں ادا کرنا چاہیے۔ اسی مہر کے بارے میں یہ تشریح آئی ہے کہ اگر مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بیوی رضامندی سے کمی زیادتی کرنی چاہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں اور یہ ان کے صوابدید پر موقوف ہے کہ مرد اگر چاہے تو مقررہ رقم میں اضافہ کر دے اور بیوی اگر چاہے تو کم کر دے۔

آیت کے ایک ٹکڑے کا موضوع سے ہٹ کر مطلب بتانا ذوقِ عربیت پر گراں ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے:۔

بات کو آغازِ کلام سے جدا کرنا اور درمیانے فقرے کو متعہ پر محمول کرنا صراحۃً کلام اللہ میں تحریف ہے۔ سیاقِ کلام تو صراحۃً حرمتِ متعہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

اوّل یہ کہ صاحبِ ہدایہ نے جو امام مالک کی طرف جوازِ متعہ کی نسبت کی ہے اس پر تمام فقہائے نے ان کی سخت گرفت کی ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ متعہ کی حرمت، کا فیصلہ عامہ صحابہ، فقہاء، کا فیصلہ ہے صاحب المنہل العذب المورود رقمطراز ہیں کہ متعہ حرام ہے کسی حال میں جائز نہیں۔ یہی جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے حازمی فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب فقہاء اور ائمہ امت اس پر متفق ہیں۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں متعہ کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے:۔ اہلِ مدینہ اور امام مالک، اہل کوفہ اور امام ابوحنیفہ، اہلِ شام اور امام اوزاعی، امام لیث اور امام شافعی اور محدثین یہی کہتے ہیں۔

دوم یہ کہ علامہ شامی نے شیخ ابن الہمام سے جو نقل کیا ہے کہ متعہ کی حرمت حجۃ الوداع میں ہوئی یہ صحیح نہیں ہے۔ جنگِ اوطاس میں اس کی حرمت ہمیشہ کے لیے ہو چکی تھی جیسا کہ احادیث کے تتبع سے ظاہر ہے۔ ابوداؤد کی ایک حدیث میں حجۃ الوداع کا ذکر ہے مگر اس میں صرف اس قدر ہے کہ متعہ کی حرمت حجۃ الوداع میں ہوئی یہ راوی کی غلط فہمی ہے۔ حجۃ الوداع میں تحریم جدید نہیں بلکہ اسی حرمتِ سابقہ جنگِ اوطاس کا اعلان حجۃ الوداع میں کیا گیا تھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ حجۃ الوداع میں اجتماع بڑا تھا اس لیے حضور انور نے اس بڑے مجمع میں اعلان کیا کہ برائے عامہ متعہ کی حرمت سے واقف ہو جائے۔ راوی کو پہلے سے متعہ کی حرمت کا علم نہ تھا وہ یہ سمجھا کہ اس کی حرمت کا اب اعلان ہوا اور متعہ اب حرام ہوا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ
مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ
اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ
اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ
مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ
وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع ۴ / ۱

اور جو کوئی تم میں سے اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہاری ملک یمین میں ہوں اور ایمان والیاں ہوں۴۹۔ اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے تم سب ایک دوسرے کی ہم جنس ہو۵۰۔ پس تم ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اپنے

نکاح میں لے لو اور دستور کے مطابق ان کا مہر ان کے حوالے کردو بشرطیکہ وہ نکاح کی قید میں رہنے والیاں ہوں بدکار نہ ہوں اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والی ہوں[51]۔ پھر اگر قیدِ نکاح میں آجانے کے باوجود بدچلنی کی مرتکب ہوں تو اس کے لیے اس سزا سے آدھی ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے[52]۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جنہیں اندیشہ ہے کہ شادی نہ کرنے سے زنا میں مبتلا ہو جائیں گے اور صبر کرلینا تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ بڑا ہی بخشنہار اور رحم کار ہے[53]۔

اسلام میں غلامی کی اصلاح

دُنیا میں غلامی کی تاریخ حاکمیت و محکومیت اور فاتح و مفتوح کی تاریخ کے ساتھ شروع ہوتی ہے، طاقتور قبائل کمزور قبائل کو یعنی فاتح اور حاکم مفتوح اور محکوم کو غلام بناتے تھے۔ غلامی کے رواج میں سب سے زیادہ لڑائیوں کو دخل ہے ان میں جو شکست خوردہ ہوتے تھے ان کو یا تو قتل کر دیا جاتا تھا یا معاوضہ لے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور جو عمر بھر کے لیے غلام بن جاتے تھے جن سے ہر قسم کے کام لیے جاتے تھے ان میں آخری صورت زیادہ رائج تھی جس نے رفتہ رفتہ لونڈی اور غلاموں کی تجارت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ لونڈی، غلام زندگی کی ایسی ناگزیر ضرورت بن گئے تھے کہ کوئی ملک اور قوم بھی غلامی کے رواج سے خالی نہ تھی۔ یونان، مصر، ہندوستان، ہر ملک میں غلامی رائج تھی۔ بعض بعض ملکوں میں تو غلاموں کی تعداد ملک کی اصل آبادی کے برابر تھی۔ خود یورپ میں انیسویں صدی کے وسط تک غلامی رائج تھی۔ یورپین قومیں محض جنگی قیدیوں ہی کو نہیں بلکہ

وحشی قوموں کو بھی زبردستی غلام بنالیتی تھیں۔ غلاموں کی حیثیت جانوروں سے بہتر نہ تھی۔ آقا ان کی جان تک کا مالک ہوتا تھا۔ غلاموں کے قتل کی کوئی سزا نہ تھی۔ ان سے طرح طرح کے پرمشقت کام لیے جاتے تھے۔ اور ادنیٰ لغزش کی بڑی سخت سزا دی جاتی تھی۔ ان کی ساری املاک کا مالک آقا ہوتا۔ الغرض ان کو سوسائٹی میں انسانیت کا مرتبہ حاصل نہ تھا۔

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے دوسرے مظلوم طبقوں کے ساتھ غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت اور حسن سلوک کا سبق دیا۔ ان کو انسانی حقوق عطا کیے اور ان کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ ان آیات میں قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتار دینا چاہتا ہے کہ اسیران جنگ میں سے جو عورتیں تمہارے قبضہ میں آجائیں، انہیں اس لیے حقیر اور ذلیل نہ سمجھو کہ وہ غلام ہیں، دوسری قوم کی عورتیں ہیں اور جنگ میں قید ہو کر آئی ہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے ہر آدمی دوسرے آدمی کا ہم جنس ہے اور انسانی برادری کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ ان میں سے جو عورتیں مسلمان ہوگئی ہیں تم ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ ان سے نکاح کرنے میں کوئی عیب نہیں، انسان ہونے کے لحاظ سے سارے انسان برابر ہیں اور فضیلت کا معیار ایمان و عمل ہے۔ غلامی کے بارے میں قرآن کی اصلاحات میں ایک اہم اصلاح ہے۔ قرآن نے جو اصلاحات کی ہیں اور غلاموں کو جو حقوق دیے ہیں اور آقا پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں ان کے نتیجہ میں غلامی کی شکل و صورت بدل گئی اور آقائی و بندگی کے پرانے مفہوم کے اعتبار سے غلامی غلامی نہ رہی بلکہ غلام آقا کے خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ اس کی آزادی اور ترقی کی راہیں کھل گئیں چنانچہ اسلام کی تاریخ علم و کمال کے ہر میدان میں اصحاب کمال غلاموں سے بھری ہوئی ہے۔

۴۹۔ اور جو کوئی تم میں سے اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہاری ملک یمین میں ہوں اور ایمان والیاں ہوں۔ یعنی جس کو اس بات کی مقدور نہ ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے اور اس کے مہر اور نفقہ کا تحمل کر سکے تو بہتر ہے کہ ایسا شخص آپس میں کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کرے کہ اس کا مہر کم ہوتا ہے اور نفقہ میں یہ سہولت ہے کہ اگر مالک نے اس کو اپنے یہاں رکھا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو شوہر اس کے نفقہ سے فارغ البال رہے گا اور اگر شوہر کے حوالہ کر دیا تو بھی بہ نسبت نفقہ حرہ تخفیف ضرور رہے گی۔

اس ارشاد گرامی کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شریف زادی سے نکاح نہیں کر سکتا ہے تو وہ کسی مسلمان کنیز سے نکاح کرے اور اس کی شرط یہ ہے کہ مرد اس قدر فراخی اور وسعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد

عورت سے نکاح کر سکے کیونکہ کنیز کا مہر اور نان و نفقہ آزاد عورت سے بہت کم ہوتا تھا۔ اصل ارشاد میں لفظ طول آیا ہے۔ طول کے معنے میں علمار کا اختلاف ہے۔

طول کے معنے

اصل لغت میں لفظ طول تین معنے میں آتا ہے غنا، قدرت، فضل۔ یہ طول سے لیا گیا ہے جس کے معنے لمبائی کے ہیں اعراض میں ہو یا جواہر ہیں۔ غنی اور مالداری کو طول اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے انسان دُنیا میں برتری اور اقتدار حاصل کرتا ہے، اسی سے تطوّل مال میں بڑھوتری کے معنے میں ہے اسی سے تطاول مال کے ذریعے لوگوں پر برتری کے معنے میں ہے اسی لیے ارشاد نبوت ہے یتطاولون فی البنیان تعمیرات میں لوگ برتری کا اظہار کریں گے اور اسی سے استطالہ دوسروں کے مقابلہ میں دست درازی کے ذریعے برتری کو کہتے ہیں۔ بزرگی اور برتری کو بھی طول کہتے ہیں شدید العقاب ذی الطول تینوں معنے میں ہم آہنگی ہے۔ آیت میں تینوں معنے کا احتمال ہے۔ اگر آیت میں طول کے معنے غنا کے ہیں جیسا کہ عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر اور قتادہ کی رائے ہے۔ تو اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مال کی اتنی وسعت نہ ہو کہ آزاد عورت سے شادی کر سکو تو پھر تمہیں مومن کنیز سے شادی کر لینی چاہیے۔ اس کے مفہوم میں یہ بات آگئی کہ اگر ایک شخص میں آزاد عورت سے شادی کی وسعت ہے تو اسے کنیز سے شادی نہ کرنی چاہیے دوسری یہ کہ اگر ایک شخص کی کسی آزاد عورت سے شادی ہو چکی ہے تو اسے کنیز سے شادی نہ کرنی چاہیے۔

اس دوسرے مسئلہ کے بارے میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

اگر کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہو تو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا سب کے نزدیک حرام ہے۔

لیکن سب کے نزدیک سے مراد احناف ثوری، اوزاعی اور امام شافعی مراد ہیں ان سب کے خیال میں آزاد عورت اگر نکاح میں ہو تو کنیز سے نکاح ناجائز ہے مگر امام مالک اور امام عثمان بتّی فرماتے ہیں کہ اگر دوسری آزاد عورت سے شادی کی وسعت نہ ہو تو کنیز سے کر سکتا ہے جیسا کہ ابن عربی نے احکام میں اور قرطبی نے تفسیر میں تصریح کی ہے۔ اگرچہ قرطبی نے یحمی کے حوالہ سے ابو حنیفہ کے مسلک کو ظاہر قرآن قرار دیا ہے چنانچہ مدونہ میں ہے لیست الحرة بطول تمنع نکاح الامة اس طرح گویا امام اعظم اور ان کے ہمنواؤں کے خیال میں کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہونا خود طول ہے جس کی موجودگی

میں کنیز سے نکاح نہیں ہو سکتا لیکن امام مالک طول کو قدرت کے معنے میں لے کر یہ مطلب بتاتے ہیں کہ جو شخص کسی آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہیں رکھتا ہے وہ کنیز سے شادی کرلے اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جس کے نکاح میں بالفعل آزاد عورت ہو وہ بھی اگر دوسری شادی کرنا چاہے اور آزاد عورت سے شادی کی قدرت نہ ہو تو کنیز سے شادی کرلے۔ ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں اس کی توضیح کی ہے۔

پہلی بات یعنی اگر ایک شخص میں آزاد عورت مسلمان سے شادی کی طاقت نہ ہو تو اسے مومن کنیز سے شادی کر لینے کی اجازت ہے۔

اس موضوع پر علماء میں اختلاف ہے۔

قرآن کی اس آیت میں حکم ہے یا رخصت ہے امام ابوحنیفہ اسے رخصت اور امر ارشادی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے امام ابوحنیفہ ان قیود کو جو اس آیت میں آئی ہیں احترازی نہیں کہتے مثلاً کنیز کا مسلمان ہونا۔ اگر اس قید کو نظرانداز کر کے کتابیہ کنیز شادی کرلی تو نکاح ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے جبکہ امام شافعی اور دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ قید احترازی ہے یعنی ان کے خیال میں کنیز کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے اگر غیر مسلم کنیز سے شادی کی تو نکاح ہی نہ ہوگا خواہ وہ کتابیہ ہو، شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

جس کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی مقدرت ہو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا امام شافعی کے نزدیک حرام ہے اور امام ابوحنیفہ کے مذہب میں مکروہ ہے ایسے ہی صحت نکاح کے لیے لونڈی کا مسلمان ہونا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک افضل ہے۔

مولانا اشرف علی فرماتے ہیں:

لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں دو قیدیں لگائیں ایک یہ کہ وہ ایسی عورت سے نکاح نہ کر سکے جس میں دو قیدیں ہوں ایک حریت دوسرے ایمان، دوسری قید یہ کہ وہ مسلمان لونڈی ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان قیدوں کی رعایت اولیٰ ہے اور اگر بلا رعایت ان قیود کے لونڈی سے نکاح کیا تو نکاح ہو جائے گا لیکن کراہت ہو گی اور امام شافعی نے ان دو قیدوں کو احترازی فرمایا ہے لیکن قید اوّل کی صفت ثانیہ کو احترازی کہا بس حرہ غیر مومنہ کے مستطیع کو بھی نکاح کنیز کی اجازت نہیں ہے۔

کنیزوں سے نکاح پر پابندی کیوں ؟

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام جب مساوات کا علمبردار ہے بلکہ ایک ہی صف میں

کھڑے ہوگئے محمود و ایاز کا نعرہ لگاتا ہے جیسا کہ یہاں بعضکم من بعض کہہ کر اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ انسان ہونے کے لحاظ سے ہر آدمی دوسرے آدمی کا ہم جنس ہے اور انسانی برادری کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ مقدم ہے۔ غلام اور کنیزیں آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسلِ انسانی کے افراد ہیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں تو کنیزوں سے نکاح پر یہ قدغن کیوں ہے کیا قرآن غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ذلیل حالت میں رکھنا چاہتا ہے۔

واقعی اسلام پہلا دین ہے جس نے دوسرے مظلوم طبقوں کے ساتھ غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت اور حسن سلوک کا سبق دیا ان کو انسانی حقوق عطا کیے۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی حصہ بنالیا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے اجر و ثواب کا کام قرار دیا۔ سورۃ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو گھاٹی بتایا گیا ہے ان میں ایک فک رقبۃ ، گردن سے غلامی کی رسی ہٹانا بھی ہے۔

اس آیت میں جو بات ارشاد ہوئی ہے کہ کنیزوں میں سے جو مسلمان ہوگئی ہیں ان سے نکاح کرسکتے ہو بشرطیکہ آزاد مسلمان عورت سے کرنے کی تم میں قدرت نہ ہو۔ اس قید لگانے میں جہاں تک میں سمجھا ہوں بنیادی اور اہم ترین حکمت یہ ہے کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ان کو آزاد کرکے اپنی زوجیت میں لیں اور کنیز کو کنیز نہ رہنے دیں۔ اسی لیے احادیث میں لونڈیوں کی تعلیم تادیب اور تربیت کے بعد نکاح کرنے کی ترغیب آئی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین شخصوں کو ڈبل اجر ملے گا ایک وہ شخص جو اہلِ کتاب ہیں سے اپنی نبی پر ایمان لایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، دوسرا وہ غلام جو اللہ کا اور اپنے آقا کا حق ادا کرے، تیسرا وہ شخص جس کے پاس ملک یمین والی کنیز ہو جس سے وہ ملک یمین کی بنا پر جنسی تعلقات رکھتا ہے پہلے اس کو خوب سلیقہ شعار بنائے اور خوب تعلیم دے پھر اس کو آزاد کرے پھر اس سے شادی کرے اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔ (متفق علیہ)

گویا کنیزوں پر نکاح کی پابندی اس لیے ہے کہ کنیز کو کنیز بنا کر شادی نہ ہو بلکہ مساوات قائم کرکے اس سے شادی کی جائے پابندی کا منشا یہ ہے کہ مسلمان ان کو آزاد کرکے ان سے شادی کریں۔ نبوت کا یہ منشا واضح ہوکر سامنے آجاتا ہے جب ہم کتبِ حدیث میں غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی ترغیب اور ان کی فضیلت دیکھتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے کے

ہر عضو کو آتشِ دوزخ سے بچائے گا۔ بعض روایتوں میں مسلم کی جگہ نسمہ یعنی کسی انسان آیا ہے[1]

ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ کو کوئی ایسا کام بتائیے جو مجھے جنت میں پہنچا دے فرمایا اعتق النسمۃ و فك الرقبۃ غلام کو آزاد اور گردن کو چھڑا، اعرابی نے دریافت کیا کہ کیا یہ دونوں ایک نہیں ہیں؟ فرمایا نہیں، عتق نسمہ یہ ہے کہ تم اکیلے غلام آزاد کرو اور فک رقبہ یہ ہے کہ تم بھی ان کی آزادی میں حصہ ڈالو۔[2]

صحابہ کرام اور غلاموں کی آزادی

اس ترغیب کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام بکثرت غلام آزاد کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے اپنی ایک قسم کے کفارے میں چالیس غلام آزاد کیے[3] آپ کے بھائی عبدالرحمان بن ابی بکر کا دفعۃً سوتے کی حالت میں انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ نے ان کی طرف سے یعنی ان کو ایصال ثواب کے لیے بہت سے غلام آزاد کیے۔[4]

صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ امیر یمانی نے سبل السلام شرح بلوغ المرام میں چند صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد نقل کی ہے۔

حضرت عائشہ ۶۷، حضرت عبداللہ بن عباس ۷۰، حضرت حکیم بن حزام ۱۰۰، حضرت عبداللہ بن عمر ۱۰۰۰، حضرت ذوالکلاع الحمیری ۸۰۰۰، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ۳۰۰۰۰۔[5]

حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد نہیں بتائی ہے مگر یہ لکھا ہے کہ انہوں نے بکثرت غلام آزاد کیے۔

آغازِ اسلام میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا ان میں ایک بڑی تعداد غلاموں کی تھی جو اپنے آقاؤں کے پنجہ ستم میں گرفتار تھے۔ ان کے قبولِ اسلام کے بعد ان کا ظلم اور بڑھ گیا۔ حضرت ابوبکر نے ایسے بہت سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا تھا۔ ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں حضرت بلال، حضرت عامر بن فہیرہ، لونڈیوں میں زنیرہ، نہدیہ بنت نہدیہ۔

امیر یمانی نے جو فہرست دی ہے وہ صرف ان صحابہ کی ہے جنہوں نے بکثرت غلام آزاد کیے تھے۔

---

[1] بخاری کتاب الرہن [2] بیہقی یہ حدیث طویل ہے ہم نے اس کا ٹکڑا نقل کیا ہے۔ [3] بخاری [4] مؤطا امام مالک
[5] سبل السلام شرح بلوغ المرام۔

صحابہ میں مشکل سے کوئی ایسا نکلے گا جس نے کچھ غلام آزاد نہ کیے ہوں۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

بہرحال منشأ قرآنی یہ ہے کہ کنیزوں سے ان کی غلامی کا داغ مٹا کر ان کو برابری کا درجہ دیا جائے اور پھر ان سے نکاح کیا جائے۔ غلام ہونے کی حالت میں ان سے شادی کرنے سے پرہیز کیا جاتے۔ اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں اور نہ یہ قرآن کا منشا ہے کہ باندیاں بلا نکاح رہیں یا حالت فجور میں رہیں۔ اس سے قرآن نے کھلے لفظوں میں منع کیا ہے۔

ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء

اپنی کنیزوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

اور ان کو نکاح سے روکنا زنا پر مجبور کرنا ہے۔ پھر صاف الفاظ میں حکم دیا ہے کہ

انکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم

تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی اور غلاموں میں سے جو نیک ہوں ان کے نکاح کر دو۔

بہرحال لونڈیوں سے نکاح پر پابندی اس لیے لگائی گئی کہ اس سے ان کی غلامی کو ختم کرنا مقصود ہے ان کی تذلیل کی زندگی کو قرآن دیکھنا نہیں چاہتا اور غلامی کی عمر دراز کرنا نہیں چاہتا۔ قرآن نے اول تو غلامی اسیران جنگ میں محدود کی اور وہ بھی اس طرح کہ کم سے کم اس کا امکان باقی رکھا۔ سورۂ محمد کی آیت فاما منا بعد واما فداء کے ذریعے اعلان کر دیا کہ اگر مصالح جنگ کے خلاف نہ ہو تو چاہیے کہ اسیران جنگ کو فدیہ لے کر یا احسان کر کے چھوڑ دو، دوسرے غلاموں کے حقوق کی رعایت پر اس قدر زور دیا اور ان کے لیے ایسے احکام و قوانین بنائے کہ غلامی غلامی نہیں رہی بلکہ سوسائٹی کا مساویانہ عنصر بن گئی۔ چنانچہ یہاں بھی کنیز سے نکاح پر پابندی میں بھی راز پوشیدہ ہے۔

قرآن کی نظر میں بندہ و آقا

۵۰ ۔ اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو تم سب کے ایمان کی اصلی کیفیت معلوم ہے تم کو تو ظاہر پر اکتفا کرنا چاہیے۔ بعض لونڈی کا ایمان اللہ کی نظر میں بعض آزاد عورت کے ایمان سے بہتر اور افضل ہو سکتا ہے تو اب حیثیت ایمانی سے لونڈی کے ساتھ نکاح کر لینے میں کوئی قباحت اور انکار نہ ہونا چاہیے اور آپس میں تم سب ایک ہو۔ ایک اصل سے پیدا ہوئے ہو، ایک دین میں شریک ہو پھر ان سے نکاح کو کیوں معیوب اور ننگ و عار سمجھتے ہو،

اس کلام سے لونڈیوں کے نکاح کی طرف توجہ دلانا اور ان سے نفرت کو دور کرنا مطلوب ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ عزّ و شرف کی اصلی بنیاد ایمان پر ہے ہوسکتا ہے کہ ایک عورت لونڈی ہوتے ہوئے ایمان کے اعتبار سے بڑے بڑے شریف زادوں اور شریف زادیوں پر فوقیت حاصل کرے۔ اس وجہ سے مجرد اس خیال کی بنا پر کہ ایک عورت لونڈی ہے۔ اس کے اندر شرف کے امکان کے اس پہلو کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ اور ایمان ایک ایسی چیز ہے جس کے ناپنے اور تولنے کا حقیقی پیمانہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور دوسرے اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے بعضکم من بعض میں اس طرف اشارہ ہے کہ لونڈی اور غلام ہونا تو ایک عارضی اور ہنگامی حالت ہے نسل کے اعتبار سے تو جتنے غلام اور باندیاں ہیں سب ایک ہی آدم کے اولاد ایک ہی حوا کی اولاد ہیں[2]

اس فقرے کے ذریعے قرآن نے یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے کہ انسان ہونے میں اور مسلمان ہونے میں سب ایک ہیں۔ مسلمانی اور انسانیت سب کا اشتراکی سرمایہ ہے لیکن دونوں میں فرق ہے ایک نمایاں اور سب کے سامنے ہے یعنی انسانیت اس کے بارے میں فرمایا بعضکم من بعض آزاد بحیثیت آزاد ہرگز اللہ کے یہاں مقرب اور مستحق نجات نہیں اور غلام بحیثیت غلام ہرگز غلام ہونے کی وجہ سے کسی اجر و ثواب سے محروم نہ رہے گا جیسا کہ یورپ میں ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ کالے کو کالے ہونے کی وجہ سے شہریت کے وہ حقوق نہیں ملتے جو گورے کو ملتے ہیں۔ دوسری چیز پوشیدہ ہے یعنی ایمان اس کے بارے میں فرمایا واللہ اعلم بایمانکم فقہائے نے اس سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ایمان اصل میں تصدیق قلبی کا نام ہے اور یہ بھی اسی آیت سے سمجھا ہے کہ ظاہر ایمان کو قبول کرلیا جائے گا۔ مفسرین قرآن نے آیتِ قرآنی کے منطوق، مدلول اور مفہوم سے جو کچھ سمجھا ہے وہ ایک علمی سرمایہ ہے آئیے آپ بھی لطف اندوز ہو لیجیے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

> اس فقرے کے لانے میں یہاں حکمت یہ ہے کہ اہل عرب میں انساب پر فخر کرنے کی بیماری عام تھی۔ یہ کہہ کر بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں انساب کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین باتیں جاہلیت کی ہیں نسب پر طعنہ، حسب پر فخر اور پچھتر کے ذریعے بارش۔ اور لوگ مسلمان ہو کر بھی اسے نہ چھوڑیں گے۔ اور اہل جاہلیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن۔

معمولی آدمی کے بیٹے کو کمین سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اہل ایمان کو اخلاقِ جاہلیت سے بچانے کے لیے فرمائی ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں؛

مقصد اس فقرے کا یہ ہے کہ اہلِ عرب میں یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ باندی کی اولاد کو جو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور اس پر باندی بچہ کی جو پھبتی کسی جاتی ہے جوازِ نکاح کے بعد یہ قطعاً بے معنے ہے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور اولادِ آدم ہونے کی حیثیت میں برابر ہو۔

قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ

یہ دونوں فقرے لوگوں کو باندیوں کے ساتھ شادی سے مانوس کرنے اور نفرت سے روکنے کے لیے لائے گئے ہیں۔

کنیزوں سے نکاح کی اور شرطیں

۵۱۔ پس تم ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے نکاح میں لے لو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ان کے حوالے کر دو بشرطیکہ وہ قیدِ نکاح میں رہنے والیاں ہوں، بدکار نہ ہوں اور چوری چھپے آشنا بنانے والی نہ ہوں یعنی تو اب مناسب ہے کہ حسبِ بیان بالا ان لونڈیوں سے نکاح کر لیا کرو۔ ان کے مالکوں سے اجازت لے کر اور قاعدہ و دستور کے موافق ان کا مہر دے دیا کرو جبکہ وہ خوشی سے قیدِ نکاح میں آئیں۔ مستی نکالنے والیاں نہ ہوں یعنی زنا نہ ہو کہ اس میں مہر لازم نہ ہو سکے گا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ زنا میں مہر لازم نہیں ہوتا اور نکاح کے لیے گواہوں کا ہونا لازم ہے۔[1]

اس فقرے میں نکاح کے لیے اور شرطیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ جن کنیزوں سے نکاح کرنا چاہتے ہو۔ ان کے سرپرستوں سے اجازت لے لو۔ دوم یہ کہ ان کے مہر کی ادائیگی کر دو۔ سوم یہ کہ ان کا مقصد ازدواجی زندگی میں رہنا ہو، چہارم یہ کہ علانیہ ہو اور گواہوں کی موجودگی میں ہو۔ چوری چھپے نہ ہو۔

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

سرپرستوں کی اجازت

نکاحِ کنیز کے صحیح ہونے کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ ان کے مالکوں اور سرپرستوں کی اجازت لی جائے خواہ کنیز مکاتبہ ہو مدبرہ ہو یا ام ولد۔ جو حکم کنیز کا ہے وہ ہی غلام کا ہے۔ پہلا امر اباحت کے لیے تھا اور یہ امر وجوب کے لیے ہے یعنی کنیزوں سے نکاح کرنا تو مباح ہے لیکن نکاح میں ان کے سرپرستوں سے اجازت لینا واجب ہے۔ اسی بنا پر الجصاص نے یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ کنیز سے نکاح کرنا اگرچہ واجب نہیں ہے لیکن اس سے نکاح کے جواز کی شرط یہ ہے کہ مالک کی اجازت ہو۔ اور اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جس کنیز سے نکاح کا ارادہ ہو وہ اپنی نہ ہو بلکہ اس سے دوسروں کے مالکانہ تعلقات ہوں۔ یہ دونوں مسئلے اُمت میں اتفاقی ہیں ایک یہ کہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی مملوکہ سے نکاح ناجائز ہے جیسا کہ الجصاص نے بتایا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی مملوکہ سے مملوکہ ہوتے ہوئے نکاح ناجائز ہے۔ اپنی مملوکہ سے نکاح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کو آزاد کرے۔ اہلِ تشیع میں سے طبری نے بھی مجمع البیان میں اسے اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کنیز سے نکاح کے لیے اس کے مولیٰ سے اجازت ضروری ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفسِ نکاح میں خود کنیزوں کی رضامندی معتبر نہ ہو گی۔ نکاح میں رضامندی ان کی ہی معتبر ہو گی۔ یہ کنیز کا حکم ہے اگرچہ اس حکم میں غلام بھی کنیز کے ساتھ ہے لیکن تھوڑا سا فرق ہے غلام نے اگر آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا تو نکاح تو ہو جائے گا مگر نکاح موقوف ہو گا۔ موقوف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مالک نے اجازت دے دی تو ہو جائے گا ورنہ نہیں۔ یہ امام اعظم، امام مالک، حسن بصری، عطا ابن ابی رباح، سعید بن المسیب، شریح قاضی اور عامر الشعبی کا مذہب ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ نکاح ہی منعقد نہ ہو گا۔

مہر دینا واجب ہے

اس آیت میں دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ جن کنیزوں سے تمہارا ازدواجی تعلق قائم ہو ان کو مہر کی ادائیگی واجب ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ مہر کس کو دیا جائے۔ باندی کو دیا جائے یا اس کے مالک کو دیا جائے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ مالک کو دیا جائے کیونکہ باندی اس کی مملوکہ ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ کنیز کو دیا جائے۔ ظاہر قرآن امام مالک کا ساتھ دے رہا ہے کیونکہ اتوھن اجورھن کی تعبیر کا ظاہری تقاضا بھی ہے۔ جمہور کی جانب سے علامہ تفتازانی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ

یہ انداز تعبیر مہر کا وجوب بتانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور یہ سمجھانا ہے کہ مہر کنیز کی آبرو کے لیے اجر ہے اور اس لحاظ سے ان کے سپرد ہونا چاہیے لیکن مولیٰ کو ملک یمین کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ باندی قبضہ کے لحاظ سے اسی غلام کی طرح ماذون ہے جیسے مالک تجارت کی اجازت دے دیتا ہے جیسے وہاں تجارت میں رقم پر غلام کا قبضہ ہوتا ہے اور مالک آقا ہوتا ہے ایسے ہی یہاں رقم پر قابض تو باندی ہے لیکن مالک آقا ہی ہے۔ اور الجصاص نے یہ جدت کی ہے کہ یہاں پہلا باذن اھلھن محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ نکاح بھی ان کے مالکوں کی اجازت سے کرو اور رقم بھی ان کو ان کے مالکوں کی اجازت سے دو! اور آیت میں معروف یہ ہے کہ مہر کے دینے میں ٹال مٹول نہ ہو اور دستور و رواج کے مطابق ہو اور قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مالکوں کی اجازت سے ان کو دینے کا دستور ہو تو اس کی پیروی کی جائے۔

نکاح کا مقصد عفت ہے

اصل ارشاد میں محصنات آیا ہے۔ شارحین قرآن نے اسے پاکبازی و عفت کے معنے میں لیا ہے۔ اس کا مصدر احصان ہے جو حصن سے بنا ہے جس کے معنے قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں۔ اس سے حصان، احصان، محصن اور محصن الفاظ بنائے گئے۔ حصان قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے۔ حسان بن ثابت حضرت عائشہ کی شان میں کہتے ہیں؛

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ　　وَتُصْبِحُ غَرْثَى مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

اس کے معنے پاکدامن عورت کے ہیں۔ دوسرے کے معنے حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں۔ یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے دو بار حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں ماضی معروف کے صیغے کے ہیں، تیسری جگہ اس کا اسم فاعل محصن (حفاظت میں لینے والا) اور اسم مفعول محصنۃ (حفاظت میں لی گئی) یہاں آیا ہے۔ محصنات غیر مسافحات یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا وضع کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ صرف لطف اندوزی کا ارادہ ہو اور بس۔ اس فقرے کے ذریعے کھلے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ شادی سے عورتوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ عفت و عصمت کی زندگی گزاریں گی، اخلاق و کردار بلند رکھیں گی۔ اور اپنے داعیات فطرت کو اپنے شوہر کے ذریعے پورا کریں گی۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شادی کرتے وقت اوّل نظر عورت کی پاکدامنی اور عفت و عصمت پر ہی ہونی ضروری ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا کہ شادی کے ذریعے گوہر عصمت محفوظ رکھا جائے۔ بہر حال نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عفت و عصمت اور ناموس کو

آبرو کی انمول دولت جو انسان کو بخشی گئی ہے اس دولت کی حفاظت کا ضامن ازدواج کا بھی آئینی طریقہ ہے جسے ہم نکاح کہتے ہیں۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ متعہ عفت و عصمت کا ضامن نہیں ہے اور جو متوعہ ہے وہ عفت و عصمت والی ہرگز نہیں ہے کیونکہ وہ محفوظ نہیں ہے۔

نکاح کے لیے گواہوں کی شرط

نکاح کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ علانیہ ہو خفیہ اور چوری چھپے نہ ہو۔ اصل ارشاد میں ولا متخذات اخدان آیا ہے۔ اتخاذ کے معنے بنانا ہیں اور اخدان جمع خدن کی ہے، اس کے معنے چھپے یار اور آشنا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے باقاعدہ نکاح کے ذریعے جنسی تعلقات ہوں، آشنائی اور یاری کی راہ سے نہ ہو۔ اس کے مدلول میں یہ بھی داخل ہو کہ نکاح کا اعلان ہو اور اعلان کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ نکاح دو آدمیوں کو گواہ بنا کر ہو۔ نکاح میں گواہی کی شرط ہونے کی مصلحت ظاہر ہے۔ اگر نکاح میں گواہی شرط نہ ہوتی تو نکاح اور سفاح میں کوئی فرق نہ ہوتا اور جن خرابیوں کی وجہ سے شریعت نے زنا کو حرام کیا ہے وہ بدستور باقی رہتی۔ زنا کی تحریم بے سود ہو جاتی۔ نیز نکاح کی عظمت اور شان ظاہر نہ ہوتی۔

نکاح کی گواہی میں دس باتیں ضروری ہیں:

۱۔ دو گواہ ہوں ایک گواہ کے سامنے اگر ایجاب و قبول ہو گا تو نکاح نہ ہو گا۔
۲۔ دونوں گواہ مرد ہوں یا ایک مرد ہو اور دو عورتیں ہوں۔
۳۔ دونوں گواہ آزاد ہوں، غلام کی گواہی کافی نہیں ہے۔
۴۔ دونوں گواہ عاقل ہوں مجنوں اور بیہوش نہ ہوں۔
۵۔ دونوں گواہ بالغ ہوں نابالغ بچوں کی گواہی کافی نہ ہو گی۔
۶۔ دونوں گواہ مسلمان ہوں، کافروں کی گواہی کافی نہیں۔
۷۔ دونوں گواہ ایسے ہوں کہ ان کو عدالت میں پیش کر سکیں۔
۸۔ دونوں گواہ ایک ساتھ طرفین کے ایجاب و قبول سنیں۔
۹۔ دونوں گواہ ایجاب و قبول کے الفاظ سن کر یہ سمجھ لیں کہ نکاح ہو رہا ہے،
۱۰۔ دونوں گواہ زوجین سے واقف کر دیئے جائیں۔

بہر حال آیت کے مدلول سے نکاح کے لیے گواہوں کی شرط معلوم ہو رہی ہے ورنہ آیت کا منطوق تو یہ ہے کہ اگر آزاد مومن عورت سے نکاح کرنے کے لیے تمہارے معاشی احوال و ظروف تمہارا ساتھ

نزدیں تو معاشرے میں کسی کی کنیز سے نکاح کر لو بشرطیکہ وہ مومنہ ہو۔ ان کے مالکوں سے اجازت لے لی جائے۔ ان کے مہر کی ادائیگی کر دی جائے۔ ان کا مقصد قیدِ نکاح میں رہنا ہو، بدکاری کرنا اور چوری چھپے یاری دوستی کرنا مقصد نہ ہو۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ اگر قرآن کے نزدیک متعہ کی صورت میں جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی صورت جائز ہوتی تو قرآن آزاد عورت سے نکاح نہ کر سکنے کی صورت میں کنیز سے نکاح کرنے کی متبادل صورت ہرگز تجویز نہ کرتا۔ کیونکہ جب متعہ کی اجازت موجود ہے اور اس کا حصول بھی آسان ہے تو پھر کنیز سے نکاح میں کیوں دلچسپی لی جائے۔ علامہ آلوسی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ اس آیت میں آزاد عورت سے نکاح کی صورت میں باندیوں سے نکاح کی متبادل تجویز اعلان کر رہی ہے کہ اگر از روئے قرآن متعہ کی گنجائش ہوتی تو قرآن یہ اندازِ تعبیر ہرگز اختیار نہ کرتا و من لم یستطع یہ بات بلاغتِ قرآنی کے خلاف ہے کیونکہ متعہ کے جائز ہونے کی صورت میں عدم استطاعت کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔ شاہ عبدالعزیز نے یہ بات بالکل برموقع فرمائی ہے کہ:

> اگر متعہ را در کلام سابق تحلیل مے نمودند پس چرا می گفتند ومن لم یستطع

یعنی اگر بقول شیعہ فما استمتعتم سے جوازِ متعہ کا پروانہ مل جاتا تو یہ کیوں فرمایا جاتا کہ و من لم یستطع کیونکہ یہ کھلی بات ہے کہ جنسی تعلقات کے لیے اس کے سامنے متعہ کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ کنیزوں سے نکاح پر یہ پابندیاں بتا رہی ہیں کہ اسلام میں متعہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ یہ اسلام کے مذاقِ عفت کے مناسب ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

> محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حق لے کر مبعوث ہوئے تو آپ نے جاہلیت کے کل نکاحوں کی بنیاد ڈھا ڈالی سوائے اس نکاح کے جو آج کل رائج ہے۔
>
> (بخاری کتاب النکاح)

غلاموں کے لیے سزا

۵۲۔ پھر اگر قیدِ نکاح میں آجانے کے باوجود وہ بدچلنی کے مرتکب ہوں تو ان کے لیے اس سزا سے آدھی ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے۔ یعنی جو آزاد مرد یا عورت نکاح سے فائدہ اٹھا چکے یعنی مجامعت کی نوبت آچکی ہو اور پھر وہ زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا اور اگر نکاح نہیں ہوا بلکہ نکاح سے پہلے ہی زنا کیا تو اس کے لیے سو کوڑوں کا حکم ہے اور لونڈی اور غلام کے لیے قبل نکاح اور بعد نکاح ہر حالت میں صرف پچاس کوڑے ہیں زیادہ نہیں۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس فقرے میں لفظ فاحشہ جرم بے حیائی زناکاری کے معنے میں آیا ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کردی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے۔ یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہوجاتی فاحشہ ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر فرمادی ہیں۔ اب جو ان حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ فاحشہ کا مرتکب ہے اسی لیے قرآن نے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا ہے ولا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشۃ آیت میں عذاب سے مراد زنا کی سزا ہے اذا احصن میں احصان قید نکاح میں آنے کے معنے میں ہے یعنی لونڈیاں قید نکاح میں آکر اگر بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا یہ ہے۔ محصنات احصان سے اسم مفعول ہے اور محصنۃ کی جمع ہے اس کے معنے یہاں شریف اور آزاد بیویوں کے ہیں۔ قرطبی۔ ابن قتیبہ، بغوی، آلوسی اور دوسرے شارحین قرآن نے اس کی مراد الحرائر الابکار بن بیاہی شریف عورتیں بتائی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ باندی زناکاری کا بیاہی ہوکر ارتکاب کرے تو شریف کنواری عورت کی سزا سے آدھی سزا ہے۔ شریف کنواری عورت کی سزا قرآن میں سو درے بتائے گئے ہیں تو باندی شادی شدہ کی سزا پچاس درے ہے۔ یعنی آیت میں باندی شادی شدہ کا آزاد کنواری سے مقابلہ ہے آزاد شادی شدہ کی سزا سنگساری ہے اور اس کی تنصیف ممکن نہیں اس لیے باندی کی سزا بھی یہی بتائی ہے یعنی پچاس درے۔ اس آیت سے چند مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

اول یہ کہ کنیز شادی شدہ ہو اس کو پچاس دروں کی سزا دی جائے گی یہ تو آیت خود بتا رہی ہے لیکن یہ آیت اس میں خاموش ہے کہ اگر کنیز غیر شادی شدہ ہو تو اس کو بھی سزا دی جائے گی یا نہیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر، الحسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن دوسرے کبار ائمہ کہتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو بھی یہی سزا ملے گی۔ وہ فرماتے ہیں کہ شادی شدہ کو قرآن سے اور غیر شادی کے لیے سنت سے سزا ثابت ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ شادی شدہ کی سزا قرآن سے اور غیر شادی شدہ کی حدیث سے معلوم ہوئی ہے۔ آلوسی اور قرطبی نے یہی تاثر ظاہر کیا ہے قرطبی فرماتے ہیں باندی کو شادی شدہ ہونے کی صورت میں سزا قرآن سے اور غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں حدیث سے دی جائے گی۔ اور آلوسی لکھتے ہیں فالمزوجۃ محدودۃ بالقرآن وغیرھا بالسنۃ، نسائی میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کنیز شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اس کو بدکاری پر سزا دو۔

صحیحین میں بھی زید بن خالد الجہنی کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی سے

ملتا جلتا ارشاد ہے۔

دوسرے یہ کہ غلاموں کی بدکاری کی سزا کا اس میں ذکر نہیں ہے مگر اس آیت کے مدلول سے علماء نے یہ سمجھا ہے کہ غلاموں کو بھی سزا دی جائے گی۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ غلام کی سزا مرد ہو یا عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ صرف پچاس درّے ہے۔ یہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے باندی کی سزا اس آیت کے منطوق سے اور غلام کی سزا اس کے مدلول سے معلوم ہو رہی ہے۔

تیسرے یہ کہ اس آیت میں لفظ محصنات لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور لونڈیوں کے لیے لفظ محصنات شادی شدہ عورتوں کے معنے میں آیا ہے اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ جب ان کو نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے۔ گویا احصن میں احصان کے معنے شوہروں کی حفاظت میں آنا ہیں اور محصنات میں احصان کے معنے خاندان کی حفاظت میں آنا ہیں۔ اس فرق پر غور کرنے سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر ہی محصنہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے کہ لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری، کیونکہ وہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی وہ ملک میں ہے اور نہ اسے معاشرے میں وہ مرتبہ حاصل ہے جو خاندانی عورت کو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہو گی نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں سے۔ نیز یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ سورۃ کی دوسری آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈیوں کی سزا نصف بتائی گئی ہے۔ رہی شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ آزاد عورتوں سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوسری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے رجم کی سزا کی تصریح نہیں کرتا ہے لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن لوگوں کے ذہن سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے لیکن نبوت کے ذہن سے مخفی نہیں رہ سکتا [1]

[1] تفہیم القرآن۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ جیسے کہ لونڈیوں کے لیے مہر اور احصان کی وہی شرطیں مقرر ہوئیں جو آزاد عورتوں کے لیے تھیں تاکہ سوسائٹی کے اندر ان کا معیار اونچا ہو ایسے ہی ارتکاب زنا کی صورت میں ان کے لیے بھی سزا مقرر ہوئی تاکہ بالتدریج ان کا اخلاقی معیار سوسائٹی کے معیار پر آجائے۔ اور پھر دوسرے مالکوں کی لونڈیوں کے ساتھ مسلمانوں کو نکاح کی اجازت بھی اسی پس منظر میں دی گئی ہے کہ اس سے لونڈیوں کا معاشرتی معیار بلند ہو لے

باندیوں سے نکاح میں محتاط رہو

۵۳۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کو اندیشہ ہے کہ شادی نہ کرنے سے برائی میں مبتلا ہو جائیں گے اور صبر کر لینا تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ بڑا ہی بخشنہار اور رحم کار ہے۔ یعنی لونڈیوں سے نکاح کرنے کا ارشاد اور استحسان اسی کے حق میں ہے جو کوئی شخص تم میں ڈرتا ہو مشقت یعنی زنا میں مبتلا ہونے سے اور اگر صبر کرو اور باندیوں سے نکاح نہ کرو تو بہت اچھا ہے تمہارے حق میں کیونکہ اولاد آزاد ہو گی جس کو صبر و تحمل میں کھٹکا ہو تو اس کو بہتر ہے کہ ایسی حالت میں کسی کی لونڈی سے نکاح کرے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے صبر کرنے والوں پر۲ علامہ بغوی، علامہ نسفی اور علامہ آلوسی نے ذالک کا مشار الیہ باندی سے نکاح بتایا ہے۔

عنت کی لغوی تحقیق

عنت کے معنے علامہ ابن الاثیر نے حسب ذیل لکھے ہیں مشقت۔ فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا، زنا، اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں جور، اذیت کا اور اضافہ کیا ہے۔ یہ عَنِتَ یَعنَتُ کا مصدر ہے۔ امام ابوجعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں۔ عنت کے معنے گنہگار ہونا، کسی ایسے کام میں پڑ جانا کہ جس سے نکل نہ سکے، کسی چیز سے ہڈی ٹوٹ جانا ارشاد باری العنت منکم میں عنت سے مراد زنا اور بدکاری ہے اور یہ مادہ مشقت کے معنے پر دلالت کرتا ہے، اور علامہ ابو السعود ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں ارقام فرماتے ہیں۔ عنت اصل میں ہڈی کے جڑ جانے کے بعد ٹوٹ جانے جانے کو کہتے ہیں لیکن بعد میں ہر اس مشقت کو اور ضرر کو بطور استعارہ کہنے لگے جو حالت سنور جانے

---

[1] تدبر قرآن [2] افادات شیخ الاسلام

کے بعد انسان کو لاحق ہو اور علامہ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ عنت سے مراد زنا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، ضحاک، عطیہ عوفی اور عبدالرحمان بن زید نے بھی بیان کیا ہے۔ عنت کے معنے اصل میں مشقت کے ہیں اور زنا کو بھی عنت اسی مشقت کی بنا پر پڑا ہے کہ جو دُنیا و آخرت میں زانی کو اس فعل کے نتیجہ میں اٹھانی پڑتی ہے۔ مبرد کا بیان ہے کہ اصل میں عنت یہ ہے کہ عشق اور شہوت آدمی کو زنا پر مجبور کرے اور پھر آخرت میں اس کی سزا پاتے اور دُنیا میں اس پر حد لگائی جاتے۔ ابو عبیدہ اور زجاج نے عنت کے معنے ہلاکت کے کیے ہیں اور کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ حد کیا ہے اور کچھ نے ایسا گناہ جو غلبہ شہوت کی بنا پر ہو۔ اور امام ابوبکر عزیزی سجستانی نے نزہتہ القلوب میں بسند متصل مبرد سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک عنت کے معنے طاقت سے زیادہ تکلیف اٹھانے کے ہیں۔ اور امام ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں اختلاف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ صحیح قول اس بارے میں یہ ہے کہ ارشاد باری ذالک لمن خشی العنت میں عنت سے مراد دینی اور بدنی ضرر ہے کیونکہ عنت کہتے ہیں اس چیز کو جو انسان کو ضرر پہنچائے۔ چنانچہ عنت فلاں کا استعمال ایسے کام کے لیے ہوتا ہے جو دین یا دُنیا میں ضرر رساں ہو۔ اسی معنے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ودوا ما عنتم بعض نے عنت کے معنے ہلاکت بتائے ہیں۔ بہر حال جو لوگ اس کی تاویل میں زنا کے معنے لیتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ زنا ایک دینی ضرر ہے جو عنت میں داخل ہے اور جو لوگ اس کی توجیہ میں گناہ کا ترجمہ کرتے ہیں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ گناہ سب کے سب چونکہ دین کے لیے ضرر ہیں اس لیے عنت ہیں۔ اور جو اس کی تشریح میں عقوبت کے معنے بیان کرتے ہیں یعنی وہ شرعی حد کہ جو بدن کو ضرر پہنچاتی ہے وہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ حد محدود کے بدن کے لیے ضرر رساں ہے اس لیے وہ عنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو لمن خشی العنت منکم فرمایا ہے اس میں عنت سب معانی کو عام ہے اور یہ سب معانی زنا میں موجود ہیں۔ کیونکہ زانی کو دُنیا میں سزا اس کی وجہ سے ایسی شدید ملتی ہے جو اس کے بدن کے لیے سخت ضرر رساں ہے اور پھر دین و دُنیا میں اس کا گناہ اور مضرت علیحدہ۔ نیز تمام مفسرین کا جو تفسیر کے اہل ہیں اس پر اتفاق ہے کہ یہاں عنت کے معنے زنا ہی کے ہیں۔ اس لیے کہ زنا کو ذاتی طور پر لذت اور تقاضائے شہوت ہے لیکن چونکہ وہ عنت کا سبب ہے لہٰذا اس کے ارتکاب کو عنت کی طرف منسوب اور اس سے موصوف قرار دیا گیا[1]

---

[1] لغات القرآن

اردو شارحین قرآن میں سے شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، حضرت شیخ الہند نے مشقت اور تکلیف کے معنے کیے ہیں۔ مولانا اشرف علی اور مفتی شفیع نے زنا کے معنے بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے نقصان اور برائی کے اور مولانا مودودی نے بند تقویٰ ٹوٹ جانے کے معنے بتاتے ہیں۔ معنے خواہ کچھ ہوں آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ باندیوں سے نکاح کی اجازت صرف ان کے لیے ہے جن کو یہ اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں ان سے زنا کا ارتکاب ہو جائے گا۔ اگر خواہش نفس کا اتنا غلبہ نہیں ہے جس سے حرامکاری میں پڑنے کا فوری اندیشہ ہو رہا ہو تو پھر کنیزوں سے نکاح کرنے کے مقابلے میں بہتر یہی ہے کہ خود خواہش نفس پر قابو حاصل کر لیا جائے۔

اسلام میں متعہ کی گنجائش نہیں ہے

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر قرآن کے نقطہ نظر سے متعہ روا ہوتا اور نبوت نے اس کی اجازت دی ہوتی تو قرآن کو نکاح پر اس قدر پابندیاں عائد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب آپ کے پاس قضائے شہوت کا یہ آسان ذریعہ موجود ہے تو پھر اندیشہ گناہ کا خطرہ ہی بے معنے ہے۔ دراصل متعہ کا جواز قرآن کی روح سے تصادم ہے۔ بات نامکمل رہ جائے گی اگر ہم اس کے مقاصد کو نظرانداز کر دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر اب تک سوائے اہل تشیع کے کسی مذہب سماوی میں متعہ کا جواز نہیں ملتا یعنی یہ کہ مرد و عورت کے جنسی روابط ایک سال ایک ماہ ایک ہفتہ ایک دن ایک گھنٹے کے لیے معاوضہ دے کر قائم کیے جائیں۔ اگر یہ متعہ جائز ہو اور اس کی اجازت ہو جائے تو

اولاً نسب مختلط اور مشتبہ ہو کر رہ جائے آدمی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکے گا کہ ممتوعہ کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ کس کا ہے؟

ثانیاً، ممتوعہ پر دسترس شرعی قانون میں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی کے ساتھ باضابطہ اس کا نکاح نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ممتوعہ عورت کے گاہک بہت زیادہ ہوں گے اور اس پر قبضہ کرنے کی ہر شخص کوشش کرے گا اور وجہ ترجیح کسی کو حاصل نہ ہو گی اور پھر اس راہ سے تباہیوں اور بربادیوں کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں، معاشقہ اور آوارگی کی تاریخوں میں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ثالثاً، متعہ والی عورت کو متعہ کی لت پڑ جاتی ہے طبع سلیم رکھنے والے مرد کو ایسی عورت سے گھن معلوم ہوتی ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی سلیم الطبع اس سے شادی تک کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ محبت و الفت دور کی بات ہے۔

رابطہ متعہ کا دروازہ جب کھل جاتا ہے تو کوئی مستقل قاعدہ اور قانون نہیں رہتا تو پھر کسی خاص مرد کو خاص عورت سے لگاؤ نہ رہے گا جس کو جہاں موقعہ مل گیا نام اور اُجرت مقرر کرنے کے بعد جو کچھ کرنا ہو گا کر گزریں گے۔ یہی حال زنا کا ہے پھر عفت اور پاکدامنی کا تصور کیا ہو گا۔

خاصاً، عورت سے صرف یہی مقصد نہیں کہ اس سے جنسی تقاضا پورا کیا جائے بلکہ مقصد یہ بھی ہے کہ دو جان مل کر ایک دوسرے کے رفیق ہوں۔ گھر کے کاموں میں بھی، کھانے پینے میں بھی، بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی اور زندگی کی دوسری ضروریات میں بھی، پھر غم میں بھی خوشی میں بھی۔ اور یہ ساری باتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عورت کسی ایک کی جائز طریقہ پر ہو کر نہ رہے۔ متعہ میں یہ چیز ناپید ہے وہ ہے ہی مستاجرہ یعنی کرائے پر وقتی طور پر لائی ہوتی۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوٰتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے دین کے قوانین و احکام بیان کرے اور — چاہتا ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے طریقوں پر چلا دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور — اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے اور اللہ تمہاری مصلحتوں کو خوب جاننے والا اور اپنے تمام احکام میں حکمت و دانائی والا ہے[54] - اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تم پر رحمت کے ساتھ لوٹ آئے اور وہ لوگ جو نفسانی خواہشوں کے پیروکار ہیں چاہتے ہیں کہ تم راہِ حق سے دُور ہٹ جاؤ[55] - اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تمہارے لیے نرمی و آسانی ہو[56] - اور

واقعہ یہ ہے کہ انسان کمزور بنایا گیا ہے۔ ۵۸

نزولِ شرائع کا مقصد

ان آیات میں اسلامی قانون کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے گویا یہ آیات مالیاتی اور معاشرتی احکام بیان کرنے کے بعد اٹھے ہوئے سوالات کا جواب ہیں۔ سوال ہوا تھا کہ ان احکام و ضوابط کا فائدہ اور ان کی حکمت کیا ہے؟ ہمارے پیشرو بھی اس قسم کے قوانین و ضوابط کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اور جو کچھ آج ہم سے کہا جا رہا ہے اس کی ماضی کے مقابلے میں حیثیت کیا ہے؟ یہ تشدید ہے یا تخفیف۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ تمام احکام و قوانین جو تمہارے لیے بیان ہو رہے ہیں تو ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ فلاح و سعادت کی جو راہ تم سے پہلے سب نیک انسانوں پر کھولی گئی ہے وہ تم پر کھل جائے اور اس طرح ایک ایسا مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظامِ تہذیب تم کو عطا کر دیا جائے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ان آیات میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی کہ اسلامی احکام و قوانین کا بنیادی مقصد افراد کی تکمیلِ ذات اور انسان کی اجتماعی خودی کی نشو و نما ہے۔ فرد کی تکمیلِ ذات اور اجتماعی سیرت کی تشکیل و تعمیر ایک ایسا مقصد ہے جس سے سیاسی ترقی اور معاشی فارغ البالی کا مقصد خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی شخصیت کا نشو و نما زندگی کی ایک ایسی حالت پر موقوف ہے۔ جس میں افراد کی حقیقی اور لابدی ضروریات پوری ہوں اور پھر چونکہ اسلامی قوانین کا مقصد انسان کی تکمیلِ ذات اور اس کی اجتماعی خودی کا نشو و نما ہے۔ اس لیے وہ مادی زندگی کی ضروریات سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے فرائض میں سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ مملکت کی معاشی تنظیم کرے۔ اسی طرف بعد کی آیت میں اشارہ ہے۔ اس طرح اسلامی قانون خارجی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ انسان کی حیاتِ خارجی ہو یا اس کی باطنی زندگی دونوں کی بیک وقت اصلاح چاہتا ہے۔ کیونکہ خارج و باطن دونوں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں کہ دوسرے کی بھی اصلاح کی جائے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو درست نہیں کیا جا سکتا جب تک خود انسان کا نفس بھلائی کی طرف مائل نہ ہو جائے

اور اگر انسان کا نفس خود خواہشوں کا پرستار ہو کر رہ جائے جیسا کہ و یرید الذین یتبعون الشہوات سے اشارا ہو رہا ہے تو تمدن کی تمام اصلاحی کوششیں، معاشرتی زندگی کو درست کرنے کی ترکیبیں اور سیاسی نظام کا تغیر و تبدل بیکار محض ہے۔ جب تک کہ افراد میں بھلائی کی طرف میلان نہ ہو تمدنی زندگی امن و مسرت سے ناآشنا رہے گی۔ قرآن نے لیبیّن لکم ۔ کا مفعول حذف کر کے اس طرف اشارا کیا ہے۔ الجصاص نے ٹھیک لکھا ہے کہ وہ تمام احکام اللہ سبحانہ، ہمارے لیے بیان کرتا ہے جن کی معرفت کے ہم محتاج ہیں الفاظ یہ ہیں مَابِنَا الحَاجَۃ الی مَعرِفَتِہ ۔

۵۴۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے دین کے قوانین و احکام بیان کرے اور چاہتا ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے طریقوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت کے ساتھ توجہ فرماتے اور اللہ تمہاری مصلحتوں کو خوب جاننے والا اور اپنے تمام احکام میں حکمت والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے ارشاد سے مطلوب یہی ہے کہ تم کو حلال اور حرام کا علم ہو جاتے اور تم کو پہلے انبیاء کا راستہ نصیب ہو جیسے حضرت ابراہیم وغیرہ اور مغفرت کیسے تمہاری اور اللہ کو تمہارے مصالح اور تمام حالات کا پورا علم ہے اور اس کے ہر حکم، ہر تدبیر میں حکمت ہے تو اب اگر اس کے حکم کی اطاعت نہ کرو گے تو ہدایت سے محروم رہو گے اور پہلوں کے بھی مخالف اور اللہ کی رحمت و مغفرت سے بھی محروم رہو گے۔ پہلے سے زنا اور لواطت کی حرمت اور ان سے توبہ کرنا اور عورتوں کے متعلق بعضے احکام اور جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کا ذکر اور نکاح کے متعلق مہر وغیرہ قیود و شرائط کا تذکرہ اور بدکاری سے ممانعت اور اس پر سزا کا ذکر تھا اور بچند وجوہ لوگوں کو ان کی طاعت دشوار تھی۔ اس لیے اس آیت میں اور آئندہ کی دو آیتوں میں ان احکام کی پابندی کو خوب موکد اور مستحکم کر کے مخالفت سے روک دیا[1]

سُورت کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں اس سورت کے نزول سے پہلے سورہ بقرہ میں تمدن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں ان سب کی طرف بحیثیت مجموعی اشارا کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدن کے وہ قوانین ہیں جو اللہ سبحانہ، تمہارے سامنے بیان کر رہا ہے اور یہ قوانین بقول الجصاص ہماری ان ضرورتوں سے متعلق ہیں جن کی معرفت کے ہم محتاج ہیں اور یہ بیان دو طرح سے ہے منطوق کی راہ سے اور مدلول کے ذریعے اور یہ وہ قوانین ہیں جن پر قدیم زمانہ سے ہر دور کے انبیاء اور ان کے پیرو کار عمل کرتے چلے آئے ہیں اور یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ تم کو ہدایت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقہ زندگی کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔ لے

نجاتِ عالم کے لیے اُمت کا انتخاب

گویا سمجھایا گیا ہے اور لکھ تمہارے لیے پر زور دے کر بتایا گیا ہے کہ تم دُنیا میں اس لیے روانہ کیے گئے ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے لیے اپنی آیتیں اور اپنے احکام و ہدایات بیان فرمائے اور انبیاء سابقین کے ذریعے ایمان و عمل کی جو راہیں دُنیا کے لیے کھولی گئی تھیں ان کی تمہیں ہدایت بخشے تاکہ تم اس سے وفاداری ظاہر کرو اور اللہ تم پر مہربان ہو۔ اس بات کو قرآن نے اللہ کے ارادے اور فیصلہ سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ آخری نبوت کے ذریعے ایک ایسی اُمت کو وجود میں لانا مقصود ہے جو دُنیا میں نبوت کی نیابت کر سکے اور پورے دین کی حامل اور تمام انبیاء کی وارث ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اللہ سبحانہٗ نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی کامل شریعت عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنائے۔ اس بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر عالمی دعوت کا علمبردار ہو کر آتا ہے وہ علاوہ ان اُصول کے جو دوسرے انبیاء لے کر آئے کچھ نئے اُصول اختیار کرتا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں :

> وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دُنیا میں پھیلاتا ہے اور ان کو ذریعہ بنا کر محنت کرتا ہے قرآن کی اس آیت کنتم خیر اُمۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

دُنیا کی تمام قوموں میں اس پیغمبرانہ کام کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ ایران تین ہزار سال ناز و نعم میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جوتی زمین کی طرح نشو و نما کے مادے سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا۔

لے تفہیم

مشیت ایزدی نے اسی کو نا کا اور یرید اللہ لیبین لکم کا تاج ان کے سر پر رکھا اور فلاح و سعادت کی وہ راہ جس پر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین چل چکے تھے وہ ان پر کھول دی و یھدیکم سنن الذین من قبلکم اور بالآخر ان کی اس دعا کو شرف قبول عطا فرمایا جسے وہ تڑپ کر مکی زندگی کی پُرآشوب نمازوں میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے تھے اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین اور اس راہ پر تمہیں چلا کر اللہ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت تمہارے لیے عام کر دے اور زمانہ جاہلیت میں تم سے جو معاشرتی، معاشی، سیاسی اور فکری کوتاہیاں تم سے ہو چکیں علم صحیح اور عمل حسن کے ذریعے تمہاری توبہ قبول کرے و یتوب علیکم، اور اللہ دنیا کی ساری قوموں کو خوب جاننے والا اور اپنے فیصلوں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

ہدایت عالم کے کام کے لیے اللہ کا فیصلہ

۵۵- اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تم پر رحمت کے ساتھ لوٹ آئے اور وہ لوگ جو نفسانی خواہشوں کے پیرو کار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ حق سے دُور ہٹ جاؤ۔ یعنی یہ مختلف قیدیں جو اوپر گزریں اس سے مطلوب تم پر رحمت فرمانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان قیدوں کی نسبت حکم فرمایا۔ اور جو لوگ اپنی شہوتوں پر فریفتہ ہیں وہ البتہ یہی چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستہ سے دُور جا پڑو یعنی انہی کی طرح تم بھی اپنی شہوت کا اتباع کرو اور گمراہ ہو جاؤ تو اب جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو[1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ تم سے عالم کی ہدایت کا کام لینا چاہتا ہے دوسری یہ کہ اس کام میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ طبقات ہیں جو احکام حق کی جگہ نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ اللہ سبحانہ کا یہ ارادہ کیسے ظہور میں آیا اور واللہ یرید ان یتوب علیکم نے وجود کا لبادہ کیسے پہنا۔ نبوت کی محکم پیغمبرانہ تعلیم اور قرآن حکیم کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی صورت میں پڑے ہوئے تھے جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی اور جن کو جہالت کفر نے برباد کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اس میں اللہ کی مدد سے ایمان و عقیدہ پیدا فرمایا۔ زندگی کی نئی رُوح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں ابھار دیں اور اندرونی استعدادیں اجاگر کر دیں۔ آپ کی تربیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے انہیں کندن بنا دیا تھا لکم اور علیکم سے جن کو مخاطب کیا جا رہا ہے اور جن کے لیے اللہ نے رحمت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ انسانیت کی پوری تاریخ میں بہترین انسانی معاشرہ ثابت ہوا جو دلکش، کامل اور تمام انسانی محاسن سے آراستہ تھا۔ اس معاشرے کا تعارف اس آیت کا یہ ایک ٹکڑا کرا رہا ہے۔ واللہ یرید ان یتوب علیکم یہ فقرہ اگرچہ بے حد مختصر مگر بہت زیادہ بلاغت والا، ہمہ گیر، معنی خیز اور وسیع امکانات رکھنے والا ہے۔ جب اس معاشرے کا کسی اور معاشرے سے مقابلہ کیا جائے گا، تو بحیثیتِ مجموعی اور انفرادی اس کا پلہ بھاری نکلے گا۔ اس فقرے میں اس کے عظیم کام اور اس کے بلند مقام کو بتایا جا رہا ہے۔

راستہ کی مشکلات

دوسرے فقرے میں اس راہ کی مشکلات کو بتایا ہے۔ ارشاد ہے ویرید الذین یتبعون الشہوات ان تمیلوا میلاً عظیما، جو لوگ احکامِ حق کی جگہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ اعتدال سے ہٹ کر دور جا پڑو۔ یہ نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑنے والے کون ہیں اور یہ نفسانی خواہشیں کیا ہیں؟ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں "شہوت پرست لوگوں سے بقول ابن زید مراد فساق ہیں اور بقول ابن عباس مراد زانی اور بقول سدی مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور بقول بعض صرف یہودی ہیں[1] قرطبی نے عموم کی وجہ سے ابنِ زید کی رائے کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور آلوسی نے بھی اسے اپنایا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہدایتِ عالم کا جو کام اللہ نے تمہارے سپرد کیا ہے اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ لوگ ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ تم اس کام سے ہٹ جاؤ۔ یہ لوگ یہودی ہوں یا عیسائی، فساق ہوں یا مجوسی ان کی اخلاقی حالت اتنی پست ہو چکی تھی کہ ان میں معاشرتی زندگی میں محرمات کا بھی امتیاز نہ رہا تھا۔ باپ کا بیٹی سے اور بھائی کا بہن سے شادی کر لینا معمولاتِ زندگی میں سے ہو گیا تھا۔ ان میں انسانی مساوات کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہر ادنیٰ اپنے سے اعلیٰ کا غلام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کو خدائی کا مرتبہ حاصل تھا۔ رعایا ان کے سامنے سجدے کرتی تھی اور ان کی ثنا وصفت کے گیت گاتی تھی۔

سب سے پہلے مزدک نے انسانی مساوات کا تصور پیش کیا مگر اس شکل میں کہ دولت اور عورت کو تمام

[1] بیان القرآن

انسانوں کا اشتراکی سرمایہ قرار دیا اس لیے ہوس رانوں میں یہ مذہب بہت مقبول ہوا، سرکاری سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری قوم ہوس رانی اور سرمستی میں غرق ہوگئی۔ اور اس سے پوری عرب دنیا متاثر ہوئی۔

عورتوں کی حد تک زنا اور فسق و فجور ان میں عام ہوگیا تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کرتے تھے اور یہ اشعار عرب کے بچے بچے کی زبان پر ہوتے تھے۔ کوئی شجاع اور بہادر آدمی ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس روانہ کر دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے، اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں، ان کا لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس بلوا بھیجتیں۔ وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے۔ عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ ایک اور رسم جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مقررہ مدت کے لیے نکاح کرتے مدت گزرنے پر اس کو اجرت دے کر روانہ کر دیتے اس کو متعہ کہتے تھے۔

مالیات کی حد تک عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری، سلب اموال اور رہزنی تھا۔ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء چور اور رہزن ہوتے تھے۔ اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ زندگی میں آبرو اور مال کی حد تک انسان کی یہی بے راہ روی اختیار کرنے والے لوگ الذین یتبعون الشھوات کا مصداق ہیں اور ان کو ہی وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدن و معاشرت میں قرآن کرنا چاہتا تھا۔ میراث میں لڑکیوں کا حصہ پانا، سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا، دو بہنوں کا نکاح میں یکجا ہونا، ملک یمین پر پابندیاں لگنا، عام عورتوں سے نکاح پر قیدیں ہونا، رضاعت قرابت، مصاہرت کی بنا پر عورتوں کا حرام ہونا، منکوحہ عورتوں کی تعداد کا مقرر ہونا، کسی عورت کا دوسرے کی منکوحہ ہونا، عورتوں کے باب میں وہ پابندیاں ہیں جو ان شہوت رانوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ اسی بنا پر یہ طبقے ان معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے جھاڑ کے کانٹوں کی طرح اہل ایمان کے پیچھے پڑ گئے۔ معاشرتی اصلاحات کو مفاد پرست طبقہ برداشت نہ کرتا تھا۔ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ اور آوارگی پسند طبقات میں ان اصلاحات سے ایک آگ لگ گئی، جس طبقہ نے بھی دیکھا کہ ان اصلاحات کی زد ان کی بے لگام

آزادیوں اور بے قید شہوت پرستیوں پر پڑ رہی ہے وہ اس ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو گئے کہ ان تمام اصلاحات کو ناکام کر کے اللہ کے بندوں کو پھر اسی تاریکی میں دھکیل دیں گے جس سے نجات دینے کے لیے اسلام نے یہ روشنی دکھائی تھی۔ قرآن نے ان سب کے جواب میں مسلمانوں کو بتایا کہ تم ان مخالفوں کی ہفوات کی پرواہ نہ کرو۔ انبیاء سابقین اور اسلاف صالحین کی اصلی وراثت یہی ہے جو تمہاری طرف منتقل ہوئی ہے۔ خدا تمہیں اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہے لیکن یہ اشرار و مفسدین یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اس رحمت سے محروم کر دیں[1]

اُمت کی مخصوص ذمہ داری

پہلی آیتِ قرآنی نے جہاں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ اس اُمت کی ذمہ داری یہ ہے کہ پورے عالم کی نجات کا سامان کرے جس کا عملی نمونہ اس کے رسول نے اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی آیت میں لیبین لکم کے انداز پر غور کریں تو یہ حقیقت خود بخود الم نشرح ہو کر سامنے آجائے گی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی صورت اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے کہ آپ اپنا قائمقام ایک ایسا گروہ تیار کر دیں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلم ہو کہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح دعوت کا کام کرے۔ ایسے ہی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس کام میں بہت بڑی مشکلات اور رکاوٹیں بھی ہیں۔ اور یہ مشکلات ان لوگوں کی جانب سے ہیں جو اس زندگی میں اپنی چاہتوں کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ یہ ہر دور میں مختلف رہے ہیں۔ قرآن نے یہاں الشہوات جمع لاکر اشارہ کر دیا ہے کہ یہ چاہت ایک نہیں مختلف ہیں۔ قرآن نے الشہوات کی تشریح دوسرے موقعہ پر النساء عورتوں البنین اولاد نرینہ، الذھب والفضۃ سونا چاندی کے انبار، الخیل المسومۃ نشان زدہ اصل گھوڑے۔ الانعام مویشی اور الحرث کھیتی سے کی ہے۔ جیسا کہ آپ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں۔ یہ الشہوات ہی دینِ حق کے راستہ میں رکاوٹیں ہیں۔ یہاں ارادے دونوں موجود ہیں۔ ایک ارادہ الٰہی ہے کہ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں ہدایت ربانی اور پیغامِ نبوت کی ترجمان ہو۔ انہیں توحید۔ آخرت۔ رسالت پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کے ایک ایک عمل سے

[1] تدبر قرآن

ظاہر ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی قرآن نے تلقین کی ہے۔ ان کے معاملات انہی خطوط پر انجام پائیں جو قرآن نے بتا دیے ہیں ان کی معاشرت، ان کی معیشت اور ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ واللہ یرید ان یتوب علیکم کا مصداق ہو اور شہوت کے پرستاروں کی جانب سے اس راہ میں جو بھی رکاوٹ بن کر آئے اور جس نام سے بھی آئے اسے ہٹانے کے لیے سر توڑ کوشش کی جائے خواہ یہ رکاوٹ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا نام لے کر آئے اور خواہ میکڈوگل کا نظریہ جبلت اور چاہے فرائڈ کا نظریہ جنسیت اور ریڈلر کا نظریہ حب تفوق اور پھر چاہے کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت ہو یا کلیاولی کا نظریہ قومیت و وطنیت ہو۔ یہ سب الذین یتبعون الشھوات ہیں۔ یہ سب چاہتے ہیں کہ اہل ایمان راہ حق سے ہٹ جائیں۔ وہاں بھی یہود، مجوس اور نصاریٰ تھے۔ یہاں بھی وہی ہیں فرق ہے تو صرف لبادوں کا ہے۔ اللہ کا ارادہ اپنی پوری جامعیت اور کاملیت کے ساتھ عرب کی سرزمین میں جلوہ فگن ہوا۔ اور ایک جماعت نے اپنا نصب العین عالم مثال اور فکر و نظر کی دنیا میں نہیں اسی عالم آب و گل میں ارادہ الٰہی کو بنایا اور اسے حاصل کر کے ایک مادی حقیقت بنا دیا۔ "تاریخ ایسی کسی دوسری مثال سے یکسر خالی ہے کیونکہ دنیا میں نصب العینی حالت کا قائم ہونا مشکل ہے۔ حضور انور اور خلفاء راشدین کے بعد اگرچہ اسلام تصور کی حیثیت سے اتنا ہی مکمل تھا لیکن عمل کی دنیا میں اس کی کامل و مکمل تصویر نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام نظامات سے عملاً برتر اور بلدارج بلند ہونے کے باوجود وہ اپنی نصب العینی حالت سے نیچے گر گیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ الذین یتبعون الشھوات سے تصادم کی وجہ سے اس نظام کے بعض پہلو دب جاتے ہیں یا اس کا کوئی خاص جز عام احساس کے دائرے سے خارج اور اہل فکر کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس نوبت پر متبعین شہوات کا طبقہ اپنی فطری بے اعتدالی اور غلو کے ساتھ اس نظام سے ٹکراتا ہے اور اس تصادم سے اسلامی نظام کا وہ پہلو جو عام نظروں سے چھپ گیا تھا برابر آتا ہے لیکن جو پہلو اس طرح ابھرتا ہے وہ ان تمام قیود کے ساتھ ابھرتا ہے جو اسلام نے اس پر عائد کر رکھی ہیں نہ کہ اس غلو اور بے اعتدالی کے ساتھ جو اتباع شہوات کا خاصہ ہے یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ اسلام نے معاشی امور کو خاصی اہمیت دی ہے اور اس حقیقت کو ملحوظ رکھا ہے کہ معاشی نظام کی ابتری اور اقتصادی پستی خود مذہب و اخلاق کے لیے مہلک ہے۔ نظری حیثیت سے یہ عنصر اسلام میں ہمیشہ سے موجود رہا اور مسلمانوں کی غفلت کے باوجود اس کا غیر شعوری اثر اسلامی زندگی پر برابر مرتب ہوتا رہا لیکن صدیوں سے اسلام کا یہ پہلو مسلمان مفکرین نے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اب گزشتہ دو برس سے جب سے مغرب کے متبعین شہوات نے معاشی امور کو انسان کی زندگی میں غالب اہمیت دینا شروع کیا اور نئی نئی تحریکات پیدا ہوئیں جنہوں

نے معاشی زندگی پر غیر متوازن زور دیا۔ اسلامی نظام کا یہ پہلو جو سطح کے نیچے دبا ہوا تھا پھر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ لیکن اس میں الذین یتبعون الشھوات جیسی بے اعتدالی نہیں ہے۔ معاشی زندگی کو مناسب اہمیت دینے کے باوجود کوئی مسلمان یہ یقین نہیں کر سکتا کہ محض اس زندگی کی اصلاح سے دنیا کی تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے معاشی امور کو اہمیت ضرور دی ہے لیکن انہیں اخلاقی اصولوں کے تابع رکھا ہے نہ یہ کہ اخلاق و مذہب کو معاشی امور کا تابع بنا دیا ہو۔ بہرحال متبعین شہوات کا وجود اس اعتبار سے اسلام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے خلاف کشمکش کرنے سے اسلامی نظام اپنے اندرونی امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اسلام اپنی پوری کاملیت اور ہمہ گیری کے ساتھ ایک بار پھر دنیا پر نہ چھا جائے اور دوبارہ اپنی نصب العینی حالت کو نہ پائے۔

عقل انسانی خود اپنے لیے قانون نہیں بنا سکتی

۵۶۔ اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تمہارے لیے نرمی اور آسانی ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انسان کمزور بنایا گیا ہے یعنی انسان کو اللہ نے ضعیف بنایا ہے اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ اپنی شہوات و مرغوبات سے کہاں تک صبر کر سکتا ہے تو اس لیے ہر حکم میں تخفیف کا لحاظ فرمایا گیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ انسان کے حق میں جو کچھ مفید دیکھا وہ اس کے ذمہ لگا دیا آسان ہو یا سخت مثلاً عورتوں اور شہوت سے صبر کرنا آدمی کو بہت شاق تھا اس لیے اس کی خواہش کو پورا کر لینے کے لیے طریقے جائز اللہ نے بتا دیے کہ اس سے اپنا مطلب حاصل کر سکیں، یہ نہیں کہ تقاضائے شہوت سے بالکل روک دیا ہو۔ حق تعالیٰ نے اپنی شریعت میں تنگی نہیں رکھی کہ کوئی حلال کو چھوڑے اور حرام کی طرف دوڑے۔ خلاصہ ان آیات کا یہ نکلا کہ نفس کو شہوات سے بچانا اور ان تمام قیدوں کا پابند ہونا جو عورتوں کے باب میں مذکور ہوئیں۔ ہرگز دشوار نہیں ہے اور ان کی پابندی نہایت ضروری اور مفید ہے[1]

دراصل اس آیت میں قانون کے بارے میں مہمات معارف پیش کیے گئے، مثلاً قانون الٰہی کی ضرورت، قانون الٰہی میں تخفیف اور آسانی۔ آیت میں پہلے اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ چونکہ انسان کمزور ہے اس لیے اللہ نے قانون سازی اپنے ذمہ لے کر انسان کو اس بوجھ سے ہلکا کر دیا۔ یعنی چونکہ انسان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ خود بخود اپنی حقیقی فلاح کا راستہ بنا سکے کیونکہ ہم جب کائنات اور زندگی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے مظاہر پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کرتے ہیں کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے فہم و ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری فکر کے دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ایک عالمِ مادی دوسرا عالمِ انسانی اور یہ دونوں کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔ عالمِ مادی بے جان اشیائ کے مجموعہ کو کہتے ہیں یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے جن کو تجربے، مشاہدے اور قیاس سے ٹھیک طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس عالمِ انسانی کے قوانین اس قدر پیچیدہ، مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں نہیں آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو ان پر وہ وثوق اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو عالمِ مادہ کے قوانین کی نسبت عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہہ ممکن ہے لیکن انسانی امور، معاملات اور تمدنی مظاہر کی توجیہہ صحت کے ساتھ دشوار بلکہ غیر ممکن ہے پھر چونکہ مادی اشیائ کے خواص و افعال یکساں اور غیر متغیر ہیں اس لیے زمانے اور وقت کی تبدیلیاں بھی ان پر مؤثر نہیں ہو سکتی ہیں۔ کسی مادی چیز کے بارے میں ہم بآسانی یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ فلاں فلاں حالات و شرائط کی موجودگی میں اس سے یہ خاصیت ظاہر ہو گی۔ لیکن عالمِ انسانی میں اس قطعیت اور صحت کے ساتھ اسباب و نتائج کا تعین بہت دشوار ہے۔ یہاں ہمیں انسان کی آزاد فطرت سے سابقہ پڑتا ہے بے جان مادے سے نہیں اور انسان اپنے اعمال و افعال میں مادے کی طرح اضطراری طور سے کسی معین قانون کا محکوم نہیں ہے۔ اس کا آزاد ارادہ ہر قانون کو توڑ سکتا ہے اور ہر نظریے کو باطل کر سکتا ہے۔ علت و معلول کا تعلق اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ بس فلاں فلاں علت ہی کا رہینِ منت ہے انسانی امور، معاملات اور تمدنی زندگی میں واقعات و مظاہر کی توجیہہ ایک دشوار عمل ہے جس میں قدم قدم پر اختلافِ رائے ہو سکتا ہے اور ایسی کوئی تدبیر نہیں جس سے اختلاف کا سدِ باب کیا جا سکے۔

عالمِ مادی اور انسانی امور کی دنیا میں ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ اول الذکر ہمارا فکر استقرائی طریق پر کام کرتا ہے اور آخر الذکر ہمارا فکری عمل استخراجی طریق پر ہوتا ہے اور دونوں میں یہ بھی نمایاں فرق ہے کہ عالمِ مادی میں انسان شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اور اشیائ کی حیثیت مشہود کی ہوتی ہے برعکس اس کے عالمِ انسانی میں انسان خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود ہے اس فرق کی وجہ سے عالمِ طبعی یا مادی دنیا کے مشاہدات، تجربات اور نظریات و عقائد میں خالص معروضی نقطۂ نظر اختیار کیا جا سکتا ہے اور نتائج کے استنباط میں عقل اپنی غیر جانبداری قائم رکھ سکتی ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مسائل میں یہ معروضیت ناممکن ہے۔ جہاں انسان خود اپنی زندگی اور تمدن کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے وہیں

اس کی عقل شخصی یا جماعتی جذبات و میلانات سے متاثر ہو جاتی ہے۔

عالمِ انسانی اور عالمِ مادی کا فرق معلوم کر لینے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس بات کا انکار نہیں کرے گا کہ عالمِ مادی میں صحت اور صداقت کی تلاش اور اتفاق رائے کا حصول جتنا آسان ہے عالمِ انسانی اور تمدنی معاملات میں اتنا ہی دشوار ہے۔ تمدنی زندگی کے بنیادی مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک رہنمائی نہیں کر سکتا۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اساس و بنیاد کو عقلی موشگافیوں اور فکری قوتوں کے سپرد کر دینے کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے اور ہوتا رہے گا کہ وقتی جذبات اور عارضی میلانات و شہوات فکر پر غالب رہیں گے اور جو نظریہ بھی بالآخر قائم ہوگا وہ محض ان شہوات اور جذبات کا عکس ہوگا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ وہ دائرہ ہی نہیں ہے جس میں عقل و استدلال کے پائے چوبیں پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ بقول مولانا روم

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

انسانی عقل کی انہی کمزوریوں کی طرف قرآن نے خلق الانسان ضعیفاً کہہ کر اشارہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ہر تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسئلہ کی تہ میں یہ سوال پوشیدہ ہوتا ہے کہ انسانی تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیے اور انسانی تمدن کن بنیادوں پر تعمیر ہونا چاہیے۔

اس ضروری اور فیصلہ کن سوال کا جواب کس طرح دیا جائے۔ انسانی عقل کی رہنمائی پر انسانی امور و معاملات اور تمدنی زندگی کے مسائل میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا، لامحالہ اگر ہم اس بنیادی مسئلہ کا قابلِ اعتماد فیصلہ چاہتے ہیں تو ہمیں کسی دوسرے ماخذ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کا ماخذ الہامی ہدایات ہیں اللہ نے انسانی عقل سے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔ جو لوگ الہامی ہدایات پر ایمان لاتے ہیں انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جن اصول و عقائد کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے وہ کسی انسان کے ساختہ و پرداختہ نہیں بلکہ ان کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق ہے جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ بین آنکھ زمین و آسمان کی ہر شے کو محیط ہے جب تک یہ یقین نہ پیدا ہو جائے کوئی شخص دعوتِ ایمان کو صداقت کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا اور نہ الہامی قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر سکتا ہے اس طرح جن اصولوں اور صداقتوں کو وہ قبول کرتا ہے وہ اس کی آزاد مرضی اور غیر پابند قوت فیصلہ پر مبنی اور جبر و تشدد سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ ان مقاصد اور اصولوں پر وہ یہ سمجھ کر ایمان لاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اس لیے اس کا کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ان سے اختلاف کرے۔

بہرحال انسان کا علم اور انسان کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہے اس لیے اللہ کی امداد کی ضرورت ہے کہ

اس کا علم اس کی حکمت ہر پہلو سے کامل تر اور کامل ترین ہے جیسا کہ واللہ علیم حکیم سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے خلق الانسان ضعیفاً کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان قانون پر عمل نہیں کر سکتا بلکہ جیسا کہ آیت کا سیاق بتا رہا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قانون کو اپنے لیے خود نہیں بنا سکتا۔ یہی وہ بوجھ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان سے ہلکا کر دیا ہے اس کو راستہ بتا کر اس پر چلنے کی ہدایت فرمادی۔

قوانین میں نرمی و آسانی

اس آیت کا یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ انسان چونکہ جسم کے لحاظ سے، ارادہ کے لحاظ سے کمزور ہے اس لیے اللہ سبحانہ، نے شریعت کے احکام میں سہولت کا لحاظ فرمایا ہے اس مطلب کی رُو سے ضعف سے ضعفِ جسمانی اور آزادی مراد ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، نے اسلام کے قوانین وضوابط میں یسر، آسانی اور سہولت کا لحاظ فرمایا ہے۔ مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی کہ دین بہت آسان ہے اسی کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

یہ نرمی اور سہولت ملتِ ابراہیمی کی بنیاد اور اساس ہے۔ اور اسی بنیاد پر اسلامی قانون کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو تمام قانونِ اسلامی پر ایک اجمالی نظر ڈالنی پڑے گی۔ اور اس اجمال میں بھی اتنی تفصیل ہو جائے گی جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے اس لیے ہم یہاں صرف وہ اصول پیش کرتے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ نے خاص اس موضوع پر ارشاد فرمائے ہیں ان کی روشنی میں اب سارے اسلامی قوانین کا جائزہ لے کر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اسلامی قانون میں دوسرے سماوی ادیان کے مقابلے میں کس قدر آسانی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یسر و سہولت کے لیے اسلامی قانون میں حسبِ ذیل اُمور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

۱۔ کسی عبادت کے لیے ایسی چیز کو رکن و شرط کی حیثیت نہ دی گئی جس کی ادائیگی میں دشواری ہو، شریعتِ محمدی میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اسی لیے لازم قرار نہیں دیا گیا۔ حضور انور کے اس ارشاد

اگر مجھے اپنی اُمت کے مشقت میں پڑ جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ انہیں مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

۲۔ کچھ طاعات کو فخر و مباہات اور مسرت کے اظہار کے لیے اجتماعی رسم کا درجہ دے دیا ہے۔ چنانچہ جمعہ اور عیدین کے اجتماع میں یہی رُوح کام کر رہی ہے۔ حضور کے اس ارشادِ گرامی کہ یہودیوں کو پتہ لگ

جائے کہ ہمارے دین میں تنگی نہیں کشائش ہے، اسی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بڑے اجتماع میں بننا اور شان وشوکت کو نمایاں کرنے میں آگے ہونا انسان کی طبیعت ہے۔

۳۔ طاعات میں ایسے کردار کو قانون اپنایا ہے جس کی طرف انسان طبعاً مائل ہوتا ہے اور خود عقل بھی اس کو چاہتی ہے۔ عقلی اور طبعی رغبتوں کے اسی اجتماع کو قائم رکھنے کی خاطر مساجد میں خوشبو، ان کی صفائی اور جمعہ کے روز غسل اور خوشبو کی تلقین کی ہے اور قرآن و اذان میں تحسین صوت کو پسند کیا ہے۔

۴۔ اجتماعی طبیعت کے تقاضے کو باقی رکھنے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ملک میں سربراہ کی امامت اور گھر میں صاحب البیت کی امامت کو باقی رکھا جائے۔

۵۔ رائے عامہ کا اصل شریعت سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے شریعت کی تعلیم، وعظ وارشاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر پر زور دیا ہے تاکہ بے علمی اور بے خبری پیدا ہو کر اُمت کا قانون سے عملی رابطہ نہ ٹوٹے۔

۶۔ جیسے اوامر کی حد تک خود نمونہ بن کر دکھایا ہے ایسے ہی رخصتوں پر عمل کیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے عمل کی کاپی کرنے میں آسانی ہو۔

۷۔ اللہ سے معاشرے کے مہذب ہونے اور قانون پر عمل ہونے کے لیے دُعا کی ہدایت کی ہے۔

۸۔ نبوت کی وساطت سے پیروکاروں پر اللہ کی جانب سے سکینت کا نزول ہوا اور اس طرح ان میں طاعت کی سرشاریاں پیدا ہوئیں۔

۹۔ جو شخص دوسروں کے حقوق تلف کرتا ہے اس کے حقوق بھی قانون میں تلف کر دیے۔ اسی قاعدے کے تحت نہ قاتل کو وراثت ملتی ہے اور نہ مکرہ کی طلاق نافذ ہوتی ہے۔

۱۰۔ اگر کسی دُشوار کام کو کرنے کا کہا جائے تو اس میں تدریج کو پیش نظر رکھا جائے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں قرآن میں اوّل جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں جنت و دوزخ کا ذکر تھا۔ جب طبیعتوں میں اس سے گداز پیدا ہو گیا تو حلال وحرام کے قوانین نازل ہوئے۔ اگر روزِ اوّل شراب کے حرام ہونے یا زنا کی بندش کا حکم آجاتا تو لوگ نہ چھوڑتے۔

۱۱۔ عوام کے جذبات کی خاص طور پر رعایت کی گئی ہے۔ جذبات ہی کی رعایت سے حضور انور نے کچھ کام پسندیدہ ہونے کے باوجود نہیں کیے مثلاً خانہ کعبہ میں آمد و رفت کے لیے دو دروازے قائم کرنے کا ارادہ اس لیے فسخ فرما دیا تھا کہ اس میں قریش کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں اسی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کر دیا لیکن اس کے حدود کیا ہیں یہ ایک طویل قانونی بحث ہے۔

۱۲۔ قانونِ اسلامی اپنی وضع اپنے اسلوب اپنے اندازِ بیان، اپنے طریق خطاب اپنے طریقِ استدلال

میں وضعی اور صناعی طریقوں کو نہیں اپناتا وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو قرآن کے طریقِ ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

۱۴۔ اسلامی قانون میں عابدانہ زندگی میں قانونی اوامر کا بوجھ عقلِ انسانی پر نہیں ڈالا اس کی ذمہ داری خود اٹھالی ارکان شرائط اور آداب بتائے لیکن اس کو اصطلاحات کا گورکھ دھندا بلکہ مخاطبوں کی عقل و فہم کے مطابق اس کی تحدید و تعیین فرمائی۔

اگر ادیان کا ان اصولوں کی روشنی میں تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی جتنی رعایت اسلامی قانون میں ہے اس قدر اور کہیں نہیں ہے لیکن یہ بحث کہ سہولت کا مفہوم اور اس کا معیار کیا ہے ایک طویل بحث ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے انشاء اللہ ہم پارہ ۱۷ کے آخر میں ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

سابقہ اُمتوں کے احکام میں تخفیف

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی امتوں پر جو احکام مقرر کیے گئے تھے۔ اس میں تمہاری حالت کا لحاظ کرتے ہوئے تخفیف منظور ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم پر سے یہ بوجھ ہلکا کر دیں کیونکہ اول تو انسان ضعیف الخلقت ہے۔ پھر آخری اُمت اپنے قویٰ اور ہمت کے اعتبار سے اور بھی زیادہ کمزور ہے اور جس قدر زمانہ قیامت قریب آتا جائے گا یہ ضعف اور کمزوری زیادہ ہی ہوگی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو تم پر تخفیف منظور ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ پہلی اُمتوں سے اس اُمت میں احکام کی آسانی زیادہ ہے[۱]

مقصد یہ ہے کہ جو بوجھ انسانیت کے سروں پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں لوگ گرفتار ہو گئے تھے اللہ کو یہ منظور ہے کہ قرآن کے ذریعے اس کو ہلکا کرے اور انسانیت کو اس سے نجات دلائے یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے جن سے قرآن نے نجات دلائی۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے مذہبی احکام کی ناروا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل سختیاں، ناقابل عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا بوجھ، احبار و رہبان کی طاعت کی بیڑیاں، اربابِ اقتدار کی تعبد کی زنجیریاں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنہوں نے انسانیت کے دل و دماغ کو مقید کر دیا تھا۔ قرآن نے ان سب کو ہلکا کر دیا اور زندگی کے لیے ہدایت کی ایسی سہل و آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں ہے، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں، حدیث

---

[۱] کشف الرحمان

میں ہے: حنیفۃ السمحۃ لیلھا کنھارھا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین آسان دین حنیف ہے۔

اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو لوگوں کی سہولت کا لحاظ رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ ارشاد ہے:

تم آسانی پیدا کرنے کے لیے روانہ کیے گئے ہو نہ کہ دشواری۔ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو، سکون فراہم کرو نہ کہ وحشت۔

انسانی فطرت کی بنیادی خصوصیت

۵۷۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے وخلق الانسان ضعیفا، ویسے تو انسانی فطرت قدرت کے رازہائے گراں بہا کا خزانہ ہے اور قرآن نے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اس آیت میں قرآن نے انسانی فطرت کی جس اہم خصوصیت کا ذکر کیا ہے وہ بتانا چاہتا ہوں۔ آیت کا مفاد یہ ہے کہ آدمی ہو یا آدمی کے سوا دوسری جاندار مخلوق، زندگی کی مدت جن کی جتنی بھی ہو اس مدت کو گزارنے کے لیے جن ضرورتوں کے وہ محتاج ہوتے ہیں ان کا حصول عموماً جسمانی توانائیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ مشاہدہ یہی ہے کہ آدمی بے سرو سامانی کی جس حالت میں اس دنیا میں آتا ہے مشکل ہی سے کسی دوسرے جاندار میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ جو جاندار اُون، بال، کھر، پَر، بازو، سینگ، چنگل اور ایسے ہی بیسیوں قدرتی سامان کے ساتھ دنیا میں آتے ہیں ان کے مقابلہ میں آدمی جو ایک زندہ لوتھڑے کے سوا ابتداً کچھ نہیں ہوتا، ننگا اور ہر قسم کے سامان سے خالی جسم لے کر آتا ہے وہ بھی اتنا نازک و ناتواں حساس و اثر پذیر ہوتا ہے کہ اپنے طبعی مسکن کے موسموں کی معمولی سختی کا مقابلہ بھی بآسانی نہیں کر سکتا۔ گرمی ہو یا سردی ان موسمی تبدیلیوں کی ہلکی سی شدت آدمی کو لوکھلا کر رکھ دیتی ہے حالانکہ زمین کے کرے میں انسان کے ساتھ اور بھی جاندار ہیں۔ ان کی رہائش گاہ بھی زمین ہے لیکن موسمی تکلیفوں سے بچنے کے لیے ان کو ان دردسریوں میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جتنے بھی جاندار ہیں پیدا ہونے کے ساتھ ان میں بھی ساری قوتیں اچانک ظہور میں نہیں آتی ہیں بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دن اس کے لیے گزارنے پڑتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی جب آپ آدمی کا مقابلہ دوسرے جانداروں سے کریں گے تو زمین و آسمان کا فرق محسوس کریں گے۔ مرغی کے بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی دانہ چگنے لگتے ہیں۔ آدمی کے سوا جتنے بھی ہیں جتنی کم مدت میں ان کا پیدائشی ضعف قوت کے انتہائی مدارج کو پہنچتا ہے اس مدت کو اس طویل زمانہ سے

کیا نسبت ہے جو آدمی کے بچوں کو اسی قوت کے حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جن مدارج کو دوسرے دنوں میں طے کرتے ہیں آدمی کے بچے مہینوں میں ہی نہیں بلکہ سالوں میں طے کرتے ہیں۔ ماں باپ کی اعانت سے آزاد ہو کر خود اپنی معاش کا کفیل ہونے کے لیے آدمی کو عام حالات میں کم از کم پندرہ سولہ سال کی مدت چاہتی ہے۔ پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ پیدائشی ضعف کے ازالہ کے بعد دوسروں میں معاشی ضرورتوں کے حصول کی جو قوتیں بروئے کار آتی ہیں عموماً آخر عمر تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ماں باپ کی نگرانی سے الگ ہونے کے بعد زندگی گزارنے کے لیے ان میں سے کسی کو دوسرے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر ایک اپنی جگہ خود زندگی گزارتا ہے۔ اپنی قوتِ بازو سے آخر وقت تک خود کما کما کر اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے لیکن آدمی کا کیا حال ہے۔ اول تو اس کے ضعف کا ازالہ ہی برسوں میں ہوتا ہے اس کے بعد حصولِ معاش کی جو قوتیں انسان کے دست و بازو میں نمایاں ہوتی ہیں۔ زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ بتدریج پھر وہ ہی پیدائشی کمزوری مختلف راستوں سے واپس آجاتی ہے اور بالآخر اس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جس پر وہ پیدائش کے وقت تھا۔ جیسے شروع میں نگرانوں کا ماں باپ کی صورت میں محتاج تھا آخر میں اولاد کا محتاج ہو جاتا ہے جیسے پیدائشی ضعف کی طرف قرآن نے خلق الانسان ضعیفا کہہ کر اشارہ کیا ہے ایسے ہی ظہورِ قوت کے بعد دوسرے ضعف کو خلقکم من ضعف ثم من بعد ضعف قوۃ ثم من بعد قوۃ ضعفا و شیبۃ، یہاں فرمایا ہے۔

اسی ضعف کا نتیجہ ہے کہ شخصی حیثیت سے انسانوں کے کم ہی کام ایسے ہوتے ہیں جسے وہ اپنے سامنے مکمل کر کے دنیا سے جاتا ہو۔ عام حال اس سلسلے میں اجتماعی حیثیت سے زمین کے اس کرے پر آدم کی اولاد جن جن شعبوں کے متعلق سہولتوں کو پیدا کرنے کی دھن میں مشغول ہے۔ جس رفتار سے انسان کی اجتماعی کوششیں اس راہ میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے آدمی جدوجہد میں مصروف ہے۔ سمجھنے والے یہی سمجھ رہے ہیں کہ آدمی نے راہ ترقی کا بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ بالخصوص ہوائی جہاز کی ایجاد نے اس یقین میں بڑی قوت پیدا کر دی ہے لیکن بات مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے۔ مقابلہ کیجئے تو آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچیں گے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود انسان چڑیوں، طوطوں کے برابر بھی نہیں ترقی کر سکا ہے۔ وہ نقل مکانی کے مسئلہ میں نہ لوہے کے محتاج ہیں نہ لکڑی کے اور نہ پٹرول کے اور نہ ان دوسری گیسوں کے جن کے بل بوتے پر انسان نے ہوائی راستوں پر اقتدار حاصل کیا ہے خلق الانسان ضعیفا کی یہ کیسی کھلی تفسیر ہے۔ مچھروں اور مکھیوں کے مقابلے میں بھی جو معذور رہا وہ ران تعلیوں اور ترقیوں

کے دعووں کے بعد بھی معذور اس کی ناتوانیوں، دریدحالیوں کا کیا ٹھکانہ ہے اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ جو کچھ اس سے بن آیا وہ اکیلا نہیں بلکہ ایک ایک کام کے لیے ہزاروں اور لاکھوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے بقول شخصے آدمی کے منہ میں کھانے کا ایک لقمہ بھی بیسیوں ہاتھوں سے گزرنے کے بعد جاتا ہے۔ گیہوں کے بونے والے، جوتنے والے، پانی دینے والے کاٹنے والے، بھوسہ صاف کرنے والے، تولنے والے، بیچنے والے، بازار میں لانے والے، دکان میں رکھنے والے، خریدنے والے، پیسنے والے آٹے کو لا کر لانے والے، پکنے کے بعد برتن کو بنانے والے ایندھن کی لکڑیوں کو لانے والے، دستر خوان پر چننے والے جب سب اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں تو لقمہ توڑ کر توڑنے والا اس لقمہ کو منہ تک پہنچاتا ہے۔

یہ آدمی کا حال ہے اس کے مقابلے میں اور جانداروں کو دیکھئے ان میں ہاتھی بھی ہے اژدھا بھی ہے جو بھی ہے اپنی ساری ضرورتوں کو اپنی قوت بازو سے مہیا کرتا ہے۔ کسی کی منت پذیری سے ہر ایک کی گردن آزاد ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی خود مکتفی ہے۔ وہ ہی خود مکتفی زندگی جس کے انسان درپے ہے اور ہزاروں برس سے درپے ہے۔ جانداروں کے ہر ہر فرد کو خود اکتفائیت کا جو مقام حاصل ہے۔ اگر وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو تو آدمی کی ٹولیوں کو تو خود مکتفی ہونے میں کامیاب بنالیا جائے۔ لیکن جس مقصد میں اجتماعی قوت وطاقت سے کام لینے کے باوجود آدمی کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسی مقصد میں دوسرے جاندار کامیاب ہیں اور کیوں کامیاب نہ ہوں۔

انسان میں جوانی کی وہ طاقت جو کمزوریوں کے آغوش میں ہوتی ہے اول تو یہ طاقت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ دو ہستیوں کے درمیان والی ہستی بھی ایک قسم کی نیستی ہوتی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے الوجود بین العدمین عدم

لیکن اسے اگر صوفیانہ غلو بھی قرار دے دیا جائے پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قوت وطاقت اور زور کے اس زمانے میں بھی آدمی میں قوت کے جو آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ خم ٹھونکنے والے اپنے متعلق جتنی تعلیوں سے بھی کام لیں مگر اس کا راز بھی ہلکے سے مقابلے سے کھل جاتا ہے۔ کچھ نہیں تو چیونٹی ہی کو دیکھ لیجیے اور اندازہ لگانے والوں سے پوچھ لیجیے کہ چیونٹی اپنے وزن سے تیرہ سو گنا وزن اٹھا لیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیونٹی میں اللہ سبحانہٗ جتنی قوت بھر دی ہے اگر آدمی میں بھی قوت کا یہی پیمانہ ہوتا تو لکھتے ہیں کہ اس قوت سے ۱۰۰۰ من وزنی چیز آدمی اٹھا سکتا تھا۔ یعنی اگر کچھ نہیں صرف ایک چیونٹی کو جو طاقت ملی ہے اگر آدمی کو مل جاتی تو آدمی سو ایکڑ پیداوار کو ایک ہی دفعہ میں کھیت سے گھر پہنچا سکتا تھا۔ بہرحال کتابوں میں پڑھیے زندہ چیزوں کی ایک بڑی تعداد قوت کا دہی معیار آپ کو نظر آئے گا اب قرآن کی آیت وخلق الانسان ضعیفا پڑھیے۔ یہ انسان کی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن نے اس آیت میں ذکر کیا ہے۔ اسلام نے جس معاشی نظام کو پیش کیا ہے اس میں منجملہ دوسری چیزوں کے فطرت انسانی کی اس خصوصیت کو بہت بڑا دخل ہے لے

لے اسلامی معاشیات۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَ تِجٰرَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا
فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ
تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

اے اہلِ ایمان تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ
مگر ہاں وہ مال جو آپس کی رضا مندی سے کاروبار کے ذریعے تمہیں ملا
ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور دیکھو اپنی جانوں کو ہلاک نہ
کرو اللہ تمہارے لیے رحمت رکھنے والا ہے۔ (۲۹) اور یاد رکھو جو کوئی ظلم و
سرکشی سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے دوزخ میں ڈالیں گے
اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ (۳۰) اگر تم ان گناہوں سے بچتے رہو گے

جو بڑے بڑے ہیں تو ہم تمہاری لغزشوں کو تم سے محو کر دیں گے اور تمہیں عزت و تکریم کے مقام میں داخل کریں گے۔

حرمت مال و جان اور معاشرتی زندگی

پہلی آیات میں اسلامی قانون کا اجمالاً تصوری خاکہ اور معاشرتی زندگی سے اس کا گہرا ربط بیان کیا۔ اور ساتھ ہی اُمت کی ذمہ داریاں بتائیں، اب ان آیات میں یہ حقیقت پیش کی جا رہی ہے کہ معاشرتی زندگی کی سعادت اور اُمت کی اجتماعیت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ جب تک خاندان کے تمام افراد اور اُمت کے سارے طبقات میں دیانتداری، راستبازی اور ایک دوسرے کی جان و مال کی حفاظت کا جذبہ نہ ہو۔ یہاں ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کے مال کھانے اور قتل نفس کی حرمتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان کو یکجا کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مال کی حرص اس کے حصول کے لیے جائز و ناجائز کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اس طرح اندھا بہرا کر دیتی ہے کہ اس کے لیے قتل و خونریزی تک کی نوبت آجاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خونریزیوں کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ حرص مال کو ان میں سب سے زیادہ دخل ہے جو سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری شرافتوں اور بلندیوں کا دار و مدار مال ہی پر ہے۔ وہی باعزت ہے جو روپیہ والا ہے اور بے عزت وہی ہے جو روپے سے خالی ہے۔ مشہور فارسی شعر

خوک باش و خرس باش و یا سگ مردار باش   ہر چہ باشی باش لیکن اندکے زردار باش

کی ذہنیت جب کسی فرد یا قوم پر سوار ہو جاتی ہے تو اندکے زردار باش، کے مشورے کی تعمیل کا جن کو موقعہ نہیں ملتا وہ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے میں بے باک ہوتے ہیں۔ جب مال کا عشق ان پر مسلط ہوتا ہے تو اپنے عشقی مطالبات کی بابجائی میں بے روک ٹوک مشغول ہو جاتے ہیں بے آئینی کی اس زندگی میں زمین پر جس قسم کا فساد بھی پھوٹ پڑے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں قتل اور ایک دوسرے کے مال کھانے کی حرمت یکساں رکھی ہے۔ حضور انور نے بھی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ بتایا ہے ارشاد ہے حرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ، مومن کے مال کی حرمت ایسی ہے جیسے اس کی جان کی۔

۵۸۔ اے اہل ایمان تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ مگر ہاں وہ مال جو آپس کی

رضامندی سے کاروبار کے ذریعے تمہیں ملا ہو اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور دیکھو اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے لیے رحمت رکھنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کو کسی کا مال ناحق کھالینا مثلاً جھوٹ بول کر یا دغابازی سے یا چوری سے ہرگز درست نہیں ہے۔ ہاں اگر سوداگری یعنی بیع و شراء ہو یا باہم رضامندی سے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس مال کو کھالو جس کا خلاصہ یہی نکلا کہ جائز طریقہ سے لینے کی ممانعت نہیں جو مال کو ترک کرنا تم پر دشوار ہو۔ اور دوسرے فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو بے شک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے کہ بلا وجہ کسی کے مال یا جان میں تصرف کرنے کو منع فرمادیا اور تم پر ایسے احکام بھیجے جس میں سراسر تمہارے لیے بہبودی اور خیریت ہے۔ [1]

یہاں سب سے اہم سوال یہ بھی ہے کہ مال ناجائز طور پر کھانے اور قتل نفس میں باہم ربط کیا ہے اور ان دونوں کی باہم پیوندکاری کیوں کی گئی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر جہاں تک میں سمجھا ہوں جیسا کہ الجصاص نے نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ لا تقتلوا کی نہی دونوں باتوں سے روک رہی ہے باہم قتل و خون ریزی سے بھی اور خودکشی سے بھی قد اقتضی النھی عن قتل غیرہ و قتل نفسہ، ناداری رکھنے والوں میں مال سے عاشقانہ تعلق رکھنے والے وہ ہی ہوتے ہیں جو کرنا تو سب کچھ چاہتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ قرآن میں ہے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں محض معاشی دشواریوں پر غالب آنے کے لیے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اور آج یورپ، امریکہ اور ایشیا میں پیدا ہونے کے بعد تو نہیں، پیدا ہونے سے پہلے برتھ کنٹرول کے ذریعے جو اولادکشی کی مہم جاری ہے اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ جو اپنے اندر دوسروں سے چھیننے کی طاقت نہیں رکھتے وہ معیشت میں جن سے پریشانی آنے کا احتمال ہے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی کے حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ترقی کا یہ قدم بھی اٹھا دیتے ہیں کہ معاشی پریشانیوں سے بچنے کی خاطر اولادکشی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ان کا ایک محبوب اور پسندیدہ کام بن جاتا ہے۔ مولانا گیلانی نے اپنے زمانے کے احوال کی کیسی اچھی تصویر پیش کی ہے۔

" ان ہی دنوں کے اخباروں کی یہ خبریں کس سے پوشیدہ ہیں کہ کچھ علاقوں میں خودکشی کو آسان بنانے کے لیے باقاعدہ انجمنیں قائم ہیں، رسالے نکلتے ہیں جن میں لوگوں کو بسہولت خودکشی کا طریقہ بتایا جاتا ہے پولینڈ اور آسٹریا کا نام اس سلسلے میں سب سے آگے ہے۔ سنہ ۱۹۲۷ء ۶ر مارچ کی اشاعت میں سنڈے ایکسپریس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اخبار میں بریگیڈیر میری گارڈن کا ایک بیان خودکشی کے واردات کے بارے میں شائع ہوا تھا جس میں بتایا تھا کہ ان کی رائے میں خودکشی کا سب سے بڑا سبب خانگی اور مالی دشواریاں ہیں۔

(سچ ۱۱ اپریل ۱۹۶۰ء)

چونکہ میری گارڈن کا خاص مضمون اسی موضوع خودکشی سے متعلق ہے اس لیے ان کے بیان کو خاص اہمیت دی گئی۔ اسی بیان میں انھوں نے یہ بھی بتایا تھا:

ہر ہفتہ اوسطاً آدمی زبانی یا تحریراً مجھے ارادہ خودکشی سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے جو خودکشی پر آمادہ رہتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے ان کی تعداد انگلستان میں ہر حال پانچ ہزار تک پہنچتی ہے۔ (سچ)

دیکھا آپ نے اکل اموال الناس بالباطل کا بحران بالآخر لوگوں کو کس چیز پر راضی ہونے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ انھوں نے جب حلال خوری سے رشتہ توڑا تو اس رشتہ کے جو لازمی نتائج ہیں ان سے اپنے آپ کو کیسے بچا سکتے ہیں۔

اس موقعہ پر ایک اور شخصی واقعہ کا ذکر شاید اس قرآنی اشارے کو سمجھنے میں مدد دے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایک مغربی خاتون جس کا نام مسز کینس تھا اسی کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ:

یہ ایک حسین عورت تھی ۲۹ سال کی جوان عمر، شوہر موجود تھا، اولاد بھی ہو چکی تھی، موجود تھی، شادی پر صرف ۵ سال گزرے تھے۔

مولانا کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں فلم اسٹار بننے کا موقعہ بھی مل چکا تھا لیکن آخر چند سے ہٹ کر ایک سے ہو رہنے کا اس نے فیصلہ کیا۔ روزی کا پیمانہ اس کے لیے ناپا تلا تھا۔ سینمائی زندگی کی رنگ رلیوں کے بعد اس نپی تلی معیشت کا یہ حال اس کے لیے ناقابل برداشت بن گیا۔ جس تمدن و تہذیب میں وہ پیدا ہوئی تھی وہ خدا اور اس کی رحمتوں سے مایوس تہذیب و تمدن تھے۔ ایسی حالت میں جو تحریری فیصلہ اس نے کیا اس کا اپنا بیان کردہ یہ ہے:

میں مالی مشکلات سے جن کا کوئی حل نہیں ہے مجبور ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں۔ میری آمدنی اتنی رہی جس سے خود میری اور میری بچی کی گزر ہو سکے۔ شوہر سے میری جدائی ہو چکی ہے۔ میری ایک اولاد کی وہ پرورش کر رہا ہے۔ میرے دوست و احباب ایسے موجود ہیں جو مجھے مالی امداد دے سکتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے دلوں میں میری محبت اور قدر باقی نہ رہے گی۔

اور پھر اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ،

میں اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ ختم کیے دیتی ہوں اس لیے بھی ختم کرتی ہوں کہ وہ اگر حسین نہ نکلی اور میرے خیال میں وہ حسین نہیں ہے تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔ میں ہی اس بچی کو وجود میں لائی اور میں ہی اس کو ختم بھی کرتی ہوں۔

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سرمایہ اور مال سے ناجائز تعلق خودکشی اور دشمن کشی کا سبب ہوتا ہے۔ قرآن اس آیت میں بھی بتا رہا ہے کہ مال سے ایسے روابط قائم نہ کرو جو خودکشی، اولادکشی اور غیر کشی کا ذریعہ بن جائے امــوالکــم بینکــم بالباطل کی تعبیر کس قدر بلیغ ہے۔ یہ ایک طرف اسلام کے قاعدہ اشتراک اجتماعی کو بتا رہی ہے اور دوسری طرف فرد کی انفرادی ملکیت کا احترام کر رہی ہے یعنی ایک طرف تو بتایا جا رہا ہے کہ ایک کا مال سب کا مال ہے اور دوسری طرف کہا جا رہا ہے کہ ہر ایک کا مال اس کی ملکیت ہے۔

اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں

اس میں قرآن نے قاعدۂ اشتراک پیش کر کے اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ معاشی ذمہ داریوں میں کفالتِ عامہ معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا شامل ہے۔ ہم یہاں صرف کفالت کی حد تک معالم القرآن کے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے کچھ ضروری اشارات کرتے ہیں۔ معاشی ذمہ داری کے اسی شعبے کفالتِ عامہ کی خاطر لوگ اشتراکیت کو معاشی نظام سمجھ کر اس کی طرف دیوانہ وار جا رہے ہیں، سید رشید رضا نے درست لکھا ہے کہ ان کو اس معاملہ میں راہِ اعتدال نہیں ملی ہے۔ اگر وہ تلاش کرتے تو اسلام کی آغوش میں ان کو سب کچھ مل جاتا۔ یہ اسلام ہے کہ معاشی ملکیت کے اقرار اور احترام کے ساتھ سب کے اموال کو امت کا مال بتاتا ہے اور ہر ایک کی جان کو سب کی جان کہتا ہے۔

کفالتِ عامہ سے مراد یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے حدود میں ہر انسان کی بنیادی زندگی کی ضروریات کی کفالت کی جائے۔ یہ کفالت اس درجہ تک ہونی چاہیے کہ کوئی فرد ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد انتظام کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ شخص ان

وسائلِ حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا تاخیر اجتماعی خزانے سے بقدرِ ضرورت مدد حاصل کر سکیں اور اسلامی مملکت کا کوئی شہری بھوکا پیاسا، ننگا بے ٹھکانہ اور بیماری میں علاج سے محروم نہ رہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اسی آیت کی روشنی میں یہ اُصول واضح فرمادیا ہے کہ اصحابِ امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمّہ دار ہیں۔ ابوداؤد میں بحوالہ سلیمان بن عبدالرحمان ہے کہ:

ابومریم ازدی کہتے ہیں کہ میں حضرت معاویہ کے پاس گیا انہوں نے کہا ابو فلاں کیسے تشریف لائے ہو؟ میں نے کہا، آپ کو ایک ارشادِ نبوت سنانے آیا ہوں۔ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس کو اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کا سربراہ بنایا ہے اگر وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ گیا اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔ حضرت معاویہ نے یہ سُن کر ایک آدمی کو عوام کی ضروریات پوری کرنے پر مقرر فرمادیا۔

ترمذی کتاب الاحکام میں ہے:

عمرو بن مرہ نے معاویہ سے کہا کہ میں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو سربراہ مملکت ضرورت مندوں فقیروں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ سبحانہٗ اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ یہ سُن کر معاویہ نے ایک آدمی کو عوامی ضروریات پوری کرنے پر مقرر کر دیا۔

اسلامی ریاست کی اس ذمّہ داری کی اہمیت کا اندازہ خلافت کی اس تعریف سے بھی ہو سکتا ہے کہ جو حضرت سلمان فارسی نے کی ہے۔ ابوعبید کتاب الاموال میں رقمطراز ہیں:

خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور شہریوں پر اس طرح مہربان ہو جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر ہوتا ہے۔

شہریوں کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا اہتمام دراصل اس خیر خواہی کا حصہ ہے جو سرکار پر لازم قرار دی گئی ہے جو حکومت شہریوں کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتے اس کا انجام بُرا ہوگا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بخاری کتاب الاحکام باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح میں ہے:

جس شخص کو اللہ سبحانہٗ نے حکمران بنایا اور اس نے شہریوں کے پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

ایک اور ارشاد مسند ابی عوانہ میں ہے :

جو شخص مسلمانوں کا سربراہ ہے اور پھر ان کی بھلائی کے لیے محنت نہیں کرتا ہے اور ان کے لیے خیر خواہ نہیں ہے وہ ان کے ساتھ جنت میں نہ داخل ہوگا۔

ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ خیر خواہی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جن ضروریات کی عدم تکمیل سے اس کی جان ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو ان کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

قرآن نے حکومت کو اپنے تمام شہریوں کا ولی اور سرپرست بنایا ہے اس کی سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے۔ ترمذی نے ابواب الفرائض میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے :

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ و رسول ہے۔

اور امام ترمذی ہی نے کتاب النکاح کے باب ما جاء لا نکاح الا بولی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے :

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔

یہ بات کہ یہ سرپرستی صرف نکاح اور شادی کے معاملہ تک نہیں ہے بلکہ یہ ایک عمومی سرپرستی ہے جس میں رعایا کی ضروریات کی تکمیل بدرجہ اولی شامل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط سے صاف ظاہر ہے جو آپ نے ایک نو مسلم قبیلہ کے سردار کے نام لکھا تھا۔ آپ سردار کے توسط سے اس کے قبیلہ حمیر کے لوگوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں :

اہل حمیر میں تم کو اچھے روش اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں نہ خیانت کرنا اور نہ مخالفانہ روش اختیار کرنا، اللہ کا رسول تمہارے مالدار اور غریب تمام لوگوں کا سرپرست ہے۔ صدقہ کا مال محمد رسول اللہ علیہ وسلم یا ان کے گھر والوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم اپنی پاکیزگی کی خاطر غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو۔

اس خط میں اہل حمیر کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے ان کے مال کا جو حصہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا ہے وہ صدر مملکت کے ذاتی مصرف میں نہ آئے گا بلکہ ضرورت مند مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ ان کو اطاعت کرکے سرکشی کی روش اختیار کرنے یا امانت ترک کرکے ادائے عشر و زکوٰۃ میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو فرد بھی مصیبت یا ضرورت سے پریشان ہوگا خواہ وہ مالدار ہو یا مفلس اللہ کا رسول اس کو سہارا دینے کے لیے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وہ حیثیت مراد ہے جو حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کو حاصل تھی۔ یہ بات حضرت عمر کے ایک اثر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو ایک خط لکھا تھا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اللہ ورسولہ مولی من لا مولی لہ کا حوالہ دے کر حکومت کی ذمہ داری بتائی تھی۔

حکومت کی اس سرپرستی میں بنیادی ضروریات کے علاوہ بشرطِ گنجائش افراد کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی داخل ہو جاتی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وفات پا جائیں۔ ان کے قرضے اسلامی حکومت کے خزانے سے ادا کیے جائیں گے۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں آپ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے لہٰذا جو قرض والا مر جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔

امام بخاری نے کتاب النفقات میں اس موضوع پر خاص عنوان "من ترک کلا او ضیاعاً فالی" قائم کر کے لکھا ہے کہ

پھر جب اللہ نے آپ پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپ نے فرمایا مجھ سے مسلمانوں کا اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے لہٰذا جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہو گی اور جو مال چھوڑ جائے، وہ اس کے وارثوں کا ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قرض کے علاوہ مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دوسری ذمہ داریوں مثلاً بے سہارا اولاد اور اہلیہ کی کفالت کے سلسلے میں بھی یہی اعلان فرمایا۔ امام ترمذی نے ابواب الفرائض میں "من ترک مالاً فلورثتہ" کے تحت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو بے سہارا چھوڑ جائے اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ترک ضیاعاً کے معنے یہ ہیں کہ اس حال میں چھوڑ جائے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور فالی کے معنے یہ ہیں کہ میں اس کی کفالت کروں گا۔

اسی مفہوم کی ایک حدیث ابوعبید نے کتاب الاموال میں حضرت مقدام بن معدی کرب کے حوالے سے نقل کی ہے:

جو متوفی مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے اور جو ذمہ داریاں چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ ہیں اور کبھی فرمایا وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہیں۔

اصل ارشاد میں من ترک کلا آیا ہے۔ ابوعبید کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں کل میں وہ تمام افراد داخل ہیں جن کی کفالت مرنے والے کے ذمہ ہو اور بچے بھی اس میں شامل ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو افراد اسلامی حکومت کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے ان کو اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا۔ اس حقیقت پر خلافت راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے مشہور شافعی فقیہ عزالدین بن عبدالسلام نے قواعد الاحکام میں یہ انکشاف کیا ہے کہ حضرت عمر نے اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام تقریر میں فرمایا تھا:

لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روک دوں۔

اس ارشاد کی تشریح خود عزالدین بن عبدالسلام نے اس طرح کی ہے:

اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلے میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرے تاکہ ان کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ اللہ سبحانہ سے اس کی تکمیل کی دعا کریں۔ حکمرانوں پر شہریوں کے حقوق کے موضوع پر یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے۔

اس اصول کا اعلان حضرت عمر نے اس وقت بھی فرمایا تھا جب آپ سعد بن مالک کو عراق کا امیر بنا کر روانہ کر رہے تھے۔ (البدایہ والنہایہ)

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا حضرت عمر کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے دیا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا:

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پوری کر دوں۔ جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر

اتنی گنجائش نہ رہے تو ہم باہمی امداد کے ذریعے گزر اوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیارِ زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش تمہیں پتہ ہوتا کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے۔ میں تو یہ بات تمہیں صرف اپنے عمل ہی سے سکھا سکتا ہوں۔ بخدا میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ حکومت کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو ذاتی ملکیت نہ سمجھ کر تمہیں واپس کر دوں اور تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو میں تمہارے ذریعے فلاح پاؤں گا اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو میرا انجام خراب ہو گا کچھ عرصہ میں خوشی منالوں گا مگر آخرت میں ہمیشہ خراب و غمگین رہوں گا۔ میرا حال یہ ہو گا کہ نہ کوئی کچھ کہنے والا ہو گا نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ عذر پیش کر کے معافی حاصل کر سکوں۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمر جب شام تشریف لے گئے تو حضرت بلال نے بڑی ہی موثر انداز میں آپ کو یہ بتایا کہ عوام بھوک سے پریشان ہیں۔ آپ نے فوراً مقامی حکام کو حکم دیا کہ ہر مسلمان کے لیے بقدرِ کفایت غذائی اجناس فراہم کریں۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ اور ابن جوزی نے سیرۃ عمر بن الخطاب میں بحوالہ کلبی یہ بھی بتایا ہے کہ،

ایک بار حضرت عمر اپنی چادر میں کنکریاں بھر کر اسے سر کے نیچے رکھے ہوئے مسجد میں سو رہے تھے کہ ایک پکارنے والے نے یا عمر یا عمر کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ آپ چونک کر اٹھے اور آواز کی سمت دوڑے۔ دیکھا کہ ایک اعرابی اونٹ کی نکیل تھامے کھڑا ہے اور اس کے گرد لوگ جمع ہیں۔ جب اس نے حضرت عمر کو دیکھا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ یہی امیرالمومنین ہیں۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ تجھے کس نے ستایا ہے۔ وہ اٹھ کر اپنا حال بیان کرنے لگا۔ چند اشعار پیش کیے جن میں قحط کی شکایت تھی۔ حضرت عمر اپنا ہاتھ سر پر رکھ کر چیخے ہائے عمر ہائے عمر۔ لوگو! تم سمجھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ قحط اور خشک سالی کا ذکر کر رہا ہے۔ عمر سیر ہو کر کھاتا پیتا ہے اور مسلمان قحط کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ کون ہے جو ان لوگوں کو رسد اور کھجوریں اور ان کی ضرورت کی چیزیں پہنچائے چنانچہ آپ نے دو انصاری افراد کو بہت سے اونٹوں کے ساتھ جن پر اجناس اور کھجوریں لدی ہوئی تھیں روانہ کیا وہ یمن گئے اور اپنے ساتھ جو کچھ لے گئے تھے اسے وہاں تقسیم کر دیا۔

کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمرؓ کا تصوّر اتنا بلند، اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ ابنِ سعد نے طبقات میں اور ابن جریر طبری نے "تاریخ" میں لکھا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر اسلامی مملکت میں کوئی جانور بھی بھوکا مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے حضور مجھے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا ارشاد ہے :

لو مات جمل ضیاعاً علی شط الفرات لخشیت ان یسألنی اللّٰہ،

اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ بھی بے سہارا مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے بارے میں اللہ سبحانہٗ مجھ سے پوچھیں گے۔

کفالتِ عامہ اور قیامِ عدل کی ذمہ داریوں کو بتمام و کمال ادا کرنے کے لیے آپ نے یہ پروگرام بنایا تھا ایک سال تک پوری اسلامی مملکت کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا تھا کہ :

اگر میں زندہ رہا انشاءاللہ ایک سال تک اپنی رعایا کے درمیان دورہ کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی خبر مجھ تک نہیں پہنچ پاتی ان کے مقامی حاکم مجھے ان کی ضروریات سے باخبر نہیں رکھتے اور خود وہ لوگ مجھ تک نہیں پہنچ پاتے۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ پھر الجزیرہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا، پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو مہینہ تک رہوں گا پھر بحرین جاؤں گا اور دو مہینہ وہاں رہوں گا۔ پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا، پھر بصرہ جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ خدا کی قسم! یہ سال کتنا اچھا ہوگا۔[1]

مگر شہادت نے آپ کو اس پروگرام کے مطابق عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ خود مدینہ میں آپ اہلِ حاجت کا پتہ لگانے اور ان کی حاجت روائی کا اہتمام کرنے کے لیے راتوں میں گشت لگاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ کو کسی کی کسی ضرورت کا پتہ اسی گشت کے دوران لگا اور آپ نے فوراً وہ ضرورت پوری کی۔ آپ اپنے ماتحت حکام کو بھی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہٗ جب ایک وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ نے ان لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ :

سنو! لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین

[1] تاریخ طبری

کو کھلانے کا سامان کرو۔

کفالتِ عامہ کی ذمہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے نگران کو ہدایت کی تھی کہ ضرورت مند اہلِ ذمہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گزر کسی کے دروازے پر ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا، ایک بوڑھا آدمی جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپ نے پیچھے سے اس کے بازو کو ٹھونکا اور پوچھا تم کس مذہب کے ہو اہلِ کتاب ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں بڑھاپے، ضرورت مندی اور جزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ (راوی) کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لا کر اُسے کچھ دیا پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا اور ان سے کہا اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو۔ کیونکہ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے جزیہ وصول کر کے کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔[1]

شام کے سفر میں آپ کو راستہ میں کچھ عیسائی ملے جو جذام میں مبتلا تھے۔ آپ نے ان کی معذوری کے پیشِ نظر ان کے لیے روزینہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔[2] غیر مسلم رعایا کی ضروریات کی تکمیل کا یہ اہتمام صرف حضرت عمرؓ کی شفقت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ابتداء ہی سے یہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک اہم اُصول تھا۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نقل کیے ہوئے اس خط سے ظاہر ہے جو آپ نے قبیلہ حمیر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب حضرت خالد بن ولید نے اہلِ حیرہ کے ساتھ جو عیسائی تھے معاہدہ کیا، تو اس میں ایک دفعہ یہ شرط بھی رکھی کہ:

میں نے ان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آ پڑے، یا جو آدمی پہلے مالدار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں اس کا جزیہ ساقط کر دیا جائے گا اور جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں مقیم رہے گا اس کے اور اس کے اہل و عیال کی کفالت

---

[1]، [2] تاریخ طبری۔

مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔

اوپر جو احادیث و آثار نقل کیے گئے ہیں ان کا تعلق بہت بنیادی ضروریات سے ہے اگرچہ بعض احادیث میں ادائے قرض کا بھی ذکر آیا ہے اور سرپرستی (ولایت) کی احادیث کا تعلق ہر طرح کی بنیادی ضروریات سے ہے۔ بعض دوسرے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ غذا، لباس، مکان اور علاج جیسی بنیادی ضرورتوں کے علاوہ دوسری ضروریات کی تکمیل کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کو شادی کرنے کے لیے بیت المال سے مالی امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کوفہ کے والی زید بن عبدالرحمٰن بن عمر بن الخطاب کو لکھا تھا جیسا کہ کتاب الاموال میں ابوعبید نے لکھا ہے کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے جنہوں نے شادی کی ہو اور ان کے پاس نقد مال نہ ہو۔

ان آثار کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ محروم اہل حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے۔ بعض بنیادی ضروریات کی تکمیل لازمی ہے مگر حتی الامکان دوسری اہم ضروریات کی طرف بھی توجہ کرے۔ مسلمان حکمرانوں کے فرائض پر اظہار خیال کرنے والے متعدد مفکرین نے اس فرض کی صراحت کی ہے۔ جن مفکرین نے اسے فرائض امیر میں داخل نہیں کیا ہے مثلاً ماوردی اور ابویعلی، ان کے پیش نظر غالباً یہ مفروضہ ہے کہ زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی تحصیل و تقسیم سے یہ مقصد بتمام و کمال حاصل ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں بنیادی اصول کو حافظ ابن حزم نے واضح کیا ہے۔ المحلی میں رقمطراز ہیں:-

> ہر ملک کے مالدار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان اہل حاجت کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے کہ وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کر سکیں۔ اور اسی طرح جاڑے اور گرمی کا لباس اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔

امام غزالی التبر المسبوک میں لکھتے ہیں:

> سلطان پر واجب ہے کہ جب اس کی رعایا تنگی میں مبتلا ہو اور فاقہ اور مصیبت سے دوچار ہو تو ان کی مدد کرے۔ بالخصوص قحط اور گرانی کے زمانہ میں، کیونکہ ایسے حالات میں لوگ کسب معاش میں ناکام رہتے ہیں اور گزر اوقات کرنا دشوار ہو جاتا ہے ایسے حالات

میں سلطان کو چاہیے کہ ان کو کھانا فراہم کرے اور سرکاری خزانے سے انہیں مال دے کر ان کی حالت بہتر بنائے۔

الجصاص نے احکام القرآن میں سورۂ یوسف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ،

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا جو قصہ سنایا ہے اور ان کے بارے میں قحط کے زمانے میں غذائی اشیاء کو محفوظ کر کے انسانوں میں بقدرِ ضرورت تقسیم کرنے کا جو واقعہ نقل کیا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہر زمانے میں حکمرانوں پر یہ واجب ہے کہ جب ان کو اندیشہ ہو کہ قحط کے سبب عوام ہلاک ہو جائیں گے تو ایسا ہی طریقہ اختیار کریں۔

اس مسئلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل پورے اسلامی معاشرے پر فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ کی بقدر کفایت تکمیل بالآخر ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہ مقصد کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل۔ جس حد تک افراد کے اپنے وسائل اور محنت اور پھر معاشرے کے رضاکارانہ تعاون سے حاصل نہ ہو سکے اس حد تک ریاست کو اپنے زیرِ اہتمام حاصل کرنا ہو گا تاکہ شریعت کا منشا پورا ہو سکے۔ بعض فقہا نے اس اصول کی صراحت بھی کر دی ہے۔ چنانچہ امام نووی نے منہاج الطالبین میں لکھا ہے،

فرض کفایہ میں شامل ہے ... مسلمانوں کی تکلیف دور کرنا مثلاً ننگے کو کپڑے پہنانا، اور بھوکے کو کھانا کھلانا جبکہ یہ ضروریات زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعے پوری نہ ہو رہی ہوں۔

منہاج الطالبین کے شارح شہاب الدین احمد البرلسی اس بیان پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

کیا تکلیف دور کرنے سے مراد اس مقدار کی فراہمی ہے جس سے سدِ رمق ہو جائے یا بقدرِ کفایت فراہمی مراد ہے۔

اور اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں،

اس بارے میں دو رائیں ہیں جن میں صحیح رائے دوسری ہے چنانچہ ایسا لباس فراہم کرنا ضروری ہے جس سے پورا بدن ڈھک جائے اور جو جاڑے اور گرمی کے حالات کے لیے موزوں ہو نیز کھانے کپڑے کے ساتھ وہ چیزیں شامل ہیں جو اتنی ہی ضروری ہوں، مثلاً طبیب کا معاوضہ، دوا کی قیمت اور معذور کے لیے ملازم جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس موضوع پر یہاں اموالکم بینکم بالباطل پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ

سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں کہ اشتراکیت کوئی معاشی نظام ہے۔ بحقیقت میں یہ معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے۔ سید رشید رضا نے صحیح لکھا ہے:

جن ممالک میں اسلامی ہدایات کو اپنایا جائے گا ان میں کسی کو تن پوشی اور بھوک کی شکایت نہ ہوگی۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں یکساں ہوں گے۔ کیونکہ اسلام کے نظام معیشت نے اہل اسلام پر یہ فرض کیا ہے کہ ہر حاجت مند اور ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ اور اس کی فرضیت ایسی ہی ہے جیسے فقیروں کے لیے، مسکینوں کے لیے سرمایہ دار کے مال میں حق فرض ہے۔ ان ممالک میں رہنے والا یہ یقین کرتا ہے کہ اُمت کا مال خود اس کا مال ہے۔ حالتِ اضطرار میں اس کے لیے ذخیرہ ہے۔ اسلام نے سرمایہ داروں کے اموال میں مال کی ایک مقررہ مقدار سرکار کے قبضہ میں دی ہے اور دوسرے واجباتِ وقت شہریوں کے اختیارِ تمیزی اور صوابدید پر چھوڑ کر خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے تاکہ ان میں جذبۂ سخاوت پیدا ہو۔ ہاں کسی ضرورت مند کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی کہ مالکوں کی رضامندی اور اجازت کے بغیر ان کے اموال میں دست درازی کرے۔ کیونکہ اس میں دوگونہ خرابیاں ہیں۔ ایک اخلاقی فضائل کی راہیں ختم ہو جاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ نکموں اور کاہلوں کا ایک پیشہ ور طبقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دو خرابیوں کے علاوہ اجتماعی زندگی کی ابتری اور انسانیت کا انحطاط اس کے نتیجے میں رونما ہوگا وہ اس سے الگ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے فرد کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہو اور نہ کوئی شخص دوسروں کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے۔ اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غریبوں کی اعانت حاجت مندوں کی حاجت روائی اور بیماروں کی عیادت و خبر گیری اور اسی نوع کے دیگر انسانی فضائل یکسر ناپید ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ اور قانون کی طاقت سے حوالہ کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور اس کے تصورات کی اصلاح، اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل اور ایک مناسب ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت میں نہ جائے۔ اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی اُمور میں بھی انسان کے آزاد اور بااختیار ارادے کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی

احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔

اکل بالباطل کا مطلب

اکل بولا ہے مگر مراد صرف کھانا نہیں بلکہ تمام تصرفات ہیں اور باطل کے معنے ناحق اور ناجائز کے ہیں کہ کسی کے مال کو باہم ناجائز طور پر نہ لو۔ چونکہ اموالکم بولا ہے اس لیے الجصاص نے اس سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جیسے کسی کے مال کو ناجائز اور ناحق استعمال کرنا از روئے آیت قرآنی حرام ہے ایسے ہی اپنے مال کو بھی ناحق اور ناجائز استعمال کرنا حرام ہے۔ اپنے مال کا ناجائز استعمال یہ ہے کہ ان کاموں میں خرچ کرے جن کے کرنے سے اللہ نے منع فرمادیا ہے۔ مثلاً سودی کاروبار کرے شراب کی دکان کرے، قمار پر مال لگائے اور باطل عبداللہ ابن مسعود کی تشریح کے مطابق ان تمام صورتوں کو اپنے اندر لپٹے ہوتے ہے جو شرعاً حرام ہیں۔ قرآن نے ایک لفظ بالباطل فرماکر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کیے ہوئے مال کو حرام قرار دے دیا۔ پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیلات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے فرمادی۔ آپ نے ہر ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرمادی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید و فروخت یا ناجائز اجارہ داری وغیرہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں مذکور ہیں۔ وہ درحقیقت اس قرآنی حکم کی تشریح ہیں اس لیے وہ سب احکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے احکام ہیں۔ احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنے احکام شرعیہ مذکور ہوتے ہیں۔ سب کا عام طور پر یہی حال ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قرآنی اشارہ کی تشریح ہوئی ہے خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی تشریح ہے[1]

باطل طریقے سے مراد لین دین، کاروبار اور تجارت کے وہ طریقے ہیں جن میں معاملہ کے دونوں فریقوں کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں ایک کا مفاد محفوظ ہوتا ہے۔ دوسرا ضرر یا غرر کا ہدف بنتا ہے۔ قرآن نے اس مفہوم کی طرف خود اشارہ فرمادیا ہے چنانچہ باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی نہی کے بعد یہ جو فرمایا ہے کہ الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم یہ مثبت پہلو سے اسی اجمال کی وضاحت ہے جو پہلے ٹکڑے میں پایا جاتا ہے۔ اس ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ معاملہ اور لین دین کی بنیاد جب حقیقی باہمی رضامندی پر ہے تب ہی اس سے جو منافع ہوتا ہے

[1] معارف قرآن م شفیع۔

وہ جائز ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی دھوکا پایا جاتا ہے یا اس میں ایک فریق کی بے بسی اور مجبوری کو دخل ہے تو اگرچہ وہ بظاہر اس پر راضی بھی ہو لیکن یہ اکل اموال الناس بالباطل کے حکم میں داخل ہے۔ اسی لیے معاملے اور تجارت کی وہ صورتیں اسلام میں ناجائز ہیں جن میں ضرر یا غرر کا شائبہ ہو۔ سُود اس کاروبار کی بدترین شکل ہے[1]

معاشی وسائل میں تجارت

اگرچہ معاشی وسائل ایک سے زیادہ ہیں مثلاً صنعت، زراعت، ملازمت وغیرہ مگر یہاں صرف تجارت کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ معاشی وسائل میں سب سے زیادہ ہے اور اس راہ سے حاصل شدہ منافع سب سے زیادہ پاکیزہ ہیں اور یا اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشی وسائل میں معیشت کی بنیاد بھی باقی ہے دوسرے وسائل بھی اگرچہ وسائل ہیں مگر حاصل ان کا بھی تجارت ہی ہے۔

یہاں قرآن تجارت کا لفظ بول کر ہر مالک کی ملکیت کا حق مان کر اسے یہ حق بھی دے رہا ہے کہ وہ اپنی املاک کو مزید نفع کمانے اور اس طرح انہیں اپنی ملکیت میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ اس مقصد کے تحت اپنی ملکیت کے ذریعے خود کوئی پیدا آور کاروبار کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کاروباری واسطہ سے بھی اپنا منشا پورا کر سکتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ دوسرے مواقع پر اس کی ترغیب بھی دی ہے۔

ملکیت کے ذریعے نفع کمانے کا حق سخت ترین اعتراضات کا ہدف بنایا گیا ہے۔ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کی تجویز بھی اس مخصوص حق کو تسلیم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔

نفع کمانے کا ذریعہ زیادہ تر مالک کا نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاجر تیار شدہ مال کو ایک جگہ سے خرید کر دوسری جگہ یا ایک وقت خرید کر دوسرے وقت فروخت کرتا ہے اسے مال خریدتے وقت مستقبل میں خواہ یہ مستقبل کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو، حالات طلب کا اندازہ لگاتا ہے۔ مال خرید کر بازار میں لانے کے وقت تک قیمت تبدیل ہو سکتی ہے جس کا تمام تر اثر اس کی آمدنی پر پڑتا ہے۔ یہاں لاگت قیمتِ خرید متعین ہوتی ہے اور قیمتِ فروخت غیر متعین اور غیر متیقن ہوتی ہے۔ تاجر کو بھی اپنا کاروبار عدم متیقن

[1] تدبر قرآن

کی فضا میں انجام دیتا ہے خواہ اکثر اوقات یہ عدمِ تیقن درجہ میں اس عدمِ تیقن سے کم ہو جو بڑے صنعتی کاروبار میں ہوتا ہے۔ تاجر کے پیسے بھی صنعت کار کی طرح نفع ونقصان دونوں ہی کا امکان رہتا ہے صنعتی کاروبار کرنے کی طرح تاجر بھی چند مفید سماجی اعمال انجام دیتا ہے۔ اسی طرح زراعت میں بھی پیداواری عمل کے آغاز اور فصل کی تیاری کے درمیان زمانی فصل پایا جاتا ہے کسان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی پیداوار کے بازار میں پہنچنے تک حالات طلب میں کیا تبدیلی ہو گی اور پیداوار کس نرخ پر فروخت کی جاسکے گی۔ وہ بھی اپنے کاروباری فیصلوں میں مستقبل کے بارے میں اپنے اندازوں کو ہی رہنما بناتا ہے۔ زراعت میں بھی لاگت متعین، مقرر اور آمدنی غیر مقرر اور غیر متیقن ہوتی ہے۔ الغرض صنعت، زراعت اور تجارت سب میں ایک رُوح کام کرتی ہے۔

تجارت کی دوسری شکل شرکت

سرمایہ کے نفع آور کاروبار کی تجارت میں دوسری شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنے سرمایہ کے ساتھ دوسرے فرد یا افراد سے مل کر کاروبار کرے۔ کاروبار میں ہر شریک سرمایہ اور کاروباری جدوجہد دونوں کے ساتھ آتا ہے اس شکل میں نفع اور نقصان میں ہر شریک پہلے سے طے شدہ نسبت کے مطابق حصہ دار ہوگا۔ یہ شرکت کی سادہ ترین صورت ہے۔

اس شکل میں اور ذاتی تجارت کی صورت میں ہونے والے نفع کے اندر اصولاً کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اس شکل میں نفع کے وقوع اور اس کے استحقاق پر علیحدہ گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شرکت سے متعلق تفصیلی قانونی بحثوں کا مطالعہ اسلامی فقہ کی کتابوں کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ تفصیلات میں مختلف فقہاء کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی نشاندہی یا اس پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہاں ہم صرف اہم باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر دو فریق برابر سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوں تو امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک ضروری ہے کہ وہ دونوں نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوں لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ غیر مساوی نسبتیں بھی طے کر سکتے ہیں کیونکہ اگرچہ سرمایہ ان کا برابر ہے لیکن کاروباری صلاحیتوں اور عملی جدوجہد کے اعتبار سے دونوں افراد کے درمیان فرق ممکن ہے۔ شرکت کی اس عام شکل کو فقہی اصطلاح میں شرکت العنان کہتے ہیں۔ اس شکل میں شرکا کی ذمہ داری سرمایہ میں ان کے حصوں کی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔

شرکت کی ایک اختلافی شکل شرکت المفاوضہ ہے۔ شرکاء اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔ خسارے کی شکل میں شرکاء کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ نفع کی صورت میں ہر شریک کو برابر برابر حصے ملتے رہیں۔ شرکت کی اس صورت میں صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

تجارت کی تیسری شکل مضاربت

سرمایہ کو تجارت میں لگانے کی تیسری شکل یہ ہے کہ مالک اپنا سرمایہ کسی کاروباری کے سپرد کر دے۔ سرمایہ والا صرف سرمایہ فراہم کرے اور کاروباری فریق اسی سرمائے کے ذریعے کاروبار چلائے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین صورت ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا شریک صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے سرمایہ نہیں لگاتا۔

کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں طے شدہ نسبتوں کے ساتھ حصہ دار ہوں گے۔ کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس کو سرمایہ لگانے والا برداشت کرے گا۔ کاروباری فریق کو صرف یہ نقصان ہوگا کہ اسے اپنی سعی و جہد کا کوئی صلہ نہ ملے گا۔ کسی فریق کے حق میں بہر صورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سرمایہ فراہم کرنے والا یہ شرط نہیں پیش کر سکتا کہ نفع ہو یا نقصان اسے ایک مقررہ رقم ضرور ملنی چاہیے۔ البتہ نفع کی تقسیم کے لیے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جو تناسب بھی چاہیں طے کر سکتے ہیں۔

فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا فریق نقصان کی ذمہ داری کاروباری فریق کے سر نہیں ڈال سکتا وہ یہ طے نہیں کر سکتا کہ نقصان کی صورت میں بھی اسے اپنا سرمایہ واپس ملنا چاہیے کاروبار میں خسارے کے باعث اگر پورا سرمایہ بھی ڈوب جائے تو اس کی یا اس کے کسی حصہ کی ادائیگی کاروباری فریق کے ذمہ نہ ہوگی۔ بہرحال ذاتی کاروبار ہو یا شرکت اور یا پھر مضاربت یہاں قرآن نے اس کے جواز کی بنیادی شرط یہ بتائی ہے کہ عن تراض منکم ہو۔

کاروبار کے جواز کی بنیادی شرط

اور اس بنیادی شرط عن تراض منکم کا مطلب یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب اور دھوکے سے۔ رشوت اور سود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر فی الواقع وہ مجبوری کی رضامندی ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جوئے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر فی الواقع جوئے میں حصہ لینے والا

ہر شخص اس غلط امید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی رضامند نہیں ہوتا۔ جعل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ اندر جعل وفریب نہیں ہے۔ اگر فریق ثانی کو معلوم ہوجائے کہ کوئی اس سے جعل وفریب کر رہا ہے تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔[1]

بہرکیف باہمی لین دین کو قرآن نے عن تراض منکم پر مبنی کیا ہے یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی رضامندی کے بغیر اپنی ملک نہیں بنا سکتا۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہاء اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لین دین میں باہمی رضامندی کی شرط تقریباً تمام متمدن اقوام کے قوانین میں مسلم ہے۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب، غصب وغیرہ کو اسی لیے جرم قرار دیا گیا ہے کہ ان تمام صورتوں میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے لیکن قرآن نے اس عام قانون کے علاوہ مالی معاملات اور مال کے لین دین کے متعلق چند اور قوانین کا بھی اضافہ کیا ہے جن میں پہلی دفعہ تو ابھی آپ پڑھ آئے ہیں اور دوسرے پارے میں بھی بحث گزر چکی ہے یعنی لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اور دوسری آپ تیسرے پارے میں سود کے موضوع پر پڑھ چکے ہیں کہ لا تظلمون و لا تظلمون۔ اسلامی معاشیات کے لیے یہ تینوں دفعات میرے خیال میں سنگ میل کا حکم رکھتی ہیں۔ سود قمار کا ان تینوں دفعات کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

ذاتی کاروبار، شرکت اور مضاربت میں سرمایہ کاروبار میں نقصان کے خطرہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے لیکن سود وقمار میں سرمایہ اپنی بحفاظت واپسی کی شرط کے ساتھ نقصان کے خطرے سے بری الذمہ ہو کر داخل ہوتا ہے۔ یہی فرق سود وقمار میں نفع کے استحقاق کو ختم کر دیتا ہے۔ اس اصول کی معقولیت پر مزید اطمینان کے لیے اس نفسیاتی کیفیت کا مطالعہ کر لینا بھی مفید ہوگا۔ جو سرمائے کے کاروبار میں شرکت کی ان دو مختلف صورتوں میں کاروباری کی ہوتی ہے۔ اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف قرآن نے عن تراض منکم سے اشارہ کیا۔ عن تراض منکم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دے دیا ہے وہ باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعے حلال ہوجائیں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی اللہ نے حلال کیا ہے اگر وہ تمہاری ملک نہیں کسی اور کی ملک ہے اس کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ تجارت کے ذریعے ہو اور باہم رضامندی سے ہو اس میں جھوٹ، فریب،

---

[1] تفہیم القرآن۔

دھوکا نہ ہو۔

لفظ تراضی سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ کاروبار اور لین دین میں لینے اور دینے والے کے لیے مجلس میں ایجاب و قبول ہو جانے کے بعد کوئی اختیار باقی نہیں رہتا ہے کیونکہ آیت تجارت کی راہ سے بشرط تراضی استعمال و تصرف کا پروانہ دے رہی ہے اور ظاہر ہے کہ پروانہ دینا بیع کے مکمل ہونے کی علامت ہے اور بیع کی تکمیل دلیل ہے لینے والے اور دینے والے میں سے کسی کے لیے اختیار نہ ہونے کی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجلس کے برخاست ہونے تک دونوں کو نہ لینے اور نہ دینے کا اختیار ہے ان کا مستند وہ ارشادِ نبوت ہے جو بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالے سے آیا ہے کہ:

لینے والے اور دینے والے کو اختیار ہے جب تک دونوں متفرق نہ ہوں۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوت صحیح ہے لیکن تفرق سے تفرقِ ابدان نہیں بلکہ تفرقِ اقوال مراد ہے یعنی مجلس کا برخاست ہونا مراد نہیں بلکہ بات چیت کا ختم ہونا مراد ہے۔ شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ تفرق سے بات چیت کا ختم ہونا عرف اور شریعت میں بکثرت آیا ہے۔ لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ آیتِ قرآنی استعمال کے جواز کی تو دلیل ہے مگر لینے والے اور دینے والے سے حق فسخ کو سلب کرنے کی دلیل نہیں ہے اور تفرق سے بات چیت کا ختم ہونا مجازی معنے ہیں حقیقی معنے نہیں ہیں۔

خودکشی اور باہم خونریزی کی ممانعت

پہلے ارشاد ہوا تھا کہ اپنے مال باہم ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور اب فرمایا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ اس کے معنے میں شارحینِ قرآن نے موقعہ اور مقام کی مناسبت سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کے معنے یہ بتائے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ یعنی باہم خونریزی نہ کرو اور یہ اندازِ بیان اس عمل کی قباحت کو اثر انگیز طور پر ظاہر کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ ارشادِ نبوت ہے المسلمون کا لنفس الواحدۃ سارے مسلمان ایک جان کی طرح ہیں۔ امام حسن بصری نے یہی معنے بتائے ہیں مطلب اس تعبیر کا یہ ہے کہ جو شخص معاشرے میں کسی کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنوں ہی کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ معاشرے کے تمام افراد سب بھائی بھائی ہیں اور ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔ اسی لیے قرآن نے ایک کے قاتل کو سب کا قاتل قرار دیا۔

الجصاص نے یہ معنے بتائے ہیں کہ خودکشی نہ کرو کیونکہ بہت سے نادان جب ان پر غم، خوف یا

کوئی سخت معاشی بدحالی آتی ہے تو خودکشی کر لیتے ہیں ۔ قرآن نے خودکشی کو سنگین جرم قرار دیا ہے کیونکہ خودکشی کرنے والا فی الواقع تکلیف کے سامنے ہمت ہار دیتا ہے اور جو تکلیف سے گھبرا کر ہمت ہار دیتا ہے اس کا اللہ پر ایمان نہیں ہے۔ اسی لیے ارشادِ نبوت میں خودکشی کرنے والے کی سزا جہنم بتائی گئی ہے اور آیت میں اسی معنے کو لے کر عمرو بن العاص مشہور صحابی نے شدید سردی میں غسل سے رخصت پر استدلال کیا ہے ۔

کچھ لوگوں نے اس فقرے کو پہلے فقرہ کا تتمہ بتایا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دُنیا میں اس سے نظامِ تمدن خراب ہونا ہے اور اس کے بُرے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی بدولت سخت سزا کا مستوجب بن جاتا ہے [1]

جن دو چیزوں کا یہاں قرآن نے ذکر کیا ہے یعنی لوگوں کے اموال کی حرمت اور انسانی جان کی حرمت۔ اسلام میں ان دونوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے ۔ قرآن میں فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان اسلامی مقاصد زندگی کے حصول کے لیے فعال تعاون اسلام کا ایک اہم تقاضا ہے ۔ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ مقاصد تمام و کمال حاصل ہوں جو اسلام کو مطلوب ہیں ۔ انہی مقاصد کے لیے فرد کو اپنے دائرہ کار میں اپنے ذرائع اور وسائل سے کام لیتے ہوئے اپنے دائرۂ عمل میں کوشش کرنی ہے ۔ اسلامی طرزِ زندگی میں ان دونوں کے درمیان مفادات کے ٹکراؤ کی اصولی طور پر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عملی زندگی میں مفادات کا ٹکراؤ اور اس بنا پر افراد کے درمیان اور فرد و اجتماع کے مابین کشمکش اور نزاع کی شکل اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں میں سے ایک کو خطرہ لاحق ہو جاتے مال کو یا جان کو۔ اسلامی زندگی کی کامیابی کا مدار ان دونوں کا تحفظ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات کے ذریعہ اس حقیقت کو اور زیادہ واضح کیا ہے ۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ

ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے قابلِ احترام ہے اور اس پر دست درازی ممنوع ہے اس کی جان اس کا مال اس کی آبرو ۔

---

[1] تفہیم القرآن

اب تک قرآن نے معاشرتی زندگی میں سعادت حاصل کرنے کے لیے آبرو کے تحفظ کی ہدایات کی تلقین کی ہے اور زیرِ نظر آیت میں جان اور مال کے تحفظ کی ہدایت کی ہے۔ آخر میں فرمایا ہے کہ ان اللّٰہ کان بکم رحیما یعنی تمہیں باہم ایک دوسرے کے مال ناجائز طور پر کھانے اور باہم قتل و خونریزی کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ کی ذات تم پر مہربان ہے اور یہ احکام اسی مہربانی و شفقت کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح تمہارے اموال اور تمہاری جانیں محفوظ ہوں گی۔

ظلم و سرکشی کی سنگین سزا

۲۹۔ اور یاد رکھو جو کوئی ظلم و سرکشی سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے دوزخ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ یعنی جو کوئی ظلم اور زیادتی سے باز نہ آئے بلکہ ناحق اوروں کا مال کھائے یا ظلماً کسی کو قتل کر ڈالے تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور ایسے ظالموں کو آگ میں ڈال دینا اللہ تعالیٰ کو دشوار نہیں ہے بالکل سہل اور آسان ہے تو اب کوئی یہ سمجھ نہ بیٹھے کہ ہم تو مسلمان ہیں، دوزخ میں کیسے جا سکتے ہیں اللہ تعالیٰ مالک و مختار ہے اس کو عدل و انصاف سے کون روک سکتا ہے [1]

اصل ارشاد میں ذالک آیا ہے۔ اس کے مشارالیہ کے مقرر کرنے میں مختلف خیالات ہیں۔ کچھ کی رائے میں اس کا مشارالیہ قتلِ نفس ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ قتلِ نفس اور لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانا ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ شروع سورت سے یہاں تک جس قدر محرمات گزرے ہیں سب کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ بغوی نے آخری رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ عدوان اور ظلم دونوں الگ الگ ہیں۔ عدوان یہ ہے کہ تم زور و زبردستی سے کسی کا مال چھین لو یا دوسرے کی جان کے لیوا ہو جاؤ اور ظلم یہ ہے کہ دھاندلی سے کسی کا حقِ واجب ادا نہ کرو بلکہ اس کو دبا بیٹھو۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی جان کا زور اور زبردستی سے لیوا ہو جائے گا یا کسی کے مال کو طاقت کے زور سے چھینے گا۔ یا جو شخص کسی کے حقِ واجب کو دھاندلی سے ادا نہ کرے گا اس کے لیے اللہ کے یہاں سنگین سزا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی نے بیان القرآن میں اپنے افادات میں بڑی لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ عدوان کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص واقع میں قتل کا مستحق نہ ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور ظلم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ غیر مستحق کا قتل ہو جانا تین طرح ہو سکتا ہے ایک یہ کہ فعلاً خطا ہوئی مثلاً گولی شکار پر چلائی اور وہ کسی آدمی کے لگ گئی، دوسرے یہ کہ قاضی و حکم سے اجتہاداً

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

غلطی ہوئی مثلاً تنقیح مقدمہ روئداد سے ثبوت ہوگیا اور گواہوں کو اپنے نزدیک معتبر سمجھا اور واقع میں وہ معتبر نہ تھے تیسرے یہ کہ حقیقتِ حال یعنی اس کا غیر مستحق ہونا معلوم ہے پھر بھی اس کو عمداً قتل کر ڈالا۔ ظلم کا لفظ کی وجہ سے پہلی دو صورتیں آیت کا مصداق نہ رہیں۔ اور عدوان کی قید سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص واقع میں مستحق قتل ہو مثلاً اس پر قصاص واجب ہے اس کا قتل کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ ولی کی درخواست پر واجب ہے اور ولی کو جائز ہے۔

پوشیدہ حقیقت کی طرف اشارہ

وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔ یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ انداز بیان ایک پوشیدہ حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں لیکن اللہ کی صفاتِ عدل و رحمت کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔ وہ اپنے آپ کو رعایتیں دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں اور بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے ہیں لیکن یہود کی طرح توقع بھی رکھتے ہیں کہ اللہ ان پر بہت مہربان ہے اس لیے سب کو بخش دے گا۔ قرآن نے جو یہود کا قول سیغفر لنا نقل کیا ہے وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس قماش کے لوگ شہ تو حاصل کرتے ہیں اس مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے لیکن ان کی حیلہ گر طبیعت آڑ تلاش کرتی ہے خدا کی رحمت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ جو لوگ ظلم و عدوان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو جہنم میں ڈالنا خدا کے لیے دشوار نہیں ہے۔

کبائر سے اجتناب کا نتیجہ

۳۰۔ اگر تم ان گناہوں سے بچتے رہو گے جو بڑے بڑے ہیں تو ہم تمہاری لغزشوں کو تم سے محو کر دیں گے اور تمہیں عزّت و تکریم کے مقام میں داخل کریں گے۔ پہلی آیت میں مذکور تھا کہ کوئی ظلماً کسی کے مال یا جان کو نقصان پہنچائے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس سے معلوم ہو گیا تھا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی بندہ کے لیے موجبِ عذاب ہے۔ اب اس آیت میں گناہوں سے بچنے کی ترغیب اور گناہوں سے اجتناب کرنے پر وعدۂ مغفرت اور جنت کی توقع اور طمع دلائی جاتی ہے تاکہ اس کو معلوم کر کے ہر ایک آدمی گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے اور معلوم ہو جائے کہ جو کبیرہ گناہ مثلاً کسی کا مال غصب یا سرقہ کرنے یا کسی کو ظلماً قتل کرنے سے بچ گیا جن کا ذکر ابھی گزرا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے جن کا مرتکب بغرض تحصیل سرقہ اور قتل ہوا تھا۔[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس موضوع پر چند باتیں تفصیل طلب ہیں۔ اول یہ کہ کبیرہ اور صغیرہ کی حقیقت کیا ہے دوسرے یہ کہ تکفیر سیئات کا مطلب کیا ہے اور پھر یہ کہ اس موضوع پر اہل السنت اور معتزلہ کے مابین فکری اختلاف کیا ہے۔

گناہ کبیرہ کسے کہتے ہیں ؟

گناہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر کوئی وعید ہو یا حد ہو یا اس پر لعنت آئی ہو یا اس میں مفسدہ کسی ایسے گناہ کا مفسدہ جیسا ہو جس پر وعید، حد یا لعنت آئی ہو یا وہ براہ تہاون فی الدین صادر ہوا ہو۔ احادیث میں کبائر کی جو تعداد آئی ہے وہاں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ احوال و ظروف کے مطابق وقت کے تقاضوں کا جواب ہے [1]

قرآن و حدیث کی رُو سے اور اقوالِ سلف کی تشریحات کے مطابق گناہ کبیرہ یہ ہے کہ اس پر قرآن میں کوئی حد شرعی یعنی دُنیا میں سزا مقرر کی گئی ہو یا اس پر لعنت کے الفاظ آئے ہوں یا اس پہ جہنم کی دھمکی ہو۔ ایسے تمام گناہ کبیرہ ہیں اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج کسی گناہ کبیرہ کے برابر ہوں۔ اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے [2]

سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ گناہ کبیرہ وہ ہے کہ جس پر اللہ اور اس کے رسول نے دُنیا میں غصہ یا کوئی حد مقرر کی ہو اور آخرت میں اس پر عذاب عظیم مرتب کیا ہو یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو یا اس کو کفر کے ساتھ موسوم کیا ہو اور صغیرہ وہ ہے کہ جس سے منع تو فرمایا مگر اس پر غضب و لعنت وغیرہ اُمور کو نہیں فرمایا [3]

گناہ کا چھوٹا بڑا ہونا اگرچہ حالات اور نسبتوں کے بدلنے سے تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے اس وجہ سے ان کی منطقی حد بندی ذرا مشکل ہے تاہم یہ ایسی چیز نہیں جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ جس طرح ہجرت اور جہاد بھی نیکی ہے اور راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا بھی نیکی ہے لیکن نیکی ہونے کے لحاظ سے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی طرح کسی کا گھر لوٹ لینا بھی گناہ ہے اور راستہ میں گندی چیز کا پھینکنا بھی برائی ہے لیکن دونوں برائیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ درحقیقت نیکی اور بدی دونوں کی چھوٹائی اور بڑائی کے ناپنے کے لیے پیمانہ ان کے اثرات و نتائج ہیں۔ اگر ہماری نگاہ دُور رس ہو اور ہم خواہشات نفس کی جانبداری سے بالاتر ہو کر حقائق پر غور کریں تو اس کے سمجھنے میں کوئی التباس پیش نہیں آسکتا [4]

---

[1] بیان القرآن [2] معارف م ش [3] معارف م ا [4] تدبر قرآن

تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں۔

۱۔ کسی کی حق تلفی خواہ وہ خدا ہو جس کی حق تلفی کی گئی ہے یا والدین ہوں یا دوسرے انسان یا خود اپنا نفس، پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو ظلم بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔

۲۔ اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلے میں استکبار، جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور عمداً ان کاموں کو نہ کرے جن کا اس نے حکم دیا ہے۔ یہ نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیت اپنے اندر لیے ہوتے ہو گی اسی قدر گناہ بھی شدید ہو گا۔ اسی معنے کے لحاظ سے گناہ کے لیے فسق اور معصیت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

۳۔ ان روابط کو توڑنا اور ان تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور درستی پر انسانی زندگی منحصر ہے خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں یا بندے اور بندے کے درمیان، پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملے میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کے توڑنے، خراب کرنے کا گناہ زیادہ ہے[1]

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور موضوع کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اگرچہ دوسرے علماء نے بھی اس موضوع پر داد تحقیق دی ہے لیکن جو سلجھی ہوئی اور لطیف بحث حافظ ابن القیم نے کی ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کبائر کے موضوع پر سلف میں اختلاف حقیقت کا اختلاف نہیں ہے بلکہ محض تعبیری ہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں سورۂ نساء میں زیر تشریح آیت تک اللہ سبحانہ نے جن جن باتوں سے منع کیا ہے وہ سب کبائر ہیں۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ کبائر میں سب سے اکبر گناہ شرک کرنا، خدا کی تدبیر سے نڈر ہونا، اللہ کی رحمت سے بے امید ہونا اور رحمت الٰہی سے مایوس ہونا ہے۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ خدا کی ہر نافرمانی کبیرہ ہے۔ علی ابن طلحہ کہتے ہیں۔ ایسا ہر گناہ کبیرہ ہے جس پر دوزخ کی غضب کی لعنت کی اور عذاب کی دھمکی ہو۔ ضحاک کہتے ہیں جس گناہ پر دنیا میں سزا اور آخرت میں عذاب ہو کبیرہ ہے۔ الحسین بن الفضل کہتے ہیں جس گناہ کو قرآن نے کبیر یا عظیم کہہ کر پکارا ہے وہ کبیرہ ہے۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کبیرہ وہ

---

[1] تفہیم القرآن

گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے وہ صغیرہ ہیں۔ مالک بن مغول کہتے ہیں۔ اہل بدعت کے گناہ کبائر ہیں اور اہل السنت کے صغائر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بدعت خود کبائر میں سے ہے اس کی اساس پر کیے ہوئے اہل السنت کے مقابلے میں کبائر ہیں۔ کچھ کی رائے میں ارادہ اور قصد سے کیے گئے سارے گناہ کبائر ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ سب گناہ کبیرہ ہیں جو جائز سمجھ کر کیے جائیں۔ اور سدی کہتے ہیں کبائر وہ گناہ ہیں جن سے اللہ نے منع کیا ہے اور سیئات ان کبائر تک پہنچنے کے ذرائع، مقدمات، توابع اور وسائل ہیں۔ سدی کا مطلب یہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ نے منع کیا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو بالذات منع ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بالذات تو ممنوع نہیں بلکہ ان کے مقدمات اور مبادی ہیں اس طرح صغائر نام ہوا مقدمات کا اور کبائر نام ہے مقاصد و غایات کا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کا میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

مثلاً کسی کا مال غصب یا سرقہ کرنے یا کسی کو ظلماً قتل کرنے سے بچ گیا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے جن کا مرتکب بغرض تحصیل و تکمیل سرقہ اور قتل ہوا تھا

تکفیر سیئات کا مطلب

تکفیر کے معنے ڈھانپ دینے اور مٹا دینے کے ہیں اور سیئات کے یہاں معنے چھوٹے گناہوں کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا نامۂ اعمال بڑے بڑے جرائم سے خالی ہوگا تو چھوٹی خطاؤں کو نظرانداز کر دیا جائے گا۔ یعنی اگر تم نے بڑے گناہوں سے دامن بچا کر رکھا تو اس بڑے گناہ کی راہ میں جتنے تم نے مقدمات، توابع اور وسائل اختیار کیے ان کو ملیامیٹ کر دیا جائے گا اور تم پر فرد جرم نہ لگائی جائے گی البتہ اگر کبائر کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو ان کی راہ میں جو تم نے وسائل اختیار کیے ہیں اور جن ذرائع سے ان کا ارتکاب کیا ہے اور اس سلسلے میں جو مقدمات اور توابع بھی تم نے اختیار کیے ہیں ان مقدمات و توابع اور وسائل و ذرائع کو جرائم کی فہرست میں لکھ لیا جائے گا اور پھر جو مقدمہ تم پر قائم کیا جائے گا اس میں یہ مقدمات و توابع بھی گرفت میں آجائیں گے۔

قرآن نے یہاں نکفر عنکم سیئاتکم کی تعبیر اختیار کی ہے نغفر لکم ذنوبکم نہیں فرمایا۔ دونوں تکفیر سیئات اور مغفرت ذنوب میں جوہری فرق ہے۔ یہاں چار چیزیں مغفرت، تکفیر، ذنوب اور سیئات، ذنوب سے مراد کبائر، سیئات سے صغائر ہیں۔ سیئات وہ ہیں جن میں کفارہ کام دے سکے اسی بنا پر سیئات کے لیے تکفیر آیا ہے۔ مغفرت کبائر کے لیے ہے اور تکفیر صغائر کے لیے۔ یہی وجہ

ہے کہ مصائب، ہموم اور غموم کے لیے تکفیر کا لفظ آیا ہے۔ مصائب ذنوب کی مغفرت کا نہیں بلکہ تکفیر کا سامان ہیں ذنوب کی بخشش و مغفرت مصائب سے نہیں بلکہ توبہ سے ہوتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کی لطیف تحقیق

حضرت شیخ الاسلام نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اور تکفیر سیئات کا جو مطلب بتایا ہے اور اس سلسلے میں معتزلہ اور اہل السنت کے مذہب کی جس لطیف انداز میں تنقیح فرمائی ہے وہ بہت عجیب وغریب ہے فرماتے ہیں:

اس آیت میں چند باتیں بحث طلب ہیں مگر اصل سب کی ایک ہی ہے کہ اس آیت کا عمدہ اور اصلی مطلب واضح ہو کر سامنے آجائے جس سے تمام امور کا جان لینا آسان ہو جائے۔

معتزلہ اور ان کے ہمنواؤں نے سرسری طور پر اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے یعنی پوری عمر میں ایک کبیرہ گناہ بھی نہ کرو گے تو پھر صغیرہ گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے خواہ ان کی مقدار کچھ ہو اور اگر صغائر کے ساتھ ایک یا دو بھی کبیرہ گناہ شامل ہو گئے تو معافی ممکن نہیں ہے بلکہ سب کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی۔

اہل السنت فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کو معافی اور گرفت کا اختیار بدستور قائم ہے۔ پہلی صورت یعنی اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے اور ایک بھی کبیرہ گناہ نہ کرو گے تو پھر صغیرہ خواہ کتنے ہوں ضرور معاف ہوں گے۔ اس صورت میں معافی کا لازم ہونا اور دوسری صورت یعنی اگر صغائر کے ساتھ کبیرہ ایک بھی ہو تو مواخذہ کا ضرور ہونا معتزلہ کی کم فہمی اور بدفہمی کا نتیجہ ہے اور اس آیت کے ظاہری الفاظ سے جو معتزلہ کا مذہب راجح نظر آتا ہے اس کا جواب کچھ نے تو یہ دیا ہے کہ انتفاء شرط سے انتفاء مشروط ہونا لازم اور ضروری نہیں ہے۔ اور کسی نے یہ بتایا کہ آیت زیر تشریح میں کبائر سے اکبر کبائر یعنی شرک مراد ہے اور کبائر کو جمع شرک کی قسموں کے متعدد ہونے کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ اور اسی کے ذیل میں اور باتیں بھی زیر بحث آگئی ہیں لیکن ہم ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے آیت زیر تفسیر کے ایسے محقق اور عمدہ معنے پیش کرتے ہیں جو نصوص اور عقل کے مطابق قواعد اور تحقیقات محققین کے موافق ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس آیت ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم اور دوسری آیت جو سورۃ نجم میں ہے۔

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم دونوں کا مدعا اور مقصد ایک ہے۔

صرف لفظوں میں تھوڑا سا فرق ہے تو اب جو مطلب ایک آیت کا ہوگا وہی دوسری آیت کا ہوگا۔ لہٰذا سورۂ نجم کی آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں صاف موجود ہے۔

عن ابن عباس قال ما رأیت شیئا اشبہ باللمم مما قال ابو ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ کتب علی ابن آدم حظہ من الزنا ادرک ذلک لا محالۃ فزنی العین النظر وزنی اللسان المنطق والنفس تمنی وتشتھی والفرج یصدق ذالک ویکذبہ۔

بشرط فہم اس حدیث سے دونوں آیتوں کے واقعی اور تحقیقی مطلب کا پورا سراغ ملتا ہے۔ اس مطلب کے مقابلے میں کوئی دوسری تقریر آیت کے مطلب کے لیے کیونکر قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے۔ بالخصوص معتزلہ کی ہرزہ سرائی کیسے قابلِ التفات اور لائقِ جواب سمجھی جاسکتی ہے اور واقعی حدیث مذکور کا مطلب اور حضرت ابن عباس نے جو اس سے بات نکالی ایسی عجیب اور قابلِ قبول تحقیق ہے کہ جس سے دونوں آیتوں کا مطلب واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے اور معتزلہ کی خرافات کی گنجائش اور اہلِ حق کو اس کی تردید کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اور ذیلی اور ضمنی اقوال واختلاف بھی بہت خوبی سے طے ہو گئے۔ چنانچہ اہلِ فہم معمولی غور و فکر کے بعد سمجھ سکتے ہیں۔ محض وضاحت کی خاطر ہم حدیث مذکور کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سورۂ نجم کی آیت میں جو لمم آیا ہے اور جس کی معافی کا ذکر ہے اس کی تعیین اور تحقیق کے متعلق ابوہریرہ کی حدیث سے بہتر ہم کو کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے ذمہ پر جو زنا کا حصہ مقرر فرما دیا ہے وہ ضرور اس کو مل کر رہے گا پس زنا میں آنکھ کا حصہ تو دیکھنا ہے اور زبان کا حصہ یہ ہے کہ اس سے وہ باتیں کی جائیں جو زنا کے لیے مقدمات اور اسباب ہوں اور نفس کا حصہ یہ ہے کہ زنا کی تمنا اور اس کی خواہش کرے لیکن فعل زنا کا تحقق اور اس کا بطلان دراصل شرمگاہ پر موقوف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر شرمگاہ سے زنا کا صدور ہو گیا تو آنکھ زبان دل سب کا زانی ہونا متحقق ہو گیا۔ اور اگر باوجود تحصیل جملہ اسباب و ذرائع کے شرمگاہ کا فعل نہ ہوا بلکہ زنا سے توبہ اور اجتناب نصیب ہو گیا۔ تو اب تمام وسائل زنا جو فی نفسہ مباح تھے صرف زنا کی تبعیت کی وجہ سے گناہ قرار دیے گئے تھے وہ سب کے سب لائقِ مغفرت ہو گئے یعنی ان کا زنا ہونا باطل ہو گیا اور گویا ان کا قلب ماہیت ہو کر بجائے زنا عبادت بن گئے کیونکہ فی نفسہ نہ معصیت تھے نہ عبادت بلکہ مباح تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ زنا کے لیے

وسیلہ تھے معصیت کے ذیل میں داخل ہو گئے تھے جب زنا کے لیے وسیلہ نہ رہے تو اب ان وسائل کا زنا میں شمار ہونا اور ان کو معصیت قرار دینا انصاف نہیں ہے مثلاً ایک شخص مسجد میں چوری کے ارادے سے گیا مگر وہاں جا کر عین موقعہ پر متنبہ ہو گیا اور چوری سے توبہ کی اور رات بھر نماز پڑھتا رہا تو ظاہر ہے کہ جو رفتار چوری کا ذریعہ تھی اب وہ توبہ اور نماز کا ذریعہ ہو گئی۔ بنا علیہ عبداللہ ابن عباس اس حدیث ابوہریرہ کو سن کر سمجھ گئے کہ لمم وہ باتیں ہیں جو دراصل گناہ نہیں مگر گناہ کا ذریعہ ہو کر گناہ ہو جاتی ہیں۔ اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ بڑے گناہ اور کھلے گناہ سے تو بچتے ہیں ہاں صدور لمم ان سے ہو جاتا ہے لیکن بڑے گناہ کے کرنے سے پہلے ہی وہ اس سے تائب ہو جاتے ہیں تو ابن عباس نے جیسے حدیث ابی ہریرہ سے آیت سورۃ نجم کا مطلب سمجھ لیا ہم کو چاہیے کہ وہی معنے حسب ارشاد ابن عباس اس آیت کے بھی معلوم کر لیں جس کے بعد بحمداللہ نہ ہم کو اس کی ضرورت ہو گی کہ اس آیت کی توضیح میں گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی مختلف تفسیریں نقل کریں اور نہ معتزلہ کے استدلال کے لیے جواب کی فکر ہو گی اور تکفیر سیئات کی وجہ اور دخول جنت کا سبب بھی بسہولت قواعد کے مطابق معلوم ہو جائے گا اور اجتناب کے معنے بھی ظاہر ہو جائیں گے۔ خلاصہ ہر دو آیت کا حسب ارشاد حدیث و بیان ابن عباس یہ ہوا کہ جو لوگ ان گناہوں سے رکیں گے اور ان کے ارتکاب سے اپنے کو بچاتے رہیں گے تو اس اجتناب کی وجہ سے ان کے وہ برے کام جو انہوں نے کسی گناہ کبیرہ کے سلسلے میں کیے ہیں معاف کر دیے جائیں گے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ زنا کے صغائر شراب نہ پینے سے معاف ہو جائیں گے۔ شراب پینے کی وجہ سے زنا کے صغائر کا مواخذہ لازم اور واجب ہو جائے گا واللہ اعلم۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث انشاءاللہ سورۃ مائدہ میں آ رہے ہیں۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ
مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا
مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ
فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ ع ۲

اور اللہ نے تم میں سے کچھ کو کچھ پر جو برتری دے رکھی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمائی کی ہے اس میں سے ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس میں سے ان کا حصہ ہے اور اللہ سے اس کے فضل کو مانگتے رہو بلا شبہ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اور ہم نے والدین اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے حقدار مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں ان کو ان کا حصہ دے دو بلا شبہ اللہ

ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔"۶۳

معاشرتی زندگی کی سعادت

اجتماعی زندگی کے اچھے ہونے کے لیے معاشرتی زندگی کی سعادت ناگزیر ہے اور معاشرتی زندگی میں سعادت اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک ظاہر کے ساتھ باطن بھی صاف اور پاک نہ ہو۔ علامہ بقاعی فرماتے ہیں کہ قتل اور اکل بالباطل کی ممانعت کے بعد تمنی سے ممانعت فرمائی ہے۔ اوّل الذکر ظاہر اعمال سے اور ثانی الذکر کا اعمال باطن سے تعلق ہے۔ اوّل کے ذریعے ظاہری گناہوں سے اور آخر الذکر کے ذریعے باطنی گناہوں سے طہارت ہوتی ہے۔ تمنی چونکہ حسد کا ذریعہ ہے اس لیے اس پر قدغن قائم کر دی۔ یہ تمنی ہی اکل بالباطل کا اور اکل بالباطل قتل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قفال مروزی کہتے ہیں کہ اکل بالباطل اور قتل کو حرام کرنے کے بعد اس آیت میں ان راہوں پر بھی اللہ سبحانہٗ نے پہرہ لگا دیا جو اکل بالباطل اور قتل کی طرف جانے والے ہیں۔ اس طرح اس آیت میں ایک بڑی اہم اخلاقی ہدایت دی گئی ہے جسے اگر ملحوظ رکھا جاتے تو معاشرتی زندگی کی سعادت سے انسان بہت آسانی سے ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے چند در چند امتیازات رکھے ہیں کوئی خوبصورت ہے کوئی بدصورت، کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بدآواز کوئی طاقتور ہے اور کوئی کمزور، کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت، کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں پیدا کیا ہے، کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدن کی ساری گوناں گونی قائم ہے اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے۔

جہاں اس فرق کو اس کی فطری حدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک قسم کا فساد رونما ہوتا ہے اور جہاں سرے سے اس فرق کو مٹانے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں دوسری قسم کا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے بے چین ہو جائے یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اسے جائز طریقہ

حاصل نہیں ہوتا اسے پھر وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔

۶۱۔ اور اللہ نے تم میں سے کچھ کو کچھ پر جو برتری دے رکھی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ یعنی حق تعالیٰ نے جو کسی کو کسی پر کسی امر میں فضیلت و شرافت اور اختصاص و امتیاز عنایت فرمائے تو تم اس کی ہوس اور حرص نہ کرو کیونکہ یہ بھی گویا ایسا ہی ہے کہ کسی کے خاص مال اور جان میں بلاوجہ دست اندازی کی جائے جس کی حرمت ابھی گزر چکی ہے۔ نیز اس سے باہم تحاسد و تباغض پیدا ہوتا ہے اور حکمتِ الٰہی کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔ بعض عورتوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا سبب ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ مردوں کو خطاب کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا اور میراث میں مردوں کو دوہرا حصہ دیا جاتا ہے عورت سے اس آیت میں ان سب کا جواب ہو گیا [1]

یہ آیت بھی قرآن کے مہماتِ معارف میں سے ہے اس میں دو باتیں بحث طلب ہیں ایک تمنا اور دوسری وہ چیز جس میں تمنا کی جاتی ہے یعنی ما فضل اللہ بہ ہمیں تمنا سے پہلے اس چیز کو جاننا چاہیے جس سے تمنا کی جاتی ہے۔

انسانوں کا صفاتی تفاوت

ما فضل اللہ بہ انسان کی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن نے مختلف پیرایوں میں ذکر کیا ہے کہیں فرمایا ہے: انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض اور کہیں ارشاد ہوا ہے۔ ورفع بعضکم فوق بعض درجات اور کہیں بتایا ہے رفعنا بعضکم فوق بعض درجات۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشاگاہِ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے، جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے اور نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے حصہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ صفات کے تفاوت کی اگر یہ نیرنگیاں یہاں نہ ہوتیں تو ان گنت بے شمار بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا ہے صرف ایک شخصیت بن کر رہ جاتا۔ ایک کو دوسرے سے

[1] افادات شیخ الاسلام

ممتاز کرنے کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا کیا جائے۔
باوجود ان تمام اختلافات و امتیازات کے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں صف بندی کی گئی ہے۔ ان میں اختلاف کے باوجود ائتلاف و مجانست اور مشابہت بھی یقیناً موجود ہے اور اتنی زیادہ کہ اسی کی بنیاد پر ہم ان کو کسی نہ کسی نوع یا صنف میں داخل کرتے ہیں۔ ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی امتیازات کے وحدت کی مشترک باتیں اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ان کی نوعی یا جنسی صف بندی ہو تی ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں، گدھوں، بیلوں کے افراد کو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان تمام انواع میں ایک نوع کے نیچے افراد انسانی بھی مندرج ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ انسان کے سوا حیوانات کی جتنی قسمیں ہیں۔ اگرچہ ان کے افراد میں بھی صفات و کمالات کا تفاوت ہے لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کے تمام افراد میں نہیں تو ایک نوع کی جو مختلف اصناف ہیں ان میں سے ایک صنف میں باوجود صفاتی تفاوت کے اتنی یکجہتی پائی جاتی ہے کہ جو کمالات ایک فرد میں پائے جاتے ہیں وہی کمالات اسی صنف کے دوسرے افراد میں بھی موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں آدمی پر غور کیجئے۔ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور مختلف نسلوں میں بٹا ہوا ہے لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں کو تو درکنار ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے تفاوت اور اتنا تفاوت بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان کہا جائے تو دوسرے پر لفظ حیوان کا اطلاق بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ بظاہر دونوں ہی آدمی ہیں، دونوں انسانی چہرے رکھتے ہیں لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی، اندرونی، بیرونی، ظاہری و باطنی کمالات و صفات کے لحاظ سے ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا ٹھیک اس کے بالمقابل تحت الثریٰ یا پاتال میں ہے، ایک خوبصورت ہے اتنا خوبصورت کہ دیکھنے والے تکتے رہتے ہیں دوسرا اتنا زشت رو کریہ المنظر بھدی شکل کا کہ دیکھ کر جی متلائے۔ ایک غبی ہے دوسرا ذہین، ایک چست و چالاک ہے دوسرا کاہل و پست، ایک فرشتہ خصلت ہے دوسرا شیطان سیرت، کسی کو شاعری سے لگاؤ ہے تو دوسرے کو ریاضی سے، کسی کا جی بیوپار اور کاروبار کو چاہتا ہے تو دوسرا کتابوں کا کیڑا نظر آتا ہے۔
جیسے حیوانی اصناف میں صفاتی تفاوت کی کمی نے ہر صنف اور ہر قسم کے افراد میں ان کی زندگی کی سطح کو مساوی اور ہموار رکھا ایسے ہی انسانی افراد میں اندرونی و بیرونی اعتبار سے کمالات و صفات کے تفاوت نے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے اندر مدارج کا ایسا اختلاف پیدا کر دیا کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر ملنی مشکل ہے۔
مدارج و مراتب کا یہ تفاوت افرادِ انسانی میں کمالات و صفات کے تفاوت کا نتیجہ ہے اور یہ تفاوت

اکتسابی نہیں بلکہ عموماً اکثر و بیشتر پیدائشی ہوتا ہے کیونکہ کسب و اکتساب سے بھی کمالات و صفات کی کمی و بیشی ان ہی رجحانات و میلانات کے تابع ہوتی ہے جنہیں ہر شخص ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔ شاعری کی صلاحیتوں کو ہر شخص محنت و ترقی دے سکتا ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ جسے شاعری سے قدرتاً مناسبت نہ ہو قوت و طاقت سے کوئی اسے شاعر بنا سکتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اکتسابی نشوونما کی توقع ان ہی صفات کے متعلق کی جاسکتی ہے جنہیں شکم مادر سے بچہ اپنے ساتھ لایا ہو۔ بہرحال صفات و کمالات کے اسی تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف رونما ہوا ہے۔

زیر تشریح آیت میں ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہی انسان کی وہ خصوصیت ہے جس سے انسانی زندگی کے سارے نظام متاثر ہوتے ہیں۔ معاشی زندگی کی وہ مساوات جو گدھوں، کتوں، بلیوں وغیرہ حیوانات میں پائی جاتی ہے۔ انسانی زندگی کا معاشی نظام اس سے بالکل مختلف ہے اور اس اختلاف یعنی فطری کمالات کی کمی و بیشی کی وجہ سے معاشی زندگی میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے۔ اس کو ختم کرنے کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کے اندر اسی وقت تبدیلی پیدا کی جائے جب رحم مادر میں مختلف جذبات و رجحانات کی صلاحیتوں اور مناسبتوں کو قدرت فراہم کرتی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن قرآن میں کائناتی حوادث کے کلیات میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں یعلم ما فی الارحام بھی ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہی جانتا ہے جو نطفہ میں انسانی کمالات بھرتا ہے کہ ماؤں نے کن صلاحیتوں کے بچوں کو اپنے ارحام میں محفوظ کیا ہے۔ اسی لیے قرآن نے فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض کے ذریعے اعلان کیا ہے کہ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں بلکہ براہ راست اللہ کا کام ہے اور جس طرح یہ اللہ کا کام ہے ٹھیک ایسے ہی تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج و مراتب کا فرق بھی کسی دوسرے کا نہیں بلکہ اللہ کا ہی کارنامہ ہے۔ ورفعنا بعضھم فوق بعض یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا جو اپنے ثمرات و نتائج کے لحاظ سے انمول اور قیمتی ہے اور اسی لیے دونوں کو اپنی اپنی صفات کی قیمت برابر نہیں ملتی۔ ایک کا درجہ دوسرے سے اسی تفاوت کی وجہ سے اگر بلند ہوتا ہے تو یہ بھی اللہ سبحانہ کی دین کا نتیجہ ہے۔

یہاں قرآن نے صفات و کمالات کے تفاوت کے اسی نتیجہ کو صرف ما فضل اللہ بعضکم علی بعض کے اطلاقی پیرائے میں پیش کیا ہے یعنی صرف یہ بیان کیا ہے کہ کچھ کو کچھ پر ہم نے ہی برتری اور فضیلت دی ہے لیکن یہ بات کہ کن باتوں میں فضیلت دی ہے اسے چھوڑ دیا ہے اور وجہ اس کی

یہ ہے کہ وہ اس قدر مختلف الجہات وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی۔ تفاوت صفات کے قانون پر تنبیہ کرنے کے لیے ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض کی تعبیر کافی ہے۔ ہر شخص اس کی تفصیلات کو تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں خود ہی سمجھ سکتا ہے مگر صفاتی وکمالاتی تفاوت کے اس قانون کے تحت بعض افراد کو بعض پر جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہو جاتی ہے ایک موقعہ پر اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق

اور خدا ہی نے برتری دی تم میں سے کچھ کو کچھ پر روزی میں۔

اس آیت میں فی الرزق کی تصریح سے معلوم ہو رہا ہے کہ نوعِ انسانی میں صفاتی وکمالاتی تفاوت کا قانون اللہ نے اس لیے نافذ کیا ہے کہ انسانوں میں رزقی فرق مراتب پیدا ہو ورنہ انسانی افراد کی معاشی سطح کو ہرگز برابر رکھنے کا ارادہ ہوتا تو جس قدرت نے ہزاروں جانداروں کی معاشی سطح کو تفاوت کے اس قانون سے الگ کرکے برابر کر دیا ہے۔ وہی قدرت صرف نوعِ انسانی کے افراد میں اس مساوات کے پیدا کرنے میں کب مجبور تھی[1]

مدارج کے اختلاف پر غم وغصے کی لہریں

اس آیت میں جہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ بعض کی بعض پر برتری خود خدا کی بنائی ہوئی ہے وہیں لا تتمنوا کہہ کر برتری اور ترجیحی سلوک کے ان قصوں میں آرزو آفرینیوں سے حق تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے مقصد یہ ہے کہ پیمائشی مغالطوں سے پیدا ہونے والے خواہ مخواہ کی اس غیر ضروری کوفت سے اہلِ ایمان کو نجات دلائی جاتی۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ اپنی اپنی واقعی ضرورتوں اور حاجتوں کی حد تک سوچنا اور اسی کے مطابق جدوجہد کرنا یہ اور بات ہے اور فیتے لگا کر اپنے آپ کو دوسروں سے ناپ ناپ کر بیٹھے بٹھاتے لوگ غم کے ہاتھوں میں خود اپنے ہی ہاتھوں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ قطعاً دوسری چیز ہے سعی وعمل کے تو ہم مکلف ہیں لیکن ناپا ناپی کے ان خرخشوں میں پڑ کر لوگ جو پریشان ہو رہے ہیں اور اسی کا نام معاشی تردد رکھ لیا ہے کسبِ معاش کی ہوس اور مادی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

معاشرے میں بے شمار برائیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان سبک دماغی کی وجہ سے آرزوؤں اور

---

[1] اسلامی معاشیات

تمناؤں کا شکار ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط ارمان اور خود ساختہ غم لوگوں کو ایسے میدان میں ڈال دیتا ہے جس میں آدمی کی ساری جدوجہد اور اس کی تمام قابلیت وصلاحیت ایک لاحاصل تصادم ایک بے فائدہ تنازع کی نذر ہو جاتی ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ ہر شخص کو معاشی جدوجہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ دوسروں کے ساتھ ناپ ناپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مائیگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں مبتلا نہ کرنا چاہیے۔ اس قرآنی آیت میں بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے پوری ہونے کے باوجود دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے رہتے ہیں وہ دنیا میں اگر تنہا آتے اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا تو دوسروں سے ناپنے کا موقعہ ہی ان کو نہ ملتا۔ پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی بسر ہوتا آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گزاریں۔ تجربہ بتا دے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قدرتی معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہو گا کہ قطعاً وہمی اور خود تراشیدہ تھا۔

تلاش معاش کا ذریعہ اکتساب ہے

۶۲۔ جو کچھ مردوں نے کمائی کی ہے اس میں ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس میں ان کا حصہ ہے اور اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو بلاشبہ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے لیے حصہ مقرر ہے جیسا کچھ وہ کام کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ ملتا ہے اس میں ہرگز کمی نہیں کی جاتی۔ جو کسی کو شکایت کا موقعہ ملے۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنی حکمت اور رحمت کے مطابق کسی کو خاص بڑائی اور فضیلت عنایت کرے' اس کی حرص اور شکایت کرنی بے جا ہوس ہے۔ البتہ اپنے عمل کے معاوضہ سے اور زیادہ ثواب وانعام مانگو تو بہتر اور مناسب ہے۔ اس میں کچھ خرابی نہیں تو اب جو فضل کا طالب ہو اس کو لازم ہے کہ عمل کے ذریعے سے طلب کرے۔ حسد اور تمنی سے فضل کا طالب نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے ہر ایک کے درجے اور استحقاق کو خوب جانتا ہے اور ہر ایک سے مناسب شان اس سے معاملہ کرتا ہے تو اب جس کو فضیلت عطا کرتا ہے سراسر علم و حکمت کے مطابق ہے کوئی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کیوں اس میں خلجان کرے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ مہمات معارف میں سے ہے اس پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ پچھلے فقرے میں تمناؤں، آرزوؤں، ولولوں، خواہشوں اور ارمانوں سے منع کیا تھا اور بتایا تھا کہ دنیا میں صفات و کمالات کے تفاوت سے جو نتائج فضل الٰہی کی صورت میں رونما ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر صرف آرزوؤں اور تمناؤں کی مخلوق بن کر نہ رہو بلکہ اس کے لیے دو کام کرو ایک یہ کہ اللہ کے سامنے اس فضل کی خاطر طلب کے ہاتھ پھیلاؤ اور دوسرے یہ کہ اکتساب کرو۔ قرآن نے جسے یہاں اکتساب کہا ہے اسے دوسرے موقعہ پر ابتغاء فضل کہا ہے کہیں فرمایا تبتغوا من فضلہ کہیں وابتغوا من فضل اللہ اور وابتغاءکم من فضلہ فرمایا ہے۔ اکتساب اور ابتغاء فضل دونوں قرآن کی معاشی اصطلاحات ہیں۔ آخر صحاح کی حدیث مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے روز اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہو لیں گے۔ ان ہی چار سوالوں میں سے ایک بڑا سوال یہ بھی ہوگا عن مالہ من این اکتسبہ وفیہ انفقہ یعنی اس سے مالیات کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس کے اکتسابی ذرائع کیا تھے؟ اور اخراجات کیا تھے؟ سچ پوچھئے تو قرآن کی معاشیات کا تعلق اکتساب ہی سے ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ولولوں اور آرزوؤں کی مخلوق نہیں بلکہ اکتساب اور ابتغاء فضل اللہ یعنی تلاش معاش کے لیے کرو، اس کی طاقت پیدا کرو اور ہمت کرو، محنت کرو اور اس کے ساتھ اللہ کی جناب میں سوال کے لیے ہاتھ اٹھاؤ اور اس دعا و اکتساب میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ جیسا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اکتساب و محنت صرف مرد کا کام ہے۔ عورت کا معیشی اور مالیاتی استقلال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں اس سے صاف انکار کر دیا کہ یہ اکتساب صرف مردوں کے حصے میں آیا ہے اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مرد کی کمائی مرد کے لیے ہوگی، عورت کی کمائی عورت کے لیے ہوگی۔ عورت بیٹی ہو کر باپ سے الگ، بہن ہو کر بھائی سے الگ، بیوی ہو کر شوہر سے الگ مستقلاً اپنی کمائی کا انتظام کر سکتی ہے اور اس کی مالک ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو مرد و عورت کی دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں کارخانہ معیشت کے محنت و اکتساب میں دونوں پڑے رہے ہیں۔

اکتساب یا ابتغاء فضل کا قرآن میں کیا مقام ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تلاش معاش کی خاطر سورۂ مزمل میں تہجد کی نماز کی فرضیت عام مسلمانوں سے ہٹا دی گئی۔ قرآن میں ہے:

علم ان سیکون منکم مرضی و اخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ۔

اللہ جان چکا ہے کہ تم میں کچھ لوگ بیمار ہوں گے اور کچھ تلاش معاش کی خاطر زمین پر چلتے پھرتے رہیں گے۔

آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ اگر تہجد کی نماز سب پر فرض کر دی جائے گی تو فضل اللہ کے ابتغاء یعنی تلاش معاش کے فریضے سے کچھ لوگ محروم ہو جائیں گے۔ قرآن نے نماز کے فریضہ کو اٹھا لینا گوارا کیا لیکن تلاش معاش کے فریضہ سے لوگوں کو روکنا گوارا نہ کیا۔

معاشی کاروبار پر اسلام کا زور

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اکتساب یعنی تلاش معاش کو قرآن کس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اولاً وہ اس معاملہ میں مرد و عورت کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا نہیں چاہتا اور پھر ہر ایک کے اکتساب کو اکتساب ہی کہتا ہے۔ یہ نہیں کہ مرد کا اکتساب تو اکتساب ہے اور عورت کا اکتساب ہی نہیں ہے۔

ثانیاً اس آیت نے یہ بھی بتا دیا کہ ہر شخص کی آمدنی کا اہم اور بنیادی ذریعہ اکتساب ہے خواہ یہ اکتساب تجارت کے ذریعے ہو یا زراعت کے، صنعت کے ذریعے یا اجارہ کے یہ اکتساب ہی مالکانہ حقوق کا ضامن ہوتا ہے اور مالکانہ حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے استعمال و تصرف کا حق ہے، مزید نفع کمانے کے لیے کاروبار میں لگانے کا حق ہے۔ انتقال ملکیت کا حق ہے اور اس کے تحفظ کا حق ہے۔ مقابلہ اور تنافس کا میدان قرآن کے نزدیک اکتساب ہی کا ہے اور اکتساب رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔ قیامت بھی قائم ہو رہی ہو تو اکتساب کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی مشہور حدیث ہے کہ:

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر قیامت بھی قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو اگر اس کے بس میں ہو کہ کھڑا نہ ہو جب تک کہ اس کو بولے تو چاہیے کہ پودے کو بوئے۔

اکتساب ہی کے موضوع پر اکرا ابو بکر الجصاص کا یہ استدلال صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ آیت قرآنی سے مستنبط ہے۔ قرآن کی آیت

> انشأکم من الارض واستعمرکم فیہا
> اٹھا کر کھڑا کیا تم کو زمین سے اور آبادکاری کرائی تم سے اس میں

کے تحت لکھتے ہیں:

یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کی کل آبادکاری کھیتی، باغبانی اور تعمیرات کے ذریعے واجب ہے
مذہب اور دین کے متعلق آج جو غلط نظریات پائے جاتے ہیں ان کی موجودگی میں کون یقین کر سکتا ہے
کہ قرآن اس آیت میں مما اکتسبوا اور مما اکتسبن کہہ کر اکتساب کو کیا مقام دے رہا ہے۔ کہاں یہ نقطہ نظر کہ
جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل
کرے گا اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے شغلوں میں انہماک، اکتساب اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی
خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مذہب کے ان غلط رجحانات کے استیصال میں قرآن نے کیا
کام کیا ہے ضرورت ہے کہ اس پر مستقل کام کیا جائے۔

صوفیاء کو نادانوں نے بدنام کر دیا ہے کہ ان کا دنیوی کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طبقہ کی
کوئی شخصیت نہیں بلکہ وہ کہ جن کا اساطین صوفیہ میں شمار ہوتا ہے میری مراد مشہور بزرگ حضرت شیخ
ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی ہیں۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ ارشاد نقل کیا ہے :

حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین
اور کھیت آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر خلق اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ
دنیا کی آبادکاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو یعنی فضول خرچی مقصد نہ ہو تو ہرگز آبادکاری
کو نہ چھوڑیں۔

آگے اور بڑھیے فرماتے ہیں :

اسی طرح اگر لوگوں کو پتہ ہوتا کہ آبادکاری کے کام کے چھوڑنے اور زمین کو بےکار پڑا
رہنے میں کتنا گناہ ہے تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے کہ آبادی کے جو اسباب ہیں ان کو برباد ہونے
کے لیے چھوڑ دیں۔

آگے تمثیل سے اس اسلامی نظریہ کی تشریح کرتے ہیں :

جو کوئی زمین کا کوئی ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے
اگر اس کی کوتاہی و سستی سے نوسو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے سو من
غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو اس سے روزِ قیامت سو من غلہ کی بازپرس ہو گی۔
اور اس کے برابر اس سے واپس مانگا جائے گا۔ (نفحات الانس)

آخر میں اس اعلان پر مولانا جامی نے ان کے بیان کو ختم کیا ہے کہ :

جو اپنی کاہلی سے زمین کی آبادکاری کو چھوڑ بیٹھا ہو اور اس کا نام اس نے ترکِ دنیا

رکھا ہو تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

معاشی جدّوجہد اور اکتساب بھی جہاد ہے

ممکن ہے کہ ارباب تنقید کو طبرانی کی اس حدیث پر سنداً کوئی اعتراض ہو جس میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرا پیشہ اور گزر بسر کا ذریعہ شکار ہے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے عموماً نماز باجماعت کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہوں میرے متعلق کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ :

بہت اچھا مشغلہ ہے مجھ سے پہلے جتنے پیغمبر گزرے سب شکار کرتے تھے اور شکار کی تلاش میں نکلتے تھے باقی جماعت کی نماز کے لیے تمہارے واسطے بس یہ کافی ہے کہ روزی کی تلاش میں جب تم کو جماعت سے غیر حاضر ہونا پڑے تو جماعت کی محبت، جماعت والوں کی محبت، اللہ کے ذکر کی محبت، ذکر اللہ میں مشغول ہونے والوں کی محبت اور اپنے اہل و عیال کے لیے حلال روزی کی تلاش کی خواہش الغرض یہ سب چیزیں جماعت کی غیر حاضری کی قائمقام ہیں تمہیں چاہیے کہ اپنے اہل وعیال کے لیے طلب حلال میں کوشش کرو۔ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

صاحب مجمع الزوائد کا جو طبرانی جیسے محدثین کی حدیثوں میں سنداً اگر کوئی سقم پاتے ہیں تو اس پر تنبیہہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ اس حدیث کے متعلق سکوت اختیار کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک یہ صحیح ہے اور پھر جب قرآن گواہ ہے کہ ابتغاء رزق میں اکتساب ہونا چاہیے اور اس میں حرج نہ ہونا چاہیے اسی لیے تہجد کی نماز کی فرضیت عام مسلمانوں سے ساقط ہوئی۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ولولوں، آرزوؤں اور ارمانوں میں نہ گزارو بلکہ اکتساب کرو، محنت کرو، کوشش کرو اور ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض کو حاصل کرو۔ خواہ یہ فضیلت مردوں میں باہم ہو یا عورتوں میں باہم ہو یا عورتوں اور مردوں میں۔ جو فضائل غیر اختیاری ہیں ان کے پیچھے نہ پڑو کہ وہ سعی و عمل سے حاصل نہیں ہوتے۔ ان فضائل کی بہم رسانی کے لیے تگ ودو کرو جو اختیاری ہیں مثلاً مالدار ہونا، معتبر ہونا، نیک ہونا، عالم ہونا، یہ فضائل تمناؤں سے نہیں اکتساب سے حاصل ہوتے اور اکتساب کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔

تلاشِ معاش کا ذریعہ دُعا ہے

آخر میں فرمایا واسئلوا اللہ من فضلہ یعنی تلاش معاش کی ایک تدبیر اگر اکتساب ہے تو اس کے ساتھ ہی تلاشِ معاش کی دوسری تدبیر اللہ سبحانہ سے مانگنا اور سوال کرنا ہے۔ جیسے وہ حصولِ معاش کی حکیمانہ تدبیر ہے ایسے ہی یہ بھی حصولِ معاش کا حکیمانہ طریق ہے۔ کیونکہ اپنی معاشی ضرورتوں کی خاطر ہم جن چیزوں کے محتاج ہیں۔ جن راہوں سے وہ پیدا ہو کر آرہی ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچا کر عمل کا صحیح طریقہ اختیار کرنا اگر حصولِ معاش کا حکیمانہ طریق ہے تو پھر ان ہی چیزوں سے افادہ و استفادہ کے معاملہ میں اس طریقِ عمل کو اختیار کرنا ہمارے لیے کس درجہ ناگزیر ہے جو علم و یقین کی اس روشنی کا تقاضا ہے جو خود ان چیزوں کے خالق اور پیدا کرنے والے کے متعلق ہم اندر رکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے باہر ہوا ہو رہا ہے اور جو قوتیں اور طاقتیں ہمارے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن کا دعویٰ ان کے بارے میں یہ ہے کہ ان سب کی تخلیق اور ان کے عمل پیدائش کا تعلق اللہ کی یگانہ ذات اور اس کے ارادے سے ہے جب سب کچھ اس کے قبضے میں ہے تو اس سے مانگنا بھی ویسا ہی طریق ہے جیسا کہ حصولِ معاش کے لیے محنت و اکتساب کی تدبیر کرنا۔ میرے خیال میں معاشی جدوجہد کے سلسلے میں عمل کا پہلا طریقہ اگر کوئی عقلی تدبیر ہے تو دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عقلی تدبیر کہلانے کا مستحق ہے یہی واسئلوا اللہ من فضلہ کا منطوق ہے۔

دُعائی تدبیر کی کامیابی و ناکامی

ناکامیوں کے ہزارہا تجربات کے بعد بھی جب اکتساب کا چھوڑ دینا بدعقلی کی دلیل ہے تو صرف اس لیے کہ دعائیں بھی کبھی قبول نہیں ہوتی ہیں۔ تدبیر کے اس طریقہ سے محض اس لیے بے تعلق ہو جانا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ اکبر! اپنے اختیار پر بھی جنہیں اختیار نہیں ہے اور اپنا اقتدار بھی جن کے اقتدار میں نہیں ہے ان کو اختیار و اقتدار کا اگر حصہ مل جاتا ہے ان کی بارگاہوں میں لگاتار نامنظوریوں کے باوجود درخواستوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا۔ ہزار دفعہ جس کی درخواست مسترد ہو چکی ہے وہ ایک ہزار ایک کے بعد بھی منظوری کی توقع کرتے ہوتے، درخواست دینے سے نہیں گھبراتا۔ پھر پتہ نہیں کہ جو حکوم

نہیں حاکم ہے تابع نہیں متبوع ہے جاہل نہیں عالم ہے کھلے لفظوں میں جو بندہ نہیں خدا ہے۔ اگر کسی بندے کی کسی درخواست کو کسی وقت قبول نہیں کرتا یا جاہل کے جہل کا اپنے علم کو تابع نہیں بناتا تو کیسے مان لیا جائے کہ جس کے اختیار میں سارے جہان کے اختیارات ہیں اور جس کے اقتدار کے ساتھ سارے جہان کے اقتدارات اٹھے ہوئے ہیں۔ بندے کے کسی مطلبے کو پورا کرنا اس کے اختیار سے خاکم بدہن باہر ہے۔ اللہ اکبر جو اپنی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو کافر کہتا ہے آپ نے اس سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے مایوس بنا لیا۔ قرآن ہی میں ہے۔

انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون

اس کا کھلے لفظوں میں مطلب یہی ہے کہ کافر ہوئے بغیر کوئی اللہ سبحانہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ ایمان و اسلام کے دعوی کے باوجود اللہ کی رحمتوں سے مایوس ہو کر دعا و استغفار معاشی مشکلات کی راہ میں جھوٹی عقل تسلی سمجھنا بہت بڑی جسارت ہے۔

دعائی تدبیر اور عقلی تدبیر میں ہم آہنگی

قرآن کی بتائی ہوئی اور نبوت کی برتی ہوئی راہ یہی ہے کہ دونوں میں ہم آہنگی ہو عقلی تدبیر بھی ہو اور دعا میں انہماک بھی ہو۔ غزوۂ بدر ان دونوں کی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے ایک طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جنگ کے ضوابط رائج اختیار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔ میدان جنگ میں بہترین موقعہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیر کب چلائے جائیں۔ تلوار کب نکالی جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے غیر پر کس وقت حملہ کیا جائے، ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر کیا، دشمنوں کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی، مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک ان کو منقطع کرنے کی تدبیریں وغیرہ وغیرہ ان میں سے ہر بات کی تعلیم اور ان پر اپنی خاص توجہ، براہ راست حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قائم کیے ہوتے تھے یہاں تک کہ دست مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ دوسری طرف دعا میں اتنا انہماک تھا یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے ہاتھ میں ہے اس سے مانگنے میں اور واسئلوا اللہ من فضلہ پر عمل میں اتنا زور صرف ہو رہا تھا کہ حضرت علی بیان فرماتے ہیں کہ،

میں بدر کے روز ایک لڑائی لڑا، پھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گرے ہوئے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں۔ میں واپس میدان جنگ میں آیا اور لڑا پھر گیا تو میں نے حضور کو سجدے میں ہی پایا۔ (فتح الباری)

سجدے سے سر اٹھایا، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوتے ہیں، تن بدن کا ہوش نہیں ہے، شانہ مبارک سے چادر شریف ڈھلک کر گر گئی ہے، پورے انہماک و استغراق، دل کی ساری قوت و توجہ، اصرار الحاح کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں:

یا اللہ آپ کو یاد دلاتا ہوں، آپ کا عہد اور آپ کا وعدہ اے اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی عبادت نہ ہو، اے اللہ اگر یہ مٹھی بھر جماعت مسلمانوں کی تباہ ہو گئی تو زمین میں آپ کی عبادت کا نظام نہ رہے گا۔ (صحیح بخاری)

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی مدد کو بے قرار اور اضطراب کو ڈھونڈا جا رہا ہے کہ بقول معلم الامت حضرت عبداللہ ابن مسعود کے

ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم شدہ چیز کو کوئی ڈھونڈھ رہا ہو اس طرح جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کو ڈھونڈھ رہے تھے۔

اللہ کی بارگاہ اس بیقراری کو دیکھ کر دوسروں سے نہیں رہا جاتا اور جیسا کہ بخاری میں ہے:

تب حضرت ابوبکر نے آپ کے دست مبارک کو پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیجئے یا رسول اللہ۔

اسی کی تفصیل مسلم میں ہے کہ

ابوبکر آئے اور آپ کی چادر کو پکڑ کر آپ کے شانہ مبارک پر ڈالا پھر آپ سے لپٹ گئے اور بولے اے اللہ کے نبی اللہ آپ سے کیا گیا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

وہ اکتساب تھا اور یہ فضل خداوندی کی بھیک ہے وہ عقلی تدبیر تھی اور یہ دعائی تدبیر ہے۔

دونوں تدبیروں میں فرق

تدبیر عقلی یا تدبیر دعائی ہیں، دونوں تلاش معاش، ابتغاء فضل کی تدبیریں لیکن دونوں میں فرق ہے معاش پیدا کرنے والا ایک ہے اور جن راہوں سے معاش آ رہی ہے وہ بے شمار ہیں۔ اور اتنی بے شمار کہ بے حد و حساب ہیں، ایک ایک قطرے کو موتی بننے کے لیے بقول غالب

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

کے طرح طرح کے پیچیدہ اور نازک قوانین سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے تدبیر عقلی بہ نسبت تدبیر دعائی کے زیادہ آسان ہے۔

ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے، سوال کرنے کا تعلق رکھنا ایسا معاملہ ہے کہ جس سے

کچھ نہیں ہوتا ہے وہ بھی بہرحال اس کام کو تو کر ہی لیتا ہے اسی لیے اس کا جذبہ اللہ سبحانہ نے ہر ایک میں ودیعت کیا ہے لیکن تدبیر کے عقلی پہلو کی پابجائی میں عمل کو پیدائش کے ان پیچیدہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ ہاتھ سے چمچہ کو منہ تک پہنچانے کے لیے آدمی کو ہزاروں مرحلوں کا اندیشہ گزرتا ہے یا جیسے غالب نے کہا ہے کہ ایک قطرہ کو موتی کی حالت تک پہنچنے کے لیے دریا کے ہر حلقہ موج میں نہنگوں کے سینکڑوں کھلے ہوئے دہانوں کو بند کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تدبیر کے اس مرحلہ کی پابجائی کا حق ادا کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں جان کو جوکھوں میں ڈالنا پڑتا ہے اس پر وہی قابو پا سکتا ہے جو پیدائش کے سارے قوانین پر گہری نظر رکھتا ہو اور عمل کی قوتوں سے بھی سرفراز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تدبیر عقلی کا ہر شخص اپنی اپنی عقل اور قوتِ عمل ہی کے حساب سے مکلف ہوتا ہے۔ اسے یہاں قرآن نے اکتساب کی مردوں اور عورتوں کی طرف نسبت کر دی ہے اور حکم نہیں دیا ہے تاکہ اس کی پابجائی ہر شخص اپنی عقل اور قوتِ عمل کے مطابق کر سکے برخلاف دعائی تدبیر کے کہ وہ کلی تدبیر ہے۔ یعنی پیدائش کی راہوں سے نہیں بلکہ خود پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنا ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی نہیں کر سکتا مانگنے پر تو اسے بھی قدرت ہوتی ہے اور مانگ ہی اس کی آخری پناہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اس پر عمل نہ کرنے والے کے لیے سنگین وعید آئی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ ؛

جو اللہ سے نہیں مانگتا ہے اللہ اس پر غصہ فرماتا ہے ۔

تدبیر کی یہ وہ راہ ہے کہ جب بھی کامیابی سے نہ ملے پھر بھی کامیابی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ ہماری ساری تدبیروں میں حصولِ معاش کے لیے اس عجیب و غریب اور بے خطا تدبیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے واسئلوا اللہ من فضلہ فرما کر مسلمانوں کے لیے روحانی اور مادی ترقیوں کے لیے ایک راہ کھول دی ہے۔ خبر نہیں کہ معاشی ضرورتوں کے لیے اس تدبیر کو لوگوں نے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اللہ اکبر جس تدبیر کے بارے میں نبوت نے ضمانت دی تھی کہ ؛

جس کے لیے دعا کی راہ کھول دی گئی اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔

اس کے تاثیری نتائج کے متعلق لوگوں کے دلوں میں انکار پیدا ہو گیا ہے و نا للہ فالی اللہ المشتکی۔

حصولِ معاش کے دیگر ذرائع

۶۳ ۔ اور ہم نے والدین اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے حقدار مقرر کر دیے ہیں۔

اور جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں ان کو ان کا حصہ دے دو۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔
یعنی مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لیے تم میں سے اے مسلمانو! ہم نے وارث مقرر کر دیے اس مال کے جس کو چھوڑ کر مریں اور قرابت والے کسی کو اس سے محروم نہیں رکھا اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے ان کو ان کا حصہ ضرور پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمام امور سے باخبر ہے کہ وارثوں کو کیا حصہ ملنا چاہیے اور جن سے معاہدہ ہوا ہے ان کو کیا ملنا چاہیے اور ہمارے ان احکام کو کون بجا لاتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے [1]
اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اکتساب ہی حصولِ معاش کا ذریعہ نہیں ہے اکتساب کے علاوہ بھی حصولِ معاش کے ذرائع ہیں۔ مثلاً وراثت اور معاہدہ۔ ان ذرائع سے بھی انتقالِ ملکیت ہو کر معاشی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

وراثت انتقالِ ملکیت کی ایک شکل خونی رشتہ کی بنا پر ملکیت کا ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہونا ہے۔ انتقالِ ملکیت کی اس شکل کو اکتساب سے جدا کر کے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی شرط نہیں ہے۔ یہ انتقال مالک کی مرضی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات اس کے علی الرغم قرآن کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ قرآن نے ان رشتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر مرنے والے کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو منتقل ہوں گے۔ وراثت کا قانون پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس کی مزید تشریح سنت نے کر دی ہے۔ ضابطہ میراث کے مطابق ایک فرد کو اس کے ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزہ کے انتقال پر ان کی ملکیت کا ایک حصہ مل جاتا ہے۔ مرنے والے کے املاک کی اس ضابطہ کے مطابق تقسیم لازمی ہے۔ اس میں خواہ میراث پانے والے کے اکتساب کو کوئی دخل نہیں ہے۔

حصولِ ملکیت کا دوسرا ذریعہ معاہدہ ہے یعنی کسی مملوکہ چیز کا شرعاً درست معاہدے کے ذریعے ایک مالک سے دوسرے مالک کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اس میں سارے عقود آ گئے۔ عورت کو جو مہر اور نان و نفقہ عقدِ نکاح کے ذریعے شوہر سے حاصل ہوتا ہے دین، اجارہ، مزارعت۔ مصالحت کے سارے معاملات، سیاسی، ملکی، بین الاقوامی عہود، اس میں آ گئے: عقدِ بیع، عقدِ موالات اور وصیت سب اس میں داخل ہیں۔ وصیت کے علاوہ ایسے تمام معاہدوں میں طرفین کی رضامندی شرط ہے۔
اصل ارشاد میں موالی آیا ہے۔ یہ عربی زبان میں وسیع معنے میں آتا ہے۔ ولی سے بنا ہے اور ولا معنے

[1] افادات شیخ الاسلام

قرب بھی استعمال ہوا ہے خواہ وہ قرب کسی لحاظ سے ہو اس لیے لفظ وارث یعنی عصبہ، ابن العم، حلیف، آزاد شدہ غلام، غلام کو آزاد کرنے والا۔ اس آیت میں مولی یعنے وارث آیا ہے یعنی وہ لوگ جن کو ترکہ پر ولایت حاصل ہے یا وہ لوگ جن کو میت سے قرب حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن مردوں کا اپنی کمائی اور جن عورتوں کا اپنی کمائی میں حصہ ہے ان کے ورثہ بھی ہیں جن کا ان مردوں اور عورتوں کے ترکہ میں حصہ ہے اور یہ ورثہ کون ہیں؟ یہ والدین اور اقربا ہیں اور وہ سب لوگ ہیں جن سے تمہارا عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ عہد و پیمان والے کون ہیں؟ اصل مطلب تو عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں وصیت، عقد موالات اور دین وغیرہ سب داخل ہیں۔

مولی الموالات اور عقد موالات

بعض شارحین قرآن نے اس آیت کے مدلول میں مولی الموالات کو بھی داخل کیا ہے۔ مولی الموالات وہ دو شخص کہلاتے ہیں جو باہم قول و قرار کر کے ایک دوسرے کے اس طرح دوست بن گئے ہوں کہ اگر ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا اسے ادا کرے اور ایک کی وفات پر دوسرا اس کی میراث پائے اسی کو عقد موالات کہتے ہیں۔ عرب میں یہ رسم اور دستور تھا جو لوگ اس رسم کو قرآن کی اس آیت کا منطوق بتاتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے ذریعے قرآن نے اس دستور کو قائم رکھا اور مولی الموالات کو میراث میں حقدار قرار دیا۔ انصار و مہاجرین میں مواخات کی بنا پر میراث کا جو سلسلہ باہم جاری ہوا اس کا سرچشمہ بھی یہی آیت ہے۔ شیخ الاسلام رقمطراز ہیں :

> اکثر لوگ حضرت کے ساتھ اکیلے اکیلے مسلمان ہو گئے تھے ان کا سب کنبہ اور تمام اقربا کافر چلے آتے تھے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی کر دیا تھا۔ وہی دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے جب ان کے اقربا بھی مسلمان ہو گئے تب یہ آیت اتری کہ میراث تو اقربا کا حق ہے اب رہ گئے وہ منہ بولے بھائی تو ان کے لیے میراث نہیں۔ ہاں زندگی میں ان کے ساتھ سلوک ہے اور مرتے وقت کچھ وصیت کر دے تو مناسب ہے مگر میراث میں کوئی حصہ نہ ملے گا۔[1]

مولانا کے ارشاد میں دوسرے شارحین قرآن کے مقابلے میں کچھ معنویت ہے۔ مولانا الذین عقدت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایمانکم کا مصداق وصیت وغیرہ کو قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرے شارحین قرآن نے اس آیت کو مواخات کی بنا پر وراثت کا پروانہ قرار دے کر سورۃ انفال کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے اسے منسوخ قرار دیا اور کچھ نے سورہ احزاب کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے اسے منسوخ فرمایا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ابتدائے اسلام میں جب تک کہ اکثر مسلمانوں کے رشتہ دار مسلمان نہ ہوتے تھے اور اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم انصار و مہاجرین عقد مواخات جس کا اثر اسی موالات جیسا تھا منعقد فرمایا۔ اس وقت اسی رسم قدیم کے موافق حکم رہا کہ انصار و مہاجرین میں باہم میراث جاری رہی۔ پھر جب لوگ کثرت سے مسلمان ہوگئے تو اس میں اول ترمیم وہ ہوئی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی چھٹا حصہ مولی الموالات کو اور باقی دوسرے ورثہ کو دلایا جاتا تھا۔ پھر بعد چندے سورۃ احزاب کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے بالکل ہی اس مولی الموالات کا حصہ منسوخ ہوگیا[1]

اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت میں موالی سے وارث مراد ہیں اور والذین عقدت ایمانکم کے بارے میں یہ ہے کہ جب مہاجر مدینے آئے تو مہاجر انصاری کی وراثت پاتا تھا۔ اس مواخات کی وجہ سے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان قائم کی تھی پھر جب یہ آیت نازل ہوئی ولکل جعلنا موالی تو میراث منسوخ ہوگئی اور دوسرے فقرہ میں والذین عقدت ایمانکم میں ان کے لیے نصرت، مہربانی ہے میراث باقی نہیں رہی ہاں اس کے حق میں وصیت ہو سکتی ہے۔

جن لوگوں نے آیت کو منسوخ کہا ہے انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مواخات والے جو وراثت پاتے تھے وہ قرآن کی اس آیت کی وجہ سے پاتے تھے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس موالات کی بنا پر وراثت پاتے تھے جو عرب میں رائج تھی۔ اور جسے قرآن نے بعضھم اولیاء بعض کہہ کر قائم رکھا تھا۔ اس آیت نے اسی رواج کو منسوخ کیا ہے۔

اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مواخات والوں کو اس آیت کی بنا پر میراث دی جاتی اور پھر اس آیت کو آیت احزاب سے منسوخ قرار دیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ مواخات والوں کو موالات کی بنا پر وراثت

---

[1] بیان القرآن

دی جائے اور اس آیت کے ذریعے موالات کے عرب رواج کو منسوخ کیا جائے۔ ہمارے خیال میں دوسری رائے قابل ترجیح ہے۔ مولانا عثمانی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔

کیا موالات کی ہر نوع ختم ہو گئی

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر اس آیت نے موالات کی بنا پر وراثت کو منسوخ کیا ہے تو کیا موالات کی ساری انواع کو ختم کیا ہے یا اب بھی اس کی کچھ انواع باقی ہیں۔ مولی صرف وارث کے معنے میں بھی آتا ہے۔ امام نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح کی ہے کہ اگرچہ لفظ مولی زیادہ تر حلیف اور مولی الموالات کے معنے میں آتا ہے تاہم مولی غلام کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کا دور جاہلیت ختم ہو جانے کے بعد زمانہ اسلام میں مولی الموالات کے بہت آثار نظر آتے ہیں۔ دوسری صدی تک کا یہ اسلامی دستور باقی تھا کہ جب کوئی نومسلم مشرف باسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقدِ موالات کرتا یعنی دوستی کا عہد و پیمان کرتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف اور مولی کہلاتا تھا۔ اسی نسبت سے امام ابن ماجہ کو ربعی، امام بخاری جعفی اور امام ابوحنیفہ کو تیمی کہتے ہیں۔ یہ نسبت غلامی کی نہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بارے میں امام طحاوی نے مشکل الآثار میں عقدِ موالات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> عبداللہ بن یزید کہتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا۔ یعنی نومسلم ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کرلو پھر تمہاری نسبت بھی ان کی طرف ہو گی میں خود بھی ایسا ہی تھا۔

یہ عبداللہ بن یزید امام اعظم کے شاگرد ہیں چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ ابوحنیفہ اور ابن عون کے شاگرد ہیں۔ فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتا یہ رہا تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ ولاء اور مولی الموالات کے دستور کی وجہ سے کہتے ہیں بالتصریح تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ عقدِ موالات کس نے کیا تھا۔ امام صاحب کے والد کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ ان کے والد ثابت مسلمان پیدا ہوئے اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ زوطی نے مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا ہو گا۔ بہرحال مولی الموالات کا یہ دستور زمانۂ اسلام میں موجود رہا۔ یہاں تک تو سارے ائمہ فقاہت متفق ہیں کہ وارث کے ہوتے ہوئے مولی الموالات کو کچھ میراث نہیں

ملتی ہے خواہ وہ وارث ذوی الفروض نسبی ہوں یا عصبہ یا ذوی الارحام۔ لیکن جب کوئی نہ ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے جیسا کہ الجصاص نے تفصیل لکھی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اگر اقربا میں سے کوئی وارث نہ ہو تو امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر فرماتے ہیں جو شخص جس مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہو اور اس نے اس مسلمان سے عقدِ موالات کر لیا ہو اور وہ جس سے عقدِ موالات قائم ہے بغیر وارث کے مرگیا تو یہ نومسلم اس کا وارث ہوگا۔ اور اس نسبت کی وجہ سے وارث ہوگا۔ امام مالک، ابن شبرمہ، امام ثوری، امام اوزاعی اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کا مال سارے مسلمانوں کا اشتراکی سرمایہ ہے اور اسے خزانۂ سرکار میں داخل کیا جائے گا۔ الجصاص نے اس آیت سے اپنے موقف پر اس طرح استدلال کیا ہے:

زیرِ تشریح آیتِ قرآنی یعنی والذین عقدت ایمانکم الخ ان لوگوں کے حق میں میراث کا اعلان کر رہی ہے جن سے عقدِ موالات ہو چکا ہے جبکہ ان کا کوئی نسبی اور رحمی وارث موجود نہ ہو۔ آغازِ کار میں قرآن نے موالات کے اس دستورِ عربی کو مہاجرین وانصار کے درمیان بعضھم اولیاء بعض کہہ کر قائم رکھا تھا بعدازیں واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض کہہ کر اس میں یہ ترمیم کی تھی کہ ذوی الارحام کی موجودگی میں یہ موالات میراث میں موثر نہ ہوگی۔ یعنی عقدِ موالات کرنے والوں کو ذوی الارحام کی موجودگی میں کوئی میراث نہ ملے گی۔ آیتِ قرآنی کا مدلول ظاہری یہ ہے کہ اگر نسبی، عصبہ اور ذوی الارحام موجود نہ ہوں تو میراث عقدِ موالات کرنے والوں کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ عقدِ موالات والوں کی میراث سے محروم ہونے کی شرط اور قید اولوا الارحام موجود ہی نہ ہوں تو پھر سارے قرآن اور ساری سنت میں ایسی کوئی قانونی دفعہ نہیں جس سے ذوی الارحام اور ورثاء کی عدم موجودگی میں عقدِ موالات کرنے والوں کو میراث سے محروم کیا جا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس سنت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عقدِ موالات کرنے والوں کے لیے وراثت ہے۔ ابوداؤد میں تمیم داری کے حوالہ سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص کے بارے میں طریقِ کار کیا ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر کوئی نومسلم اسلام لاتا ہے وہ اس نومسلم کی زندگی اور موت میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہے۔ موت میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہونے کا اس کے سوا اور کیا منشا ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی میراث کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عمر، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حسن بصری،

ابراہیم نخعی کی، بلکہ امام زہری سے دریافت کیا گیا کہ نومسلم اگر عقدِ موالات کرے تو اس کا کیا حکم ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سعید بن المسیب کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی نومسلم کسی قوم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو تو ان کے لیے اس کی میراث جائز ہے۔ ربیعۃ ابن عبدالرحمٰن کا فیصلہ یہ ہے کہ دارِ حرب ہو یا دارِ اسلام اگر کوئی نومسلم کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہو تو اس کی میراث اس کو ملے گی جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہے۔ (احکام القرآن)

حافظ منذریؒ نے تمیم داری کی حدیث پر نوٹ لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا اور ان کے اصحاب کا یہی مذہب ہے مگر ان کی شرط یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عقدِ موالات ہوا ہو اور محدثین میں سے یہی مذہب اسحاق ابن راہویہ کا ہے بلکہ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں تصریح کی ہے کہ اسحاق بن راہویہ کے ساتھ تمیم کی روایت پر عمل کرنے والوں میں امام احمد، طاؤس، ربیعہ اور لیث بن سعد بھی ہیں اور یہی حضرت عمر بن الخطابؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا فیصلہ ہے۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں شائد کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ اسلام نے ہر قسم کے زمانۂ جاہلیت کے حلقوں کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ ان میں عقدِ موالات بھی داخل ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر ابوداؤد میں حدیث آئی ہے:

جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

اسلام میں کوئی حلف نہیں ہے جاہلیت کی حلف میں اسلام توانائی نہیں پیدا کر سکتا ہے۔

یہ روایت مسلم میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اس قسم کے کسی حلف کی گنجائش نہیں ہے۔ الجصاص نے احکام القرآن میں اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اس حلف کے بارے میں ہے جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں باہم اٹھاتے تھے زمانۂ جاہلیت کا عقدِ موالات یہ ہوتا تھا کہ دو شخص باہم یہ عہد کرتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہے، میری معافی تیری معافی ہے اور میں تیرا وارث ہوں گا اور تو میرا وارث ہوگا یہ عقدِ موالات چونکہ ایسی بہت سی منکرات پر مشتمل ہوتا تھا جن سے اسلام نے روکا ہے مثلاً یہ کہ ہم ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے چاہے حق پر ہوں یا باطل پر۔ بلاشبہ اسلام نے اس قسم کے عقدِ موالات کو نہ صرف ختم کیا ہے بلکہ کالعدم قرار دیا ہے اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد کو واجب قرار دیا ہے۔ نیز جاہلیت کے عقدِ موالات میں حلیف اقربا کی موجودگی میں وارث ہوتا تھا۔ اسلام نے اقربا کے وراثت میں حقوق مقرر کر کے اس پر بھی قدغن قائم کر دی لا حلف فی الاسلام کے یہی معنے ہیں کہ اسلام اس قسم

عہود کو گوارا نہیں کرتا ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ اسلام نے جس عقدِ موالات کو کالعدم قرار دیا ہے۔ وہ قبائل کا عقدِ موالات ہے یعنی قبائل باہم ایک دوسرے کی مدد کا، صلح کا، جنگ کا عہد کرتے تھے۔ اسلام میں قبائلی تعاون کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عقدِ موالات کو غلط قرار دیا ہے۔ وہ عہدِ مواخات نہیں ہے جیسے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے مابین کیا ہے۔

بہرحال عقدِ مواخات ہو یا عقدِ موالات علی الاطلاق اسلام میں منع نہیں ہے بلکہ وہ خاص عقدِ موالات منع ہے جو بہت سی منکرات پر مشتمل ہوتا تھا۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ
فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلِيًّا كَبِيْرًا ۞ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا
يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۞

مردوں کو عورتوں پر اس بنا پر درجہ قوامیت حاصل ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں خاص باتوں میں فضیلت عطا فرمائی ہے[64]۔ اور اس لیے کہ عورتوں کی زندگی کا بندوبست کرنے کے لیے مرد اپنے اموال خرچ کرتے ہیں[65]۔ لہٰذا نیک اور

صالح عورتیں وہ ہیں جن میں طاعت شعاری ہوتی ہے اور جو اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے کام لے کر مردوں کی غیب میں بھی شوہروں کے حقوق و مفادات کی نگران بن کر رہتی ہیں[66]۔ اور دیکھو جن بیویوں سے تمہیں غلط روی کا اندیشہ ہو تو تم ان کو نصیحت کرو اور ان سے خوابگاہوں میں علیحدگی اختیار کر لو اور ان کی پٹائی کرو[67]۔ بعد ازیں اگر وہ تمہارے کہنے پر چلیں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو یقین مانو کہ اللہ سب کے اوپر ہے اور سب سے زیادہ بڑائی رکھنے والا ہے[68]۔ اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے قرابت داروں میں سے مقرر کرو[69]۔ اگر وہ دونوں اصلاح کے خواہاں ہوں گے تو اللہ دونوں کے مابین موافقت کا سامان کر دے گا اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے[70]۔

شوہر کی صدارت اور بیوی کے فرائض

یہاں تک معاشرتی زندگی کی سعادت کے اصول بتائے گئے ہیں معاشرت سعادت سے ہم روش نہیں جب تک خانگی زندگی سعادت والی نہ ہو۔ خانگی سعادت عبارت ہے میاں بیوی سے۔ اس سورت میں قرآن نے اب تک عورت کے حقوق اور شوہر کے فرائض بتائے ہیں۔ اب مردوں کے حقوق اور عورت کے فرائض بتانے جا رہے ہیں۔ یہاں تک قرآن نے عورتوں کے جو حقوق اور مردوں کے جو فرائض اس سورت میں بتائے ہیں ان کو ذہن میں ایک بار پھر تازہ کر لیجئے۔

۱۔ سب سے پہلے بتایا کہ مرد و عورت کی نوعیت اگرچہ مختلف ہے مگر جنس کے اعتبار سے دونوں انسان ہیں۔ اور انسان ہونے کے لحاظ سے دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر برتری نہیں ہے۔

۲۔ پھر بتایا کہ تخلیق کے اعتبار سے عورت مرد کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ شادی اپنی پسند کی عورتوں سے کرنی چاہیے تاکہ زندگی محبت پر استوار ہو سکے۔

۴۔ شادی چار سے زیادہ کرنے کی اجازت نہیں ہے اور چار کے لیے عدل کی ناگزیر شرط ہے۔

۵۔ اگر شرطِ عدل پوری نہ کر سکو تو ایک سے زیادہ عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے

۶۔ عورتوں کا مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

۷۔ مال و جائداد میں عورت ہر حیثیت سے وارث ہے بیوی ہو کہ بیٹی، ماں ہو یا بہن۔

۸۔ عورت مال و متاع نہیں ہے کہ دوسروں کو وراثت میں مل جائے۔

۹۔ عورتوں کو مال و متاع لینے کے لیے شوہر مجبور نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ عورتوں کے ساتھ معاشرت، نیکی اور انصاف پر مبنی ہونی چاہیے۔

۱۱۔ بیوی شوہر کو ناپسند ہو تو صبر و برداشت سے کام لے۔

۱۲۔ نکاح کے بعد نباہ نہ ہو سکے اور شوہر عورت کو چھوڑنا چاہے تو اگر بیوی کو سونے اور چاندی کا ڈھیر بھی مہر میں دے دیا ہو اس سے واپس نہ لیا جائے۔

۱۳۔ عورت اگر باپ کی منکوحہ ہو، ماں ہو، بیٹی ہو، بہن ہو، چچی یا پھوپی ہو، خالہ ہو یا بھتیجی، بھانجی ہو یا رضاعی ماں، رضاعی بہن ہو یا خوشدامن، یا کوئی شادی شدہ ہو اس سے شادی روا نہیں ہے۔

۱۴۔ شادی کا مقصد عفت و عصمت کا تحفظ ہے۔

عورتوں کے یہ حقوق یا مردوں کے یہ فرائض بتانے کے بعد اب مردوں کے حقوق کے سلسلے میں

عورتوں کو جو زریں ہدایات دی گئی ہیں اس کی داستان بھی قرآن کی زبان سے سن لیجئے تاکہ دونوں کے فرائض و اختیارات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جا سکے کہ قرآن نے عصمت وعفت کے تحفظ کی کتنی زبردست جدوجہد کی ہے۔ اور دونوں کے باہمی رشتۂ محبت کو کس قدر پائدار اور جاندار قرار دیا ہے۔ کوئی ایسا قانون کہ جو صرف ایک فریق پر ذمہ داری عائد کرے اور دوسرے کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے خواہ وہ کتنا ہی خوشنما اور جاذب نظر ہو وہ اُدھورا اور ناقص ہی ہوگا۔ آئین اور ضابطہ مکمل وہ ہی ہو سکتا ہے جو ہر ایک پر دوسرے کی ذمہ داری کو ضروری قرار دے گو اس کی شکل مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ عورت اپنی خلقت میں کمزور، اپنے فطری جذبات میں اعتدال سے دور اور اپنی جسمانی ساخت میں مرد کے مقابلے میں بڑی حد تک ضعیف ہے اور اسی وجہ سے یہ قابل لُطف وکرم، لائق اُنس ومحبت ہے اور باعث درگزر ہے۔ نزول قرآن سے پہلے دُنیا کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ وجودِ انسانی کا کامل ظہور صرف مردوں ہی کی جنس میں ہوا ہے۔ عورتوں کی ہستی کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتی وہ صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ مردوں کی کام جوئیوں کا ذریعہ ہوں اور ان کی چاکری اور پرستاری کریں۔

قرآن تاریخ عالم کی سب سے زیادہ پرانی آواز ہے جو اس اعتقاد کے خلاف بلند ہوئی۔ اللہ نے نوع انسانی کو مرد وعورت کی دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی کے لیے اپنے فرائض رکھتے ہیں۔ قرآن نے دونوں کے فرائض اور دونوں کے حقوق کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اللہ نے دُنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص باتوں میں قربت دی ہے۔ ایسی ہی قربت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریاتِ معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں اس لیے قوامیت وکارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر ان ہی کے حصے میں آیا ہے۔

۶۴۔ مردوں کو عورتوں پر اس بنا پر درجہ قوامیت حاصل ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں خاص باتوں میں فضیلت عطا فرمائی ہے۔ پہلی آیتوں میں ذکر تھا کہ مرد اور عورت کے حقوق کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ اگر رعایتِ حقوق میں فرق ہوتا تو عورتوں کے لیے وجہ شکایت ہوتی۔ اب اس آیت میں مرد اور عورت کا درجہ بتلاتے ہیں کہ مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ عورت کے درجہ سے اس لیے فرق مدارج کے باعث جو احکام میں فرق ہوگا وہ سراسر حکمت اور قابلِ رعایت ہوگا۔ اس میں عورت اور مرد بقاعدہ حکمت ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ عورتوں کو اس کی خواہش کرنی بالکل عبث ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے حاکم اور نگران بنایا ہے۔ دو وجہ سے اوّل بڑی اور وہبی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصل سے بعضوں کو بعضوں پر یعنی مردوں کو عورتوں پر علم وعمل میں کہ جن دونوں پر

تمام کمالات کا مدار ہے فضیلت اور بڑائی عطا فرمائی جس کی تشریح احادیث میں موجود ہے اور دوسری وجہ جو کسبی ہے یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں اور مہر، خوراک، پوشاک جملہ ضروریات کے کفیل ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی حکم برادری چاہیے[1]

کوئی عقل مند اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مرد اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بہت سے معاملات میں عورت سے برتر ہے۔ غریب عورت پر زندگی میں کچھ زمانہ ایسا گزرتا ہے جس میں وہ بڑی حد تک بے کار ہوتی ہے اور دوسرے کی امداد و اعانت کی محتاج ہوتی ہے۔ میری مراد حمل، رضاعت، بچوں کی تربیت اور حیض و نفاس کے زمانے سے ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ مرد کی صدارت کے موضوع پر تحریر فرماتے ہیں:

ضروری ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کا قوام بنایا جاتے اور فطرت کا تقاضا ہے کہ عورت پر مرد کو غلبہ حاصل ہو اس لیے کہ مرد عقل میں کامل سیاست میں ماہر، حمایت میں مضبوط اور ننگ و عار کو دور کرنے کی صلاحیت کا مالک ہے اور اس حیثیت سے بھی مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے کہ مرد عورت کو کپڑا روٹی اور گھر مہیا کرتا ہے[2]

جدید تحقیق میں مرد کی حیثیت

جدید تحقیق نے بھی اس کی تائید کر دی ہے کہ مرد کا دماغ عورت سے بڑا ہے اس میں فہم ذکا کا مادہ نسبتاً زیادہ اور اس کی عقل میں پختگی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مرد کا جسم اور عضلات مضبوط ہوتے ہیں اس سلسلے میں کچھ لوگوں کی تحقیق ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش خدمت ہے۔

مشہور نیشلسٹ فلاسفر علامہ پرودھن اپنی کتاب ابتکار النظام میں رقمطراز ہیں:

عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے اسی قدر کمزور ہے جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی عقلی قوت کے مقابلہ میں ضعیف نظر آتی ہے اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے، وہ مردوں کی رائے کے مطابق نہیں ہوتی۔ پس مرد اور عورت میں یہ فرق کوئی عارضی امر نہیں ہے بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] حجۃ اللہ البالغہ

مبنی ہے[1]

اس قول کو نقل کر کے علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں :

حواس خمسہ جس پر انسان کی عقلی اور دماغی نشو ونما کا دار ومدار ہے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے ۔ علامہ میکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس خمسہ سے ضعیف ہیں[2]

پھر کچھ آگے چل کر علامہ موصوف لکھتے ہیں :

سائیکلوجیا نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے مغز اور مرد کے مغز میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے ۔ مرد کے مغز کے وزن کا اوسط عورت کے مغز سے سو گرام زیادہ ہے[3]

عورت کا دماغ

جدید تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے بہت چھوٹا ہے جس کا اثر عقل وشعور پر پڑتا ہے ۔ تولنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ احمق کا دماغ عقلمند کے دماغ سے کافی چھوٹا ہوتا ہے ۔ اسی سلسلہ میں علامہ فرید وجدی رقمطراز ہیں :

یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے ۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ½ ۴۹ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴ اوقیہ ، دو سو اٹھہتر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا ۔ لیکن جب ۱۹۱ عورتوں کے دماغ کا وزن کیا گیا تو سب سے وزنی ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا ۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قویٰ مرد کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہوتے ہیں[4]

اور دماغوں کا یہ اختلاف کسی خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہر جگہ ہوتا ہے اس میں متمدن اور غیر متمدن کی کوئی تمیز نہیں ہے ۔ انسائیکلوپیڈیا کا مصنف پروفیسر دوخارینی لکھتا ہے :

جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے اسی طرح امریکہ کے وحشی ترین اقوام میں

---

[1] مسلمان عورت ۔ [2]، [3]، [4] مسلمان عورت

بھی پایا جاتا ہے۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ جدید تحقیقات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ مردوں میں عورت کی بہ نسبت زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے اور مرد صلاحیت میں عورتوں سے ہر اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں۔

شوہر کے قوام ہونے کا مطلب

قوام قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قیم اور قیام بھی اسی کے ہم معنے ہیں عربی زبان میں قام جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنے نگرانی، حفاظت، ولایت، کفالت کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر عورتوں کے نگران، محافظ، والی اور کفیل ہوتے ہیں گویا قوامون علی النساء میں بالادستی اور ولایت کا مفہوم بھی ہے اور کفالت و تولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم ملزوم سی ہیں۔

گھر کی چھوٹی سی وحدت بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ حدیث میں ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے باز پرس ہوگی۔ اور اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمایا ہے کہ مرد بھی گھر کی ریاست میں حاکم ہے اور اس کے گھر کے لوگ بمنزلہ ایک رعیت کے ہیں۔ ہر ریاست کو اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو ملے یا عورت کو قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے۔

عقلی احتمالات صرف تین ہیں مرد حاکم ہو، عورت حاکم ہو، دونوں برابر ہوں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ ان تین کے علاوہ کوئی احتمال نہیں۔

قرآن نے مرد کے حاکم ہونے کا اعلان کیا۔ قرآن ایک جامع قانون ہے وہ جس موضوع کو لیتا ہے ایک کامل حکم کے انداز پر اس کے سارے پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ مرد و عورت کے باہمی حقوق اور ذمہ داریاں بتانے کے بعد یہ ضرورت تھی کہ گھر کی چھوٹی سی ریاست میں ایک نظم کا ڈھانچہ بتایا جائے۔ کیوں اس کے بغیر انتظام نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ گھر کی حکومت کو صراحۃً حکومت نہیں کہا مگر مرد کی سربراہی کا صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی ہے کہ حاکم (سربراہ) ہونے سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی نظام کے لیے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ ہو کہ اختلاف

[1] مسلمان عورت

کے وقت اس کے فیصلے سے کام چل سکے۔ جس طرح ملک وسلطنت اور ریاست کے لیے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہتے ہیں۔ ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے۔ عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں اس کام کے لیے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں اور بچوں کے زیادہ ہیں۔ یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھدار اس کا انکار نہیں کر سکتا [1]

شوہر کے قوام ہونے کی وجہ

قرآن نے عورت کے مقابلہ میں گھر کی ریاست میں مرد کے سربراہ ہونے کی دو وجہیں بتائی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔

یہاں فضیلت بمعنے شرف، کرامت اور عزت نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے مرد کو شریف، نیک اور معزز بنایا ہے اور عورت کو کمین، بد اور ذلیل بنایا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ روحانی دنیا یعنی قرب حق اور حسن عمل میں مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور ساری عبادتیں جس طرح اور جس پیمانے پر مرد کی قبول ہو سکتی ہیں وہی ساری راہیں عورت کے لیے بھی کھلی ہیں بلکہ یہاں فضل اللہ بعضھم علی بعض یہ بتا رہا ہے کہ ان میں سے ایک صنف یعنی مرد کو اللہ نے طبعاً ایسی خصوصیت وہبی عطا فرمائی ہے جو عورت کو نہیں دی ہے یا اس سے کم دی ہے۔ باپ بیٹے دونوں بحیثیت بندۂ خدا بالکل ایک ہیں۔ عند اللہ اعمال کی مقبولیت کی حیثیت سے دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن دنیا میں قرآن ہی نے بتایا ہے کہ باپ بالادست ہو اور اولاد زبردست باپ حکم دے بیٹا حکم مانے ٹھیک اسی طرح معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر تفوق حاصل ہے جس کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اس پر ڈالی جائے مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت اور صلاحیت یا کمانے اور محنت کرنے کی جو استعداد و ہمت مرد میں موجود ہے وہ عورت میں نہیں ہے

یہاں سید رشید رضا نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہ مصری سے بڑے پتے کی بات نقل کی ہے۔ وہ بھی گوش گزار فرمالیجیے :

---

[1] معارف قرآن م ش

مرد کو عورت پر جن راہوں سے فضیلت ملی ہے وہ دو طرح کی ہیں فطری اور کسبی۔ فطری یہ کہ مرد اپنے مزاج کے لحاظ سے عورت کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور، زیادہ کامل، زیادہ بھرپور اور زیادہ حسن و جمال رکھتا ہے بلکہ تمہیں میری یہ بات سن کر شاید حیرت ہی ہو کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ خوبصورتی نام ہے بناوٹ کی تکمیل اور تمامیت کا۔ انسان بھی اپنی حیات جسمانی میں حیوانات کی ایک نوع ہے۔ سارے حیوانات میں نظام تخلیق ایک ہے۔ تمام جانداروں میں نر مادہ کے مقابلے میں کامل تر اور حسین تر ہوتا ہے۔ مرغ اور مرغی، بکرا، بکری، شیر شیرنی، گائے اور بیل میں آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مرد میں تخلیقی کمال کا شاہکار داڑھی اور مونچھوں کا ہونا ہے۔ اسی بنا پر پیدائشی طور پر جس کے داڑھی نہ آئے وہ عیب شمار ہوتا ہے اور ایسا شخص بال اگانے کے لیے تدبیر کے درپے ہوتا ہے اور مزاج کے طاقتور ہونے اور کمال خلقت کی وجہ سے مرد میں عورت کے مقابلہ میں انجام بینی اور عقل کا بلوغ زیادہ ہے۔ اطبا کا فیصلہ ہے کہ عقل سلیم ہمیشہ جسم سلیم میں ہوتی ہے۔ اور کسبی یہ کہ عورت کے مقابلے میں مرد تمام کاموں میں محنت، ایجاد اور فن کاری میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کی زندگی میں عورت کے مقابلے میں مرد کی صدارت کی۔

شوہر کے قوام ہونے کی دوسری وجہ

۶۵۔ اور اس لیے کہ عورتوں کی زندگی کا بندوبست کرنے کے لیے مرد اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔

دوسری وجہ قرآن نے عورت کے مقابلہ میں گھر کی ریاست میں مرد کے سربراہ ہونے کی یہ بتائی ہے کہ مرد عورتوں کے اخراجات کے کفیل اور ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی بیوی کی معاشی اور کفالتی کی ذمہ داری کا بوجھ شوہر پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری شوہر نے اتفاقاً نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس لیے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ اسی میں اس کی صلاحیتیں ہیں اور وہی اس کی پابجائی کر سکتا ہے۔

تمام مکاتب قانون اسلامی اس بات پر متفق ہیں کہ شوہر پر اپنی بیوی کا نفقہ واجب ہے اور بیوی کو ان تمام ضروریات سے بے نیاز کرے جو خوراک پوشاک اور رہائش سے متعلق ہیں۔ جو بات یہاں خبری پیرائے میں کہی گئی ہے وہ ہی بات دوسرے موقعہ پر انشائی پیمانے میں بتائی گئی ہے۔ ارشاد نبوت میں بتایا گیا ہے کہ عورتوں کو صرف رہائش، خوراک اور پوشاک ہی نہیں دیتے ہے بلکہ شوہر کا فرض ہے کہ ان میں حسن کاری کرے۔ چنانچہ ترمذی میں ارشاد ہے:

تم بیویوں کو کپڑا اور کھانا دینے میں حسن کاری کا مظاہرہ کرو۔

مقدارِ نفقہ

نفقہ کی تفصیلات کی تعیین عورت کی ضروریات اس کے سابقہ معیارِ زندگی، عرفِ عام اور شوہر کی مالی حالت کو دیکھ کر کی جائے گی۔ اگر شوہر نادار ہو تو بھی اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہوگا البتہ اس سے ناداری کی حالت میں اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا بلکہ وہ رقم اس کے ذمے قرض ہوگی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے سرکار میں استغاثہ کیا کہ میرے شوہر کنجوس آدمی ہیں بخوشی اتنا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں جو میرے بچوں کو کافی ہو۔ یہ روداد سنا کر اسی عورت نے دریافت کیا کہ

میں ان کے مال میں سے بچوں کو کھلا دوں تو کیا اس میں حرج ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ہاں اتنا لے لو جو تیرے اور تیرے بچوں کے کافی ہو جایا کرے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی دستور تھا کہ ازواج مطہرات کے نفقہ کے لیے انتظام فرماتے تھے بلکہ ایک باغ ہی اس کام کے لیے خاص کر رکھا تھا جسے فروخت کر کے سال بھر کا نفقہ ایک ہی بار جمع کرا دیتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حبس نفقۃ الرجل قوت سنۃ لاہلہ کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نخل بنی نضیر کو فروخت فرما دیا کرتے تھے اور اس کی قیمت سے اپنے اہل وعیال کے لیے سال بھر کے کھانے کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔

بلکہ فقہائے کرام نے تفصیل بتائی ہے کہ مرد کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ بیوی کے لیے طہارت و نفاست کا سامان فراہم کرے۔ چنانچہ صاحب رد محتار میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے لیے ایسی چیزوں کا سامان کرے جس سے وہ اپنے آپ کو صاف ستھری رکھ سکے اور میل کچیل سے پاک رہے جیسے کنگھی، تیل، صابون وغیرہ جیسا وہاں کا رواج ہو اور اتنی خوشبو کا فراہم کرنا بھی ضروری ہے جس سے وہ بدبو دور ہو جائے اور اتنا پانی بھی ہونا ضروری ہے جس سے کپڑے اور بدن دھو سکے۔

یہ بات کہ نفقہ کا معیار کیا ہو؟ اس کے بارے میں تین رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ نفقہ کی مقدار کی تعیین میں صرف شوہر کی حالت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ سرخسی کاسانی اور شامی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ میاں اور بیوی دونوں کی مالی حالت کو معیار بنایا جاتے۔ یہ رائے امام مالک کی ہے اور فقہاء حنفیہ سے خصاف کی ہے۔ صاحب ہدایہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ احناف کا اسی پر عمل ہے تیسری رائے یہ ہے کہ صرف عورت کی مالی حالت کا لحاظ کیا جائے۔ یہ رائے شاذ ہے۔ [1]

بہرحال ان دو وجوہ سے اللہ نے مردوں کو قوام بنایا ہے یعنی گھر کی چھوٹی سی ریاست میں اللہ نے مرد کو صدارت کا منصب دیا ہے۔ صدارت دینے کے باوجود بعضھم کہہ کر یہ لطیف اشارہ بھی کر دیا کہ:

اولاً کہ مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے وہی تعلق ہے جو جسم کے اعضاء کا باہم ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ جسم کے اعضاء میں جو نسبت سر کو دوسرے اعضاء سے ہے وہی نسبت مرد کو عورت سے ہے گویا مرد سر ہے تو عورت بدن ہے یعنی نہ مرد کو اپنی برتری کے گھمنڈ میں عورت پر زیادتی کرنی چاہیے اور نہ عورت کو مرد کی برتری کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہونا چاہیے کیونکہ اعضاء بدن میں کسی عضو کی برتری نظام بدن کی صلاح اور فلاح کی وجہ سے ہے ورنہ نفس عضو ہونے میں سب برابر ہیں۔

ثانیاً یہ بھی بتا دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی برتری ثابت بھی ہو جائے تو اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہرگز نہیں کہ گھر کے انتظام میں مرد کی سربراہی ہے انتظامی حیثیت میں اگر مرد عورت سے بالا ہے تو عورت اس حیثیت میں بالا ہے کہ مرد کو اس کی خدمت پر لگا دیا ہے۔ وہ مخدومہ بھی بیٹھی ہے کھانا مرد لا رہا ہے کپڑے سرمائی و گرمائی وہ مہیا کر رہا ہے۔ رہائش کا انتظام وہ کر رہا ہے۔ بہرحال ایک پہلو میں اگر مرد کو برتری حاصل ہے تو دوسرے پہلو میں عورت کو بھی برتری حاصل ہے۔ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے بلکہ ایک جزئی بالکل ایسی جزئی جیسی سربراہ مملکت کو عام شہریوں کے مقابلے میں ہوتی ہے۔

عورت صالحہ اور اس کا فریضہ

۶۶۔ لہٰذا نیک اور صالح عورتیں وہ ہیں جن میں طاعت شعاری ہوتی ہے اور جو اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے کام لے کر مردوں کی غیب میں بھی ان کے حقوق و مفادات کی نگران بن کر رہتی ہیں۔ یعنی جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کی تابعداری کرتی ہیں اور اللہ کے حکم کے موافق خاوند کے پیچھے اس کی رضا کے موافق اپنے نفس اور خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں اپنے نفس اور مال زوج میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتی ہیں۔ [2]

---

[1] نظام النفقات [2] افادات شیخ الاسلام

قانتات قنوت سے بنا ہے اس کے معنے خضوع و خشوع کے ساتھ فرمانبرداری کے ہیں۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں بھی اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی فرمانبرداری کے لیے نہیں آیا ہے۔ یہاں بھی اسی معنے میں آیا ہے۔ اسی سے وتر میں قنوت آتی ہے۔ شوہروں کی معروف میں طاعت بھی اس میں داخل ہے لیکن یہ اس کا منطوق نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صالح عورتیں وہ ہیں جن میں یہ اوصاف ہوں، اوّلاً جس میں اللہ سبحانہٗ کی فرمانبرداری کے ساتھ شوہر کی طاعت کا جذبہ بھی ہو۔

شوہر کی طاعت و فرمانبرداری

عورت شوہر کی محبت اور اس کی خوشنودی اپنے ایثار اور فرمانبرداری ہی سے خرید سکتی ہے یعنی عورت جب شوہر کی معروف میں طاعت کرے گی۔ شوہر اس پر اپنی جان چھڑکتا رہے گا اور بیوی کے لیے وہ سارے جتن کرے گا جو ایک شریف مرد کر سکتا ہے۔ اسی لیے عورت کی خوبیوں میں شوہر کی معروف میں اطاعت کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> عورت جب پنج وقتی نماز پڑھے رمضان کے مہینے میں روزے رکھے، اپنی آبرو کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کے کہے کو مانے تو وہ جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

نماز، روزہ اور عفت و عصمت کے تحفظ کے ساتھ شوہر کی فرمانبرداری بھی ضروری بتائی گئی اور اس میں اشارہ ہے کہ عورت پر جہاں حقوق اللہ کی بجاآوری ضروری ہے شوہر کے حقوق کا پاس بھی ضروری ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ بہترین عورت کونسی ہے آپ نے جواب فرمایا:

> شوہر جب اس کو دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب کسی کام کا حکم دے بجا لائے اور شوہر کی اپنی جان و مال میں ایسی مخالفت نہ کرے جو اسے ناپسند ہو۔

شوہر کے حقوق کی بجاآوری کی تاکید کا اس سے دلچسپ اور بلیغ انداز اور کیا ہو سکتا ہے۔ گویا جو عورت محسوس کرے کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں وہ یقین کرے کہ وہ سرکار دو عالم کے نزدیک بہترین ہے سب کچھ ہے مگر جو خاتم النبیین کی نگاہ میں بہتر نہیں اور محروم ہے۔

شوہر کی ناجائز بات میں اطاعت نہیں

یہ حقیقت ہے کہ شوہر کی طاعت عورت پر معروف میں واجب ہے یعنی عورت اپنے شوہر کی

ان باتوں پر عمل نہ کرے گی جو رب العزت کے احکام کے خلاف ہوں اور قانتات میں اس طرف لطیف اشارہ ہے کیونکہ قنوت کی اصلی روح اللہ تعالیٰ کی طاعت میں دوام کے ہیں۔ اب شوہر کی اطاعت اسی حد تک ہے جہاں پر اللہ کی طاعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اگر شوہر کی طاعت میں اللہ کی طاعت سے محرومی ہوئی ہے تو وہ قانتات میں سے ہرگز نہیں ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس موضوع پر لا تطیع المرأۃ زوجھا فی معصیۃ اللہ کا عنوان قائم کرکے بتایا ہے کہ شوہر کی اطاعت کی حدود کیا ہیں حدیث میں ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک انصاری خاتون ایک بار خدمت اقدس میں تشریف لائیں اور بتایا کہ میں نے اپنی لڑکی کی شادی کردی ہے۔ اتفاق سے میری لڑکی کے بال گر گئے ہیں۔ اب میرے داماد کا تقاضا ہے کہ دوسرے بال علیحدہ سے لے کر اس کے بالوں میں شامل کردیے جائیں کہ بدصورتی جاتی رہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا ارشاد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی عورت پر لعنت کی گئی ہے جو الگ سے بال لے کر اپنے بالوں میں جوڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورت پر شوہر کی معصیت میں طاعت ناجائز ہے کیونکہ عورت پر اپنے شوہر کی طاعت سے اہم اور اقدم اپنے خالق کی طاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خدا کی معصیت کا حکم دے یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو اس کی اطاعت سے انکار کردینا عورت کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اطاعت کرے گی تو گنہ گار ہوگی۔

شوہر کی خوشنودی

ان امور میں بلاشبہ عورت شوہر کا حکم بجالائے گی جن میں اللہ کی نافرمانی نہیں ہوتی۔ فرمانبردار بیوی حدیث میں بڑی گراں قدر نعمت قرار دی گئی ہے۔ اس حدیث کو پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ فرمانبردار بیوی کا اسلام میں کیا مقام ہے۔

> تقویٰ کے بعد مسلمانوں کے لیے بہترین چیز جو اس کے لیے قابل استفادہ ہے وہ نیک عورت ہے کہ اگر شوہر اس کو حکم دے بجالائے۔ شوہر اس کو دیکھے تو خوش کردے۔ اس کو قسم دے تو پوری کردے اور اگر شوہر موجود نہ ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیر خواہ بن کر رہے۔ (ابن ماجہ افضل النساء)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچنے کے بعد بہترین دولت نیک اور فرمانبردار بیوی ہے۔ اسلام نے میاں بیوی کے رشتہ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہا ہے اور اس سلسلے میں دونوں کی

نفسیات کو پیش نظر رکھ کر ہر ایک کو اس کے لائق حقوق عطا کیے ہیں۔ بیوی پر شوہر کے جو حقوق ہیں۔ وہ سب اس لائق ہیں کہ عورت بدل وجان بجا لائے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ شوہر پورے گھر میں صدر کی حیثیت رکھتا ہے اور گھر کی ریاست کا نگران ہے اس میں بیوی بھی داخل ہے۔ پھر نگران کے جائز حکم سے سرتابی کیونکہ جائز ہو سکتی ہے اور پھر عورت اپنے شوہر کی رفیقہ حیات اور شریک زندگی ہے اور ایک دوست کا فریضہ ہے کہ دوسرے دوست کے لیے ایثار و قربانی کرے۔ عورت جو کچھ کرے رفیقہ حیات ہی کی حیثیت سے اسے کرنا چاہیے اپنے کو غلام اور محکوم نہ تصور کرنا چاہیے۔

حافظات للغیب کے معنے

نیک عورتوں کی دوسری خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ شوہر کی غیب میں عزت و ناموس کی نگران ہوتی ہیں۔ قتادہ اور ثوری کہتے ہیں کہ شوہروں کی عدم موجودگی میں اپنی جان اور شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس صورت میں غیب کے معنے میں ہے یعنی پیٹھ پیچھے۔ اور پیٹھ پیچھے کی قید اس لیے لگائی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ جب ان کا اپنے شوہروں کی غیب میں یہ حال ہے تو حضور میں ان کا کیا پوچھنا۔ اس حفاظت میں سب سے بڑی چیز شوہر کا حق زوجیت یعنی اپنے ناموس کی حفاظت۔ گویا عورت کی عفت اس کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ ایک معنے تو یہی ہیں کہ شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے ناموس اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ دوسرے معنے یہ بھی ہیں کہ ازدواجی سے متعلق میاں بیوی کے درمیان جس قدر راز ہوتے ہیں یعنی لوگوں سے الگ ہو کر خلوت میں میاں بیوی میں جس قدر باتیں ہوتی ہیں سب کی محافظ ہوتی ہیں۔ پیار و محبت کے ساتھ اگر کبھی ناراضگی بھی ہو جاتی ہے اور شوہر ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتا ہے تو کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے دیتی ہیں۔ اس صورت میں لفظ غیب اپنے معنے میں ہے غیب کے معنے میں نہیں ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ جب وہ خلوت کی باتوں تک کی محافظ ہیں تو آبرو کی حفاظت میں ان کے مقام کا اسی سے اندازہ کر لو۔ رشید رضا کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے۔

نزاہت اور پاکدامنی کے لیے جو کنائی زبان بولی جا سکتی ہے۔ یہ انداز بیان میری رائے میں بلیغ ترین ہے۔ سب پڑھتے ہیں حتیٰ کہ نوجوان لڑکیاں تک پڑھتی ہیں اور خوب سمجھتی ہیں لیکن شرمندگی محسوس کرنے کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا۔

حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے جب تم اسے

کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری طاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے ۔

یہ حدیث پہلے معنے کی تائید کرتی ہے جو سفیان ثوری اور قتادہ نے بتاتے ہیں بما حفظ اللہ میں با سببیہ ہے یعنی عورتوں کا اپنے ناموس کو محفوظ رکھنا توفیق کی وجہ سے ہوتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل کے ظہور میں آنے کے لیے صرف بندہ کا ارادہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اللہ کی توفیق بھی شرط ہے اگر بندے کی جانب سے ارادہ ہو اور اللہ کی جانب سے توفیق تو عمل موجود ہوتا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے " چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داریاں یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں ۔ انہی کی امداد اور توفیق سے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں ورنہ نفس وشیطان کے مکائد ہر وقت مرد وعورت کا گھیراؤ کیے رکھتے ہیں اور عورتیں خصوصاً اپنی علمی اور عملی قوتوں میں بہ نسبت مرد کے کمزور بھی ہیں ۔ اس کے باوجود وہ ان ذمہ داریوں میں مردوں سے زیادہ مضبوط ہیں یہ سب اللہ کی توفیق اور امداد ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بے حیائی کے کاموں میں بہ نسبت مردوں کے عورتیں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں ۔ "

عورت کی غلط کاری اور علاج

۶۷ ۔ اور دیکھو جن بیویوں سے تمہیں غلط روی کا اندیشہ ہو تو تم ان کو نصیحت کرو، ان سے خوابگاہوں میں علیحدگی اختیار کر لو اور ان کی پٹائی کرو۔ یعنی اگر عورت خاوند سے بدخوئی کرے تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مرد اس کو زبانی فہمائش کرے اور سمجھائے اگر نہ مانے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ جدا سوئے لیکن اسی گھر میں ۔ اس پر بھی نہ مانے تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کو مارے بھی لیکن نہ ایسا کہ جس کا نشان باقی رہے یا ہڈی ٹوٹ جائے ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے اس کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت ہے جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں اور مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے ۔ سرسری قصور پر نہ مارے ہاں قصور زیادہ ہو پھر مارنے میں حرج نہیں ۔ جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے مگر اس کا خیال رکھے کہ ہڈی نہ ٹوٹے اور نہ ایسا زخم پہنچائے کہ جس کا نشان باقی رہ جائے [1]

پہلی آیت میں حالات کو بیان کیا تھا اس آیت میں ناشزات یعنی غلط کار عورتوں کا پھر مبیش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا جا رہا ہے اور تقسیم کے پیرائے میں یہ بات اشارۃً معلوم ہو گئی کہ نیکوکار اور صالحات پر مردوں کو کوئی تادیبی کارروائی کرنے کا حق نہیں ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ نشوز عورت ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ عورت کی مردوں میں بھی نشوز ہوتا ہے۔ یہاں عورت کا نشوز بیان کیا ہے اور اسی پارے کے آخر میں مردوں کا نشوز بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وان امراۃ خافت من بعلھا نشوزاً

اگر عورت کو اپنے شوہر کی غلط کاری کا اندیشہ ہو۔

جیسے خبث وطیب دونوں میں ہوتے ہیں ایسے ہی نشوز بھی دونوں میں ہو سکتا ہے۔ نشوز اگر عورت کی جانب سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرد کی قوامیت کو چیلنج کرتی ہے اور مرد کی طرف سے ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بیوی کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور اس سے پیچھا چھڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ نشوز نشز سے ہے اس کے لغت میں معنے اٹھنا ہیں جیسے واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلہ ۲۸) اسی سے نشوز بین الزوجین ہے: بیوی کا شوہر کے خلاف اٹھ جانا اور شوہر کا بیوی کے خلاف ہو جانا یعنی ان میں باہم موافقت نہ ہونا۔ اس لیے لغت میں نشوز بین الزوجین کے معنے ہیں کراھیۃ کل منھما صاحبہ وسوء عشرتہ یعنی ہر ایک کا اپنے ساتھی سے کراہت رکھنا اور اس سے بدسلوکی کرنا لیکن بلحاظ حالات کے الگ الگ معنے ہیں۔ عورت کا نشوز مرد کے خلاف یہ ہے کہ بیوی اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ اس کی نافرمان ہو جائے اس سے بغض رکھے، اس کی طاعت سے باہر ہو جائے اور شوہر کا نشوز عورت کے خلاف یہ ہے کہ وہ عورت کو بلا وجہ مارے اور اس پر ظلم کرے۔

یہاں اندازِ تعبیر یہ اختیار کیا ہے کہ جن عورتوں سے تمہیں نشوز کا خوف ہو یعنی جن کے ناشزہ ہونے کی تمہیں توقع ہو یا جن کا ناشزہ ہونا تمہیں معلوم ہو۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو عورتیں ناشزہ ہوں۔ یعنی صاف طور پر ان کی طرف نشوز کی نسبت نہیں کی گئی اور نہ نشوز کو ان کا فعل قرار دیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں اس اندازِ بیان سے قرآن نے یہ سمجھایا ہے کہ عورت کا شوہر کے خلاف اٹھنا عورت کی فطرت نہیں ہے۔ اگر کبھی کبھار ایسا ہو جائے اور کسی وجہ سے وہ اپنی فطرت کے خلاف ایسا کر بیٹھے تو ایسے موقعہ پر مرد کو کیا کرنا چاہیے۔

اس میں اشارہ ہے کہ بُرائی عورت کی فطرت نہیں ہے۔ تورات میں ہے کہ شجرہ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوا نے دی تھی اس لیے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا۔ اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی فطرت میں بُرائی ہے اور وہی مرد کو سیدھی

راہ سے بھٹکاتی ہے۔ لیکن قرآن نے اس قصہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی، کسی جگہ تعبیر کا انداز بھی ایسا اختیار نہیں کیا ہے جس سے عورت کا فطرت ہی سے بُرا ہونا معلوم ہو۔ اس مقام کی نزاکت کو نظر میں رکھ کر بلاغتِ قرآنی کا مطالعہ فرمائیے کہ وہ نشوز کو فعل بنا کر فعل کی نسبت بھی عورتوں کی طرف کرنا گوارا نہیں کرتا۔

تادیب کا پہلا درجہ رفق و ملاطفت

اگر عورتوں میں نشوز رونما ہو تو شوہروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اولین طور پر ان کو نصیحت کریں۔ اصل ارشاد میں فعظوھن آیا ہے۔ وعظ کے معنے زبانی نصیحت کرنے کے آتے ہیں اور وعظ کی روح یہ ہے کہ نرمی، خوش اسلوبی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے۔ یہ بات کہ وعظ کا اصل مقصد عورت کی اصلاح اور اس کی اخلاقی حفاظت ہے اس سے واضح ہوتی ہے کہ زندگی میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جائے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں شیطان کو بہکانے اور ابھارنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ پھر اس وقت اور بھی جبکہ عورتیں نازک طبع، تند خو اور تلون مزاج ہوتی ہیں۔ اس لیے قرآن نے ان حقائق و واقعات سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ عورتوں کی فطری کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھ کر مردوں کو اس سلسلے میں مفید ہدایتیں دی ہیں تاکہ زندگی میں بناؤ سنوار پیدا ہو جائے۔ قرآن نے ذاتی معائب کی غیبت کرنے اور بدگمانیاں کرنے کی ممانعت کی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا اور خانگی زندگی کا امن و سلام اٹھ جائے گا۔ نیز اس طرح وعظ کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی کوئی اصلاح ہو سکتی ہے جس کی غیبت کی جائے۔ نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ جو کچھ کہا جائے سامنے کہا جائے اور رفق و ملاطفت سے کہا جائے۔

اس کی وجہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے کہ جذبات کی فراوانی اور حسیات کی نزاکت اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ یہ عورت ہونے کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرت پر قائم رکھ کر ہی اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے۔ ارشاد ہے:

> عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو کیونکہ وہ پسلی کی مخلوق ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تم سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دوگے اور اگر چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ انہیں نرمی اور آشتی سے سمجھاؤ۔ اس میں شوہر کو بھی تنبیہ ہے کہ غصہ میں اگر فوراً

کارروائی کی اجازت نہیں ہے اور بات کا ایسا انداز اختیار کرے جو موثر ہو۔ مختلف عورتوں کے لحاظ سے وعظ بھی مختلف ہوگا کچھ کو صرف اللہ سے ڈرا دینا کافی ہو جائے گا اور کچھ کے لیے دنیوی انجام کی تہدید و تخویف اور معاشرہ میں رسوائی موثر ہوگی۔ اور کچھ میں مرغوبات سے محرومی کی دھمکی کافی ہوگی۔

تادیب کا دوسرا درجہ مقاطعہ

اگر عورت مزاج کی الھڑ ہو اور وعظ و نصیحت اور تنبیہ و ملامت کسی درجہ میں مفید نہ ہو تو قرآن نے موثر علاج یہ بتایا ہے کہ ان کو خوابگاہوں میں چھوڑ دو۔ اصل ارشاد میں واھجروھن فی المضاجع آیا ہے یعنی ان سے بے تکلفانہ قسم کا خلاملا چھوڑ دے۔ اس کے بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ صرف بات چیت چھوڑ دے۔ دوسرے یہ کہ ان سے خصوصی تعلقات چھوڑ دے۔ مطلب یہ ہے کہ جب زبانی نصیحت اور فہمائش دونوں بے اثر ہو کر رہ جائیں اور نافرمانی و سرکشی بدستور قائم رہے تو ان سے بات چیت چھوڑ دی جائے اور اس پر بھی باز نہ آئے تو پھر ہم بستری کے تعلقات منقطع کر دو۔ لیکن یہ قدم محض بدگمانی کی بنا پر نہیں بلکہ تحقیق و تجربہ کے بعد اٹھایا جائے۔ فقہائے نے تصریح کی ہے کہ محض بدگمانی کی بنا پر یہ قدم اٹھانا جائز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بات چیت چھوڑنے کے معنے بھی بتائے ہیں جیسا کہ الجصاص نے تصریح کی ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کجی عورت کی سرشت میں داخل ہے اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی اصلاح رفق و ملاطفت ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر رفق و ملاطفت کی ساری صورتیں بیکار ہو جائیں تو یہ دوسرا قدم اٹھایا جائے کہ بات چیت چھوڑ دے مگر یاد رہے کہ ارشادِ نبوت میں تین دن سے زیادہ مسلمان سے بات چیت چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ اگر یہ قدم بھی بیکار ہو جائے تو بے تکلفی والے تعلقات چھوڑ دے لیکن از روئے قرآن اس کی مدت بھی چار ماہ ہے۔ بہرحال جو قدم بھی اٹھائے سوچ سمجھ کر اٹھائے۔ جوشِ غضب اور جذبات میں کچھ نہ کرے اور اس سے غافل نہ ہو کہ میاں بیوی کے درمیان جو تعلقات ہیں بہت گہرے ہیں۔ گھر کا سارا نظام دونوں کی مصالحت اور اتحادِ عمل میں مضمر ہے۔ عورت زندگی کی ساتھی ہے اس سے ایک منٹ کے لیے بھی آپ بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اگر باہر کا سارا نظام مرد درست رکھتا ہے تو گھر کا سارا اندرونی نظام عورت کے ہاتھ میں ہے، گھر میں کھانے پینے کا نظم، بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت اور اس طرح کی دوسری تمام چیزیں عورت سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میاں بیوی میں موافقت نہ ہو اور زندگی کی گاڑی تیز رفتاری سے رواں دواں ہو۔ جس نے کہا سچ کہا ہے کہ مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ان دونوں کی دوستی اور اتحادِ عمل کے بغیر یہ

گاڑی چل نہیں سکتی۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری باب قوا انفسکم و اھلیکم نارا" اس لیے لائے ہیں کہ اپنے مخاطبوں کو یہ بتائیں کہ عورتوں کو ان کی حالت پر نہ چھوڑنا چاہیے بلکہ نرمی سے بتدریج ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے کہ مرد پر اس قدر اصلاح کی ذمہ داری ہے۔ نیز اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مدارات اور ملاطفت کا برتاؤ ناگزیر ہے جو دلوں میں محبت و الفت کے رسوخ کا باعث ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ تدبیر بھی ہے کہ عورتوں کی بہت سی باتوں سے درگزر کی جائے اور ان کی کج مزاجی پر صبر و تحمل سے کام لیا جائے۔

تادیب کا تیسرا درجہ تعزیر ہے

اگر عورت وعظ و نصیحت اور تہدید و ملامت اور اس کے مقاطعہ سے بھی راستی پر نہ آئے تو پھر اسے مارنے کی بھی اجازت ہے۔ اصل ارشاد میں فاضربوا آیا ہے۔ اس ضرب کی صورت کیا ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حد بندی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

واضربوا ھن ضربا غیر مبرح

ان کو اس طرح مارو کہ جلد نہ کھل جائے۔

حجۃ الوداع کا مشہور تاریخی خطبہ جہاں دوسرے اہم حقائق کا حامل ہے ان ہی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔

سنو! عورتوں کے متعلق بھلائی کا تاکیدی حکم قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس بطور قیدی ہیں۔ اس کے سوا تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو۔ اگر وہ کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کر جائیں تو تم ان کو بستر پر تنہا چھوڑ دو اور معمولی تنبیہ کرو، اطاعت کر لیں تو پھر زیادتی کی اجازت نہیں ہے۔ سنو تمہاری عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں۔ اور اسی طرح تمہاری عورتوں کے تم پر حقوق ہیں۔ تمہارے حقوق یہ ہیں کہ وہ ان کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو نہ بلائیں جن کا آنا تمہیں ناپسند ہو اور ان کا تم پر حق یہ ہے کہ تم ان کو کپڑے اور کھانا دینے میں حسن کار بن کر رہو۔ (ترمذی)

یہ ارشادِ نبوت قرآن کی اس آیت میں بہترین تشریح ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن نے

جس ضرب کی اجازت دی ہے وہ اس وقت ہے جب عورت فاحشہ کی مرتکب ہوجائے۔

غور فرمائیے اس حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں جو ہدایتیں دی ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ عائلی زندگی کے نظام میں مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مردوں کو عورتوں پر برتری دی گئی ہے۔ دونوں کی حیثیت اگر برابر ہوگی تو قدرتی مساوات کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عائلی زندگی کا شیرازہ منتشر ہوکر رہ جائے۔ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد آپ نے بتایا کہ فاحشہ مبینہ یعنی کھلی بے حیائی کی صورت میں شوہر کو فہمائش، مقاطعہ اور گوشمالی کی اجازت دی گئی ہے۔ کھلی بے حیائی سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں ہے لیکن بعض نے اس میں بھی بلا وجہ توسیع کی ہے۔ الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور زبان نبوت نے تنبیہ کی ہے کہ یہ ضرب غیر مبرح ہو یعنی ایسی مار ہو کہ جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے بلکہ یہاں تک تصریح کی ہے کہ اس سے مراد مسواک سے مارنا ہے۔ جیسا کہ ابوحیان اندلسی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی ہو۔ ایسی نہ ہو جس سے چوٹ لگ جائے یا جس سے رفیق زندگی کی توہین ہوجائے۔

قرآن حکیم کے مخاطب خاص طبقہ کے لوگ خاص قوم کے افراد نہیں اس کے مخاطب عرب و عجم، چینی، حبشی، انگریز، جاپانی، رومی اور ہندی اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و رذیل، عالم و عامی، سمجھدار اور بیوقوف، بچے بوڑھے، نائی دھوبی، شہری دیہاتی، نیک بخت بدبخت ہر طبقہ ہر سطح پر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی سے لے کر قیامت تک ہر دور اور ہر زمانے والے ہیں۔ اور اس کے احکام و مسائل میں ہر انسانی ضرورت اور ماحول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ ایسے بہت سے معاشرے موجود ہیں جہاں عورتوں کے لیے جسمانی سزائیں ہی عام ہیں قرآن کی یہ اجازت ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے ورنہ قرآن کا سیاق نرمی ہی کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ عام طریق سے غرض حاصل نہ ہو تو بس اسی پر اکتفا کرنا چاہیے سنگین اور تشدد طریق کو اختیار نہ کرنا چاہیے۔

عورتوں کو مارنا اور نبوت کا منشا

عورتوں کو مارنا عام طور پر اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے۔ ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حکم دیا کہ خدا کی بندیوں کو نہ مارا کرو تو حضرت عمر نے آکر عرض کی یا رسول اللہ بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں تو آپ نے

مارنے کی رخصت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ آلِ محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہی ہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں۔ یہ اپنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں[1] مختلف عنوانوں اور مختلف پیرایوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مارنے سے روکا۔ زندگی کے آخری حصے میں مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اُمہات المؤمنین کا اجتماع دوسرے مصالح کے ساتھ مردوں کے باہمی تعلقات کا عملی درس ہے۔ یہ بھی اس کی بڑی غرض تھی، خود فرماتے تھے۔

تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے بیوی اور بچوں کے لیے بہتر ہے اور خود میں اپنے بیوی بچوں کے لیے بہتر ہوں۔ (مشکوٰۃ)

اس میں بھی اسی راز کا انکشاف ہے کہ وقتی طور پر اپنے آپ کو نیک بنا کر پیش کرنا یہ کوئی بات نہیں ہے۔ نیکی اور بھلائی تو وہ ہی ہے جو بیوی اور اولاد سے تعلقات میں نمایاں ہو عمل کر کے بھی دکھایا جاتا اور زبان مبارک سے بھی فرمایا جاتا۔

سب سے زیادہ کامل مومن وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہو اور اپنے گھر والوں کے لیے نرم ہو۔ (ترمذی)

یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ ان تینوں علاجوں میں ترتیب ہے اور ترتیب کے لیے تدریج بھی ہے ترتیب یہ ہے کہ اول وعظ پر مقاطعہ اور پھر ضرب، اور تدریج یہ ہے کہ یہ سارے کام ہنگامی نہ ہوں بلکہ آہستہ آہستہ ہوں۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ تینوں باتیں بالترتیب ہیں اور بالتدریج ہیں۔ آلوسی نے بھی النص ہو الدال علی الترتیب کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عملدرآمد تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہے وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے با دلِ نخواستہ دی ہے اور پھر بھی اسے ناپسند ہی کیا ہے تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر درست ہی نہیں ہوتی ہیں ایسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے

[1] ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی

نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے [1]

اصلاحِ حال کے بعد زیادتی

۶۸- بعد ازیں اگر وہ تمہارے کہنے پر چلیں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ سب کے اوپر ہے اور سب سے زیادہ بڑائی رکھنے والا ہے۔ یعنی وہ عورتیں تمہاری نصیحت یا علیحدگی یا ضرب و تادیب کے بعد اگر بدخوئی اور نافرمانی سے باز آجائیں اور بظاہر مطیع ہو جائیں تو تم بھی بس کر جاؤ اور ان کے قصوروں کی کھود کرید مت کرو اور خواہ مخواہ ان کے ملزم بنانے سے خدا سے ڈرو بے شک اللہ تم سب پر غالب اور حاکم ہے نعو. ترں کے معاملے میں خواہ مخواہ کی بدگمانی سے کام لو اور نہ تھوڑے قصور پر اخیر کی سزا دینے لگو بلکہ ہر قصور کی ایک حد ہے اور مار اخیر کا درجہ ہے [2] ایک مطلب یہ ہے کہ اگر ان تینوں تادیبی میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی وہ اصلاحِ حال کر لیں تو تم خواہ مخواہ دوسری تادیبی صورتیں بے محل ان کے خلاف استعمال نہ کرو۔ آغاز وعظ و نصیحت سے کرو۔ اگر یہ تدبیر سودمند نہ ہو تو بات چھوڑ دو۔ اگر اس میں بھی تمہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئے تو زناشوئی کے تعلقات چھوڑ دو اور اس میں ناکامی ہو تو پھر ضرب کے ذریعے اس کی صحت، ماحول اور اپنے عرف کے مطابق کارروائی کرو۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اگر وہ تمہارا کہا مان لیں اور نشوز چھوڑ دیں تو ان پر گفتار و کردار کے ذریعے زیادتی نہ کرو۔ گویا قوام ہونے کی حیثیت سے شوہر کو بیوی پر ظلم و زیادتی سے منع کیا جا رہا ہے اور علامہ آلوسی رقمطراز ہیں، اگر بیوی بغاوت کی جگہ طاعت کی راہ پر آجائے تو ان سے انتقام لینے کے بہانے نہ تلاش کرنے چاہئیں اور پچھلی کدورتوں کو بالکل بھول جانا چاہیے۔ لفظ تبغی دونوں معنے میں ہو سکتا ہے یعنے طلب اور تلاش بھی اور یعنے ظلم و تعدی بھی۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ اگر بیویاں آغاز ہی میں اور یا نشوز کے بعد تمہاری مطیع ہو جائیں اور توبہ کر لیں تو تم کو ان کے خلاف تکلیف دینے کے لیے راہیں تلاش کرنے کی اجازت نہیں ہے یعنی توبہ کے بعد ان کا نشوز نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔

اس سے اشارۃً یہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ اگر بیویاں ناشزات نہ ہوں بلکہ قانتات ہوں تو ان کو وعظ و نصیحت کی بھی گنجائش نہیں ہے چہ جائیکہ مقاطعہ اور ضرب و تعزیر۔

---

[1] ، [2] تفہیم القرآن

زوجین کے نزاع میں قانون تحکیم

۶۹۔ اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے قرابت داروں میں سے مقرر کرو۔ یعنی اے مسلمانو! اگر تم کو اندیشہ ہو کہ خاوند اور بیوی میں مخالفت اور ضد ہے اور وہ اپنے باہمی نزاع کو خود سمجھا نہ سکیں گے تو تم کو چاہیے کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو۔ کیونکہ اقارب کو ان کے حالات بھی زیادہ معلوم ہوں گے اور ان سے خیر خواہی کی بھی زیادہ توقع ہے۔ یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے اور جس کا جتنا زیادہ قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرا دیں گے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر میاں وہ ساری تدبیریں اختیار کرے جو اوپر والی آیت میں ذکر کی گئی ہیں اور کسی صورت میں کوئی تدبیر کامیاب نہ ہو تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ معاملہ طول پکڑ گیا ہے اور قابو سے باہر ہو گیا ہے لیکن یہاں پہنچنے کے بعد بھی قرآن نے یہ اجازت نہیں دی ہے کہ شوہر کو چاہیے کہ بیوی کو طلاق دے دے۔ قرآن میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس کے ٹوٹنے کو صرف اس وقت ہی گوارا کرتا ہے۔ جب اصلاح کی ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب دونوں میں جمعیت اور اجتماعیت ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت میں شوہر کی ساری تدبیر کے ناکام ہونے کے بعد اصلاح احوال کے لیے ایک اور تدبیر بتائی ہے۔ اس تدبیر کے مخاطب کون ہیں: میاں بیوی کے رشتہ دار، خود میاں بیوی، حکام یا مسلمانوں کی رائے عامہ، تینوں رائیں ہیں جمہور کی رائے میں حکام کچھ کے خیال میں عام مسلمان۔ کچھ کہتے ہیں کہ میاں بیوی اور کچھ کہتے ہیں کہ ان کے رشتہ دار۔ ہمارے خیال میں یہ ہدایت مسلمانوں کی رائے عامہ کو دی گئی ہے اور اس کے مدلول میں حکمران اور میاں بیوی کے رشتہ دار بھی داخل ہیں۔

ابوبکر الجصاص کی رائے میں اصل مخاطب حکام ہیں اور قرطبی نے جمہور کا یہی خیال نقل کیا ہے۔ ابوبکر کہتے ہیں کہ معاملہ چونکہ میاں بیوی کے قابو سے نزاع کے طویل ہونے کی وجہ سے باہر ہو کر عدالت میں پہنچ گیا ہے اس لیے مخاطب حکام ہیں۔ دراصل آیتِ قرآن میں یہ بات کھولی نہیں گئی ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کرلیں ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کردیں اور اگر معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں اور بگڑی ہوئی صورت حال کو درست کریں اور اس کی عملی صورت یہ تجویز فرمائی ہے کہ ایک پنچ میاں کے رشتہ داروں میں سے لیا جائے اور دوسرا بیوی کے اقارب میں سے۔ یہ دونوں اصلاح کی کوشش کریں۔ قرآن نے ان کے لیے لفظ حکم بول کر اشارہ کردیا کہ اس کام کے لیے کہ و مہ کو نہ لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان کو منتخب کیا جائے جن میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو اور ظاہر ہے کہ فیصلہ کی صلاحیت کے لیے ان کا علم والا ہونا، دیانتدار اور عادل ہونا اور معاشرے میں ذی وجاہت ہونا ضروری ہے۔ بہرحال اگر میاں بیوی کے درمیان شقاق ایسی کشمکش پیدا ہوجائے جسے وہ باہم سلجھا نہ سکیں۔ اُمت اور افرادِ اُمت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ افراد کے باہمی اور خانگی مناقشوں سے معاشرہ اسلامی کا دامن بالکل الگ اور بے تعلق نہیں ہوتا کیونکہ افراد ہی کی صلاحیت پر اُمت کی صالحیت کا مدار ہے۔ اس آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ افراد کے خانگی نزاعوں کو اُمت اپنا ہی معاملہ سمجھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر زوجین کے مابین تمہیں باہمی کشمکش کا علم ہوجائے تو تمہیں دو حکم مقرر کرنے چاہئیں ایک مرد کے خاندان میں سے ہو دوسرا بیوی کے رشتہ داروں میں سے ہو۔

حاکمین کے فرائض و اختیارات

۷۰۔ اگر وہ دونوں اصلاح کے خواہاں ہوں گے تو اللہ دونوں کے مابین موافقت کا سامان کردے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے یعنی اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرادے گا بے شک اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم اور اطلاع ہے۔ رفع نزاع اور حصول اتفاق کے اسباب اور کیفیات اس کو خوب معلوم ہیں اس لیے نزاع زوجین کے رفع ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی[1]

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہا میں ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے البتہ تصفیہ کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو اس کے لیے سفارش

[1] افادات شیخ الاسلام

کر سکتے ہیں ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خلع یا کسی امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حنفی اور شافعی علماء کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مگر علیحدگی کا وہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ حسن بصری، قتادہ اور بعض دوسرے فقہا کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے قائم کی ہے۔

حضرت علی اور حضرت عثمان کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات پنچ مقرر کرتے ہوئے ان کو عدالت کی جانب سے حاکمانہ اختیارات بھی دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عقیل بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمان کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابن عباس کو اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ ابن ابی سفیان کو سرپنچ مقرر کر دیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت علی نے حکم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جدا کر دیں۔[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابن بطال کے حوالہ سے اس موضوع پر علماء کے مابین اتفاق و اختلاف کی یہ تفصیل پیش کی ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں خطاب مسلمان حکمران طبقہ سے ہے اور اس پر بھی علماء کا اتفاق ہے ان ارادا اصلاحاً سے حکمین مراد ہیں۔ اور اس پر بھی علماء متفق ہیں کہ حکمین میں سے ایک شوہر کے اقارب میں سے ہو اور دوسرا بیوی کے رشتہ داروں میں سے ہو اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ حکمین کا کوئی فیصلہ بصورت اختلاف نافذ نہ ہوگا۔ اور اگر دونوں متفقہ طور پر دونوں میں ملاپ کرا دیں تو یہ فیصلہ بالاتفاق نافذ ہے لیکن اگر دونوں بالاتفاق بجائے ملاپ کے میاں بیوی کے درمیان جدائی کا فیصلہ کریں تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام اوزاعی اور امام اسحاق فرماتے ہیں کہ حکمین کا یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا اور اہل کوفہ امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ حکمین کا یہ فیصلہ بغیر اجازت زوجین نافذ نہ ہوگا۔ اور ان بزرگوں کا یہ اختلاف دراصل حکمین کی حیثیت میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے۔ امام مالک اور ان کے ہمنواؤں کا خیال یہ ہے کہ حکمین کی حیثیت حاکم کی ہے اور امام ابو حنیفہ اور

---

[1] تفہیم القرآن ۱

دوسرے اہل کوفہ ۔ امام احمد اور شافعی کی رائے میں حکمین کی حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ وکیل کی ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر حکمین نے جدائی کا فیصلہ کر دیا تو حاکم ہونے کی وجہ سے بغیر اجازت زوجین فیصلہ نافذ ہوجائے گا اور وکیل ہونے کی وجہ سے زوجین کی اجازت کے بغیر نافذ نہ ہوگا ۔

زیر تشریح آیت کے اس فقرے میں یہ بتایا جارہا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان شقاق رونما ہو جائے ۔ اس میں حکمین کا کام یہ ہے کہ میاں بیوی میں صلح کرائیں ۔ اس سے زیادہ کوئی کام حکمین کے روانہ کرنے کی غرض نہیں ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود فریقین اپنی رضامندی سے ان دونوں حکموں کو اپنا وکیل ۔ مختار یا ثالث بنادیں اور ان سے یہ کہہ دیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دوگے ہمیں منظور ہوگا ۔ اس صورت میں یہ دونوں حکم پورے طور پر پیش پا افتادہ معاملہ کو نمٹانے میں مختار ہوں گے ۔ اگر دونوں طلاق پر متفق ہوجائیں تو طلاق ہوجائے گی ۔ دونوں مل کر خلع وغیرہ کی صورت تجویز کردیں تو وہ بھی نافذ ہوجائے گی ۔ یہ امام ابوحنیفہ اور حسن بصری کا مذہب ہے ۔

باہمی نزاع ختم کرنے کا طریق

قرآن حکیم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہوا ۔ گویا عدالت میں جانے کے بجائے بہت سے مقدمات کا فیصلہ برادریوں کی پنچائت کے ذریعے کیا جاسکتا ہے ۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ باہم صلح کرانے کے لیے تحکیم کی تجویز صرف ازدواجی زندگی تک محدود نہیں بلکہ دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے ۔ بالخصوص جبکہ جھگڑا اقرباء میں ہو ۔ کیونکہ عدالتی فیصلہ سے وقتی طور پر جھگڑا تو ختم ہوجاتا ہے مگر دلوں میں عداوت اور کدورت کے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں ۔ فاروق اعظم نے ملک کی مختلف عدالتوں کے نام لکھا تھا کہ :

> رشتہ داروں کے مقدمات انہی میں واپس کردو تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال سکیں کیونکہ عدالتی فیصلہ دلوں میں کینہ اور عداوت کے نشوونما پانے کا ذریعہ ہوتا ہے ۔

فقہاء احناف میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب معین الحکام میں اور ابن شحنہ نے لسان الحکام میں اس فرمان فاروقی کو اسے پنچایتی فیصلوں کی خاص بنیاد قرار دیا ہے جن کے ذریعے فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے مگر اس کی جو علت و حکمت اس فرمان

میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ دار میں عام ہے کیونکہ باہمی عداوت سے سب ہی مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے۔[1]

---

[1] معارف القرآن م ش

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا
فَخُوْرَا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ
وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ
يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ
لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝

اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ بالکل شریک نہ بناؤ۔

اور والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ، غریبوں کے ساتھ اور پڑوسیوں کے ساتھ خواہ اہلِ قرابت ہوں یا اجنبی، نیز پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ سلوک میں حسن کار بن کر رہو۔ اللہ ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا ہے جو اکڑ فوں اور گھمنڈی ہوں۔ جو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہوں اور خدا کے دیے ہوئے فضل کو چھپاتے ہوں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے اور اللہ سبحانہ ان لوگوں کو بھی دوست نہیں رکھتا جو صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر آخرت والے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ اور جس شخص کو شیطان کی رفاقت مل جاتی ہے تو یہ بہت بری رفاقت ہے۔ ان لوگوں کا کیا نقصان ہو جاتا اگر وہ اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان لے آتے اور اللہ کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرتے اور اللہ ان کی حالت کی پوری خبر رکھتا ہے۔

حقوق و فرائض

اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ اس وقت رات نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت لازماً دن ہے اس لیے جب عائلی زندگی اور معاشی زندگی پر تبصرے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام نہ تو رہبانیت کو صحیح سمجھتا ہے نہ اس کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود ہے تو اس کی نوعیت آپ سے آپ مقرر ہو گئی یعنی یہ کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہو وہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کی ہدایت کو سامنے موجود پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح اپنے اندر سمیٹے ہوئے روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام، قانونی نظام، غرض اسلام زندگی کا ایک ایسا مکمل نظام ہے جس کے سارے اجزاء اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی کوزے میں سارے اجزاء کو پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی عائلی نظام کا تعارف ہو رہا تھا کہ فوراً رخ معاشی نظام کی طرح ہو گیا۔ اور معاشی نظام پر گفتگو نے رخ ایک دم معاشرتی نظام کی طرف کر لیا۔ درمیان میں اعبدوا اللہ فرما کر اخلاقی نظام کی طرف متوجہ کر دیا کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو یا اجنبی ہر حال میں اچھے سلوک کا مستحق ہے۔ جو لوگ تمہارے پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہیں لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں ان سب کے تمہارے ذمہ حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت و سلوک کرو، بخل نہ کرو خدا نے جو کچھ دیا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں لگاؤ۔ خرچ میں ریا و نمائش سے دامن بچا کر رکھو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں کچھ اخلاقی فضائل ہیں اور کچھ رذائل فضائل میں کچھ حقوق ہیں اور کچھ آداب۔

قرآن کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنے خالق کے کچھ حقوق و فرائض اور کچھ دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں کے کچھ حقوق عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے یہ حقوق و فرائض قرآنی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اسلامی اخلاق کا چہرہ پیش کیا ہے۔

عبادت اللہ کا حق اور بندے کا فرض ہے

اٹ ۔ اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ بالکل شریک نہ بناؤ۔ یعنی عبادت اور نیک عمل خدا پر یقین کرکے اور ثواب آخرت کی توقع سے کرو۔ فخر و ریا سے مال دینا بھی شرک ہے گو کم درجہ کا ہے۔[1]

یہاں حقوق و فرائض کے بیان میں سب سے پہلے اللہ کا حق پیش کیا ہے۔ صحیحین کی ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اللہ کا حق بتایا ہے۔ ارشاد ہے ،

اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کریں اور شرک نہ کریں۔

اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے یہی ارشاد ان ہی الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ اس ارشاد میں صاف بتایا ہے کہ اللہ کا بندے پر حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کی عبادت میں کسی کو ساجھی یا ساجھی نہ بنائیں اور قرآن نے اسی عبادت کو انسان کی تخلیق کا بنیادی اور اہم مقصد قرار دیا ہے۔ چونکہ خالق کا حق طبعاً مقدم ہے اس لیے یہاں وضعاً بھی تمام حقوق و فرائض سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ عبادت جس کا قرآن حکم دے رہا ہے اور جسے مقصدِ تخلیق بنایا گیا ہے کیا چیز ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک مفہوم و مدعا کیا ہے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے قرآن کا یہ مطالبہ مجمل رہے گا کہ اللہ کی عبادت کرو۔

عبادت کی معنوی توضیح

اہل لغت اور علماءِ شریعت نے عبادت کے معنے اس طرح بیان کیے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ عبادت انتہائی تذلل کا نام ہے۔ صاحبِ لسان العرب نے مشہور امام لغت زجاج سے نقل کیا ہے کہ عبادت وہ طاعت ہے جس میں خضوع ہو۔ امام نووی نے بھی عبادت کے معنے جذبہ خضوع رکھنے والی طاعت کے بتائے ہیں۔ اور حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ عبادت دو بنیادی اور اہم چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے ایک انتہائی محبت دوسرے نہایت عجز و تذلل۔ اہل عرب روندے ہوئے پامال راستہ کو طریق معبد کہتے ہیں اور تعبد بھی بمعنے تذلل آتا ہے۔ محبت ہو تذلل نہ ہو یا تذلل ہو محبت نہ ہو عبادت

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں. عبادت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

ان بیانوں اور لغوی تشریحات میں بظاہر کچھ اختلاف ہے مگر فی الواقعہ یہ اختلاف نہیں بلکہ ایک جامع حقیقت کے مختلف اہم پہلوؤں کی وضاحت ہے۔

اہلِ لغت کے بیانات اور قرآن کے استعمالات سے جو بات حقیقت بن کر نمودار ہوتی ہے کہ عبادت اللہ کے حضور باطناً ہر حیثیت سے پوری طرح جھک جانے کا نام ہے کیونکہ قرآن نے دونوں ہی قسم کے جھکاؤ کو عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ باطن کے جھکاؤ کی حیثیت فعلِ عبادت میں رُوح کی ہے جبکہ ظاہر کے جھکاؤ کی حیثیت محض قالب کی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ رُوح اور قالب کی یہ تفریق قطعاً ایک فکری اور نظری تفریق ہے۔ اس دوئی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ از روئے واقعہ بھی ان دونوں چیزوں کو الگ کیا جا سکتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے انسان کے جسم اور اس کی روح کے درمیان تفریق صرف جسم یا صرف روح کو انسان نہیں کہا جا سکتا اس لیے باطن کے جھکاؤ کی تمام تر اہمیتوں کے باوجود صرف اسی کو قرآن کی مطلوبہ عبادت قرار دینا سخت نافہمی ہے۔ عبادت تو ظاہر کے جھکاؤ اور باطن کے جھکاؤ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ عبادت کے قالب کے مقابلے میں اس کی رُوح کی اہمیت جتنی زیادہ مسلم ہے اسی قدر یہ بات بھی مسلم ہے کہ رُوح ایک پوشیدہ چیز ہے۔ اس کے برعکس عبادت کا قالب سب کے سامنے موجود ہے بلکہ یہ قالب ہی اپنی رُوح کے وجود کا ثبوت بھی ہے اور اسی کو دیکھ کر اس کا جھکاؤ کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عبادت کا قالب اس کا صرف قالب ہی نہیں ہے بلکہ اس کی رُوح کا لازمی مظہر بھی ہے۔ انسان کا ظاہر اگر خدا اور اس کے احکام کے سامنے جھکا ہوا ہے تو بھی اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا باطن بھی اپنے آپ کے حضور سجدہ ریز ہے اس لیے کہنا چاہیے کہ ظاہر کا جھکاؤ اگر صحیح معنوں میں موجود ہے تو گویا سب کچھ موجود ہے۔ چنانچہ آپ سُن چکے ہیں کہ بعض عُلماء نے عبادت کے معنے صرف طاعت کے کیے ہیں. جو ظاہری جھکاؤ ہی کی ایک واقعاتی تعبیر ہے اس سے کم از کم اتنا تو واضح ہو رہا ہے کہ ان علماء کے نزدیک احکامِ الٰہی کی طاعت اور ظاہر کے جھکاؤ کے بغیر عبادت ایک لفظِ بے معنے سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح جن اربابِ علم نے عبادت کے معنے صرف طاعت نہیں بلکہ طاعت مع الخضوع بتائے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق بھی طاعت یعنی ظاہر کا جھکاؤ عبادت کے مفہوم کا جزوِ لازم ہے۔ اس طرح جس تعبیر کو بھی لیجئے عبادت کے مفہوم سے ظاہر کا جھکاؤ علیحدہ نہیں ہے۔

قرآن کی مطلوبہ عبادت

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی جس عبادت کو انسان کا مقصدِ وجود قرار دیا ہے اور جس کی تلقین و ہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں وہ صرف پاس کے جھکاؤ یا چند رسوم کی ادائیگی کا نام نہیں ہے۔ یہی عقل صریح کا تقاضا ہے اور یہی قرآن کا ناطق فیصلہ۔ عقل کا تقاضا اس لیے ہے کہ جو خدا انسان کا خالق اور مالک، رازق اور محسن، حاکم اور معبود سبھی کچھ ہے، اسے سبھی طرح کی عبادتوں کا حقدار بھی ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ اس لیے ہے کہ قرآن کی آیتیں اپنے پیروؤں سے اللہ سبحانہٗ کی پرستش اور بندگی دونوں کا یکساں طور پر مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ جہاں یہ کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اسی کے نام کی پاکی بیان کرو، اسی سے دعائیں مانگو۔ اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو مدد کے لیے پکارو۔ اور اسی کے حضور اعترافِ نعمت کرو۔ وہیں یہی کہتی ہیں اور بار بار کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو بلے قید و شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرماں روا مانو، اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو، اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو، اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ، اور اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اس لیے اس عبادت کا مفہوم جسے انسان کی پیدائش کا مدعا و مقصد قرار دیا گیا ہے جو ہر نبی کی دعوت کا سرعنوان تھی اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے لازماً وہ ہی جامع اور کامل مفہوم ہوگا جس میں پرستش اور بندگی دونوں شامل ہیں پرستش اس کے محبوب مطلق ہونے اور بندگی اس کے حاکم مطلق ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اس طرح ان دونوں تعبیروں سے یہ حقیقت زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عبادت، محبت اور تذلل دونوں کی جامع ہے۔ حافظ ابن القیم کے استاد حافظ ابن تیمیہ سے جب دریافت کیا گیا کہ اعبدوا اللہ میں جس عبادت کا حکم دیا گیا اس کا مدعا کیا ہے تو آپ نے اس مسئلہ پر ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے کہا ہے:

> عبادت ایک جامع لفظ ہے اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ حج، راست گوئی، امانتداری، صلہ رحمی، دیانت، اطاعتِ والدین، وفائے عہد، امر بالمعروف نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ اچھا سلوک، دعا، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن اور اسی قسم کے تمام اعمالِ صالحہ عبادت کے اجزا ہیں۔ اسی طرح اللہ کی اور اس کے رسول کی محبت، رحمتِ خداوندی کی امید اور عذابِ الٰہی کا خوف، خشیت، انابت، اخلاص، صبر و شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادت کے اندر شامل

ہیں۔ (العبودیۃ ص ۲)

آگے چل کر ایک جگہ پھر فرماتے ہیں:

ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت مخلوق کے شرف و مجد اور اس کی سعادت معراج کمال ہے وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہوجاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزا کے ساتھ عبادت میں داخل ہے سارے انبیاء اللہ کا دین سکھانے آئے تھے جیسا کہ قرآن میں کئی جگہ اس کی صراحت موجود ہے اور پھر ہر نبی نے اپنے مخاطب لوگوں کو فاعبدوہ کی ہدایت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین اور عبادت ایک ہی مدعا کی دو تعبیریں ہیں۔

یہ ساری تفصیلات اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی ہیں کہ عبادت اللہ کا بنیادی حق اور بندے کا اولین فرض ہے۔

حق خدا کے بعد حقوق کی ترتیب

۴۷۔ اور والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ اور غریبوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ خواہ اہل قرابت ہوں یا اجنبی نیز پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ سلوک میں حسن کار بن کر رہو۔ یتامیٰ، نساء اور ورثا اور زوجین کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن معاملہ کو بیان فرما کر اب یہ ارشاد ہے کہ ہر ایک کا حق درجہ بدرجہ تعلق کے موافق اور حاجت مندی کے مناسب ادا کرو سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کا حق ہے پھر ماں باپ کا پھر درجہ بدرجہ سب واسطہ داروں اور حاجت مندوں کا اور ہمسایہ قریب اور غیر قریب سے مراد قرب و بُعد نسبی ہے یا قرب و بُعد مکانی۔ صورت اولیٰ میں یہ مطلب ہوگا کہ ہمسایہ قرابتی کا حق ہمسایہ اجنبی سے زیادہ ہوگا اور صورت ثانیہ کا مدعا یہ ہوگا کہ پاس کے ہمسایہ کا ہمسایہ بعید یعنی جو کہ فاصلہ سے رہتا ہے اس سے زیادہ ہے اور پاس بیٹھنے والے میں رفیق سفر اور پیشہ کے اور کام کے شریک اور ایک آقا کے دو نوکر اور ایک استاد کے دو شاگرد اور دوست و شاگرد اور مرید وغیرہ سب داخل ہیں۔ اور مسافر میں مہمان غیر مہمان دونوں آگئے اور مال مملوک لونڈی غلام کے علاوہ دیگر حیوانات کو بھی شامل ہے۔[۱]

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس کے بعد مخلوق کے حقوق کو بیان کیا ہے اور ان میں ایک خاص ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور اس ترتیب کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جسے قرآن نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلے میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں ایک دوست کی غیروں اور بیگانوں کے مقابلے میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی عزیز ہے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے۔ فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیزداری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے اس کا نام قرآن کی اصطلاحی زبان میں حمیۃ الجاهلیۃ جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کے سوا کہیں انسانی حقوق کی درجہ دار کوئی تفصیل نہیں ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے اس کی ایک غریب ماں بیمار ہے۔ ایک غریب اور بیمار باپ ہے ایک غریب اور بیمار بھائی ہے۔ ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے۔ پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیے یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے پہلے ماں کے ہیں پھر باپ کے ہیں۔ پھر بھائی کے ہیں پھر پڑوسی کے ہیں۔ پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یہ نیکی نہ ہو گی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو۔ اگر ایسا وہ کر سکے تو اخلاقاً اسے معذور سمجھا جائے گا۔ قرآن نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت کو قرآن نے اللہ سبحانہ کے بعد انسانی رشتوں میں

سب سے بڑا بتایا ہے اور خدا کی طاعت کے ساتھ ان کے ساتھ نیکی کرنے، ان کی طاعت کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نبوت نے اپنے ارشادات میں سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا۔ ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دلداری کرنے اور اس کی فرماں برداری کرنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید وتکوین میں شریک ہے وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی ومالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوتوں کا تشکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے چنانچہ قرآن نے ان کی خدمت ان کی اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلداری ہر چیز فرض قرار دی ہے بلکہ یہاں تک تاکید کی ہے کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو۔ ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو انہی کی خدمت سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ ان کی ہی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی ۱۲ مختلف آیتوں میں تاکید آئی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید عبادت کی تعلیم کے بعد آئی ہے کیونکہ اللہ کی ذات تخلیق انسانی کے لیے اگر علت فاعلی ہے تو ماں اور باپ اسی تخلیق کے لیے علت مادی ہیں۔

رشتہ داروں کے حقوق

قرآن میں والدین کے بعد وبذی القربیٰ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہاں اندازِ تعبیر ذرا مختلف ہے اور کسی جگہ والدین اور اقرباء کے حقوق کے بیان میں یہ انداز نہیں اختیار کیا گیا یعنی ہر جگہ فللوالدین والاقربین آیا ہے لیکن یہاں بجائے یہ کہنے کے وبالوالدین احساناً وبذی القربیٰ فرمایا ہے۔ شارحین قرآن نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ قرآن اس معاملہ میں امتِ محمدیہ کو یہ حکم بنی اسرائیل کے مقابلے میں زیادہ موکد کر کے دے رہا ہے۔ حرف با کا تکرار تاکید کے لیے ہے لیکن سید رشید رضا نے یہاں اس سے زیادہ لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ با کا تکرار تاکید کے لیے نہیں بلکہ تنویع ظاہر کرنے کے لیے ہے یعنی یہ بتانے کے لیے ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کی نوعیت اور ہے اور اقرباء کے ساتھ احسان کی نوعیت کچھ اور ہے جو ادب واحترام اور خدمت والدین کی کی جائے گی وہ

اقربا کی نہ ہوگی۔

پہلے بیوی، بچوں کے حقوق کا ذکر ہو چکا ہے اب یہاں والدین کے حقوق کے بعد اہل قرابت کے حقوق کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اس کا نام صلہ رحمی ہے۔ قرآن کی اخلاقی تعلیمات میں صلہ رحمی اور حقوق قرابت کی اہمیت دُنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ قرآن کی کم از کم بارہ آیات میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق ہوتا ہے۔

حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت کی راہ میں آپ کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت تعلیم اور اصلاح کے ذریعے ہم پر فرمایا بدل و معاوضہ اور مزدوری اپنی اُمت سے یہ طلب فرما۔ ہم ہیں کہ رشتہ داروں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ۔

کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری کہیں ہم درسی کہیں ہم سائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالق فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

یتیموں کے حقوق

یتیموں کے بارے میں ضروری باتیں بتائی جا چکی ہیں۔ یتیم وہ کمسن بچہ ہے جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہو جائے۔ اُمت مسلمہ کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو اپنی آغوش محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر کرے۔ عقل و شعور تک پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد واپس کر دے۔

اگر یتیم مفلس و غریب ہوں تو ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ قرآن پاک نے صرف یہاں نہیں بقرہ، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش کی تاکید اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے۔ بیت المال میں قرآن نے دوسرے ابواب خیر کے ساتھ یتیموں کی امداد کے لیے بھی ایک مد

رکھی۔ اسلامی حکومتوں نے مستقل یتیم خانے قائم کیے جن میں یتیموں کی پرورش کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی پورا انتظام تھا۔ سب سے پہلے باقاعدہ یتیم خانہ ولید بن عبدالملک نے قائم کیا۔ اس کے بعد اس کا سلسلہ قائم رہا ہر اسلامی حکومت میں یتیم خانہ ضرور ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ثروت اصحاب خیر اپنے ذاتی یتیم خانے بھی قائم کرتے تھے جن پر بڑی بڑی جائدادیں وقف کرتے تھے جن کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔ اس طرح یتیم خانوں کی بنیاد در حقیقت مسلمانوں نے رکھی جس کی تقلید دوسری قوموں اور حکومتوں نے کی۔ مسلمانوں سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس کے علاوہ قرآن نے عدالت کے فرائض میں لاوارث یتیم کی سرپرستی اور ان کی جائداد کی حفاظت اور نگرانی رکھی جس کی روشنی میں فقہائے نے باقاعدہ قوانین وضوابط بنائے۔

ناداروں اور حاجت مندوں کے حقوق

اصل ارشاد میں مساکین آیا ہے۔ یہ مسکین کی جمع ہے۔ یہ سکون سے بنا ہے۔ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جس کی معاشی حالت انتہائی سکون کی حالت میں ہو۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

المسکین کا لفظ سکون سے بنا ہے گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عجز و بے چارگی نے اسے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔

حصول معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل ساکن یا مفقود نہ ہوں لیکن اتفاقی حالات کے شکار ہو کر معاشی ذرائع سے وہ محروم ہو گئے ہوں مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا ہو اور علاج معالجہ میں سارا سرمایہ ختم ہو گیا ہو یا کاروبار میں نقصان ہو کر کنگال ہو گیا یا اسی قسم کے دوسرے حوادث کا شکار ہو گئے ہوں۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مہاجرین کا حال تھا کہ ان کو حالات نے گھر بار اور جائداد چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور انہوں نے مدینے آکر پناہ لی تھی۔ حوادث روزگار میں ان ہی مبتلا ہونے ناداروں کو الفقراء کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں مہاجرین کی صفت الفقراء آتی ہے۔ ان دونوں یعنی مسکین اور فقیر میں فرق پر ان شاء اللہ تفصیلی تبصرہ دسویں پارے میں آئے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک، ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے چکروں میں آجاتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر مسدود پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں بیروزگار تعلیم یافتہ طبقہ کی نوعیت بھی شاید اسی کے قریب قریب ہے۔ دوسروں کو حیرت ہوتی ہے کہ ہٹے کٹے ہوتے ہوئے یہ لکھے پڑھوں کا گروہ معاشی پریشانیوں میں آخر مبتلا کیوں ہے کہ جاہلوں سے

زیادہ روٹی کا مسئلہ ان کے لیے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بظاہر حالات کسی کے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں لیکن اس کے واقعی حالات کا صحیح معیار نہیں ہو سکتے۔ اکبر کا شعر اس موقعہ پر یاد آتا ہے:

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

پڑوسیوں کے حقوق اور ذمہ داریاں

اصل ارشاد میں والجار ذی القربیٰ والجار الجنب کے الفاظ آئے ہیں یعنی ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ۔ ان کی مراد میں شارحین قرآن کا اختلاف کیا ہے۔ ایک قریب کے معنے رشتہ دار و عزیز اور بیگانہ کے معنے غیر اور اجنبی کے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ نزدیک کے معنے ہم مذہب کے ہیں اور دور سے مراد دوسرے مذہب والے ہیں جیسے یہودی، عیسائی، مشرک، لیکن فی الواقع یہ حقیقت بے معنے ہے۔ قرآنی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو وہ خواہ قرابت یا عزیزداری کا ہو یا ہم مذہبی یا اور کسی قسم کی رفاقت کا ہو۔ بہرحال حق کے ساتھ دوسرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمائی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک روز آپ مجمع صحابہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک خاص دلنشیں انداز میں فرمایا خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ جاں نثار دل نے پوچھا کون یا رسول اللہ فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں ہے[1]

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا جو خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے[2]

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلیمات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے۔ اسی بنا پر ایک بار حضرت عائشہ نے پوچھا یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے ہدیہ کس کے پاس بھیجوں۔ فرمایا

---

[1] [2] صحیح بخاری کتاب الادب

جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو[1]

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربہ ہی ہو۔ آپ نے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذر کو نصیحت فرمائی کہ اے ابوذر جب شوربہ پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو[2]

دوست اور ہم نشین کے حقوق

اصل ارشاد میں اس کے لیے الصاحب بالجنب کے الفاظ آئے ہیں، ہم سفر، ہم مجلس، ہم سبق، ہم تجارت، ہم صنعت، ہم مسجد سب مراد ہیں۔ اسے عام طور سے پڑوسی نہیں کہتے گر وہ ہمسایہ کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہم سائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے اور ایسا شخص بھی اس سے مراد ہے جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو یا کسی دکان پر آپ سودا خرید تے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو یا سفر کے دوران کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسائیگی بھی ہر مہذب اور شریف آدمی پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے[3]

شریعتِ اسلام نے جس طرح دور نزدیک کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق واجب فرمائے۔ اسی طرح اس شخص کا بھی حقِ صحبت لازم کر دیا جو تھوڑی دیر کے لیے کسی مجلس میں یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، جس میں مسلم و غیر مسلم اور رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب برابر ہیں۔ اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے۔ کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں۔ اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافروں کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب [2] ترمذی [3] تفہیم القرآن۔

ہر شخص اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں۔ دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس ریل میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے۔ [1]

مسافروں اور مہمانوں کے حقوق

اصل ارشاد میں وابن السبیل آیا ہے اس کے مفہوم میں مسافر اور مہمان داخل ہیں۔ موجودہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریستورانوں نے اپنے سر لے لی ہے مگر گزشتہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی۔ اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے ضمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی کا مہمان ہوتا ہے اور جو مہمان ہوتا ہے وہ چل کر آتا ہے اور جو چل کر آتا ہے وہ مسافر بھی ہوتا ہے گویا ہر مسافر مہمان ہوتا ہے اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی ہے۔ آج ہم چل کر آنے والے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل جب ہم چل کر جائیں گے وہ ہمارے ساتھ کرے گا۔ دوسرے مذاہب میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھایا۔

یہاں قرآن نے ابن السبیل کا لفظ لا کر دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک تو یہی کہ مسافر اور مہمان ہماری حسن کاری کا مستحق ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ملکی ہو یا غیر ملکی اور دوسری طرف ہمیں سیاحت اور مسافرت کی طرف بھی اس میں ترغیب ہے۔

یہ تو قرآن حکیم کی صراحت ہے کہ مسافر کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کا برتاؤ کرو اور قرآن ہی میں انبیاء کے واقعات میں مہمان نوازی پر ضمنی اشارات بھی آئے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کو ایمان کامل کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

> جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت

---

[1] تفہیم القرآن۔

کے ساتھ دے دریافت کیا گیا کہ مہمان کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا[1]

ابوداؤد کی کتاب الاطعمہ باب الضیافت میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان کی ایک رات ضیافت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے جس کے صحن میں مسلمان صبح کرے اس پر یہ حق فرض ہے مہمان چاہے تو اس کا تقاضا کرے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

بخاری کتاب الادب اور مسلم میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اس کا حق ایک دن ایک رات ہے۔ مہمانی کی مدت تین دن ہے اس کے بعد جو کچھ کیا جائے صدقہ ہے اور مہمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ میزبان کے یہاں اتنا طویل عرصہ ٹھہرے کہ اسے تنگی میں ڈال دے۔

یہ ارشادات بتلاتے ہیں کہ ایک شب و روز کا قیام و طعام ہر صاحب استطاعت مسلمان مقیم پر مسافر مہمان کا حق ہے۔ مسافر مہمان کے لیے تین دن تک اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے اور میزبان کو چاہیے کہ خوش دلی کے ساتھ اس کی ضیافت کرے۔ تین دن کے بعد اگر میزبان کچھ کرتا ہے تو اس کی حیثیت صدقہ کی ہے اور مہمان کو حتی الامکان تین روز سے زیادہ قیام سے پرہیز کرنا چاہیے۔ رہی ایک شب و روز کی ضیافت وہ میزبان پر مہمان کا واجب الادا حق ہے۔

ماملکت ایمانکم کے حقوق

قرآن کی اصطلاح میں ماملکت ایمانکم سے مراد وہ غلام اور کنیزیں ہیں جو جنگ میں گرفتار ہوکر آئیں لیکن مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

"مال مملوک غلام اور لونڈی کے علاوہ دیگر حیوانات کو بھی شامل ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لفظ کے ذریعے غلاموں اور ان تمام جانداروں کے حقوق بیان ہو رہے ہیں جو آپ کی ملک میں داخل ہیں، بلکہ اگر اس کے مفہوم میں ان کو بھی داخل کر لیا جائے۔ اجرت کے

[1] بخاری کتاب الادب

ذریعے جن کے اوقات کے ہم مالک ہو جاتے ہیں نوکر، ملازم، مزدور جو خود تو مملوک نہیں ہوتے لیکن ان اوقات کا آقا، مالک کی ملکیت ہوتے ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے اس طرح قرآن نے یہاں ماملکت ایمانکم بول کر غلاموں، کنیزوں، نوکروں، مزدوروں اور حیوانوں کے حقوق بیان کر دیے ہیں۔ ملک یمین کی بحث میں ہم اس پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں لیکن یہاں قرآن نے یہ لفظ حقوق کے ضمن میں بولا ہے اس لیے اسلام میں غلاموں کے ساتھ حسنِ معاشرت کی بھی آیت اساس ہے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے غلاموں کے ساتھ نیک اور شریفانہ برتاؤ کرنے کی پُرزور تلقین کی ہے۔

احادیث میں غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید آئی ہے، صحیح بخاری میں معرور بن سوید سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوذر غفاری کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے ڈال دیا ہے۔ یاد رکھو جس کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو تو چاہیے کہ جو کچھ خود کھائے اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو ان کو دبا دے اور اگر ان پر بار ڈالو تو ان کی مدد کرو۔

یہ ارشادِ نبوت قرآن کی اس آیت کی بہترین تفسیر ہے۔ اس ارشاد میں صرف غلاموں ہی سے حسن سلوک کی نہیں بلکہ نوکروں، ملازموں اور مزدوروں سے بھی حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔

اس ارشادِ نبوت سے معاشی زندگی کے چند اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اولاً یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہے کہ جو لوگ مزدوری پر کام کرتے ہیں لوگ ان کو اپنا بھائی خیال کریں۔ اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

ثانیاً کم از کم کھانے پینے، رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح ایک ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں نبوت کا نقطہ نظر کیا ہے یعنی کم از کم اتنی اجرت مزدور کو ضرور ملنی چاہیے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔

ثالثاً وقت اور کام دونوں کے لحاظ سے نوکروں، غلاموں اور مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے جو ان کو مغلوب کر کے تھکا دے۔

رابعاً اگر کوئی کام ایسا پیش آ جائے جس کی انجام دہی میں غلام و نوکر اور مزدور کو دشواری پیش آ رہی ہو

اس کا مطلب نہ یہ ہے کہ اس سے یہ کام نہ کرایا جاتے اور نہ یہ کہ خواہ حالات کچھ ہوں پھر بھی اسی سے کام لیا جائے بلکہ اصل حل یہ ہے کہ کارکن کی مدد مزید قوت سے کی جائے۔

محنت اور سرمایہ کا جھگڑا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں یہی سمجھتا ہوں کہ محنت اور سرمایہ کے نام پر جس قدر آویزشیں اس زمانہ میں رونما ہو رہی ہیں۔ اس ارشادِ نبوت کی روشنی میں اس کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر عملی واقعات کی طویل فہرست بھی ہے۔ اسی حدیث کے راوی حضرت ابوذر غفاری کا یہ معمول تھا اور حضرت عمر کا سفرِ بیت المقدس میں آدھے راستہ خود سوار ہونا اور آدھے راستہ میں غلام کو سوار کرانا مشہور ہے۔

صحیح بخاری میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت میں تین آدمیوں کا فریق مخالف ہوں گا۔ ایک شخص وہ جس نے میرے نام سے کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی، دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرا وہ جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔

ایک اور ارشاد مسند ابی یعلیٰ میں ابوہریرہ کے حوالہ سے آیا ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری ادا کر دو قبل اس کے کہ پسینہ خشک ہو۔

ایک اور ارشاد مسند احمد میں آیا ہے:

مزدور کو اس کے کام میں سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ کا عامل و مزدور نامراد نہیں کیا جا سکتا۔

اس ارشادِ نبوت کا کیا مطلب ہے؟ کیا علاوہ مزدوری کے منافع میں بھی مزدور کا حصہ ہے۔ افسوس ہے کہ فقہاءِ اسلام کی کتابوں میں مجھے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ملی ہے لیکن ایک اور حدیث ہے جس سے اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی دھوئیں کو اس نے برداشت کیا تھا تو چاہیے کہ اپنے ساتھ بٹھا لو اور کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر

خادم کے ہاتھ میں کھانے میں سے کچھ چیز اٹھا کر ایک لقمہ یا دو لقمے دے دو۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو قرآن کے مطالبہ حسنِ سلوک ہی کا اس کو اثر سمجھتا ہوں۔ کیا مزدور کو بھی اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟ غلاموں، ملازموں اور مزدوروں سے مالکوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے اور حسنِ سلوک کی حد کیا ہے؟ ارشادِ نبوت سے یہ بات تو پہلے گوش گزار ہو چکی ہے کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ اسی حسنِ سلوک کے سلسلے کی ایک وہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور دریافت کیا، میں اپنے نوکر کو کتنی بار معاف کروں؟ راوی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اسی سوال کو دہرایا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا روزانہ ستر بار معاف کرو۔ اسی بنا پر فقہاء اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ نوکر جو تنخواہ پر رکھا جاتے اس پر چیزوں کے نقصان کرنے کا تاوان نہ ہوگا جب تک وہ قصداً نقصان نہ کرے۔ علامہ مقدسی نے اس جزئیہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہی امام مالک اور ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

اسی سلسلے میں وہ حدیثیں بھی ہیں جن کا تعلق اگرچہ غلاموں سے ہے مگر میرے نزدیک یہ احکام ہر شخص کے لیے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابومسعود بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے پیچھے سے حضور انور نے آواز دی خبردار ابومسعود، ابومسعود کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون آواز دے رہا ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں ابومسعود خبردار اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے غلام سے زیادہ قادر ہے۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ فتای میرا جوان کہے۔ اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت آخری بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ نماز کا خیال رکھو اور جو تمہارے غلام ہیں ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

حسنِ سلوک کے بارے میں ان تعلیمات پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی۔ ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ

ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے موالی میں شمار ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم خاندانوں میں شمار کرو جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو۔ اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں [1]

ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار، مملکتوں کا بادشاہ اور روحانی قیادت کا عظیم منصب عطا کر دیا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے۔

اخلاقی رذائل میں فخر و غرور کا مقام

۳۷ ۔ اللہ سبحانہٗ ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا ہے جو اکڑفوں اور گھمنڈی ہوں۔ یعنی جس کے مزاج میں تکبر اور خودپسندی ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھے اپنے مال پر مغرور اور عیش میں مشغول ہو وہ ان حقوق کو ادا نہیں کرتا سو اس سے احتراز رکھو اور جدا رہو [2] اصل ارشاد میں مختال و فخور کے الفاظ آئے ہیں۔ مختال کا مادہ خیل ہے۔ اسی سے خیلاً بنا ہے جس کے معنے تکبر کے ہیں۔ اسی سے حدیث میں آتا ہے من جر ثوبہ خیلاء لـم ینظر اللہ الیـہ جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہ دیکھے گا اور مختال وہ مالدار ہے جو بڑا بنتا ہے۔

فخور فخر سے بنا ہے جس کے معنے گھمنڈ کے ہیں یعنی ان چیزوں میں اپنی بڑائی ظاہر کرنا جو انسان سے باہر ہیں مثلاً سرمایہ اور جاہ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مختال وہ ہے جو اپنی ذات کی بڑائی چاہتا ہے اور عزیز دل قریبیوں اور پڑوسیوں سے ملنے میں کسرِ شان سمجھتا ہے اور فخور وہ ہے جو دوسروں کے سامنے اپنی بڑائی زبان سے کرتا ہے۔ یا یوں کہو کہ مختال اپنے آپ کو فضیلت دینے والا ہے اور فخور مال و مرتبہ سے بڑائی ظاہر کرنے والا ہے یا مختصر لفظوں میں یوں کہہ دو کہ مختال اپنے کردار سے بنتا ہے اور فخور اپنی گفتار سے ہوتا ہے۔

اس فقرے کے ذریعے یہ بات بتائی گئی ہے کہ عبادت میں اللہ کا حق ادا کرنے، اور مخلوق سے برتاؤ میں حسن کاری سے وہ لوگ گریز کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر تواضع اور شکرگزاری کے جذبے کی جگہ غرور اور فخر پیدا ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی جگہ ان پر اپنی دھونس اور رعب جمانے کی فکر کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ ایسے ناشکروں اور ناقدروں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید [2] افادات شیخ الاسلام

دراصل انسان میں جب کوئی وصف باکمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں ہے لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں۔

فخر و غرور ایک اضافی چیز ہے جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں بلکہ اس تصور کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھا۔ آپ نے قرآن کی یہی آیت ان اللہ لا یحب کل مختال فخور تلاوت فرمائی اور تکبر کی برائی کا تذکرہ کیا مجھے رونا آگیا۔ حضور نے مجھ سے دریافت کیا کہ ثابت کیوں روتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی مجھے بھاتی ہے یہاں تک کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے چپل کے تسمے بھی خوبصورت ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تم اہل جنت میں سے ہو تم اپنی سواری اور پالان کو اگر خوبصورت بناتے ہو تو یہ کبر نہیں بلکہ کبر یہ ہے کہ حق کو ہلکا سمجھو اور لوگوں کو حقیر مانو۔ ابو داؤد نے کتاب اللباس میں ابو ہریرہ کی یہ حدیث لکھی ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے فرمایا یہ تکبر نہیں ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا تکبر ہی جب انسانی طبیعت کا تقاضا اور ملکہ بن جاتے اور عادات و کردار میں اس کا ظہور ہو اس کا نام اختیال ہے اور جب بھی زبان پر نمایاں ہو تو اس کا نام فخر ہے۔

دُنیا کی زندگی میں اللہ سے لگاؤ اور مخلوق سے برتاؤ تمام بداخلاقیوں کا سرچشمہ اختیال و فخر ہے۔

فخر و غرور کی خصوصیات

۳۷۔ جو بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا حکم دیتے ہوں اور خدا کے دیے ہوئے فضل کو چھپاتے ہوں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خود پسند اور تکبر کرنے والوں کو جو کہ بخل کرتے ہیں اور اپنے مال اور علم خداداد کو لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اور قولاً و عملاً دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں اور ان کافروں کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے میں خود بخل کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی روکتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جو توریت میں مذکور تھے اور اسلام کی حقانیت پر مبنی جو آیات موجود تھیں ان کو چھپاتے سو مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیے۔[1]

پہلی آیت میں اکڑنے اور فخر کرنے والوں کا تذکرہ تھا اس آیت میں ان کا خصوصی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہیں اور دوسروں کو بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ بخیل اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کی پاسداری میں تنگ دل ہو۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو بجائے خدا کے دین سمجھنے کے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع و خاکساری اور شکر گزاری کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے جو فیاضی وجود کا اصلی محرک ہوتا ہے۔ بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی دبائے رہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ اس کی بزدلی کا راز نہ نکلے۔

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دیا ہوا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کی ایک پوشیدہ نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی ایک طرف تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی بالادستی قائم رہے دوسری طرف وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان پر تنقید نہ کرے۔ ہر شخص کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروباری نقصانات کا ذکر کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ ہیں تو یہ دریا دل لیکن مجبور ہیں۔[2]

اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہوا اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور نہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے نہ بندگان خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے، لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اللہ اذا انعم نعمۃ علی عبد احب ان یظھر اثرھا علیہ اللہ جب کسی بندے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو یعنی اس نعمت کا اثر کھانے پینے پہننے سہنے لباس اور اس کی داد و دہش ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا ہے[1]۔

بہر حال اللہ کے دیے ہوئے فضل سے مراد دولتِ مال ہے اور اس کے ساتھ دولتِ علم بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس سے منقول ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ نعمت کا اظہار بطور تحدیث نعمت کرنا جائز ہے۔

نمائشی خرچ کاروباری خرچ ہے

۷۵۔ اللہ سبحانہٗ ان لوگوں کو بھی دوست نہیں رکھتا جو صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر اور آخرت والے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور خود پسند متکبر وہ لوگ ہیں کہ اپنا مال لوگوں کو دکھاوے کی خاطر خرچ کرتے ہیں یعنی اللہ کے لیے خرچ کرنے میں تو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں لیکن لوگوں کے دکھانے کو اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کا نہ اللہ پر ایمان ہے نہ قیامت کے دن پر کہ حصول رضائے حق تعالیٰ اور تحصیل ثواب اخروی ان کو مقصود ہو اور اللہ کے یہاں مقبول اور پسندیدہ یہ ہے کہ ان حقداروں کو دیا جاتے جن کا اوّل ذکر ہو چکا ہے اور دینے میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی توقع ہو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جیسے بخل کرنا بُرا ہے ویسا ہی لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرنا بُرا ہے۔

اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا تعلق ان سے تھا جو مال کے ساتھ بخل کا تعلق رکھتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ ان ہی سرمایہ داروں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اچانک بخیل ہونے کے باوجود کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ ظاہر محسوس ہوتا ہے کہ بہت بڑے "دیالو" ہیں مثلاً کسی تقریب کے موقعہ پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گزاری کہ کسی غریب کے لیے بھی دشوار ہو لیکن یہی بخیل اور غریب ہوتے غریب تر زندگی رکھنے والا اچانک شہر کے کسی موڑ یا چوراہے پر کسی پڑاؤ یا اسٹیشن کے سامنے کسی بلند و بالا عمارت کے بنانے میں اس لیے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو اس میں آرام ملے مسافر اس میں ٹھہرائے جائیں گے یا ازیں قبل خیراتی کاموں میں چندہ کا اعلان اس احساس سے دب کر کرتا ہے کہ یہ پریشان حال لوگوں کے لیے پریشان ہے۔ کبھی ہسپتال بناتا ہے، کبھی ختم دلاتا ہے اور

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

کبھی کسی مجلس میں غریبوں میں غلہ کی تقسیم کا اعلان کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا وہ اس لیے کرتا ہے کہ خدا کو خوش کرتا ہے۔ کیا واقعی غریبوں کی غربت پر اس کا دل دکھا ہے۔ انسانی برادری کے متعلق اس کے دل میں کیا واقعی رحم کا کوئی جذبہ متلاطم ہوا ہے جن کی مالی فربہی سراسر غریبوں کا خون چوسنے سے ہوئی ہے کیا اس کا دل غریبوں کی غربت پر تڑپ سکتا ہے؟ یقیناً ان بخلاء کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اسی اٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے کہ خرچ کرنے والے اس لیے خرچ نہیں کرتے کہ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں یا خدا کی مخلوق کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں بلکہ ریاءً الناس یعنی لوگوں کو دکھانا ان کے اخراجات کا پس منظر ہے۔ یعنی جن کو غریب بنا کر وہ اپنے کو امیر بنا رہا ہے ان ہی غریبوں کی آنکھ میں اپنی مسجدوں، اپنے ہسپتالوں سے خاک جھونک رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ بخل و کنجوسی سے پیدا ہونے والی لعنت کو اس طرح وہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسروں پر ان کی دولت مندی کا رعب قائم ہو۔ ان کی برائیوں کا دنیا میں چرچا ہو۔ محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

اس ارشاد گرامی نے یہ بات کھول دی ہے کہ جیسے بخل کرنا قرآن کی نظر میں برائی ہے ایسے ہی لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرنا بھی برائی ہے۔ ارشادِ نبوت میں دکھاوے کو بھی شرک فرمایا ہے۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ شرک سے بالکل میں بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

شیطان کی رفاقت

۳۸۔ اور جس شخص کو شیطان کی رفاقت مل جاتی ہے تو یہ بہت بری رفاقت ہے۔ یعنی بخل کرنے اور دکھاوے کے لیے خرچ کرنے کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کا شیطان رفیق ہو جو ان کو ایسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ان متکبرین کو بخل اور ریاء الناس کے اعمال پر ابھارنے والا شیطان ہے۔ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہو، الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں غنا بخشی کی قوت نہیں ہے وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے۔ خلود بخشی کی قوت سے جو محروم ہے وہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہی خلود بخش ہے اور جن اعمال وافعال کا آخرت میں کوئی نتیجہ نہیں ہے وہ یقین دلاتا ہے کہ یہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا وہ سکھاتا رہتا ہے سب کچھ اسی میں ملتا ہے۔ الغرض شیطانی رفاقت کے بعد جو ہے وہ نہیں نظر آتا ہے اور جو نہیں ہے آدمی کو وہ ہے نظر آتا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کا یہ استنباط لطیف ہے کہ ارشاد میں خبردار کیا گیا ہے کہ صحبتِ بد مؤثر ہوتی ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیے۔ رفاقت کے لیے ہمیشہ نیک رفیق تلاش کرنا چاہیے۔

یہاں بخیلوں اور ریاکاروں کو شیطان کا رفیق ایسا ہی کہا ہے جیسا کہ دوسرے موقعہ پر فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن نے اخوان الشیاطین کہا ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے، شیطانی رفاقت کی حقیقت سمجھ لیجئے: حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہیں ان ہی چیزوں کو بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لیے خدا نے نبوت اور وحی کی رہنمائی عطا فرمائی لیکن اگر عقل والوں کا اصرار یہی ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم جانتے ہیں تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی انحطاط کے مریضوں کے لیے انبیاء کی نبوت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

قرآن میں ان ہی ذہنی انحطاط کے لیے ایک مخفی سزا کا ذکر ہے۔

ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین

اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمان کی یاد سے تو ہم پیچھے لگا دیتے ہیں اس کے شیطان، پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں؟ وہ ہی کہتے ہیں کہ شیطان کیا ہے کچھ بھی نہیں صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے۔ اللہ سبحانہ نے انسان کو جس مقصد کی تکمیل کے لیے زمین کے اس کرے پر بسایا ہے جو جس حد تک اس نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رکنے والے کوڑے کی صورت میں وہ ان پر برستا ہے۔ جیسے بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے۔ اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے اس کو اسی لیے بنایا گیا ہے یہی اس کا کام ہے ایک جگہ نہیں قرآن میں کئی بار ان عبادی لیس لک علیھم سلطان[1] کے اعلان کے ساتھ اس کی ڈیوٹی یہ لگائی گئی ہے۔

اجلب علیھم بخیلک ورجلک وشارکھم فی الاموال والاولاد

---

[1] میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں ہے۔

وعدھم ومایعدھم الشیطان الا غرورا

چڑھ جا ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ اور ساجھی بن جا ان کے اموال اور اولاد میں اور ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کا وعدہ سرتاسر دھوکا اور فریب ہے۔
اور خرچ کی تمام راہوں پر وہ قبضہ جما لیتا ہے اور فردا کی فکر میں ڈال کر امروز کی لذت کو بے مزہ کر دیتا ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔
اولاد کے ساتھ الاموال میں جب وہ ساجھی بن جاتا ہے تو یقین مانیے کہ

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ پندرہ میں آئے گی۔

ایمان صحیح نہ ہونے پر افسوس

۳۹۔ ان لوگوں کا کیا نقصان ہو جاتا اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لے آتے اور اللہ کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرتے اور اللہ ان کی حالت سے خوب باخبر ہے۔ یعنی ان کافروں کا کچھ نقصان نہ ہوتا اگر وہ بجائے کفر کے اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان لے آتے اور بجائے ریاکاری کے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے بلکہ ان کا سراسر نفع تھا۔ ضرر تو اس میں ہے جس کو وہ اختیار کر رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا اور کس نیت سے کر رہے ہیں۔ اسی کا عوض ان کو ملے گا۔ پہلی آیت میں ینفقون اموالھم فرمایا تھا یعنی مال کو ان کی طرف منسوب کیا تھا اب اس آیت میں وانفقوا مما رزقھم اللہ فرمایا یعنی مال کی اپنی طرف نسبت کی۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنا مال سمجھ کر خرچ کرتے ہیں ان کو چاہیے تھا کہ اللہ کا مال سمجھ کر اس کے حکم کے موافق خرچ کرتے۔[1]

یہ ان تنگ دلوں، بخیلوں اور ریاکاروں کی بدقسمتی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور اللہ کی بخشی ہوئی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سرتاسر نفع ہی نفع ہے اللہ تعالیٰ کسی کے عمل سے بے خبر نہیں۔[2]

یہ آیت کن لوگوں کے حالات کی عکاسی کر رہی ہے، مشرکین کی، یہود و نصاریٰ کی۔ قرآن کے یہی تین مخاطب ہیں۔ سید رشید رضا کہتے ہیں کہ روئے سخن سب کی طرف ہے۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود خدا کو مانتے تھے، اس کی خالقیت، مالکیت اور ربوبیت کے قائل تھے۔ البتہ کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

بھی مانتے تھے مگر اس میں خدا کے ساتھ اور کو بھی شریک کرتے یہودی اور عیسائی ایمان باللہ والیوم الآخر کے مدعی تھے لیکن شرک کے دھبوں سے ان کا دامن ایمان بھی محفوظ نہ تھا اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ سب ایمان صحیح کو اپنالیں۔ اور اگر خود مسلمانوں کا ذکر ہے تو مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ایمان کامل کو اپنالیں۔ دونوں صورتوں میں حیرت و تعجب اپنی جگہ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کردار لوگوں کے لیے کس قدر حیرت زا ہے کیونکہ اگر یہ لوگ ایمان میں اخلاص کو اپنالیتے تو دنیا کے فوائد سے تو ہمدوش ہوتے ہی آخرت کی کامرانیاں بھی ہاتھ سے نہ جاتیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَ
يُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ۞ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ
أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۞ يَوْمَئِذٍ
يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ ط
وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ۞

ع

بلاشبہ اللہ سبحانہٗ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے، اگر ایک ذرہ بھی نیکی ہو گی تو وہ اسے دگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا بدلہ بھی مرحمت فرمائے گا۔ اے پیغمبر پھر کیسی گزرے گی جب ہر امت میں سے ہم ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے بلائیں گے۔ اس روز کفر کی راہ پر چلنے والے اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش زمین کو ان پر برابر کر دیا جاتے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

جزاو سزا اعمال کے نتائج ہیں

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام قائم کیا ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار چلتا ہے۔ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات ہر ایک میں یہ یکساں جاری وساری ہیں جس طرح عالم مادہ میں یہ قانون خداوندی ہے کہ زہر کھانے سے آدمی کا جسم مرجاتا ہے اسی طرح یہ اللہ سبحانہ کا قانون ہے کہ گناہ سے اس کی روح مرجاتی ہے اور جس طرح اصول حفظان صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہوجاتا ہے اسی طرح اصول تزکیۂ قلب کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہوجاتا ہے۔ پھر جس طرح دوا اور اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعے بھی وہ شفایاب ہوتا ہے۔ غرض جس طرح دُنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے آثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہوسکتے۔ غرور اور خاکساری بخل اور فیاضی، تقویٰ اور فسق ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہوسکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہوسکتی۔ اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعی اشیاء میں ہے انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے لیکن جناب الٰہی اس سے اپنے قانون مجازات میں پاک ہے وہ جو کچھ ہے وہ سرتاسر عدل ہے۔

۴۰۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے اگر ذرہ برابر بھی نیکی ہوگی تو وہ اسے دُگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا بدلہ بھی مرحمت فرمائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ کے برابر بھی ضائع نہیں کرتا لہٰذا ان کافروں پر جو عذاب ہوگا وہ عین انصاف اور ان کی بداعمالی کا بدلہ ہے اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی تو اضعاف مضاعف اس کو اجر دے گا اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام اس کو عنایت کرے گا۔[1]

اس آیت کے ذریعے دو اہم باتیں سمجھائی گئی ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔
دوسری یہ کہ ذرہ برابر کی ہوئی نیکی بھی اللہ کے یہاں بے حد قیمتی ہو جائے گی
ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مادی علت و معلول اور عمل اور رد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے ان ہی دو اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنے پیچھے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے نکلا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنے میں بولا گیا ہے۔
قرآن میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی ہے کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل کا نام ہے۔ ارشاد ہے لتجزی کل نفس بما تسعی یعنی جزا و سزا ہمارے دُنیا میں کیے ہوئے اعمال کے آثار و لوازم ہیں۔ غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں اس اصول کی اس طرح تشریح فرمائی ہے کہ روزِ قیامت اللہ سبحانہ فرمائے گا اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر دے رہا ہوں، جو کوئی اچھا بدلہ پائے وہ خدا کا شکر کرے اور جو بُرائی دیکھے وہ خود کو ہی ملامت کرے۔ ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کا عامل کی ذات پر جیسا اثر ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق اس میں بلندی اور پستی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کی جزا میں کوئی کمی نہ کرے گا خواہ وہ عمل ذرے کی مقدار میں ہو اور کسی کو بغیر جرم کے قطعاً سزا نہ دے گا۔

نیکیوں میں تضعیف کا قانون

یہاں ارشاد ہوا ہے کہ اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے اور بڑا ثواب دیتا ہے۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اس کا دس گنا ملنا تو اس اُمت کے حق میں عام ضابطہ ہے۔ ارشادِ نبوت ہے کہ؛

جب تم میں کوئی اپنے اسلام میں حسن کار ہو جائے تو پھر جو نیکی کرتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے اور جو بُرائی کرتا ہے وہ صرف اتنی ہی لکھی جاتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

یہ گویا زبانِ نبوت سے تضاعف کی تشریح ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دس گنا تو ایک ضابطہ عام ہے

اور اس کے لیے ہے جو ایمان و اسلام میں حسن کاری پیدا کرے لیکن اللہ کی رحمت کا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بھی بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے کھلا رکھتی ہے جیسے جیسے مومن کی حسن کاری اور اللہ سبحانہٗ کی رویت کا جتنا تصور غالب ہوتا جائے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح بعض وقت خود عمل کی برتری و فضیلت اور کبھی ضرورت کا بروقت احساس بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا تو عام مسلمانوں کے بارے میں ضابطہ ہے بتلایئے مہاجرین کے لیے کیا قانون ہے۔ انہوں نے جواباً فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی وان تک حسنۃ یضاعفھا ویؤت من لدنہ اجراً عظیماً۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ اللہ سبحانہٗ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھ دیتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ اللہ اپنے پاس سے بڑا ثواب اور دیتا ہے اللہ اکبر اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

بہرحال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سو گنا ہی پر جا کر ختم نہیں ہوتا۔ اس سے بھی کہیں اوپر پہنچتا ہے بے شک جس کی رحمت غیر متناہی ہو اس کے انعامات کو بھی لامتناہی ہونا چاہیئے لیکن اللہ کی یہ داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان ہے۔ اسلام، ایمان اور احسان کے بر سہ ارتقائی مراتب کی تفصیلات ان شاء اللہ اسی پارے کے پانچویں رکوع میں آرہی ہیں۔

روز قیامت انبیاء کی شہادت

۴۱۔ اے پیغمبر پھر کیسے گزرے گی جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے بلائیں گے۔ یعنی ان کافروں کا کیا برا حال ہوگا جس وقت بلائیں گے ہم ہر امت اور ہر قوم میں سے گواہ ان کے حالات بیان کرنے والا اور ان کے واقعی معاملات ظاہر کرنے والا اس سے مراد ہر امت کا نبی اور دور کے صالح اور معتبر لوگ ہیں کہ وہ قیامت کو نافرمانوں کی نافرمانی اور فرمانبرداروں کی فرمانبرداری بیان کریں گے اور سب کے حالات کی گواہی دیں گے اور تم کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر یعنی تمہاری امت پر مثل دیگر انبیاء علیہم السلام کے احوال بتانے والا اور گواہ بنا کر لاویں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ھٰؤلاء کا اشارہ انبیاء سابقین یا کفار مذکورہ بالا کی طرف ہو اوّل صورت میں انبیاء مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء سابقین کی صداقت پر گواہی دیں گے جبکہ ان کی امتیں ان کی تکذیب کریں گے اور دوسرے احتمال سے کفار مراد ہوں

مطلب یہ ہے کہ انبیائے سابقین جیسا اپنی اپنی اُمت کے کفار فساق کے کفر و فسق کی گواہی دیں گے تم بھی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کی بداعمالی پر گواہ ہو گے جس سے ان کی خرابی اور بُرائی خوب محقق ہو گی۔ [1]

اس سے پہلی آیت میں وعید اور وعدہ تھا اب یہاں حرف فا کے ذریعہ فقرہ لا کر کہا جا رہا ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ کسی عامل کے عمل کو ذرہ برابر بھی ضائع نہ ہونے دے گا تو پھر اس روز جب پوری انسانیت اللہ کے حضور پیش ہو گی اور انبیائے شہادت کے لیے آئیں گے ان پر کیا بیتے گی۔ یعنی ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جب میدان حشر میں ہر اُمت کا نبی اپنی اُمت کے نیک و بداعمال پر بطور گواہ پیش ہوں گے حضور انور بھی اپنی اُمت پر گواہ بن کر حاضر ہوں گے جیسے ہر دور کا پیغمبر اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی اسے میں نے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا پھر بھی شہادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کے لوگوں پر دیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دور آپ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے۔ [2]

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس اتمام حجت کے بعد اگر یہ لوگ اللہ و رسول سے منحرف رہے ہیں تو آج تو اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو کیا کریں گے جب میدان حشر میں اللہ تعالیٰ تمام امتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوائے گا کہ انہوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی آپ بھی اس امت کے لوگوں پر دینے کے لیے کھڑے کیے جائیں گے۔

گواہی دینے کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ انبیاء کہیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو دین پہنچایا تھا لیکن اس صورت میں انبیاء کی شہادت اپنے معاصر مخاطبین تک محدود رہے گی اس لیے کچھ علماء نے شہادت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہر اُمت کے اعمال و افکار کو نبوت کے پیش کیے ہوئے علم و عمل سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے گا۔ اس مقابلہ میں جو صحیح ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو صحیح نہ ہوں گے وہ ناکام ہوں گے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اگرچہ آیت میں ھاؤلاء کا اشارہ انبیاء سابقین کی طرف بتایا ہے لیکن قرآن کی دوسری آیت اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار سے ہم آہنگ بھی ہے کہ ھاؤلاء کا مشارالیہ آپ کی امت ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح دوسری امتوں کے رسول اپنی امتوں پر گواہ ہوں گے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی امت پر گواہ ہوں گے۔ قرآن میں دوسری جگہ صراحۃً آیا ہے لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیداً۔ اور صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مجھ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبداللہ مجھے قرآن سناؤ تو میں نے کہا کہ یارسول اللہ میں آپ کو قرآن سناؤں۔ قرآن تو آپ پر ہی نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں مجھے یہ پسند ہے کہ میں قرآن دوسرے سے سنوں۔ حضرت عبداللہ نے سورۃ نسآء کی تلاوت شروع کی جب اس زیر تشریح آیت پر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابن ابی حاتم کے حوالے سے یہی روایت دوسرے صحابی محمد بن فضالہ کے حوالہ سے اس طرح لکھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بنی ظفر قبیلہ میں تشریف لائے اور آپ کی ہمرکابی میں عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ تھے۔ آپ نے قرآن پڑھنے کا حکم دیا۔ آپ سن رہے تھے جب قاری اس آیت پر پہنچا فکیف اذا جئنا تو آپ رو پڑے اور شدت تاثر میں آپ نے فرمایا کہ:

یارب ھذا علی من انا بین ظھریہ فکیف بمن لم اراہ۔

یا اللہ ان پر تو میں گواہی دوں گا جن میں موجود ہوں مگر ان میں گواہی کیسے دوں گا جن کو میں نے دیکھا نہیں ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ھاؤلاء سے مراد آپ کی امت ہے۔ سوچئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت سن کر شدت تاثر سے کیوں آبدیدہ ہوئے؟ قسطلانی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آپ کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہوگیا۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ رونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو قیامت کی ہولناکیاں یاد آئیں۔ پھر وہاں امت کے لیے اپنی شہادت اور شفاعت کے لیے جناب الٰہی میں درخواست کے مناظر یاد آگئے۔ لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ آپ کا رونا اپنی امت پر رحمت و شفقت کے تقاضے سے تھا۔ آپ کو یہ احساس ہوا کہ امت کے اعمال و افکار پر آپ کو گواہی دینی ہوگی اور امت کے افکار و اعمال جادۂ اعتدال پر نہ ہوں گے۔ اور اس کے نتیجہ میں امت کو سزا ملے گی۔

گویا آیت میں اشارہ کر دیا کہ امت کی تباہی و بربادی یہاں ہو یا وہاں ہمیشہ رسول کے لائے ہوئے علم و عمل سے انحراف کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مفتی صاحب نے یہ بات برمحل فرمائی ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ اُمتوں کے انبیاء اپنی اپنی اُمتوں پر بطور گواہ پیش ہوں گے اور آپ بھی اپنی اُمت کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ قرآن کریم کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی اُمت کے متعلق گواہی دے۔

قیامت کی ہولناکیاں

۸۰۔ اس روز کفر کی راہ پر چلنے والے اور رسُول کے نافرمان تمنّا کریں گے کہ کاش زمین کو ان پر برابر کر دیا جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔ یعنی جس دن ہر اُمت میں ان کے حالات بیان کرنے والا بلایا جائے گا اس دن کافر اور نافرمان لوگ اس بات کی تمنّا کریں گے کہ کاش ہم زمین میں ملا دیے جاتے اور مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے، آج پیدا نہ ہوتے اور ہم سے حساب وکتاب نہ ہوتا۔ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو چھپا نہ سکیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہو گا۔ [۱]

اس آیت میں صرف کافر کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ عاصی کا بھی ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس دن وہ سارے لوگ جنہوں نے کفر اور نافرمانی رسُول کا ارتکاب کیا ہو گا یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین ان کے سمیت برابر کر دی جائے اس دن کوئی شخص خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکے گا۔

اس فقرہ کا استیناف اور انداز بتا رہا ہے کہ پہلی آیت میں آتے ہوئے سوالیہ نشان کیف کا جواب ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ روز جب ہم ہر اُمت کے لیے اس کے رسُول کو گواہ بنا کر لائیں گے اس روز لوگوں کا کیا حال ہو گا؟ جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ کفر کرنے والے اور رسالت کے نافرمان اس روز کی ہولناکیوں کو دیکھ کر مٹی ہو کر زمین میں مل جانے کی آرزوئیں کریں گے جیسا کہ سورۂ نبا میں ہے ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابًا کچھ کی رائے میں مطلب یہ ہے کہ دفن ہونے کی آرزو کریں گے اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تمنّا کریں گے کہ ساری روئے زمین کے مالک ہوں اور اسے فدیہ میں دے کر چھٹکارا پا لیں۔

اور آخر میں فرمایا کہ ولا یکتمون اللہ حدیثاً۔ یعنی وہ دن ایسا ہو گا کہ جو کچھ کیا ہے سب ظاہر ہو جائے گا اور جس طرح دُنیا میں چھپ چھپا کر گزارہ کر لیتے تھے وہاں اخفاء کا پردہ کوئی نہ ہو گا اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپائیں گے۔ نہ چھپانے میں ایک لطیف تعریض بھی ہے دُنیا میں یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی دولت اور

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

نعمت کو چھپاتے رہے ہیں جیسا کہ پہلے پڑھ چکے ہو و یکتمون ما اتاھم اللہ من فضلہ لیکن اس روز اللہ سے کچھ بھی چھپا نہ سکیں گے ہر چیز خود بے نقاب اور ظاہر ہو جائے گی۔

بہرحال اس آیت میں قیامت کے دن کی ہولناکی پیش کی گئی ہے جس سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور ہر چیز کے کام آنے سے سوائے ایمان و عمل کے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔ قرآن کے دوسرے مواقع پر بھی مختلف عنوانوں اور مختلف پیرایوں میں اس دن کی ہولناکی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا ہے کہ لوگ اس روز پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہو جائیں گے (القارعہ) ایک اور جگہ ہے کہ وہ دن ایسا ہولناک ہوگا کہ اس کی ہولناکی بچوں کو بوڑھا بنا دے گی۔ (مزمل) اس کی تفصیلی مباحث انشاءاللہ اپنے اپنے موقعہ پر آئیں گے۔ یہاں قرآن کفر پیشہ طبیعت اور عصیان کیش مزاج رکھنے والوں کو خبردار کر رہا ہے کہ زندگی کے افکار و اعمال پر اگر نبوت کے فکر و عمل کی شہادت نہ ہوگی تو اس حالت میں جو کچھ، جتنے کچھ اور جیسے کچھ سنگین سے سنگین تر ہوں ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہی بات ہوش مند کے لیے کافی ہے کہ ہر شخص پیوند زمین ہو کر حشر کی رسوائی سے بچنے کی آرزو کرے گا۔ اور کیوں نہ کرے جبکہ وہ دن اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کا دن ہوگا یوم یقوم الناس لرب العالمین جس روز ہر شخص اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹے سے بھاگے گا یوم یفر المرء من اخیہ جس روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا یوم لا تجزی نفس عن نفس جس روز خود انسانوں کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی یوم تشھد علیھم السنتھم جس روز کوئی دوست کسی دوست کے کام نہ آئے گا یوم لا یغنی مولی عن مولی جس روز ظلم پیشہ لوگ ندامت سے اپنے ہاتھ کاٹیں گے یوم یعض الظالم جس روز عدالت الٰہی میں گواہ آموجود ہوں گے یوم یقوم الاشھاد۔ الغرض یہ دن بے حد ہولناک ہوگا یہ اپنی ہولناکی کی وجہ سے الطامۃ الکبریٰ (بڑی مصیبت) ہے یوم عسیر، یوم عظیم، یوم عصیب، یوم الحسرۃ ہے اور اپنی ہولناکیوں کی وجہ سے اسے القارعہ، الغاشیہ کہا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٤٣﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاآنکہ تم ایسی حالت میں ہو جاؤ کہ جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تمہیں پتہ ہو، اور ایسے ہی جب تم نہانے کی حاجت والے ہو تو اس حالت میں بغیر غسل کے نماز نہ پڑھو مگر یہ کہ تم مسافر ہو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھویا ہو اور تمہیں غسل کے لیے پانی

دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اور مسح کر لو چہروں کا اور
ہاتھوں کا۔[۸۲] بلاشبہ اللہ درگزر کرنے اور بخشنے والا ہے۔[۸۳]

نماز کے ذریعے اخلاقی مشکلات پر قابو

شروع سورت سے مسلمانوں کو رشتہ داروں اور ازدواجی زندگی کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید اور کسی کی حق تلفی کرنے اور جانی مالی نقصان پہنچانے کی ممانعت اور معاصی کی خرابی پر مطلع کر کے اس کے بعد واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً فرما کر اقارب اور یتامیٰ اور مساکین اور ہمسایوں وغیرہ کے ساتھ احسان و سلوک کرنے کا ارشاد کر کے اسی کے ذیل میں تکبر اور خود پسندی اور بخل و ریا سے ڈرایا تھا جو ایسے عیب ہیں کہ دوسروں کے حق ادا کرنے اور کسی کے ساتھ سلوک کرنے سے روکتے ہیں۔ اور روپیہ پیسہ دینے والوں اور لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے والوں کی طبیعت میں خواہ مخواہ آنے بھی لگتے ہیں۔ اب تمام حکموں کے آخر میں پھر مسلمانوں کو صریح خطاب فرما کر خاص نماز کی بابت جو سب عبادتوں میں اعلیٰ و افضل ہے اور شریعت میں جس قدر اس کا اہتمام کیا ہے اور اس کے ارکان و شرائط و آداب وغیرہ کو مفصل تبلایا ہے۔ کسی عبادت کا اس قدر اہتمام نہیں کیا۔ دو باتوں کی تاکید فرمائی جو امور متعلقہ صلوٰۃ میں سب سے اہم اور نفس پر شاق ہیں اور ارکان صلوٰۃ کی صحت اور خوبی کے جسم اور جان ہیں۔ اوّل یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاوقتیکہ جو منہ سے نکلے اس کو سمجھ بھی لو اور جنابت میں بھی نماز سے دور رہو یہاں تک کہ غسل کر کے تمام بدن کو خوب پاک کر لو کیونکہ نماز میں دو امر نہایت بالشان ہیں ایک حضور اور خشوع دوسرے طہارت اور نظافت اور جملہ امور متعلقہ صلوٰۃ میں بھی دو امر نفس پر شاق ہیں اور نشہ خشوع و حضور کے منافی ہے تو جنابت طہارت اور نظافت کے مخالف ہے بلکہ نشہ چونکہ مثل نوم اور غشی ناقض وضو ہے تو اس لیے طہارت کے بھی مخالف ہے تو حاصل یہ ہوا کہ نماز کو پورے اہتمام سے ادا کرو اور جملہ امور ظاہری و باطنی کا لحاظ رکھو گو نفس پر شاق ہو۔ باقی اس خاص موقعہ پر اس تاکید اور تقید سے دو فائدے معلوم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ احکام کثیرہ مذکورہ بالا جن میں حقوق و معاملات باہمی اور عبادت جانی و مالی کا ذکر تھا۔ ان سب کو بجا لانے کے ساتھ بخل اور ریا اور خود پسندی اور بڑائی سے بھی مجتنب رہنا چونکہ نفس پر شاق ہے اور سننے

والوں کو خلجان کا موقع ہے تو اس دشواری اور خلجان کا علاج بتانا مقصود ہے۔ یعنی نماز کو اس کی شرائط و آداب ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کرو گے تو جملہ اوامر و نواہی مذکورہ بالا کی تعمیل تم پر آسان ہو جائے گی کیونکہ نماز کی وجہ سے جملہ اوامر و عبادات میں سہولت اور رغبت اور تمام منہیات اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ دیگر آیات و احادیث میں مذکور ہے اور علمائے محققین نے تصریح کی ہے۔ دوسرے یہ کہ احکام کثیرہ سابقہ کو سن کر بعید نہیں جو کاہل، کم ہمت اپنے آپ کو مجبور خیال کر کے ہمت ہار دیں اور اس کاہلی کا اثر نماز میں بھی ظاہر ہونے لگے جس کے شرائط و آداب بہت کچھ ہیں اور جو ہر وقت موجود ہے اس لیے نماز کا اہتمام مناسب ہوا۔ الحاصل جو کوئی اقامت صلوٰۃ کا اہتمام اور التزام رکھے گا اس کو دیگر احکام جانی و مالی میں بھی آسانی و سہولت ہوگی اور جو کوئی دیگر احکام میں کاہلی اور بے پروائی کرتا ہے اس سے اقامتِ صلوٰۃ میں کوتاہی کرنا بعید نہیں واللہ اعلم [1]

مطلب یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے جو حقوق و فرائض بیان کیے گئے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو تو چاہیے کہ خدا کے ذکر و عبادت سے اپنی ایمانی قوت مضبوط کرتے رہو جو جماعت نماز کی حقیقت سے محروم ہوگی یعنی عبادت کے خشوع و خضوع کا اس میں ذوق نہ ہوگا وہ کبھی عملی زندگی کی اخلاقی مشکلوں پر قابو نہیں پا سکتی۔

۱۸۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تا آنکہ تم ایسی حالت میں ہو جاؤ کہ جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تمہیں پتہ ہو اور ایسے ہی جب تم نہانے کی حاجت میں ہو تو اس حالت میں بغیر غسل کے نماز نہ پڑھو مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو۔ پہلی آیات میں مسلمانوں کو خطاب تھا واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا الی آخر الآیات، اور اسی کے ذیل میں کفار کی مذمت بیان فرمائی تھی جو کہ امور مذکورہ سابقہ کی مخالفت کرتے تھے۔ اب اس کے بعد پھر مسلمانوں کو نماز کے موضوع پر خاص ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ان ہدایات کو پہلی آیات کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ اس سے پہلے کفر کی دو خرابیوں کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ ایک اللہ پر ایمان نہ لانا دوسرے اپنا مال اللہ کے لیے خرچ نہ کرنا بلکہ لوگوں کے دکھانے کو اور اپنی عزت بڑھانے کو مال خرچ کرنا اور ظاہر ہے کہ پہلی خرابی کا منشا تو علم کا نقصان اور جہل کا غلبہ ہے اور دوسری خرابی کی وجہ ہوائے نفس اور اپنی خواہش ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ گمراہی کے دو بنیادی سبب ہیں اول جہالت جس میں حق و باطل کی تمیز نہیں ہوتی، دوسرے ہوائے نفس جس سے باوجود تمیز حق و باطل کے حق کے مطابق عمل نہیں ہوتا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیونکہ شہوت سے قوتِ ملکی کمزور اور قوتِ بہیمی طاقتور ہو جاتی ہے اس کے نتیجہ میں ملائکہ سے بُعد اور شیاطین سے قرب ہو جاتا ہے۔ یہ بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے اس لیے اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اولاً نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ نادانی کی حالت ہے۔ اس کے بعد جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا۔ یہ حالت ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب کی حالت ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جہاں جُنبی ہوتا ہے وہاں ملائکہ نہیں آتے واللہ اعلم۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو جب تم کو کفر اور ریا کی خرابی معلوم ہو چکی اور ان کے اضداد کی خوبی واضح ہو چکی ہے تو اس سے نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے کی خرابی کو بھی خوب سمجھ لو کہ ان کا منشا بھی وہی ہے جو کفر و ریا کا منشا تھا اس لیے نشہ میں نماز کے نزدیک نہ جانا چاہیے تاوقتیکہ تم کو اس قدر ہوش نہ آجائے کہ جو منہ سے کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔ اور حالتِ جنابت میں نماز کے نزدیک نہ جانا چاہیے تاوقتیکہ غسل نہ کرلو مگر حالتِ سفر میں کہ اس کا حکم آگے آرہا ہے۔

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھنے کا حکم اس وقت تھا کہ نشہ اس وقت تک حرام نہ ہوا تھا لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ روایات میں منقول ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت دعوت میں جمع تھی چونکہ شراب اس وقت تک حرام نہ ہوئی تھی اس لیے انہوں نے شراب پی تھی، مغرب کا وقت آگیا تو سب اسی حالت میں نماز کو کھڑے ہو گئے۔ امام نے سورہ الکافرون پڑھی اس میں لا اعبد ما تعبدون کی جگہ اعبد ما تعبدون بیہوشی میں پڑھ دیا جس سے معنے بالکل خلاف اور غلط ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اب اگر نیند کے غلبہ یا بیماری کی وجہ سے کسی کا ایسا حال ہو جاتے کہ اس کی خبر نہ رہے کہ میں نے کیا کہا تو ایسی حالت کی نماز بھی درست نہ ہوگی جب ہوش آئے تو اس کی قضا ضرور کرے۔[1]

یہ آیتِ قرآنی بھی من جملہ ان آیات سے ہے جس میں مسائل کی بہتات ہے اور گو سورۂ مائدہ میں بھی یہی مسائل آرہے ہیں لیکن ضروری ہے کہ یہاں وضاحت کر دی جائے تاکہ آئندہ جہاں یہ مسائل متفرق طور پر بطورِ اشارات آئیں ذہن فہم و تدبر کے لیے تیار رہے۔

شراب کی حرمت تاریخ میں

الف: سب سے پہلے یہ بات کہی گئی ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں ایک یہ کہ نشہ کی حالت سے کیا مراد ہے دوسرے یہ کہ نماز سے نماز مراد ہے یا جائے نماز یعنی مساجد۔

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن کا نزول ہوا تو عرب کے لوگ صدیوں سے شراب کے عادی تھے مشکل تھا کہ یہ یک بار باز آ جاتے، اس لیے بتدریج ممانعت کے احکام نازل ہوئے۔

سب سے پہلے مکہ میں اس موضوع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

و من ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا و رزقا حسناً

اور تم کھجور اور انگور کے پھلوں سے نشہ آور عرق اور اچھی غذا بناتے ہو۔

اس آیت میں نشہ آور سکر کو رزق حسن سے الگ کر کے اشارہ کر دیا تھا کہ نشہ آور چیز رزق حسن نہیں ہے یہ آیت مکی ہے اور شراب حرام ہونے سے بہت پہلے نازل ہوئی۔

بعدازیں شراب کے موضوع پر وہ آیت نازل ہوئی جو السورۃ البقرہ میں ہے کہ

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔

پوچھتے ہیں کہ شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے کہہ دو کہ ان دونوں میں بہت بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔

غالباً ۳ھ کے آخر میں یہ دوسرا حکم آیا ہے کیونکہ حضرت حمزہ کی شہادت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ صحیح بخاری میں ایک روایت ہے:

غزوۂ بدر میں حضرت علی کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی۔ خمس میں سے ایک اور اونٹنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی۔ حضرت علی کا نکاح حضرت فاطمہ سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے۔ ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک جنگلی گھانس) لائیں اور سناروں کے ہاتھ بیچیں۔ اس ارادے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہ چند انصاریوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع پڑھا،

الا یا حمز للشرف النواء

اے حمزہ موٹی اونٹنیوں کے لیے۔

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیے۔ حضرت علی نے جا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی اور واقعہ سنایا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی اور حضرت علی اور زید کو لے کر حضرت حمزہ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہ مخمور تھے۔ حضور انور کی طرف نظر اٹھا کر

دیکھا اور کہا تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالت دیکھ کر تشریف لے آئے حضرت حمزہ نے ۱۵ شوال ۳ھ میں شہادت پائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ بقرہ کی یہ آیت ۳ھ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے اللہ کو پسند نہیں چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا مگر بہت سے لوگ بدستور پیتے رہے حتی کہ بسا اوقات نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے۔ واقعہ کی طرف شیخ الاسلام نے اپنے فوائد میں اشارہ کیا ہے۔ یہ واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف طریقے سے آیا ہے۔

نشہ میں امامت والی روایت

اس موضوع پر چھ روایات آئی ہیں۔ یہ بات کہ یہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں امامت کرائی۔ روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ ایک روایت میں حضرت علی کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمان بن عوف کا نام ہے، تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے۔ ترمذی نے کتاب التفسیر میں اور ابوداؤد نے کتاب الاشربہ میں امام حضرت علی کو قرار دیا ہے اور حاکم نے مستدرک کی دو روایتوں میں حضرت عبدالرحمان بن عوف کا نام بتایا ہے اور حاکم ہی نے مستدرک میں امام ایک اور شخص کو بتایا ہے۔ ان روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔ مثلاً

۱۔ ترمذی اور مستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ دعوت کرنے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے جبکہ مستدرک کی دو روایتوں میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے۔ اور مستدرک حاکم کی کتاب الاشربہ میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

۲۔ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت علی امام تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا اور مستدرک حاکم کتاب الاشربہ کی تین روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے اور مستدرک ہی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مہاجر امام تھا۔

۳۔ روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی لیکن مستدرک حاکم کی تفسیر سورہ نساء والی روایت میں شراب کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ جو امام بنا تھا وہ کہیں سے پی کر آیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں ترمذی اور ابوداؤد کی روایت کی وجہ سے امامت کے سلسلے میں حضرت علی کا نام لکھا ہے لیکن سید سلیمان کے نزدیک امامت کی نسبت حضرت علی کی طرف مشکوک ہے

ان کا کہنا یہ ہے کہ:

حضرت علی کا شراب پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے۔

اور مولانا فرماتے ہیں:

سب سے پہلا راوی ان روایتوں میں ابو عبدالرحمٰن السلمی ہے جس کا نام عبداللہ ابن حبیب ہے، وہ پہلے حضرت علی کا طرفدار تھا بعد کو عثمانی بنی امیہ کا طرفدار ہو گیا۔ پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علی سے سنا ہے مسلم نہیں ہے بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے،

اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

ابو عبدالرحمٰن السلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے ادھر کر دی۔

اور آخر میں حاکم محدث کا فیصلہ یہ لکھا ہے کہ

خارجیوں نے اس نشہ اور غلط قرأت کو امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی طرف منسوب کیا ہے اللہ نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا۔

اور مولانا نے یہ فیصلہ دیا ہے:

درحقیقت حضرت علی واقعہ کے راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے حضرت علی کو صاحبِ واقعہ بنا دیا۔

افسوس کہ ہمیں سید صاحب کی اس تحقیق سے اتفاق نہیں ہے، بات وہی صحیح ہے جو مولانا شبلی نے فرمائی ہے۔ شراب حرام ہونے سے پہلے شراب کا پینا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس سے دامانِ تقویٰ اور تقدس پر کوئی داغ نہیں آتا۔ جب یہ گناہ نہیں۔ جرم شرعی نہیں تو کوئی کرے اس میں سارے صحابہ برابر ہیں۔ آپ ابھی ابھی سید الشہداء حمزہ کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے شراب اس وقت پی تھی جب کہ شراب حرام نہ تھی۔

باقی سید صاحب کی ابو عبدالرحمٰن السلمی کی جامہ تلاشی کرنا اور ان کو عثمانی قرار دے کر ان کی طرف غلط گوئی اور غلط بیانی کی نسبت کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ امام ابن ابی حاتم کے یہ کہنے سے کہ ان کی روایت حضرت علی سے ثابت نہیں ہے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی روایت صحیح نہیں عجیب ہے۔ تاریخ میں آج تک ان کی ثقاہت اور دیانت پر کوئی حرف گیری نہیں کی گئی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے ڈنکے کی چوٹ

کہا ہے ھو عند جمیعھم ثقۃ، ابوعبدالرحمٰن سب کے یہاں ثقہ ہیں۔ بلاشبہ ان کے سماع میں اختلاف ہے امام شعبہ فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن نے عبداللہ بن مسعود سے اور حضرت عثمان سے نہیں بلکہ حضرت علی سے سنا ہے اور یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن کو حضرت عمر سے شرف سماع حاصل نہیں ہے۔ اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن نے حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے سنا ہے اور واقدی کہتے ہیں کہ صفین کی جنگ میں حضرت علی کے ساتھ موجود تھے۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

ابوعبدالرحمٰن السلمی اور دیگر علماء کوفہ جیسے علقمہ، اسود، حارث، لیثی، زر بن حبیش کہ جن کے پاس عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرآت کی ہے۔ ان سب لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے قرآن پاک سیکھا ہے۔ نیز یہ لوگ مدینہ جاکر حضرت عمر، حضرت عائشہ سے علم کی تحصیل کرتے تھے۔ بلکہ ان حضرات نے حضرت عمر، حضرت عائشہ سے جتنا علم حاصل کیا اتنا علم حضرت علی سے نہیں کیا اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم حضرت معاذ بن جبل سے یمن میں حاصل کی تھی۔[1]

لہٰذا یہ کہنا کہ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے عثمانی ہونے کی وجہ سے معاذاللہ حضرت علی کا نام یوں ہی کہہ دیا خلاف واقعہ ہے۔ ابوعبدالرحمٰن نے تو بلاریب عثمانی ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کیا لیکن حاکم نے غالی شیعہ ہونے کی وجہ سے یہ ہاتھ کی صفائی ضرور دکھائی ہے کہ حضرت علی کا نام ہٹاکر عبدالرحمٰن بن عوف اور کسی مہاجر کا نام لے دیا۔ امام حاکم کی وفات ۴۰۵ھ میں ہورہی ہے جبکہ ترمذی ان سے پہلے ۲۷۹ھ میں اور ابوداؤد ۲۷۵ھ میں وفات ہوچکے ہیں۔ ابوداؤد کی سنن میں اور ترمذی کی جامع میں حضرت علی کا نام ہونا اور پورے ایک سو چھبیس سال کے بعد امام حاکم کی مستدرک میں عبدالرحمٰن کا نام ہونا پورے کیس کو مشکوک بنادیتا ہے۔ ہمارے خیال میں ابوداؤد اور ترمذی کے مقابلہ میں حاکم کے بیان کی کوئی قدروقیمت نہیں ہے۔ اللہ اکبر حاکم ایک صدی کے بعد ان ارباب سنن کو خارجی بتارہا ہے فاناللہ والی اللہ المشتکی۔

بہرحال نشہ کی حالت میں نماز پڑھی گئی اور نماز میں قل یاایھا الکافرون کو کچھ کا کچھ پڑھ دیا۔ اس پر غالباً ۴ھ کی ابتداء میں یہ تیسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کردی گئی۔ اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے نماز کے اوقات میں شراب پینی چھوڑدی اور آپ نے شراب پینے کے اوقات تبدیل کردیئے۔ اصل

---

[1] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۴۲

ارشاد میں سکاری کے الفاظ آتے ہیں یہ سکران کی جمع ہے۔ سکران نشہ والے کو کہتے ہیں، نشہ خواہ کسی چیز سے ہو۔ جیسا کہ شیخ الاسلام نے اشارہ کیا ہے۔

صلوٰۃ سے مراد نماز یا مسجد

ب: لا تقربوا الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے کچھ علماء نے نماز مراد لی ہے اور کچھ نے جائے نماز یعنی مسجد مراد لی ہے۔ جن لوگوں نے صلوٰۃ سے نماز نہیں بلکہ نماز کی جگہ مراد لی ہے ان کا موقف یہ ہے کہ جس طرح کبھی ظرف بولتے ہیں اور مظروف اس کے مفہوم میں آپ سے آپ داخل ہو جاتا ہے اسی طرح کبھی مظروف بولتے ہیں ظرف مراد ہوتا ہے بشرطیکہ قرائن موجود ہوں۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں جو اس کی دلیل ہیں کہ آیت میں صلاۃ کا لفظ موضع صلاۃ کے لیے آیا ہے ایک یہ کہ فرمایا ہے کہ نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اگر صلاۃ سے نماز مراد ہو تو اس کے لیے نماز کے قریب نہ پھٹکو کی تعبیر نہیں بلکہ نماز نہ پڑھو کی تعبیر ہوتی، دوسرے یہ کہ اس آیت الا عابری سبیل کا استثناء موجود ہے۔ عبور کے معنے گزر جانا ہیں۔ یہ گزر جانا نماز کے ساتھ نہیں بلکہ جائے نماز کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے، ہماری رائے میں صلاۃ سے مراد نماز ہے کیونکہ یہی اس کے حقیقی معنے ہیں۔ حقیقی معنے کو چھوڑ کر بلا ضرورت مجازی معنے مراد لینا ٹھیک نہیں ہے۔ جو دو قرینے بتائے گئے ہیں وہ معنے حقیقی سے ہٹنے کے لیے کافی نہیں ہیں لا تقربوا قریب نہ پھٹکو کو اس کا قرینہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بلیغ انداز بات کو مؤکد بنانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے جیسے لا تقربوا مال الیتیم میں ہے۔ یہاں کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ مال یتیم سے وہ صندوق یا گھر مراد ہے جہاں مال یتیم رکھا ہوا ہے اور ایسے ہی عابری السبیل میں بھی اس کا قرینہ بننے کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ یہاں عابر سبیل مسافر کے معنے میں ہے۔ خود ایک ارشاد نبوت میں یہ لفظ مسافر اور راہ گیر کے معنے میں آیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا میں ایسے رہ جیسے کہ تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا مسافر، اصل الفاظ یہ ہیں او عابری السبیل یعنی جس طرح کوئی مسافر پردیس کو اپنا اصلی وطن نہیں سمجھتا اسی لیے تمہیں بھی چاہیے کہ اس دنیا کو اپنا اصلی وطن نہ سمجھو اس لیے سفر کے لیے اس تعبیر کو اجنبی کہنا زیادتی ہے۔ اس کے برعکس خود اس آیت میں اس حکم یعنی لا تقربوا الصلوٰۃ کی غایت حتی تعلموا ما تقولون بانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اس ارشاد میں صلوٰۃ سے مراد نماز ہے نہ کہ جائے نماز یعنی مسجد۔ ظاہر ہے کہ مسجد میں پڑھا یا کہا نماز میں جا رہا ہے نہ کہ مسجد میں۔ یعنی نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاکہ تم جان لو

جو کچھ تم کہہ رہے ہو جیسے حتی تغتسلوا حالت جنابت میں جوازِ صلوٰۃ کی غایت ہے ایسے ہی حتی تعلموا ما تقولون حالت نشہ میں جوازِ صلاۃ کی غایت ہے دونوں کا وزن یکساں ہے۔

نماز میں جاننے کا مفہوم

ج :- آیت کا موضوع نماز کی ممانعت نہیں بلکہ نماز کے اوقات میں شراب کی ممانعت ہے حتی تعلموا ما تقولون کو غایت بنا کر پیش کرنا اس کی دلیل ہے یعنی اگر اس حالت میں ہو کہ منہ سے جو کچھ کہہ رہے ہو اسے جانتے ہو تو نماز پڑھنی چاہیے۔ اور یہ فقرہ خود اس بات کی بھی غمازی کر رہا ہے کہ نماز میں قرأت فرض ہے چونکہ نشہ کی حالت میں نمازی اس فرض کی پابجائی سے محروم ہو جاتا ہے اس لیے نماز کے اوقات میں شراب پینے سے روک دیا گیا ہے۔ اگر قرأت نماز میں رکن نہ ہوتی تو یہ ممانعت ہی نہ ہوتی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس ارشاد میں تنبیہہ ہے کہ نماز نمازی اپنے حضور قلب کے ساتھ ادا کرے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے جانے اور یہ بھی اس آیت کا مطالبہ ہے کہ نمازی قرآن کے معانی سیکھے، اس پر غور و فکر کرے اور ایسی تمام چیزوں سے بچ کر رہے جو حضور قلب میں رکاوٹ بن کر رہیں۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت امام شافعی نے الرسالہ میں لکھا ہے:

> ہر مسلمان کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہے کہ اتنی عربی زبان ضرور سیکھے کہ اللہ کی توحید اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دے سکے اور کتاب اللہ کی تلاوت کر سکے اور جو اذکار اللہ نے فرض کیے ہیں یعنی تکبیر و تسبیح، تشہد وغیرہ ان کو بول سکے، اور اس سے زیادہ زبان نبوت کا علم اس کے لیے فضیلت ہے۔ (الرسالہ ص ۹)

آیت بتا رہی ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے اس کا علم ہونا چاہیے۔ سید رشید رضا کا یہ کہنا اسی معنے کے لحاظ سے ہے کہ:

> آیت دلیل ہے اس بات کی کہ ہر مسلمان پر اتنی عربی زبان کا سیکھنا واجب ہے کہ وہ نماز میں جو کچھ کہتا ہے اسے جان سکے۔

مطلب یہ ہے کہ نماز کو نمازی قلب و دماغ حاضر کر کے ادا کرے۔ حضور کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ جانے کیا کر رہا ہوں، دوسرے یہ کہ جانے کیا کہہ رہا ہوں۔ قرآن نے اس آیت میں دوسری بات کا مطالبہ کیا ہے یعنی یہ جانے کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

یعنی نماز میں جو کچھ پڑھا جاتے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بے پروائی کی وجہ سے

معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتے اس کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم وتدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

نماز میں جب تم پر نیند غالب آجائے تو سو جاؤ کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو۔

دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

نمازی کو جب نیند آجائے تو سو جانا چاہیے تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے یہاں تک کہ نماز ختم کرلے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

یہ نماز کا وہ باطنی ادب ہے جس کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی۔ جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے۔ اسی طرح نماز کے باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی غفلت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص نماز کی عربی عبارت کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ نماز کے شرائط ظاہری میں سے نہیں ہے۔ شرط تو نماز میں قرآن کی قرآت ہے "تلاوت" نہیں ہے۔ تلاوت نام ہے معانی پر غور کے ساتھ پڑھنے کا اور قرآت کہتے ہیں مطلق پڑھنے کو۔

د: ولا جنباً یعنی جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جنابت کے اصل معنے دوری اور بے گانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں جنابت سے مراد وہ ناپاکی ہے جو تقضائے شہوت سے یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بیگانہ اور دور ہو جاتا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ حالتِ جنابت میں نماز پڑھنا تمہارے لیے ایسا ہی ممنوع ہے جیسا کہ نشہ کی حالت میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوش میں ہونا اور جنابت سے پاک ہونا شرائطِ نماز میں ہیں۔ اور یہ بھی پتہ لگ گیا کہ نشہ اور جنابت کی دونوں حالتیں نجاست کی حالتیں ہیں

---

[1] تفہیم القرآن

نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ اسی لیے قرآن نے شراب کو رجس بھی کہا ہے۔

جنابت کے اسباب

جنابت کو اصطلاح میں حدث اکبر بھی کہتے ہیں۔ جنابت کے پیدا ہونے کے دو اسباب ہیں۔
۱۔ منی کا نکلنا۔ یعنی منی کا اپنی جگہ سے بشہوت جُدا ہو کر جسم سے باہر آنا، سونے میں یا جاگنے میں، بیہوشی میں یا ہوش میں، جماع سے یا بغیر جماع کے کسی خیال و تصور سے یا لواطت سے۔
۲۔ ایلاج یعنی کسی شہوت والے مرد کے خاص حصہ کا کسی زندہ عورت کے خاص حصہ میں یا کسی دوسرے زندہ آدمی کے مشترک حصہ میں داخل ہونا منی نکلے یا نہ نکلے۔
جب یہ دو سبب موجود ہوں گے تو جنابت پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ شخص جنب کہلائے گا۔

جنابت میں قرآن کی تلاوت

جنابت کا یہ حکم تو قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ جنابت والے کو نماز پڑھنا منع ہے۔ اسی سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسائل بھی استنباط فرماتے ہیں کیونکہ حالت جنابت میں نماز کی ممانعت کی علت جنابت کا نماز کے مزاج سے نسبت اور لگاؤ نہ رکھنا ہے۔ چونکہ نماز کا مزاج مناجات الٰہی ہے اور مناجات الٰہی کے لیے طہارت ناگزیر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مزاجی مناسبت کی رعایت سے ان کاموں پر بھی جنابت والے پر قدغن قائم کر دی جن میں اسی نوع کا تقدس پایا جاتا ہے۔ مثلاً سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل ہو کر آیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنابت والا شخص اور حیض والی عورت قرآن کی تلاوت نہ کریں۔

اگرچہ روایتی حیثیت سے اس حدیث پر حافظ عسقلانی نے التلخیص الحبیر میں کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا راوی اسماعیل بن عیاش ہے۔ اور امام بیہقی اور مشہور محدث ابن ابی حاتم اور ابن عدی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن حافظ ابو حاتم نے اسے موقوف کی حیثیت سے اس کی صحت کو سراہا ہے۔ امام بیہقی نے خلافیات میں حضرت عمر کا فیصلہ اس موضوع پر کراہت قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر جمہور ائمہ ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل اکثر علماء نے جنبی کے لیے قرآن پڑھنے پر قدغن قائم کی ہے۔ صرف امام مالک نے تعوذ کی خاطر چھوٹی آیات کو جائز سمجھا ہے۔ علامہ مقدسی نے حضرت علی، حضرت عمر، تابعین میں حسن بصری،

ابراہیم نخعی، زہری، قتادہ اور ائمہ میں ابوحنیفہ، شافعی کا بھی مذہب بتایا ہے اور ابوداؤد، نسائی اور ترمذی کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی لکھا ہے کہ

حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی تلاوت سے سوائے جنابت کے کوئی چیز نہ روکتی تھی۔

جنابت میں قرآن کو ہاتھ لگانا

جس معنویت کی بنا پر حالت جنابت میں قرآن کی تلاوت ناجائز ہے۔ اسی معنویت کی بنا پر حالت جنابت میں قرآن کو ہاتھ لگانا بھی ناجائز ہے۔ امام حاکم نے مستدرک میں، طبرانی، دار قطنی اور بیہقی نے اپنی سنن میں حکیم بن حزام کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کا والی بنا کر روانہ کیا تو فرمایا تھا کہ طہارت کے بغیر قرآن کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

اسی بنا پر ائمہ میں امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ جنبی کے لیے حالت جنابت میں قرآن کو ہاتھ لگانا منع ہے۔

حالت جنابت میں مسجد میں جانا

اسی معنویت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت جنابت میں مسجد میں جانے سے منع فرمایا ہے ابوداؤد نے سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے دروازے مسجد میں کھلے دیکھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان گھروں کے دروازوں کو مسجد سے ہٹا لو۔ لوگوں نے اس خیال سے تعمیل نہیں کی کہ شاید کوئی رخصت مل جاتے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ گھروں کے دروازے مسجد سے ہٹا لو۔ میں مسجد کو کسی حیض والی عورت اور جنابت والے مرد کے لیے روا نہیں کرتا ہوں۔

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ حالت جنابت میں جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونا اور مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام سفیان ثوری کا مذہب ہے۔ امام احمد وضو کرنے کے بعد جنبی کو مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونے، تلاوت قرآن اور

نماز کی ممانعت کی جو لطیف حکمت بیان فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ فرماتے ہیں :
چونکہ اللہ کے شعائر کی تعظیم دین کے واجبات میں سے ہے اس لیے بغیر طہارت کے ان کے قریب جانے پر قدغن قائم کردی گئی ہے اللہ کے شعائر میں سے نماز، کعبہ اور قرآن ہیں، عظیم ترادب یہی ہے کہ کوئی شخص بغیر پاکی اور طہارت ان کے پاس نہ جائے اس لیے حالتِ جنابت میں قرآن کا پڑھنا، مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ مسجد دفتر کعبہ ہونے میں دین کے شعائر میں سے ہے۔

بہرحال جنابت کی حالت میں نہ مسجد میں جانا جائز ہے نہ تلاوتِ قرآن جائز ہے اور نہ قرآن کو ہاتھ لگانا روا ہے۔

۵:- الا عابری سبیل، اس کے معنے لغت میں راستہ سے گزرنے والے کے ہیں۔ فقہاء اور مفسرین کا اس کی تشریح میں اختلاف ہے کچھ کہتے ہیں کہ اس سے مراد مسافر ہیں یعنی اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور اسے غسل کی حاجت ہو جائے تو تیمم کیا جا سکتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے لیکن کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ پہلی رائے حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار کی ہے اور دوسری رائے کو حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت انس بن مالک، حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہ حضرات نے اختیار کی ہے اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے لیکن جو لوگ عابری سبیل کی تشریح مسافر سے کرتے ہیں وہ اس مسئلہ کو قرآن کی اس آیت سے ثابت کرتے ہیں اور جو عابرِ سبیل کے معنے مسجد سے گزرنے والے کے بتاتے ہیں وہ اس کو حدیث سے لیتے ہیں۔

رہا مسجد میں سے حالتِ جنابت میں گزرنے کا مسئلہ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد کہتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھنے کا ارادہ ہو یا مسجد سے گزرنے کا مسجد میں بغیر طہارت کے داخل ہونا جائز نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک حالتِ جنابت میں مسجد سے گزرنے کا جواز اسی آیت سے لیتے ہیں ان کی رائے میں عابری سبیل کے معنے راستہ عبور کرنے والے کے ہیں اور آیتِ قرآنی میں صلوٰۃ سے مراد نماز نہیں بلکہ مقامِ نماز ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے اہلِ ایمان نشہ کی اور جنابت کی حالت میں مسجد کے قریب نہ جاؤ ہاں گزرنے کی اجازت ہے لیکن امام ابوحنیفہ اور دوسرے اکابر کی رائے میں عابرِ سبیل سے مسافر مراد ہے اور صلوٰۃ انہی معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ حالتِ نشہ اور حالتِ جنابت میں نماز کے قریب نہ جاؤ لیکن اگر مسافر ہو اور جنابت کی حالت ہو جائے اور پانی نہ ہونے کی وجہ

سے غسل نہ کر سکو تو یہ مستثنیٰ ہے اسے کیا کرنا چاہیے اس کا حکم آگے آرہا ہے کہ تیمم کرے۔ مسجد سے گزرنے کا مسئلہ قرآن کی اس آیت میں زیر بحث نہیں ہے۔ اس کا حکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے جیسا کہ آپ پہلے سن چکے ہیں۔

غسل جنابت کی فرضیت

حتی تغتسلوا یہ غایت ہے یعنی حالت جنابت میں نماز کے مباح ہونے کی شرط یہ ہے کہ غسل کر لو بغیر غسل کے نماز کے قریب جانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جنابت کا کسل اور انقباض اس انشراح اور حضور قلب کے منافی ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔

آیت میں غسل کا حکم ہے لیکن غسل کے طریقہ سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے قرآن کا مبین بنایا ہے اس لیے حضور اقدس نے غسل کا طریقہ بتایا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا جو طریقہ نقل ہو کر ہم تک آتا ہے یہ ہے صحیح بخاری میں ہے:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت کرتے پہلے ہاتھ دھوتے پھر وضو فرماتے پھر تین دو ہتڑ پانی سر پر ڈالتے پھر اپنے بدن مبارک کو دھوتے۔

اس کی مزید توضیح بخاری میں یہ آتی ہے:

حضرت میمونہ کہتی ہیں میں نے آپ کے غسل کے لیے پانی رکھا۔ آپ نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے پھر استنجا کیا، پھر زمین پر ہاتھ مارا اور مٹی سے ہاتھ صاف کر کے ان کو دھویا پھر غرارے کیے پھر ناک میں پانی دیا، چہرہ دھویا، سر پر پانی بہایا، پھر آپ نے پیر دھوئے۔

ابوداؤد میں حضرت علی کے حوالہ سے ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو غسل جنابت میں ایک بال کے برابر بھی جگہ چھوڑتا ہے وہ غسل نہیں کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت میں خوب صفائی کرنا ضروری ہے اور ایک ارشاد ہے کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہے لہٰذا بالوں کو دھوؤ اور بدن کو صاف کرو۔ اس کا مقصد بھی تطہیر میں مبالغہ ہے اسی بنا پر فقہائے نے غسل جنابت میں مضمضہ اور استنشاق کو واجب کہا ہے۔ امام احمد، امام اسحاق

امام ابن ابی لیلیٰ اور عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ یہ دونوں وضو اور غسل میں واجب ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ وضو میں سنت اور غسل میں واجب ہیں اور امام مالک اور شافعی دونوں سنت کہتے ہیں۔ اس پر مزید تفصیل انشاء اللہ سورۃ مائدہ میں آرہی ہے۔

تیمم کی اجازت اور اس کے مواقع

۸۲۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھویا ہو اور غسل کے لیے پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اور مسح کرو اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا۔ یعنی حالتِ جنابت میں نماز کا نہ پڑھنا تاوقتیکہ غسل نہ کرے۔ یہ حکم جب ہے کہ کوئی عذر نہ ہو اور اگر کوئی ایسا عذر پیش آجائے کہ پانی کے استعمال سے معذوری ہو اور طہارت کا حاصل کرنا ضروری ہو تو ایسے وقت میں زمین سے تیمم کر لینا کافی ہے۔

پانی کے استعمال سے معذوری کی تین صورتیں ہیں۔ ایک بیماری کہ اس میں پانی نقصان دیتا ہے۔ دوسرے سفر کہ پانی اتنا موجود ہے کہ غسل کرے تو پیاس سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے دور تک پانی نہ ملے گا۔ تیسرے یہ کہ پانی موجود ہی نہیں ہے۔ پانی کے موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ طہارت کے ضروری ہونے کی دو صورتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ کوئی قضائے حاجت کر کے آیا ہے اس کو وضو کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ بیوی سے صحبت کی ہو اسے غسل کی حاجت ہے۔

تیمم کی صورت یہ ہے کہ پاک زمین پر دونوں ہاتھ مارے، پھر سارے منہ پر اچھی طرح مل لیوے پھر دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک مل لے۔ مٹی طاہر ہے اور بعض چیزوں کے لیے پانی کی طرح مطہر بھی ہے جیسے موزہ چمڑے کا، شیشہ، تلوار وغیرہ، جو نجاست زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہے وہ بھی پاک ہے۔ نیز ہاتھ اور چہرے پر مٹی ملنے میں تذلل اور عاجزی بھی ہے جو گناہوں سے معافی مانگنے کی اعلیٰ صورت ہے لہٰذا چونکہ مٹی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاست کو زائل کرتی ہے اس لیے بوقتِ معذوری پانی کی جانشین بنا دی گئی۔ اس کے سوا مقتضائے آسانی و سہولت جس پر حکم تیمم مبنی ہے یہ ہے کہ پانی کی نیابت کا کام ایسی چیز سے لیا جائے جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہو سو زمین کا ایسا ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب جگہ موجود ہے۔ لہٰذا خاک انسان کی اصل ہے اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے میں گناہوں اور خرابیوں سے بچاؤ ہے، کافر بھی آرزو کریں گے کہ خاک میں مل جائیں [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس آیت میں بعض مہمات مباحث ہیں جن پر تبصرہ سورۂ مائدہ کی تشریحات میں ملے گا لیکن یہاں کچھ باتوں کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے۔

تیمم کے یہاں تین مواقع بیان ہوتے، مرض، سفر اور پانی کی نایابی۔ اس سے یہ باتیں خود بخود نکلتی ہیں تیمم کی حقیقت، تیمم کے واجب ہونے کی شرطیں، اس کے صحیح ہونے کی شرطیں، پانی کے استعمال سے معذور ہونے کی صورتیں، جن چیزوں سے تیمم جائز ہے اور جن سے ناجائز، تیمم کے فرائض و واجبات، تیمم کے نواقض

نجاست کی یہاں دو حالتیں مذکور ہوئی ہیں ایک یہ کہ او جاء احد منکم من الغائط یا تم میں سے کوئی تقاضائے حاجت سے آتے۔ لفظ غائط اصلاً نشیبی زمین کے لیے آتا ہے یہاں یہ تقاضائے حاجت پیشاب اور پاخانہ سے کنایہ ہے۔ دوسری او لمستم النساء یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو۔ لمست کے معنے چھونے کے ہیں لیکن یہاں یہ کنایہ ہے مباشرت سے۔

نجاست کی ان دونوں حالتوں کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں طہارت کے لیے ناقض ہیں اور ان کے رونما ہونے سے طہارت واجب ہو جاتی ہے اور یہ بتانا بھی ہے کہ تیمم دونوں حالتوں میں طہارت کے لیے کفایت کر جاتی ہے بشرطیکہ مرض، سفر اور یا پانی کی نایابی ہو۔

نجاست کی پہلی حالت کی توضیح

نجاست کی پہلی حالت کے بیان سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آرہی ہے کہ ان دونوں راہوں سے معتاد طریق پر جو کچھ بھی نکلتا ہے اس سے طہارت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ پیشاب ہو یا پاخانہ دونوں نجاست ہیں۔ اور ان دونوں راہوں سے جو کچھ غیر معتاد طریق پر باہر آتے وہ بھی نجاست ہے جیسے مذی، ودی وغیرہ، اور اس سے بھی جمہور کے نزدیک طہارت ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ انسانی بدن سے جو چیزیں ان راہوں کے علاوہ دوسری جگہ سے نکلتی ہیں مثلاً بدن سے خون نکل آیا، ناک سے نکسیر آگئی اور منہ سے قے آگئی یہ بھی طہارت کو ختم کرتی ہے یا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر خاموش ہے۔ امام شافعی قے اور خون کو ناقض طہارت نہیں بتاتے، امام احمد تھوڑی قے اور خون کو ناقض نہیں بتاتے اور امام ابو حنیفہ خون کو ناقض کہتے ہیں بشرطیکہ نجس ہو اور خون کے نجس ہونے کا معیار بہنا ہے اگر بہتا نہیں تو نجس نہیں، ایسے ہی اگر قے معمولی ہو تو اس کو ناقض نہیں بتاتے ہاں اگر غیر معمولی یعنی منہ بھر کر ہو تو وہ ناقض ہے۔ امام ابو حنیفہ خون، قے وغیرہ کو ان دونوں راہوں سے نکلی ہوئی نجاست پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں طہارت کرنے کی علت صرف نجاست کا نکلنا ہے۔

شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ قرآن نے دو راہوں سے خروج نجاست پر خاص طہارت کا یعنی وضو کا جو حکم دیا ہے وہ محض تعبدی ہے۔ عقلیت تو یہ ہے کہ نجاست جہاں سے نکلی ہے اس جگہ کو صاف کیا جائے نہ کہ ہاتھ منہ اور پاؤں دھوئیں جائیں لہٰذا اس پر قیاس درست نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ طہارت نہ ہونے کے موضوع پر نجاست کا ہونا ایک ٹھیٹھ عقلی مسئلہ ہے یعنی اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں کہ زوالِ طہارت میں نجاست بالذات اثر انداز ہے ہاں اس کے نتیجہ میں وضو کا حکم الٰہیہ ایک امر تعبدی ہے لیکن جب نجاست کا ہونا ثابت ہو گیا تو دوسرا حکم یعنی وضو اس کے نتیجہ میں خود بخود ظاہر ہو گیا خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اگرچہ اس پر آپ کے ارشادات اور اعمال ہماری تحقیق میں روایتی حیثیت سے اس قدر پایہ صحت کو نہیں پہنچے ہیں جیسے کہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان میں صحت ہونی چاہیے۔ اس پر تفصیلی بحث کی یہاں گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں، علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں مولانا محمد زکریا نے اوجز المسالک میں، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی میں، علامہ نووی نے شرح المہذب میں اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے اعلاء السنن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

نجاست کی دوسری حالت کی توضیح

اس آیت میں نجاست کی دوسری حالت یعنی اولٰمستم النساء میں ملامست کے معنے چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں۔ اور کنائی زبان میں یہ مباشرت کے لیے استعارہ ہے۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں کنائی معنے مراد ہیں یا لغوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ کنائی معنے مراد ہیں یعنی مباشرت اور اسی کو امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری نے اپنایا ہے بخلاف اس کے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن عمر کی رائے ہے کہ آیت میں ملامست اپنے لغوی معنے میں ہے۔ اسی رائے کو امام شعبی اور امام شافعی نے اپنایا ہے۔

اس تفسیری اختلاف کی وجہ سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے امام شافعی کے نزدیک وضو ٹوٹ جائے گا لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ان کے خیال میں آیت میں لغوی معنے نہیں بلکہ کنائی معنے مراد ہیں۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوانی جذبات کے ساتھ ہاتھ لگائیں گے تو ان کا وضو ٹوٹ جائے گا، لیکن اگر جذباتِ شہوانی کے ساتھ ہاتھ نہیں لگایا تو اس سے وضو نہ ٹوٹے گا۔

امام شافعی کی ہمنوائی میں امام احمد، امام زہری، امام اوزاعی بھی ہیں۔ امام نووی نے خود امام شافعی کا اس موضوع پر جو مسلک وضاحت سے بیان کیا ہے یہ ہے:۔

وضو توڑنے والی تیسری چیز کسی جوان عورت کے بدن کو چھونا ہے، اگر بال، دانت، ناخن کو چھویا، یا نابالغ بچی کے بدن کو ہاتھ لگایا تو وضو نہ ٹوٹے گا۔[1]

علامہ ابن قدامہ نے امام احمد کا مذہب اس طرح پیش کیا ہے:۔

امام احمد کا مشہور مذہب یہی ہے کہ عورت کو چھونا اگر شہوت سے ہو تو وضو توڑ دیتا ہے اور اگر بغیر شہوت کے ہو ناقض وضو نہیں ہے۔[2]

علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد مالکی نے اپنی مشہور کتاب الشرح الصغیر میں امام مالک کے مذہب کی اس طرح توضیح کی ہے:

بالغ مرد کا کسی ایسے شخص کو چھونا جس کو عادۃً لذت کی خاطر چھویا جاتا ہو چاہے ناخن بال ہی کو چھوئے اور چاہے کپڑے کے ساتھ ہو ناقض وضو ہے۔

واقعاتی زندگی میں مسائل کا یہ اختلاف اس فکری اختلاف کی وجہ سے ہوا جو قرآن کی اس آیت کی تشریح میں صحابہ میں ہوا۔ یعنی کچھ بزرگوں نے ملامست کو لغوی معنے میں لیا اور کچھ نے اسے کنائی معنے میں سمجھا۔

ہماری رائے میں زیر تشریح آیت میں ذوق تشریع سے قریب تر وہ تفسیر ہے جس میں ملامست کے کنائی معنے بتائے گئے ہیں۔ اس معنے کے اعتبار سے آیت کی یہ تفسیر ہو گی کہ اگر تم جنابت کی حالت میں ہو یعنی شہوت انزال کے ذریعے پوری کر رہے ہو، بیمار ہو یا مسافر ہو یا تمہارا وضو حدث اصغر یعنی پیشاب یا پاخانہ کی وجہ سے نہ رہا ہو اور یا تم نے عورتوں سے زناشوئی کی ہو چاہے اس میں انزال نہ ہوا ہو تو تم ان سب صورتوں میں تیمم کر سکتے ہو اور امام شافعی کی رائے کے مطابق اگر ملامست لغوی معنے میں ہو تو آیت کی تفسیر یہ ہو گی کہ اگر حالت جنابت میں ہو یعنی تم نے عورتوں سے زناشوئی کی ہو، بیمار ہو یا مسافر ہو، یا پیشاب پاخانہ کے باعث یا عورتوں کو ہاتھ لگانے کی وجہ سے وضو نہ رہا ہو تو تم تیمم کر لو۔

امام شافعی کی تشریح کی بنا پر آیت سے حالت جنابت میں جواز تیمم کی گنجائش نہیں ملتی ہے اس لیے کہ ایک ہی وقت میں ملامست دو معنے نہیں لے سکتا ہے حقیقی اور مجازی، عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات بڑی حیا والی ہے کہ زناشوئی کے لیے کنائی زبان میں بات ارشاد فرمائی ہے۔ نیز ملامست

---

[1] روضۃ الطالبین [2] المغنی ابن قدامہ

مفاعلت ہے اور یہ دو کے اشتراک کو چاہتا ہے۔ اور پھر اگر آیت کی لغوی معنے سے کر تشریح کی جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال سے متصادم ہو جاتی ہے مثلاً

امام نسائی نے سنن میں حضرت عائشہ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے التلخیص الجبیر میں اس کی سند کو صحیح مانا ہے اور حافظ ذیلعی نے اسے علی شرط مسلم فرمایا ہے بیان عائشہ یہ ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے، میں آپ کے سامنے اس طرح لیٹی ہوتی تھی جیسے جنازہ ہوتا ہے جب آپ رکعت کرنا چاہتے تو اپنے پاؤں سے مجھے چھوتے۔

ایک دوسرا بیان ابو داؤد نے سنن میں حضرت عائشہ ہی کا ابراہیم تیمی کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ عائشہ کا یہ بیان دس طریق سے آیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اسے صحیح کہا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کی تقبیل فرما لیتے تھے نماز پڑھتے تھے اور وضو نہ کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے:

حضرت عائشہ حضور انور کے سر مبارک میں اعتکاف کی حالت میں شانہ کرتی تھیں۔

الغرض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان گنت اعمال کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ اگر آیت میں یہ مطلب ڈالا جائے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

پانی کی نایابی کا مطلب

اصل ارشاد فلم تجدوا ماء ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ پانی نایاب ہے یا اس لیے کہ ایک میل دور ہے یا اس لیے کہ استعمال سے بیمار ہو جائے گا یا پیاس کا اندیشہ لاحق ہو۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مسافر کے لیے جواز تیمم کی یہ شرط ہے کہ وہ پانی تلاش کرے ساتھیوں سے مانگے۔ اگر بیابان میں ہو تو دور تک نظر دوڑائے اگر درمیان میں ٹیلہ یا دیوار کی رکاوٹ ہو اس کے پار جائے کیونکہ قرآن نے فلم تجدوا ماء فرمایا، نہ پانے کا مصداق وہ ہی ہو سکتا ہے جو طلب اور جستجو کرے۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کی ملک میں پانی نہیں وہ لم تجدوا ماء

کا مصداق ہے اگر پانی پاس موجود نہیں ہے کسی سے مانگنا شرط نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورہ مائدہ میں آرہی ہے۔ یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن نے بیمار اور مسافر کو تیمم کی رخصت دی ہے بیمار کو اس لیے کہ پانی تو موجود ہے مگر نقصان دیتا ہے اور مسافر کو اس لیے کہ پانی کا حاصل کرنا دشوار ہے اور اس تندرست کو بھی رخصت دی ہے جسے پانی دستیاب ہی نہ ہو خواہ اسے وضو کی حاجت ہو یا غسل کی۔ ان سب صورتوں میں تیمم جائز ہے۔ ظاہر قرآن سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ بیمار ہونا، مسافر ہونا اور حدث اصغر یا اکبر کے بعد پانی کا نہ ملنا جواز تیمم کے حالات ہیں۔ بیمار کے پاس اور مسافر کے پاس پانی ہونا تیمم میں مانع نہیں ہے کیونکہ بیمار کو پانی نقصان دیتا ہے اور مسافر کو سفر میں پانی کی ضرورت ہے تو اصل لم تجدوا ماء بیمار اور مسافر کی قید نہیں بلکہ صحت ور آدمی جو حدث اصغر یا اکبر میں مبتلا ہو اس کی قید ہے یعنی اگر تندرست انسان بے وضو ہو یا جنبی ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے تیمم کی اجازت ہے۔

تیمم کے لغوی اور شرعی معنے

اصل ارشاد میں تیمموا آیا ہے۔ لغت میں تیمم کے معنے قصد و ارادے کے آتے ہیں۔ اس کا مادہ ام آتا ہے امّ یؤم امًّا سے امام اور ماموم بنتا ہے اور اسی سے تیمم ہے اسے تیمم اور تامّم دونوں طرح بولا گیا ہے۔ صاحب بنایہ نے تامّم اور تیمم اور ام کے معنے ارادہ کرنے کے لکھے ہیں۔ اسی سے حدیث ہے کانوا یتامّمون شرار ثمارھم فی الصدقۃ وہ صدقہ میں بدترین پیداوار کا ارادہ کرتے تھے یتیممون بھی آتا ہے۔ لغوی معنے کے اعتبار سے اعشیٰ کا یہ شعر ہے۔

تیممت قیسًا وکم دونہ　　من الارض من مھمہ ذی شزن

لغوی معنے سے ترقی کر کے اصطلاحی معنے پیدا ہو گئے یعنی تیمم نام ہے۔ مٹی کے ذریعے چہرے اور ہاتھوں کے مسح کرنے کا اور تیمم بالتراب اسی معنے میں بولا جاتا ہے۔ ایک شعر میں شاعر نے بڑی جدت پیدا کی ہے کہ دونوں معنے میں استعمال کیا ہے۔

تیممتکم لما فقدت اولی النھیٰ
ومن لم یجد ماء تیمم بالتراب

لغوی معنے کی رعایت سے امام ابو حنیفہ نے تیمم میں نیت کو شرط قرار دیا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ لغوی معنے ہی میں استعمال ہوا ہے۔

صعید کی لغوی تحقیق

تیمم کس سے کیا جاتے؟ یعنی طہارت میں پانی کی جگہ کیا استعمال کیا جاتے۔ قرآن نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ تیمم صعید سے کیا جائے۔

صعید کے بارے میں اہل لغت کی تحقیق یہ ہے۔ مجدالدین فیروزآبادی قاموس میں لکھتے ہیں کہ صعید مٹی یا سطح زمین کو کہتے ہیں۔ ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں لکھا ہے کہ صعید سطح زمین کی مٹی کو کہتے ہیں۔ صاحب مصباح لکھتے ہیں صعید عربی زبان میں مٹی، سطح زمین اور راستہ کو کہتے ہیں۔ اصل میں صعود سے بنا ہے جس کے معنے بلند ہونے کے ہیں۔ صعید فعیل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ صعید روئے زمین کو کہتے ہیں اور بعض کی رائے ہیں صعید اس غبار کو کہتے ہیں جو اوپر کو چڑھتا ہے۔ امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ علامہ علی بن محمد خازن بغدادی تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل میں لکھتے ہیں؛

> ربیع نے امام شافعی سے صعید کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اسم صعید غبار والی مٹی کے علاوہ اور کسی معنے کے لیے نہیں آتا چنانچہ سنگریزہ پر بھی خواہ موٹا ہو یا باریک صعید کا لفظ نہیں بولا جاتا اور اگر مٹی سنگریزہ کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ اس پر غبار آجائے تو صعید وہ ہے جو اس کے ساتھ ملا ہے۔

صعید کی فقہی تشریح ہے لغوی نہیں جو امام شافعی نے اپنے مسلک کے مطابق کردی ہے چنانچہ قاضی ابوبکر بن العربی صاحب عارضۃ الاحوذی امام شافعی کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں۔

> یہ ان کی اپنے مذہب کے مطابق تفسیر فقہی ہے اور ہم نے جو معنے بیان کیے ہیں وہ زیادہ صحیح اور لغت کے زیادہ مطابق ہیں۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے فتصبح صعیداً زلقاً پھر ہو جائے گی وہ زمین صاف اپٹوان۔
>
> اور زجاج نے جو لغت عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے۔
>
> میں اس موضوع پر اہل لغت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ صعید کے معنے روئے زمین کے ہیں خواہ اس پر مٹی ہو یا نہ ہو اسی سے قرآن میں صعیداً جرزاً اور صعیداً زلقاً آیا ہے۔ صعید نام اس لیے ہوا کہ وہ زمین کی سطح بالائی کی انتہا ہے ؎

ؔ فتح الباری

امام بخاری نے اپنی صحیح میں سورہ نسا کی تفسیر میں صعید کے معنے وجہ الارض کے لکھے ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابو عبید کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ اسی بنا پر ائمہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ زمین کی جنس میں سے جس چیز سے بھی تیمم کر لیا بشرطیکہ وہ پاک کرنے والی ہو تو جائز ہے۔ اگرچہ اس پر گرد و غبار نہ ہو۔ زمین کی جنس سے وہ چیز مراد ہے جو نہ آگ سے پگھلے، اور نہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ پتھر اور گچ، چونہ، سرمہ، گیرو، ہڑتال، گندھک اور یاقوت اور زبرجد، فیروزہ اور عقیق سب زمین کی جنس ہیں۔

خود ارشادِ نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، صحیح بخاری میں ہے:

حضرت جابر کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے لیے تمام روئے زمین مسجد اور طہور بنا دی گئی ہے۔

تیمم کا طریقہ مسنون

تیمم کے طریقہ میں اختلاف ہے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ تیمم کا طریقہ بھی ان مسائل میں ایک ہے جن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی لوگوں نے مختلف نقل کیا ہے۔ محدثین کے ظہور میں آنے سے پہلے اکثر فقہا تابعین نے جس مسنون طریقہ کی نشان دہی فرمائی یہ ہے کہ تیمم دو دفعہ زمین پر ہاتھ مارنے کا نام ہے۔ ایک بار چہرے کے لیے اور دوسری بار ہاتھوں کے لیے ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی دو ضرب کے قائل ہیں۔ امام احمد، امام اسحاق اور امام اوزاعی ایک ضرب بتلاتے ہیں امام الحسن بن حی اور امام ابن ابی لیلی تین ضربات کہتے ہیں۔ احادیث سب کی تائید کرتی ہیں:

دار قطنی، حاکم اور بیہقی نے بحوالہ عبداللہ بن عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے

تیمم دو ضربیں ہیں ایک ضرب چہرے کے لیے دوسری ضرب ہاتھوں کے لیے کہنیوں تک۔

اس کی سند میں علی ابن ظبیان ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی روایات ہیں مگر ان میں کوئی بھی روایتی سقم سے خالی نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں عمار بن یاسر کی روایت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی یہ ترکیب ہوئی ہے۔

اے عمار تجھے کافی ہے یہ بات کہ اپنے ہاتھ کو زمین پر مار پھر اس میں پھونک مار پھر مسح کر اپنے چہرے اور ہاتھوں کا۔

اگرچہ امام نووی نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ ضرب کا طریق بتایا جا رہا ہے تیمم کرنے کا طریق

نہیں لکھا یا جارہا ہے لیکن ہمیں اس موقعہ پر شاہ ولی اللہ کی بات پسند ہے کہ عمار کی روایت میں درجہ کفایت بنایا گیا ہے اور ابن عمر کی روایت میں طریق مسنون بنایا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عمار کو یہ بتا رہے ہوں کہ زمین میں لوٹ مارنے کا نام تیمم نہیں بلکہ ہاتھوں کو لگی ہوئی مٹی سے مسح کافی ہے۔ قدر ممسوح اور تعداد ضربات بتائی مقصود نہیں ہیں

تیمم میں مسح کے اعضاء

قرآن میں محل مسح وجہ چہرہ و یدین دونوں بتائے گئے ہیں لیکن ید کا اطلاق عربی زبان میں مختلف ہے۔ ید پہنچے تک کی جگہ کو بھی کہتے ہیں یعنی اس جوڑ تک جو کلائی کو ہاتھ سے پیوند کرتا ہے۔ چوری میں چور کا ہاتھ یہاں تک کاٹا جاتا ہے۔ اور ید انگلیوں سے کہنیوں تک کے حصہ کو بھی کہتے ہیں اور ید مونڈھے تک کو بھی کہتے ہیں۔ اس لیے اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد، امام اسحاق، امام اوزاعی اور ظاہریہ یہ کہتے ہیں کہ صرف پہنچوں تک ہاتھوں کا مسح کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں جمہور اور ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ کہنیوں تک ہاتھوں کا مسح کیا جائے اور امام زہری کہتے ہیں کہ مونڈھوں تک مسح کیا جائے۔ ہمیں یہاں قاضی ثناء اللہ کی بات مبنی بر انصاف معلوم ہوتی ہے۔

> امام زہری سے منقول ہے کہ تیمم میں مونڈھوں تک مسح واجب ہے ایسے ہی صحابہ کے بارے میں بھی ہے کہ انہوں نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بغلوں اور مونڈھوں تک مسح کیا لیکن یہ سب کچھ حضور انور کی تعلیم سے پہلے کی کہانی ہے۔ جب اپنے اللہ کی مراد بتا دی تو سب کو علم ہو گیا۔ عمار بن یاسر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ فوجی پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہ آپ کے ہمراہ تھیں۔ پڑاؤ میں حضرت عائشہ کا ظفاری موتیوں کا ہار گر گیا ہار کی تلاش میں سب کو رکنا پڑا، صبح ہو گئی، پانی موجود نہ تھا۔ اللہ نے طہارت کی رخصت والی آیت نازل فرمائی۔ لوگ اُٹھے زمین پر ہاتھوں کو مارا پھر ہاتھ اٹھائے اور بغیر جھاڑے ہاتھوں کو خوب اپنے چہروں پر ملا اور ہاتھوں کا مونڈھوں تک مسح کیا۔ یہ ابن الجوزی نے امام احمد کے حوالے سے روایت پیش کی ہے اور ابن ماجہ میں ہے کہ ہم نے شانوں تک مسح کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ہم نے حضور انور کے ساتھ شانوں تک تیمم کی لیکن حضور انور کی تعلیم اور اجماع سے معلوم ہوا ہے کہ پورا ہاتھ مراد نہیں ہے۔ ہاتھ آیت میں مقدار کی حد تک مجمل ہے۔ حضور نے آیت کے چہرۂ اجمال سے نقاب اٹھائی اور بتایا تیمم میں ہاتھ کی

مقدار وہی ہے جو وضو میں ہے یعنی کہنیوں تک ، عمار بن یاسر کہتے ہیں کہ جس وقت آیت تیمم نازل ہوئی میں موجود تھا۔ حضور انور نے ہمیں حکم دیا۔ ہم نے ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے لگائی تھی ۔ یہ روایت مسند بزار میں موجود ہے اور حافظ عسقلانی نے التلخیص الحبیر میں بلا تنقید اسے نقل کیا ہے اور ابوداؤد حدیث عمار میں کہنیوں تک کے الفاظ لاتے ہیں لیکن اس کی سند میں قتادہ کہتے ہیں کہ میرے سے ایک محدث نے بیان کیا یہ محدث اگرچہ مبہم ہے لیکن قتادہ خود اس کی ثقاہت کی نشاندہی کے لیے کافی ہے ۔ لہذا حدیث عمار اس آیت قرآنی کے لیے بیان بن کر آئی ہے ۔ [1]

تیمم، غسل اور وضو کی جگہ

اس پر اب تو پوری امت کا اجماع ہے کہ تیمم جنابت کی حالت میں اور وضو کی ضرورت میں کام دے سکتی ہے یعنی آپ کو نہانے کی حاجت ہو یا وضو کرنا ہو تو دونوں کی جگہ تیمم کر سکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث نے لکھا ہے کہ امت میں حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود حالت جنابت میں تیمم کے جواز کو نہیں مانتے تھے ۔ وہ قرآن کی اس آیت میں ملامست کو جماع سے کنایہ نہیں بلکہ چھونے کے معنے میں سمجھتے تھے اس لیے بحالت جنابت غسل کے قائل نہ تھے لیکن عمران بن حصین کی حدیث اس شخص کے بارے میں جو جنابت اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے نماز با جماعت سے رہ گیا تھا اور اس کو حضور انور نے فرمایا علیک بالصعید فانہ یکفیک مٹی سے تیمم کر لینا کافی ہے ۔ یہ صحیحین میں موجود ہے اور عمار بن یاسر کی حدیث پہلے پڑھ چکے ہو۔ اگرچہ حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اس رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ بہرحال تیمم جنابت کے غسل اور وضو دونوں کی نیابت کرتی ہے اور اس کی حیثیت عامہ علماء قانون کی نظر میں ناپاکی کو ہٹانے کی نہیں بلکہ چھپانے کی ہے ۔ امت میں صرف داؤد ظاہری کے خیال میں اس کی حیثیت رافع کی ہے ورنہ سب یہی کہتے ہیں کہ تیمم ساتر ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اگر تیمم رافع حدث ہوتی تو پانی ملنے پر اس کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور پانی کا ملنا مٹی کے طاہر ہونے کی غایت نہ ہوتا یہ تیمم کی قانونی حیثیت ہے ۔

[1] تفسیر مظہری

پانی ملنے پر اداشدہ نماز کا اعادہ

اس قانونی نقطہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جو نمازیں تیمم سے ادا کی جا چکی ہیں وہ عذر زائل ہونے پر یا پانی دستیاب ہونے پر لوٹائی جائیں گی کیونکہ قرآن نے پانی نہ ملنے کی صورت یا عذر موجود ہونے کی صورت میں پانی سے طہارت کی قید ہٹادی ہے اس لیے اگر وقت اوّل میں بھی نماز تیمم سے پڑھ لی اور وقت کے اندر عذر دُور ہوگیا یا پانی دستیاب ہوگیا تو نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ ایسا واقعہ خود زمانۂ نبوت میں پیش آیا حضورؐ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ نماز کو لوٹانا نہیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر گئے نماز کا وقت آگیا، پانی موجود نہ تھا۔ دونوں نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی، پھر وقت کے اندر پانی دستیاب ہوگیا۔ ایک ساتھی نے وضو کرکے نماز کا اعادہ کرلیا اور دوسرے نے نہیں کیا۔ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر واقعہ بیان کیا آپ نے اسے مخاطب کرکے جس نے نماز کا اعادہ نہیں کیا تھا فرمایا اصبت السنۃ تم نے سنّت کے مطابق کیا اور تمہارے لیے وہ ہی نماز کافی ہے اور وضو کرکے نماز لوٹانے والے سے کہا کہ تمہیں ڈبل اجر مل گیا۔

تیمم کے بارے میں اور بھی ضروری مباحث ہیں جو انشاء اللہ سورہ مائدہ میں آپ پڑھیں گے۔

عفو و مغفرت کا درجہ قانونی تیسرا ہے

۴۳۔ بلاشبہ اللہ درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت دے دی اور مٹی کو پانی کے قائمقام کردیا اس لیے کہ وہ سہولت اور معافی دینے والا ہے اور بندوں کی خطائیں بخشنے والا ہے اپنے بندوں کے نفع اور آسائش کو پسند کرتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نمازیں نشہ کی حالت میں جو کچھ کا کچھ پڑھا گیا تھا وہ بھی معاف کردیا گیا اور جس سے یہ خلجان بھی نہ رہا کہ آئندہ تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھیں گے شاید پہلی غلطی کا مواخذہ ہو۔ [1] اور اس سے یہ بھی اشارہ ہوگیا ہے کہ اصل اور قانونی مطالبہ تو طہارت کاملہ کا ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ عفو و کرم کے درجہ کی بات ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عزیمت کا قانون ہو یا رخصت کی بات ہو دونوں اللہ کی جانب سے ہیں عزیمت اگر اس کی عزت و حکمت کا تقاضا ہے تو رخصت میں اس کی عفو و مغفرت کا مظاہرہ ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ
وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۞ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ط
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ق وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۞ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا
وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ط وَ
لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ
وَاَقْوَمَ لا وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ ضلالت کے خریدار بنے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ سے بھٹک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے، اور اللہ ہی کارساز ہونے کے لحاظ سے کافی ہے اور اللہ ہی کی مددگاری کفایت کرتی ہے[۸۴]۔ یعنی وہ لوگ جو یہودی ہیں وہ

باتوں کو ان کی اصلی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں سمعنا وعصینا
اور اسمع غیر مسمع اور راعنا اپنی زبانوں کو مروڑ کر اور دین میں
طعنہ اندازی کی خاطر۔ اور اگر یہ لوگ سمعنا واطعنا اور اسمع اور انظرنا
کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ درست ہوتا لیکن ان پر
ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے پھٹکار ڈال دی اس لیے تھوڑی
سی تعداد کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں۔

اسلام کا نظامِ حیات اور اس کی اپوزیشن

دُنیا میں نزولِ قرآن کے وقت دین کے دو تصور کارفرما تھے ایک یہ کہ دُنیا انسان کے لیے قید خانہ ہے اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانے کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے اور اس پنجرے سے اپنے آپ کو آزاد کرائے یعنی وہ دُنیا کو چھوڑ دے بستیوں سے دُور نکل جائے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھ جائے اپنی خواہشوں کو دبا کر کچل دے صرف اسی صورت میں اس کی روح کی اوپر سے وہ پردہ ہٹ سکتا ہے جو اسے خدا کے جلووں کے دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کر لینے سے روکے ہوئے ہے اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ ریاضتیں کر کے ریا کے اس جال سے باہر نکل جائے دین کا یہی نظریہ ہے جس کا نام رہبانیت ہے اور نزولِ قرآن کے وقت عیسائیت اس کی علمبردار تھی۔
دوسرا تصور یہ ہے کہ انسان کو دُنیا سے منہ موڑ لینے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی دُنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول طور پر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔

ہے دنیوی معاملات اور مسائل تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے معاشرتی اور اخلاقی ہدایات دیتا ہے جن کی پوری پوری پابندی کرنی چاہیے - باقی زندگی کی تمام شاخوں میں وہ آزاد ہے کیونکہ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا کام نہیں اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے جو دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے - یہ یہودیوں کا نظریۂ دین ہے نزول قرآن کے وقت یہ بھی موجود تھے -

ان دونوں نظریوں کے مقابلے اسلامی نظریہ یہ ہے کہ جیسے دنیا کو چھوڑ دینا اور نفس کو مار ڈالنا غلط ہے ایسے ہی بندگی کو صرف فرد کا کام اور دین کو صرف انسان کی نجی زندگی کا معاملہ سمجھنا بھی غلط ہے - صحیح بات یہ ہے کہ عبادت گاہ ہو یا گھر، کھیت ہوں یا بازار، معاشی ادارے ہوں یا سیاسی ادارے یہ سارے شعبے دین کے فرائض اور بندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے مقامات ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جگہ سے نہ تو انسان بھاگ سکتا ہے اور نہ ان میں اپنی من مانی کرنے کا مجاز ہے، صحیح خدا پرستی یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی انفرادی سے لے کر اجتماعی تک احکام الٰہی کے تحت گزارے۔ وہ عبادت گاہ میں اگر رب العالمین کی عبادت کرتا ہے تو اس سے باہر بھی وہ ہی کچھ کرے جسے کرنے کا اسے حکم ملا ہے اور اس طرح اس کی دُنیوی زندگی کا نظام پورا پورا وہ ہے جو اس کے مالک کو پسند ہے -

اس سورت میں اب تک عائلی نظام، معاشرتی نظام اور اخلاقی نظام سے بحث کی گئی ہے اور اب قرآن سیاسی نظام اور قانونی نظام سے متعارف کرانا چاہتا ہے اور بتانا چاہتا ہے کہ اسلام کا سیاسی اور قانونی نظام کیا ہے چنانچہ آیت ۵۸ ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات سے شروع ہو کر پورے پارہ میں ان دونوں نظاموں کا کامل ترین چہرہ پیش کیا گیا ہے -

نزول قرآن کے وقت دو قومیں موجود تھیں ایک عیسائی، دوسرے یہودی اور یہ دونوں اسلام کے نظام حیات کے لیے اپوزیشن تھیں، اس لیے قرآن نے یہاں یہودی اپوزیشن کا چہرہ پیش کر کے ان کی خدا پرستی، دینداری پر ضرب کاری لگائی ہے اور سورت کے آخر میں عیسائیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسلام کی راہ اعتدال کا صحیح تصور پیش ہی نہیں ہو سکتا جب تک افراط و تفریط کے دونوں رُخ سامنے نہ آجائیں اب یہاں یہودیوں کے ایک فرقہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ نبوت اور اسلامی نظام حیات کی اپوزیشن کی حیثیت سے مطالعہ کریں۔ اگر یہ نکتہ آپ پیش نظر رکھیں تو آپ پورے کلام میں وہ بے ربطی محسوس نہ کریں گے جو عام شارحین محسوس کر رہے ہیں -

۴۴ - کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ سے بھٹک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ ہی کارساز ہونے کے لحاظ سے کافی ہے اور اللہ ہی کی مددگاری کفایت کرتی ہے - ان آیات میں یہود کے بعض قبائح اور ان کے مکر و فریب کا بیان ہے اور ان کی ضلالت اور کفر پر خود ان کو نیز دوسروں کو مطلع کرنا ہے تاکہ ان سے علیحدہ رہیں چنانچہ ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا" سے لے کر یا ایہا الذین امنوا لا تقربوا تک یہود کے قبائح بیان ہو چکے ہیں - بیچ میں ایک خاص مناسبت سے نشہ اور جنابت میں نماز سے ممانعت ذکر کر کے پھر یہود کے قبائح کا بیان ہے - یہود کو کتاب کا کچھ حصہ ملا یعنی الفاظ پڑھنے کو ملے اور عمل کرنا جو مقصود تھا نہیں ملا اور گمراہی خرید کرتے ہیں یعنی پیغمبر آخرالزمان کے حالات و اوصاف کو دُنیا کی عزت اور رشوت کے واسطے چھپاتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان گمراہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ اے مسلمانو! تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے تم ہرگز ایسا نہیں جانتے سو اللہ کے فرمانے پر اطمینان کرو اور ان سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم کو نفع پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے لیے کافی ہے اس لیے دشمنوں سے اس قسم کا اندیشہ نہ کرو اور دین پر قائم رہو[1]

جیسا کہ آیت کی تمہید میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اس سورت میں آگے آیت میں اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام سے بحث آ رہی ہے اور پہلے اسلام کے عائلی، معاشرتی اور اخلاقی نظام سے بحث ہو چکی ہے - یہاں یہودیوں کے مخصوص چہرے کو سیاسی نظام کو پیش کرنے کے لیے بطور تمہید پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اسلام کے سیاسی نظام کے قائم کرنے میں ان سے بچ کر رہیں اور پھونک پھونک کر قدم اٹھائیں - اسی لیے بات کا آغاز استفہام کے ذریعہ کیا گیا ہے اور ہر شخص کو مخاطب بنا کر کہا گیا ہے کہ کیا تم کو ان کے حالات کا پتہ نہیں ہے - یعنی چونکہ یہ تمہاری سب سے بڑی اپوزیشن ہے تمہیں ان کے حالات سے باخبر رہنا چاہیے تاکہ زندگی کے کسی گوشہ میں تم ان کی کاپی نہ کر سکو -

قرآن نے یہود کا چہرہ بتاتے ہوئے اس آیت میں ان کے اجتماعی زندگی کو چار طرح سے بے نقاب کیا ہے -

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہود کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے

اولاً یہ کہ یہود کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا ہے اصل ارشاد اوتوا نصیبا من الکتاب ہے۔ اس فقرے کی یا یہودیوں کے اس کردار کی تشریح میں شارحین قرآن مختلف ہیں۔ ایک رائے تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں کہ الفاظ پڑھنے کو ملے اور عمل سے محروم رہے۔ قاضی ثناء اللہ نے بھی اسی کو اپنایا ہے قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ ان کو علم تورات کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔ یہی زمخشری نے اختیار کیا ہے۔ سید رشید رضا نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ قرآن کی یہ تعبیر کہ ان کو کچھ کتاب کا حصہ دیا گیا ہے نصیبا من الکتاب بتا رہی ہے کہ ان کو ساری کتاب یاد نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زمانہ نزول میں تورات کو اس طرح یاد نہیں کیا تھا جیسے مسلمانوں نے قرآن کو یاد کر لیا تھا اور عصر اول میں کتاب کے متعدد نسخے تیار نہیں ہوئے تھے جیسے قرآن کے متعدد نسخے تھے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں کے پاس صرف ایک ہی تورات کا نسخہ تھا جسے حضرت موسیٰ نے لکھا تھا۔ اس پر ہم اجمالی بحث تیسری جلد میں کر چکے ہیں لیکن ہمیں اوتوا نصیبا من الکتاب کی تشریح میں مفتی محمد عبدہ کی یہ تشریح زیادہ پسند ہے کہ کتاب کا ایک حصہ دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے اپنی زندگی میں ساری کتاب کو دستور حیات کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ زندگی کی مختلف احوال میں کتاب الٰہی کے بیشتر احکام کو چھوڑ دیا اور ان کو عملی پذیرائی نہیں دی مثلاً مالیاتی مسائل میں انہوں نے تورات کے حکم سود کی ممانعت کو عملاً قبول نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تورات کے کچھ احکام پر عمل کرتے تھے اور اکثر احکام سے عملی زندگی میں روگرداں تھے۔ یہی معنے ہیں اس آیت کے افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض، یہاں کفر انکار کے معنے میں نہیں بلکہ کافرانہ زندگی اختیار کرنے کے معنے میں ہے اور ایمان ببعض الکتاب مومنانہ زندگی اپنانے کے معنے میں ہے۔ گویا کتاب کے جس حصے پر وہ عمل کرتے تھے اس کو قرآن ایمان ببعض الکتاب اور اوتوا نصیبا من الکتاب کہتا ہے اور جس حصے پر وہ عمل نہیں کرتے قرآن کفر ببعض الکتاب اور نسوا حظا مما ذکروا بہ کہتا ہے۔

قرآن نے یہ بات اتنی قوت اور وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں لیکن افسوس ہمارے شارحین قرآن دوسری راہوں میں چلے گئے۔ اول تو اس مقام پر خاموشی سے گزر جاتے ہیں اور جو لب کشائی کرتے ہیں ان کا حال یہ کہ وہ مختلف وادیوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کو قرآن کی یہ آیات یہاں بے ربط آنے لگی ہیں۔

یہود خود ضلالت کے خریدار ہیں

ثانیاً یہ کہ یہود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں یعنی کس طرح وہ ہدایت دے کر ضلالت خریدتے ہیں یعنی یہود کا کتاب الٰہی کے بیشتر حصہ سے عمل کی زندگی میں کٹ جانا اور تھوڑے حصہ سے وابستہ رہنا اس لیے ہوا کہ ان میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف مصالح اور منافع اور اغراض و مفادات رہ گئے تھے۔ ان کی پوری دینی زندگی محض کاروبار بن کر رہ گئی تھی۔ وہ کتاب الٰہی کے ایک حصے کو چھپا کر مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اسی کو قرآن میں یکتمون ما انزل اللہ ویشترون بہ ثمنا قلیلا کہا ہے۔ یہی ہدایت کے بدلے میں ضلالت کا خریدار بننا ہے اور یہی مغفرت کے بدلے میں عذاب کا سودا کرنا ہے اور اسی کو آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو خریدنا کہا گیا ہے۔ گویا سیاسی مفادات، قومی منافع اور ملکی مصلحتوں کی خاطر اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دینا قرآن کی زبان میں ضلالت کی خریداری ہے۔ اور یہ برائی اس وقت رونما ہوتی ہے جب کوئی قوم ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت، جماعت کے بلند مقام سے گر کر ابن الوقتی، مصلحت پرستی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتی ہے۔ اور پوری زندگی میں چند رسوم کی ادائیگی کو دینداری کا نام دے کر باقی زندگی کو وہ دین کی پابندی سے آزاد کر لیتی ہے۔ دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے دین کا رابطہ توڑ بیٹھتی ہے۔ قرآن نے ان کی قومی زندگی سے متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔

اہل ایمان کے بارے میں یہودی خواہش

ثالثاً یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی صراط مستقیم سے بھٹک جاؤ۔ یعنی وہ خود ہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان بھی گمراہ ہو جائیں اور زندگی میں صراط مستقیم سے ہٹ جائیں۔ اور اسلام کو صرف انفرادی زندگی تک محدود کر کے اجتماعی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کا رابطہ اسلام سے توڑ لیں۔ قرآن نے اہل ایمان کے لیے اس یہودی خواہش کا قرآن میں مختلف عنوانوں سے ذکر کیا ہے کہیں ارشاد ہوا ہے؛

ود کثیر من اهل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً

اہل کتاب میں سے اکثر کی خواہش یہ ہے کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کافروں میں واپس لوٹا دیں۔

اس موضوع پر ہم پہلی جلد میں یہودی خواہش کا پورا چہرہ بے نقاب کر چکے ہیں ۔ اور کہیں بتایا ہے :

ودت طائفة من اهل الکتاب لو یضلونکم

اہل کتاب کا ایک طبقہ یہ بات دل سے پسند کرتا ہے کہ تم کو گمراہ کر دیں ۔

اور کسی جگہ صاف صاف بتایا ہے :

یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین ۔

اے اہل ایمان اگر تم اہل کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی بھی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے ۔

گمراہ کرنا، کافر بنانا اور اہل ایمان کے گمراہ ہونے کی خواہش ہونا سب کا حاصل ایک ہے ۔ اختلاف حقیقت کا نہیں صرف انداز بیان کا ہے ۔ ان کی یہ خواہش اگر دیکھنا چاہتے ہو تو ان کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم اور مخفی پروپیگنڈا زمانہ نبوت سے لے کر آج تک عقائد اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی، جغرافیائی تحریروں کے ذریعہ سے اسلامی آبادیوں کے درمیان جاری رہتا ہے وہ دیکھ لو بلاشبہ وہ سب اسی خواہش کے مظاہر ہیں ۔ ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اسلام کے جادۂ اعتدال سے ہٹ جائیں ۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کہیں علمیت کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں پورے خلوص اور پورے زور قلم کے ساتھ اسلام کے محقق اور شارح بن کر مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف بغاوت کے جراثیم پیدا کرتے ہیں ۔ دین و سیاست کی تفریق، اسلام کی نظام حکومت سے یکسر بے تعلقی اور اس کا محض ایک اعتقادی، اخلاقی اور عباداتی نظام ہونا وغیرہ وغیرہ ان کی اسی خواہش کے غیر شعوری مظاہر ہیں ۔

رابعاً یہ کہ یہودی اہل ایمان کے دشمن اور اس دنیا میں نبوت کی سب کی بڑی اپوزیشن ہیں ۔ اصل ارشاد یہ ہے واللہ اعلم باعدائکم مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تم سے زیادہ تمہارے دشمنوں کو جانتا ہے ۔

یہ کہہ کر گویا اہل ایمان کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہاری اپوزیشن ہیں ان کے افکار و اعمال کی کاپی کبھی نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ تم بھی عمل کے لیے کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو لے کر باقی کو چھوڑ بیٹھو اور اس طرح تم بھی ایمان و کفر کی یکجائی کا جرم کر لو ۔

خامساً یہ کہ ولایت و نصرت کے تعلقات ان سے نہیں تمہارے اللہ سے ہیں ۔ ولی ہونے کی حیثیت

سے وہ زندگی کے ہر موڑ پر تمہارا رہنما ہے اور نصیر ہونے کی حیثیت میں وہ ہر مشکل میں تمہارا مددگار ہے۔ کسی کے تعلقات سے دھوکہ نہ کھاؤ اور کسی کی مدد پر بھروسہ نہ کرو۔ اللہ کا ولی ہونا یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی مصلحتوں کی رعایت کرتا ہے اور اس کا مددگار ہونا یہ ہے کہ وہ ان کو دشمنوں کی ایذارسانی سے بچاتا ہے۔

ولایت ونصرت کے لیے کفایت کی قید لگا کر اشارہ کر دیا کہ اجتماعی زندگی میں اللہ کی ولایت ونصرت سے ہٹ کر کسی سے یہ تعلقات وروابط نہ قائم کرنے چاہئیں۔ اس معاملے میں انفرادی مراسم اور انفرادی مصالح کو کوئی وزن نہ دینا چاہیے۔ یہودی اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے ہی کے پیش نظر وہ تمہارے کھلے دشمن اور تم کو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹانا چاہتے ہیں اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ مد مقابل اور اپوزیشن کی حیثیت سے تمام مفادات سے بالا ہو کر ہونا چاہیے۔

تحریف یہودیوں کا شیوہ ہے

۴۵۔ یعنی وہ لوگ جو یہودی ہیں وہ باتوں کو اپنی اصلی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ یعنی یہود میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو تورات میں نازل فرمایا اس کو اپنے ٹھکانے سے بدلتا اور پھیرتے ہیں یعنی معنوی اور لفظی تحریف کرتے ہیں۔[1]

اس کے تین مطلب ہیں ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں رد وبدل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیات کتاب کے معنے کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کی صحبت میں آکر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انہیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔[2]

عام شارحین قرآن نے تحریف کے دو ہی محمل بتائے ہیں ایک یہ کہ توریت میں تحریف کرتے تھے دوسرے یہ کہ حضور انور کی باتوں میں تحریف کرتے تھے۔ موقعہ اور مقام کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

معنے مراد ہوں کیونکہ ویقولون کا عطف اسی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اگر حضور انور کی باتوں میں تحریف مراد ہو تو پھر تحریف کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بات کو غلط معنے پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اگر تورات میں تحریف مراد ہے اور یہ ان کے علماء کے جرائم میں مستقل پیشہ ورانہ جرم کو بتایا جا رہا ہے تو پھر تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنے اور مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق دوسرے معنے پہنا دیے جائیں جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ

اکثر انواعہ وجوداً ان یقلب اللفظ من ظاہر مرادہ الی ھواہ

تحریف کی عام قسموں میں سے سب سے زیادہ رائج یہ ہے کہ اپنی خواہش کے مطابق مراد مقرر کی جائے۔

تورات میں دونوں قسم کی تحریفات ہوئی لفظی بھی اور معنوی بھی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اظہار الحق میں تورات سے ۰۰ اشہادتیں ایسی پیش فرمائی ہیں حق میں تحریف ہوئی ہے۔

شان نبوت میں یہود کی شرارت

۴۶۔ اور کہتے ہیں سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا اپنی زبانوں کو مروڑ کر اور دین میں طعنہ اندازی کی خاطر۔ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کوئی حکم سناتے ہیں تو یہود جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا مطلب یہ ہے کہ قبول کر لیا لیکن آہستہ سے کہتے ہیں کہ نہ مانا یعنی ہم نے صرف کان سے سنا دل سے نہیں مانا اور جب یہود آپ سے مخاطب ہوتے تو کہتے ہیں سن نہ سنایا جائے تو۔ یعنی ایسی بات کرتے ہیں جس کے دو معنے ہوں ایک معنی کے اعتبار سے دعا، دوسرے معنے کے لحاظ سے بددعا، چنانچہ یہ بات بظاہر دعا ہے۔ مطلب یہ کہ تو ہمیشہ غالب اور معزز رہے کوئی تجھ کو بری اور خلاف بات نہ سنا سکے اور دل میں یہ نیت رکھے بہرا ہو جائیو۔ ایسے ہی جب خدمت اقدس میں یہودی ہوتے تو کہتے راعنا، اس کے بھی دو معنے ہیں ایک اچھے ایک برے جن کا بیان سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اچھے معنے تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور شفقت کی نظر کرو کہ آپ کا مطلب سمجھ لیں اور جو پوچھنا ہو پوچھ سکیں اور برے معنے یہ کہ یہود کی زبان میں یہ کلمہ تحقیر کا ہے یا زبان کو دبا کر راعینا کہتے یعنی تو ہمارا چرواہا ہے اور یہ ان کی محض شرارت تھی کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر پیغمبروں نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ یہود ان کلمات کو اپنے کلام میں رلا ملا کر اس طرح کہتے کہ سننے والے اچھے ہی معنے پر محمول کرتے اور برے معنے کی طرف دھیان بھی نہ جاتا۔ اور دل میں

بُرے معنے مراد لیتے اور پھر دین میں یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب ضرور معلوم کر لیتا، اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو خوب کھول دیا [1]

سمعنا واطعنا، اسمع غیر مسمع، راعنا وغیرہ الفاظ عرب کی مجلسی زندگی کے الفاظ میں سے ہیں جو متکلم کی قدر افزائی و تحسین، سننے والے کے اظہار، ذوق و شوق کے موقع پر استعمال ہوتے تھے جیسے ہم بولتے ہیں بجا ارشاد ہے، سر تسلیم خم ہے، خوب بات فرمائی ہے، کیا نکتہ ارشاد ہوا، مکرر ارشاد ہو، پھر فرمایئے، اسی طرح عرب میں بھی مذکورہ الفاظ، کلمات رائج تھے۔ یہ الفاظ اصلاً تو اظہارِ تحسین، اعتراف و قبول کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو زبان کو ذرا توڑ مروڑ کر تلفظ کو بگاڑ کر یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزاء بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے۔ لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لیجئے۔

سمعنا واطعنا کے لفظی معنے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہل عرب یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار کسی بادشاہ کے حکم وارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے طاعت کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے سمعنا واطعنا تو بات بات پر کہتے لیکن لب و لہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ اطعنا کو عصینا بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں۔ اس تحریف میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم و طاعت کے جملہ کو نافرمانی و سرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے۔ اس لیے وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے کہ ہم نے سمعنا واطعنا کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سن کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

اسمع غیر مسمع کے لفظی معنی ہیں سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سُن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دانشمندانہ اور حکیمانہ بات سنیے۔ یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے۔ اس سے پہلے کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدر دانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدردانی کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ٹھونگ کے انداز میں باندازِ تمسخر بھی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ذرا اس کی ناشنیدنی سنو۔ یہ کبھی بے پر کی اڑا رہا ہے ایسی بات کہہ رہا ہے کہ کسی نے نہ سنی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو غیر مسمع کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لیے قرآن نے اس کی یہ نوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف اسمع کہا جائے۔

راعنا کے لفظی معنے ہیں ذرا ہماری رعایت فرمائیے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سننا چاہیے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہم کہتے ہیں پھر ارشاد ہو، پھر فرمائیے اسی طرح عربی میں راعنا کہتے ہیں۔ یہ انداز سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے لیکن یہودی زبان کو توڑ مروڑ کر اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ راعنا میں عین کے زیر کو ذرا دبا دیتے تو یہ لفظ راعینا بن جاتا اس کے معنے ہیں اے ہمارے چرواہے۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو اہل ایمان کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا۔[1]

نبی کی شان میں گستاخی دین میں طعن ہے

۴۷ – اور اگر یہ لوگ سمعنا واطعنا اور اسمع اور انظرنا کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ درست ہوتا لیکن ان پر ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے پھٹکار ڈال دی اس لیے ان میں تھوڑی تعداد کے علاوہ سب ایمان سے محروم ہیں۔ حق تعالیٰ نے یہود کے تین قول مذموم بیان فرما کر اب بطور ملامت و ہدایت ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر یہود عصینا کی جگہ اطعنا کہتے اور بجائے اسمع غیر مسمع کے اسمع کہتے اور راعنا کی جگہ انظرنا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور یہ بات درست اور سیدھی ہوتی اور اس نے یہود کی شرارت

---

[1] تدبرِ قرآن

کی گنجائش نہ ہوتی جو کلمات سابقہ سے یہود بُرے معنے اپنے دل میں مراد لیا کرتے تھے لیکن چونکہ ان کو ان کے کفر کے باعث اپنی رحمت و ہدایت سے محروم کر دیا ہے اس لیے وہ مفید اور سیدھی باتوں کو نہیں سمجھتے اور ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے سے آدمی کہ وہ ان خباثتوں اور شرارتوں سے مجتنب رہے اور اس وجہ سے اللہ کی لعنت سے محفوظ رہے جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ جسارت اور گستاخی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے یعنی ان پر لعنت ڈال دی ہے اور ان پر یہ لعنت ان کے کافرانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس میں اشارہ ہو گیا ہے کہ گناہ سے گناہ پیدا ہوتا ہے اگر یہ کفر اختیار نہ کرتے تو شانِ نبوت میں گستاخی جیسے سنگین جُرم کو نہ اپناتے اور طعناً فی الدین کہہ کر یہ بھی بتا دیا کہ نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے کیونکہ نبی فی الواقع مجسمہ دین اور مظہرِ شریعت ہوتا ہے۔

تھوڑا ایمان یا تھوڑے ایماندار

آخر میں فرمایا فلا یومنون الا قلیلاً اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ قلیل ایمان کی صفت ہے اور عبارت یوں ہے فلا یومنون الا ایمانا قلیلاً یعنی وہ تھوڑا سا ایمان لاتے ہیں جو ایمان صلاحیت اور پاکیزگی نفس کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی اور انفرادی زندگی کے متعدد اجزا ہیں۔ بنی اسرائیل دینی زندگی کے سارے اجزا میں سے صرف چند اجزاء پر نام و نمود کے لیے ایمان رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ایمان نہ کسی کو نیک بناتا نہ اس سے تزکیہ ہوتا ہے اور نہ عقل انسانی کی ترقی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے پاس ایمان کامل ہوتا تو وہ بلاشبہ آگے بڑھ کر اس کتاب اور اس نبوت کا استقبال کرتے جو ان کی کتاب کی مصدق بن کر آئی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کی تھوڑی تعداد ایمان لاتی ہے اور عبارت یوں ہے فلا یومنون الا عددا قلیلاً یعنی ان کی تھوڑی سی تعداد ایمان لاتی ہے۔ اس مطلب کی تائید صحیح بخاری کی ابوہریرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

اگر مجھ پر دس یہودی ایمان لے آتے تو تمام یہودی ایمان لے آتے۔

ان الفاظ پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے یہودی آپ پر ایمان لا چکے تھے مگر اس کے باوجود

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تمام یہود ایمان نہیں لائے۔ مسند احمد کی اس روایت سے جو ابوہریرہ کے حوالہ سے آئی ہے کہ :

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہود کے دس بڑے عُلَمار مجھ پر ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے عُلَمار مراد تھے اگر ان کے دس عُلَمار ایمان لے آتے تو ان کی اتباع میں یقیناً بقیہ یہود بھی ایمان لے آتے جیسا کہ قبائل عرب بھی اس کے منتظر تھے کہ قریش ایمان لے آئیں تو ان کی اتباع میں ہم بھی ایمان لے آئیں گے ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری کے وقت رؤسائے یہود سے مشاہیر کے نام بھی لکھے ہیں ۔

یہاں کعب احبار نے دس کی بجائے بارہ کا عدد بتایا ہے ۔ دونوں روایتوں میں یہ اختلاف ہے کہ حضور نے دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا، کعب کہتے ہیں کہ بارہ اور ابوہریرہ کہتے ہیں دس ۔ یحییٰ ابن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ہو سکتا ہے کہ کعب احبار نے پورا عدد ذکر کیا ہو اور ابوہریرہ نے ان کی تعداد بتائی ہو جو مشرف باسلام نہ ہوئے تھے ۔ عبداللہ بن سلام اور مخیریق اسلام قبول کر چکے تھے ۔ بہرحال خلاصہ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کلمہ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب اور سادہ سمجھتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے ۔ مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے ان کے عُلَمار کو بہت کم توفیق ہوئی ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ
مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ
كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٤٧﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ
يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ
يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾
ع ۶ ۸ ۲ انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُبِينًا ﴿٥٠﴾

اے اہل کتاب! اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے اور جو اس کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور اس وقت سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہرے مسخ کر ڈالیں اور پھر پیٹھ پیچھے لوٹا دیں، یا ان کو ایسا ہی پھٹکار والا بنا دیں جیسے سبت والوں کو بنا دیا اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔ یہ بات اللہ کبھی نہیں معاف

کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ بڑا گناہ کرتا ہوا خدا پر بہتان اٹھاتا ہے۔[۸۹] کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ پاکیزگی اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور رائی برابر کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔[۹۰] دیکھو یہ اللہ پر کیسے بہتان اٹھاتے ہیں ان کی کھلی گنہ گاری کے لیے یہی بات کافی ہے۔[۹۱]

اہل کتاب کو اسلام کی دعوت

یہودیوں کا مذہبی تصور یہ تھا کہ دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنی چاہیے، رہے دنیوی معاملات اور مسائل تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے متعینہ ہدایتیں دیتا ہے جن کی پوری پوری پابندی کرنی چاہیے باقی زندگی میں وہ آزاد ہے دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات کو انسانوں کی علمی و فکری رہنمائی میں حل کیا جائے۔ یہی ان کی تمام فکری و عملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی۔ اس کے برعکس اسلام کی آواز عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں تک محدود نہیں بلکہ وہ بازاروں کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایتیں دیتا ہے، کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو وہ دین نہ کہتا ہو۔

قرآن نے اس آیت میں اسی اسلام کی دعوت دی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی عبادت کے یہ دو لازمی تقاضے ہیں ایک یہ کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور دوسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ دوسروں سے عابدانہ تعلقات ہی کو قرآن ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ کہتا ہے اسی کو اتخاذِ ارباباً من دون اللہ کہا ہے اسی کو عبادتِ طاغوت کہتا ہے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ جیسے کسی کے ساتھ پرستش کے تعلقات قائم کرنا اس کی عبادت ہے ایسے ہی کسی کو مطاعِ مطلق مان کر اپنے اورمرضی سے اس سے بندگی کے تعلقات قائم کرنا اس کی عبادت ہے۔ یہودی بندگی کی حد تک شرک کا جرمِ عظیم اختیار کیے ہوئے تھے۔ محض پرستش کی حدود میں اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کر کے اپنی پاکیزگی نفس کے مدعی تھے۔ قرآن ان آیات میں ان کے اسی طرزِ عمل کو افتراء علی اللہ کذبا اور اثم مبین کہتا ہے۔

۴۷ اے اہلِ کتاب اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور اس وقت سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہرے مسخ کر ڈالیں اور پیٹھ پیچھے ان کو لوٹا دیں یا ان کو ایسا ہی پھٹکار والا بنا دیں جیسے سبت والوں کو بنا دیا تھا اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔
آیاتِ سابقہ میں یہود کی ضلالت اور مختلف قبائح کا ذکر فرما کر اب ان کو بطورِ خطاب ایمان اور تصدیقِ قرآن کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت سے ڈرایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اہلِ کتاب ایمان لاؤ قرآن پر جس کے احکام مصدق اور مطابق ہیں توریت کے ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ مٹا ڈالیں ہم تمہارے چہروں کے نشانات یعنی آنکھ ناک وغیرہ، مطلب یہ کہ تمہاری صورتیں بدل دی جائیں پھر الٹ دیں تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف یعنی چہرے کو مطموس اور ہموار کر کے پیچھے کی طرف اور گدی کو آگے کی طرف کر دیں یا ہفتہ کے دن والوں کی طرح تم کو مسخ کر کے جانور بنا دیں اصحابِ سبت کا قصہ سورۂ اعراف میں مذکور ہے۔[1]
اس آیت میں اہلِ کتاب خصوصاً یہود کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور دعوت کے دونوں انداز ترغیب اور ترہیب اختیار کیے گئے ہیں۔ ترغیب یہ ہے کہ تمہاری کتاب کی مصدق ہے اور ترہیب میں دو باتوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ایک طمسِ وجوہ دوسرے لعنت،

قرآن کے مصدق ہونے کا مطلب

یہ قرآن اس چیز کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے یعنی قرآن حکیم اس پیشین گوئی کو سچی ثابت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبی کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق آئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن عزیز اور یہ پیغمبر تمہارے لیے سامان رحمت ہیں کیونکہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر اونچا ہوا ہے۔ تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دُنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کر دی لہٰذا تمہیں اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ یہ گویا پوری اسلامی زندگی کو اپنانے کا مختصر ترین اندازِ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی باتیں جن کی تفصیل ہر موقعہ پر پیش نہیں کی جاتی آمنوا کے تحت آجاتی ہیں۔

قرآن پر ایمان لانے کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں۔ ان سب کو بے کم و کاست تسلیم کر لیا جائے۔ اگر کوئی تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا مطالبہ اس سے کیوں کر کیا جا سکتا ہے اس بنا پر اسے ما نزّلنا سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماجئت بہ فرمایا ہے یعنی جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس کو مانو۔

چہروں کا بگاڑ اور ان کا الٹاؤ

ایمان کی دعوت میں ترہیب کے انداز میں پہلے علماء یہود سے جو بات کہی گئی ہے کہ اس وقت سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے الٹا دیں۔ اصل ارشاد یہ ہے نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا اس فقرے کی تشریح میں شارحینِ قرآن مختلف ہیں۔ کچھ کی رائے ہیں اس کا مدلول لغوی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے چہروں کے نقش و نگار اور آنکھ ناک وغیرہ اعضا کو مٹا دیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں ان لوگوں کے چہروں کو گدیوں کی طرح صاف چٹ کر دیں گے جو لوگ یہ مطلب بتاتے ہیں ان میں پھر اختلاف ہے کہ عذاب کب ہوگا۔ کچھ کہتے ہیں دُنیا میں ہوگا اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ ڈراوے سب عذابِ اخروی کے ڈراوے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ دنیا میں ہوگا ان کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ کب ہوگا تو انہوں نے جواب دیا کہ قیامت سے پہلے ہوگا لیکن مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ:

> میرے نزدیک سرے سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو طمس و مسخ کا عذاب ضرور واقع ہوگا بلکہ احتمال ہے یعنی اگر ان کے جرم کو دیکھا جائے تو وہ اس سزا کے مستحق ہیں اور اگر عذاب نہ دیں تو یہ ان کی

رحمت نہیے لے

اور کچھ کی رائے میں مدلول لغوی مراد نہیں بلکہ استعارے کی زبان میں ان کو بتایا گیا ہے کہ اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم تمہارے سرداروں کو ذلیل وخوار کر دیں۔ زمخشری نے کشاف میں، راغب نے مفردات میں وجوہ کے معنے اعیان ورؤسار کے لکھے ہیں ؎۔ اس صورت میں طمس مٹا دینے کے معنے میں نہیں بلکہ ہٹا دینے کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے کہ ہم ان کے ذی وجاہت لوگوں کے حالات کو زیر وزبر کر ڈالیں اور ان سے عزت واقبال چھین کر ذلت وادبار ان پر ڈالیں۔ بیضاوی اور رازی نے بھی یہ معنے لکھے ہیں اور اسی استعارے کی رعایت سے سید رشید رضا نے یہ معنے بتائے ہیں۔

اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ان باتوں کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہیں پہلے اس کے کہ ہم تمہارے ان مقاصد کے چہروں کو ملیامیٹ کریں جو تم اسلام کی بیخ کنی کے لیے اختیار کیے ہوئے ہو اور اسلام کو غلبہ دے کر تمہیں پیچھے ہٹائیں اور تمہارے دین وعلم کا چوراہے میں بھانڈا پھوڑیں۔

دراصل اس آیت کے سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اہل عرب بالکل ناخواندہ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا تھا اور انفرادی طور پر ان میں ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ حافظ ابن حجر نے مدینے کے ان علمار یہود کے نام بھی فتح الباری میں لکھے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ عبداللہ بن سلام، ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن حنیف، فنحاص رفاعہ ابن زید، زبیر بن باطیا، کعب بن اسد، شمویل بن زید، ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا اسلام ثابت ہے۔ ان علمار نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان سے اپنا رعب اور زیادہ گہرا اور وسیع کر رکھا تھا۔ اہل مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے۔ ان حالات میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ لوگ ان لوگوں سے جا کر پوچھتے مگر ان علمار نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے یا انبیا اور کتب آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کا جو مطالعہ آپ بتا رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے

لے معارف قرآن م ش

رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے لیکن وہ کھلے بندوں اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں صحیح ہے وہ نہ سچائی کی کھلے بندوں تردید کر سکتے ہیں نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر شخص کے دل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اہل ایمان کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے۔ کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تاکہ لوگ ان میں خود بھی الجھیں اور حضور انور اور اہل ایمان کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ یہی علماء مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے، ذو معنے الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ کہتے ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایمان لے آؤ اور انکار حق کے شیوہ سے باز آجاؤ۔ اس وقت سے پہلے ایمان لے آؤ جب ایسا ہو کہ ہم لوگوں کے چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے الٹا دیں یعنی انہیں ذلیل و خوار کر دیں یعنی وہ وقت دور نہیں ہے کہ دعوت حق کی فتح مندی ان کی ذلت و خواری کا آخری فیصلہ کر دے گی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ قرآن کا یہ اعلان حرف بحرف پورا ہوا۔

سبت والوں کی طرح کی پھٹکار

دعوت ایمان کے لیے ترہیب کے انداز میں علماء یہود سے دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم تمہارے ساتھ لعنت کا اصحاب سبت جیسا معاملہ کریں۔ سبت والوں سے مقصود یہودیوں کی وہ جماعت ہے جنہیں سبت کے دن احترام کا حکم دیا گیا تھا اور اس دن شکار کھیلنے سے روک دیے گئے تھے لیکن انہوں نے حیلے بہانے نکال کر اس حکم کی نافرمانی کی اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ سورہ بقرہ کے نوٹ ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳ میں اس پر اجمالی تبصرہ گزر چکا ہے اور تفصیل انشاء اللہ پارہ نہم میں آئے گی۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ اب تمہارے لیے آخری موقعہ ہے کہ تم سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر کبھی میسر نہ آئے گا۔ بہتر ہے کہ اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو تمہاری اپنی پیش گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی اتری ہے ورنہ یاد رکھو کہ اب تمہارے لیے وہ وقت آ پہنچا ہے کہ تمہارے اوپر بھی اسی طرح کی لعنت کر دی جائے جس طرح کی لعنت سبت والوں پر کر دی گئی ہے کہ وہ ذلیل بندر ہو کر رہ گئے تھے۔

رحمت کی طرح لعنت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی

گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے کم درجے کی ان پر کی تو یہ ان کو گویا تھوڑی سی مہلت دی گئی اور ہر مہلت جو کسی قوم کو ملتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو یہ ان کے اخروی عذاب میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔

شرک فی الطاعۃ ناقابل عفو جرم ہے

۴۸۔ یہ بات اللہ کبھی معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کو چاہے گا اللہ معاف کر دے گا اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ بڑا گناہ کرتا ہوا خدا پر بہتان اٹھاتا ہے۔ یعنی مشرک کبھی نہیں بخشا جاتا بلکہ اس کی سزا دائمی ہے۔ البتہ شرک سے نیچے جو گناہ ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ وہ سب قابل مغفرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کی مغفرت چاہیں اس کے صغیرہ و کبیرہ بخش دیتے ہیں، کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب دیے، اشارہ اس طرف ہے کہ یہود چونکہ کفر و شرک میں مبتلا ہیں وہ مغفرت کی توقع نہ رکھیں[1]

شرک کے معنے حسا جھے پن کے ہیں اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساتھی یا ساجھی ٹھہرایا جائے، گویا شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے۔

دوسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے۔

تیسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفتوں کے لوازم اور تقاضوں سے ہوتا ہے۔

پہلی قسم کے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے، اسے اس کا باپ یا اولاد سمجھ لیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر ایک قالب ہو گیا ہے۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی صورت اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے یعنی کوئی اس کا اوتار ہو سکتی ہے۔

دوسری قسم کے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے متصف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور کے اندر بھی موجود مان لی جائے اور اسی معنے و مفہوم میں مان لی جائے جس معنے و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہے مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو خود بخود جانتا ہے اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اسی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

طرح نفع و نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت اور راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کرتا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے ثابت اور موجود مان لیا جائے مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی طاعت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسے ہی محبت اور عقیدت رکھے یا اسی طرح کی طاعت کا اسے مستحق قرار دے لے تو یہ صفاتِ الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا ہے۔ اسی طرح ان صفات کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے، قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔

شاہ عبدالقادر نے پہلی دو قسموں کو آیت ولا تنکحوا المشرکات کے تحت ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے۔ مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر۔

اور تیسری قسم کا تعارف آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون کے تحت اس طرح کرایا ہے۔

> شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

اور آپ چاہیں تو پہلی دو قسموں کو شرک فی الالوہیت اور تیسری قسم کو شرک فی الربوبیت کہہ سکتے ہیں اور آپ چاہیں تو پہلی دو قسموں کو شرک فی العبادۃ اور تیسری قسم کو شرک فی الطاعۃ بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز نے اسے شرک فی الطاعۃ ہی فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

> شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ بھی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کی ایسی طاعت کی جائے کہ اگر اس کا حکم خدا کے حکم کے خلاف بھی ہو، جب بھی اسی کی اطاعت کی جائے۔

قرآن نے یہود و نصاریٰ کو اسی کا مجرم گردانا ہے۔ اسی کو قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے رفع نزاع کے لیے عبادتِ خداوندی کے ساتھ بطورِ مطالبہ پیش کیا ہے ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً

من دون اللہ یہود و نصاریٰ کی تمام فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی شرک تھا۔ یعنی شرک فی الطاعۃ یعنی انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو ارباب بنا لیا تھا۔ ارباب بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو رب السماوات والارض مانتے تھے کیونکہ اس طرح تو کبھی کسی نے کسی کو رب نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے احبار کو اور عیسائیوں نے اپنے رہبان کو زندگی کے متعلق قانون سازی کے بارے میں حلال و حرام کا حق دے رکھا تھا۔ قرآن نے ان پر کھلے بندوں یہ الزام عائد کیا ہے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ یعنی ان کو ایسا صاحب اختیار مان رکھا ہے کہ جو چاہیں وہ جائز کریں جو چاہیں وہ حرام قرار دیں۔ سارے اختیارات شریعت اور قانون سازی کے ان کو ہی حاصل تھے۔ امام رازی نے لکھا ہے،

مفسرین قرآن کی اکثریت کی رائے میں ارباب بنانے سے مراد ان کو معبود بنا لینا نہیں بلکہ اوامر و نواہی میں ان کی طاعت کرنا ہے۔

خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا یہی مطلب بتایا ہے۔ عدی بن حاتم طائی جو پہلے عیسائی تھے کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب براۃ کی یہ آیت اتخذوا احبارھم ورھبانھم پڑھی تو میں نے عرض کیا کہ ہم انہیں پوجتے تو نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہراتے ہیں تم حرام سمجھ لیتے ہو، جس بات کو حلال کر دیتے ہیں تم حلال مان لیتے ہو عرض کیا ہاں، فرمایا یہی ان کو رب بنا لینا ہے۔ (ترمذی)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے پیشواؤں، سربراہوں کو اس بات کا حق دے دینا کہ جو کچھ اپنی خواہش اور رائے سے حلال و حرام ٹھہرا دیں اس کو بلا چون و چرا مان لینا اور ان کی طاعت کرنا قرآن کے نزدیک ان کو رب بنا لینا ہے کیونکہ اس بات کا حق اللہ کے سوا بالذات کسی کو نہیں ہے۔ اس مضمون سے حضرت شاہ عبدالعزیز نے یہ استنباط فرمایا ہے کہ قرآنی نظر میں اس درجہ کی اطاعت بھی شرک ہے اور شاہ عبدالقادر نے بھی یہی بات سمجھی ہے۔

قرآن کی اس آیت میں اسی شرک کا ذکر ہے جس کا یہود ارتکاب کر رہے ہیں ورنہ دنیا جانتی ہے اور قرآن گواہ ہے کہ یہودیوں نے شرک کی پہلی دو قسموں کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہودیوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جس نے اپنے ربی کو خدا سمجھا ہو لیکن ان کے عمل کا یہی حال رہا۔ گویا حق و باطل، حلال و حرام، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کی ساری تقسیم کا اختیار انہی کے قبضے میں ہے۔ جو حلال کر دیں حلال ہے جو حرام کر دیں حرام ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ شرک تو اللہ کی حکومت سے صریح بغاوت ہے۔ اسے چھوڑ کر باقی ہر معصیت مغفرت کی گنجائش رکھتی ہے اور جس کسی کے حق میں مشیت الٰہی ہو گی اسے معافی مل جائے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتیٰ کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جاسکتا۔

یہودیوں کے ذکر میں اس آیت کے لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ تمہیں نبیوں کی اولاد ہونا، نبیوں سے نسبت اور نسب کا تعلق دھوکے میں نہ ڈال دے۔ تم نے مشرکانہ زندگی سے دین کی بنیاد ہی منہدم کردی ہے۔ اس جرم کو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔

یہود کا پاکیزگی نفس کا دعویٰ

۹۰۔ کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے پاکیزگی عطا کرتا ہے اور اللہ رائی برابر کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ یعنی یہود باوجود اس قدر خراب ہوں کے پھر بھی اپنے آپ کو پاک صاف اور مقدس کہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے آپ کو ابناء اللہ اور احباء اللہ بتلاتے ہیں جو بالکل لغویات ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اس کو پاکیزہ اور مقدس کرتا ہے۔ یہود کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا اور ان جھوٹی شیخی کرنے والوں پر ادنیٰ سا ظلم بھی نہ ہوگا یعنی یہ لوگ اپنے عذاب بے نہایت میں گرفتار ہوں گے ان پر ناحق عذاب ہرگز نہ ہوگا[1]

تزکیہ کے لفظی معنے پاک وصاف کرنا میل کچیل دُور کرنا ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو اس معنے میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دُور کرکے اس میں صیقل اور جلا پیدا کیا جائے۔ قرآن میں ہے قد افلح من زکٰھا بلاشبہ جس نے نفس کو صاف ستھرا بنالیا وہ کامیاب ہوگیا۔

یہودی اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد ہیں اور خود خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس لیے ان کے لیے خدا کے یہاں کوئی بازپرس اور سزا نہ ہو گی۔ ان کے اعمال واخلاق خواہ کچھ ہوں۔ تزکیہ نفس کے اس غرور نے ان کو عمل اور طاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کردیا تھا اور انہوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال لیا تھا حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو برگزیدگی کی یہ سند عطا نہیں کی تھی۔

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ استنباط بڑا لطیف ہے کہ جیسے کسی کے لیے اپنی پاکی کا دعویٰ کرنا، اپنی ستائش کرنا یا اپنی بے گناہی کا اعلان کرنا ہرگز روا نہیں ہے ٹھیک اسی طرح کسی کے پاک و بے گناہ ہونے کا حتمی فیصلہ کرنا بھی درست نہیں ہے ہاں بطور حسن ظن کے کسی کے بارے میں آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کیونکہ بلا علم کسی فیصلہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ فی الواقع اللہ کے یہاں کس کا کیا مقام ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا ہے بل اللہ یزکی من یشاء یعنی بزرگی تو اللہ کا عطیہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بزرگی دیتا ہے اور اللہ نے بزرگی کا مدار ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ کو بنایا ہے نہ کہ نسبت اور نسب کو۔

اس آیت میں تزکیہ کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے اور کبھی تزکیہ کی نسبت نبوت کی طرف ہوتی ہے یتلوا علیکم آیتنا و یزکیکم اور کبھی بندے کی طرف ہوتی ہے جیسے قد افلح من زکٰھا اللہ کی طرف اس لیے کہ حقیقت میں وہی اس کا فاعل ہے اور نبی کی طرف اس لیے کہ وہ لوگوں تک تزکیہ کے پہنچنے میں واسطہ ہوتا ہے اور تزکیہ کی نسبت بندے کی طرف اس لیے کہ وہ اکتساب کرتا ہے۔

اللہ پر بہتان طرازی

۹۱۔ دیکھو یہ اللہ پر کیسے بہتان اٹھاتے ہیں، ان کی کھلی گنہ گاری کے لیے یہی بات کافی ہے۔ یعنی کیسے تعجب کی بات ہے کہ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور باوجود ارتکاب کفر اور شرک کے اپنے آپ کو اللہ کا دوست کہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کے مدعی ہیں اور ایسی سخت تہمت صریح گنہ گار ہونے کے لیے بالکل کافی ہے[1]

شرک بھی اللہ پر تہمت ہے اور تزکیہ نفس بھی اللہ پر افترا ہے ظاہر ہے کہ اگر شرک کرنے والے اپنے تمام مشرکانہ اعمال کو دین کی سند دینے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان باتوں کا حکم ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تو یہ اللہ پر صریح تہمت ہے۔ اور ایسے ہی اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کا مقبول، پارسا، زاہد یا خدا کا ولی ہوں اور اللہ نے یہ اعلان نہیں کیا ہے تو وہ بھی اللہ پر جھوٹ کا بہتان اٹھا رہا ہے اور ان کا یہ افترا صاف طور پر باطل ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ
وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿٥١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ
وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ
مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ
النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ
إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾
فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ
بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ اہل ایمان سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔[92]

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو جاتی ہے تو تم کو اس کا کوئی مددگار نہ ملے گا۔[۹۳] کیا یہ بات ہے کہ ان کا حکومت میں کوئی حصہ ہے بس اس لیے وہ لوگوں کو رائی برابر بھی کچھ دینے کے روا دار نہیں ہیں۔[۹۴] یا پھر اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ لوگوں کو دے رکھا ہے اس پر چڑ رہے ہیں اگر یہی بات ہے تو ہم نے ہی تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی تھی اور ہم نے ان کو عظیم حکومت دی تھی۔[۹۵] پھر ان میں سے کچھ نے مانا اور کچھ ہٹ گئے اور ہٹ جانے والوں کے لیے دوزخ کی دہکتی آگ کافی ہے۔[۹۶]

فکری، عملی اور اخلاقی گراوٹ

دین کے متعلق جب تصور ہو کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ذریعہ ہے معاملات تمدن سے اس کا اگر تعلق ہے تو بس اتنا کہ انسان اپنی ذات کے لیے کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے اپنا کوئی نقصان ہو اور جہاں تک ممکن ہو فرقہ وارانہ برائی سے بچے۔ دین سے ان کو جو کچھ محبت تھی وہ صرف اپنے دھڑے کے بچانے تک محدود تھی۔ اس کے نتیجہ میں ان میں اتباعِ حق کی جگہ جتھا بندی اور گروہ پرستی کی روح پیدا ہو کر حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ گروہی تعصب چاہتا ہے کہ جس طرح بھی بنے اپنی بات بنالی جائے اور مخالف گروہ کو زک پہنچا دی جائے۔ اگر ایسا کرنے میں اسے خود اپنے اصولوں اور عقیدوں

کے خلاف بھی جانا پڑے تو بلا تامل چلا جاتے۔ یہی حال مدینے کے یہودیوں کا تھا وہ ہمیشہ بت پرستی کے مخالف رہے اور بت پرستوں کی تحقیر و تذلیل کرتے رہے لیکن اب اہلِ ایمان کی ضد میں آکر بت پرستوں کی تعریف کرتے اور کہتے کہ ان مسلمانوں سے تو مشرکوں ہی کا طور طریقہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

پہلی آیت میں ان کی یہ گمراہی بتائی تھی کہ ان میں مذہبی گروہ بندی کا گھمنڈ پیدا ہو کر وہ ایمان و عمل کی روح سے محروم ہو گئے تھے لیکن پھر بھی اپنے اہلِ کتاب اور بنی اسرائیل ہونے پر نازاں ہیں۔ اور ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ افکار کی حد تک وہ اوہام کی مخلوق بن کر رہ گئے تھے اور اعمال کی حد تک وہ طاغوت سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے نتیجہ میں ان میں حق اور باطل میں امتیاز نہیں رہا تھا اور ایک بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آگئے تھے جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا بلکہ صرف مصالح اور منافع ہی اغراض و مقاصد ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوئی تھی جب ان میں جبت اور طاغوت کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

۹۲۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ اہلِ ایمان سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ اس آیت میں بھی یہود کی شرارت اور خباثت کا اظہار ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہودیوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت بڑھی تو مشرکینِ مکہ سے ملے اور ان سے متفق ہو گئے اور ان کی خاطر داری کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اور کہا کہ تمہارا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے اور اس کی وجہ صرف حسد تھا۔ اس پر کہ نبوت اور دین کی ریاست ہمارے سوا دوسروں کو کیوں مل گئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ ان کو الزام دیتا ہے۔ ان آیات میں اسی کا مذکور ہے۔[1]

اس سے پہلی آیات میں یہود کی قومی زندگی میں یہ برائیاں بتانے کے لیے کہ ان میں دین سے راہِ حق سے کیسے انحراف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہدایت کے بدلے ضلالت کے خریدار، اور دوسروں کو راہِ حق سے ہٹانے کے خواہاں، اور جنابِ نبوت میں گستاخ و بے ادب ہونے کے ساتھ مشرکانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس گمراہی کا نتیجہ یہ تھا کہ ہدایت کا سر رشتہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے اسوہ کی جگہ انسانوں کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ وہ لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتے تھے اپنی نفسانی اغراض کے لیے استعمال کرتے تھے اور انسان کی زندگی میں عقلی ترقی اور روشنی کی تمام راہیں بند ہو گئی تھیں۔ ان برائیوں کی طرف توجہ دلانے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور ان کی زندگی سے عبرت دلانے کے لیے انداز بیان یہ اختیار کیا تھا الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یعنی ان کے اس انحراف کا اصلی باعث یہ تھا کہ یہود نے اپنی زندگی میں ساری کتاب کو دستور حیات کے طور پر نہیں اپنایا تھا بلکہ زندگی کے مختلف احوال میں کتاب الٰہی کے بیشتر احکام کو چھوڑ دیا تھا۔ بس ان کا یہ طرز عمل ہی ان برائیوں کا باعث بنا۔ اور چونکہ آئندہ بیان ہونے والی برائیوں کے ہونے کا بھی اصلی باعث یہی ہے اس لیے الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب کو پھر دہرایا ہے۔ یعنی ان برائیوں کا سبب بھی یہی ہے۔ اگرچہ کچھ بزرگوں نے اس کے یہ معنے بھی بتائے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو تورات کے الفاظ پڑھنے کو ملے اور عمل سے محروم رہے۔ اور یہ بھی مطلب اس فقرے کے منہ میں ڈالا گیا ہے کہ اوتوا نصیبا من الکتاب کے معنے یہ ہیں کہ ان کو ساری کتاب فی الواقع یاد نہ تھی۔ یعنی ان کے پاس پوری کتاب جو حضرت موسیٰ لے کر آئے تھے محفوظ ہی نہ تھی۔ یہ اپنی جگہ تاریخی طور پر ثابت شدہ ایک علمی حقیقت ہے جس کا اقرار خود ان امتوں اور فرقوں نے کیا ہے جن کے پاس یہ صحیفے آئے تھے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ انشاءاللہ چھٹے پارے میں آئے گا۔

اس آیت میں جن برائیوں کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے یہ ہیں کہ :

الف : وہ جبت کو مانتے ہیں

ب : وہ طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں ۔

ج : وہ اہل ایمان کے مقابلے میں اہل کفر کو سیدھے راستہ پر بتاتے ہیں۔ ان میں پہلی برائی کے لیے قرآن میں یؤمنون بالجبت کی تعبیر آئی ہے ۔

یہود کا جبت پر ایمان

امام راغب فرماتے ہیں کہ جبت اور جبس دونوں ایک ہیں، ایسی ردی چیز جو کسی کام کی نہ ہو، نیز ہر وہ چیز جس کی خدا کے سوا پوجا کی جائے جبت کہلاتی ہے اور جادو اور کاہن کو بھی جبت کہتے ہیں :

اصل میں جبت کے معنے میں اختلاف ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے معنے جادو کے بتاتے ہیں۔ عکرمہ کا خیال ہے کہ جبت حبشی زبان میں شیطان کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ طبری نے مجاہد سے جادو کے اور سعید بن جبیر اور ابوالعالیہ سے جادوگر اور قتادہ سے شیطان کے معنے نقل کیے ہیں۔ بغوی نے معالم میں، ابن سیرین اور مکحول دمشقی کا قول نقل کیا ہے کہ جبت کاہن کو کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ ہر وہ معبود جس کی اللہ کے سوا عبادت

کی جائے جبت ہے۔ امام ابن جریر کا فیصلہ اس سلسلے میں نہایت صاف ہے کہ :

جبت اور طاغوت سے مراد وہ جنس مراد ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کی جائے خواہ وہ بُت ہو یا شیطان، آدمی ہو یا جن بس اس میں جادوگر اور کاہن بھی آجاتے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں حضرت قبیصہ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آیا ہے کہ :

پرندوں کو اڑا کر شگون لینا یعنی عیافہ یا رمل کا عمل کرنا یعنی طوق اور بد فالی لینا یعنی طیرہ یہ سب جبت سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہرحال اسلام کی زبان میں جادو، کہانت، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور دوسرے تمام اعمال سفلیہ کو جبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہود اپنے دورِ زوال میں کتابِ الٰہی کو پس پشت ڈال کر بس انہی چیزوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے انبیاء نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان کی اس حالت پر ماتم کیا ہے۔ امتوں پر جب اخلاقی و مادی انحطاط آتا ہے اور غلامی جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی نہیں رہنے دیتے تو ان کی توجہات جادو ٹونے اور طلسمات نیرنجات عملیات اور قسم قسم کے وہمی اور خیالی باتوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور بجائے اللہ کی کتاب اور اس کے رسُول کے اُسوہ حسنہ کے فکر و نظر اور ان کے مطالعہ و جستجو کا مرکز یہ چیزیں بن جاتی ہیں۔ وہ ایسی تدبیریں تلاش کرتے ہیں جن سے کسی مشقت کے بغیر محض ٹونوں، ٹوٹکوں، پھونکوں اور منتروں کے زور سے سارے کام بن جائیں۔ قرآن نے یہاں معاشرہ کی اس فکری و عملی گراوٹ کو ایمان بالجبت سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں خاص طور پر اس بات کے جتانے کی وجہ یہ ہے کہ حامل کتاب اللہ ہونے، نبوت اور توحید کے ماننے کے باوجود یہ اس سوسائٹی کا بالکل چربہ بن گئے تھے جو مشرک بن کر توحید و نبوت سے بیگانہ ہو کر توہمات کا شکار تھی۔

نبوت سے بیگانہ سوسائٹی اور توہمات

مشرکین عرب میں قسم قسم کے توہمات پھیلے ہوئے تھے۔ مثلاً جن اور شیاطین، بھوت پلیت کے بارے میں ان کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن و شیطان اور بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلاف صورت اور اشکال کی وجہ سے ان کے نام الگ الگ تھے۔ جو جن میدانوں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں اور لباس بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر

بھی ہوتے تھے، اور مونث بھی، مونث کو سلاۃ کہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بیماری اڑ کر لگتی ہے جیسا کہ اکثر ہنود کا عقیدہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس مقتول کا قصاص نہیں لیا جاتا ہے۔ اس کی روح اُلّو کی صورت میں پکارتی پھرتی ہے کہ میرا قصاص لیا جائے میں پیاسی ہوں، اسے ہامہ کہتے تھے۔ ایک خیالی جانور کے معتقد تھے جس کے کاٹنے سے بھوک لگتی ہے اسے صفر کہتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ذہنیت کی اصلاح کے لیے فرمایا:

بیماری کا لگ جانا، الو، نچھتر، صفر یہ سب وہم پرستی کی باتیں ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

ایک اور ارشاد ہے:

مرض کا لگ جانا، صفر اور غول بیابانی سب خیالات ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ (مسلم عن جابر)

کہانت ایک سخت بلا تھی جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے۔ جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئی کرتے۔ اسلام نے اہل ایمان کو اس سے بھی روکا۔ ارشاد ہے:

جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے گا اور جو حیض کے زمانے میں بیوی کے پاس جائے اور جو بیوی سے اغلام کرے گا تو وہ اس دستور حیات سے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا علیحدہ ہو گیا۔ (احمد، ابوداؤد)

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مار جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ دائیں جانب سے اڑے تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

امام ابن قتیبہ عکرمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ابن عباس کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، اس طرف سے کہیں ایک پرندہ چیختا ہوا نکلا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ چلو خیر ہے۔ عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ نہ خیر ہے نہ شر، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو صرف یہ ثابت ہے کہ اچھا نام اور نیک فال پسند کرتے تھے۔

عروہ ابن عامر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بدفالی کا ذکر آ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اس حد تک درست ہے کہ کسی کا نام اچھا سننا اور اس سے خوش ہو جانا، لیکن فال کسی مسلمان کو کام سے

روکتی نہیں ہے لہٰذا تم میں سے اگر کوئی ایسی بات دیکھے جس کی وجہ سے اس کے دل میں بدفالی پیدا ہو تو اسے چاہیے کہ یوں کہہ دیا کرے اللھم لا یاتی بالحسنات الا انت ولا یدفع السیئات الا انت ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ (ابوداؤد)

اس دعا میں جو بات بتائی گئی ہے کہ اللہ ہی بھلائی پہنچاتا ہے اور اللہ ہی بلاؤں کو ٹالتا ہے اور بھلائی کو حاصل کرنے اور برائی سے بچنے کی طاقت بھی اللہ ہی دیتا ہے۔ اسلامی توحید کا وہ بلند تصور ہے کہ جس کے دل میں یہ تصور قائم ہو گیا پھر اس کے دل میں غیر اللہ کا کوئی خوف باقی نہیں رہتا اور اس کا قبلہ توجہ اللہ کی ذات رہ جاتی ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نشرہ کے متعلق دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ایک شیطانی کام ہے۔

ابن الاثیر نہایہ میں رقمطراز ہیں کہ جس شخص کو یہ وہم ہو جاتا کہ اس پر جن کا اثر ہو گیا ہے تو وہ اس منتر سے اپنا علاج کرا لیتا۔ عرب کا گمان تھا کہ اس منتر کی جنات کے اثرات کے ازالہ میں بالذات تاثیر ہے۔

ابوداؤد میں ہے:

عیسٰی ابن حمزہ فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن حکیم کے پاس گیا انہیں سرخ بادہ کی تکلیف تھی میں نے کہا کہ اس کے لیے آپ گلے میں منکے کیوں نہیں ڈال لیتے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ان باتوں سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو اپنے گلے میں اس قسم کی چیز لٹکائے اس کی جان کی حفاظت خود اسی کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

ابن الاثیر رقمطراز ہیں کہ عرب چند منکے لے کر بچوں کے گلوں میں نظر گزر کے خیال سے ڈال دیتے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اس عمل سے نظر نہیں لگتی ہے۔ اسلام چونکہ اوہام پرستی کی جڑ اکھاڑنے آیا تھا اس لیے اس نے اس وہم کی بھی تردید کر دی اور بتا دیا کہ ایک مخلوق کو دوسری مخلوق میں بالذات کوئی تاثیر نہیں ہے۔ تمام کائنات میں حقیقی موثر صرف اللہ سبحانہ کا ارادہ ہے۔ چند منکے گلے میں ڈال کر یہ عقیدہ قائم کر لینا کہ یہ خوبصورت پتھر کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے صرف ایک جاہلانہ وہم پرستی ہے۔ یہ سب اسی ایمان بالجبت کے مظاہر اور قوالب ہیں جس کا قرآن یہاں یہودیوں کو طعنہ دے رہا ہے کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ ایسے واہیات اور خرافات کو مانتے ہیں۔

یہودیوں کا طاغوت پر ایمان

دوسری برائی جس پر یہاں یہودیوں کو ملامت کی گئی یہ ہے کہ وہ طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ تیسری جلد میں ہم طاغوت کے معنے طاغوت کے کفر طاغوت کی ولایت اور طاغوتی تہذیب پر سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہاں اعادے میں طوالت ہو گی۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ حضرت عمرؓ نے طاغوت کے معنے شیطان کے اور عکرمہ نے کاہن کے بتائے ہیں۔ اور امام مجاہد کہتے ہیں کہ طاغوت انسان کی صورت میں شیطان ہے اس سے حضرت عمرؓ کے ارشاد کی توضیح ہو گئی۔ اور جابر بن عبداللہؓ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ طاغوت ایک نہیں متعدد تھے اور مختلف قبیلوں کے اعتبار سے ان کی تقسیم تھی۔ قبیلہ جہینہ کا ایک طاغوت اسلم کا ایک غرضیکہ ہر قبیلہ کا ایک طاغوت ہوتا تھا جس سے وہ فیصلے کراتے تھے۔ بعض روایات میں اس دور کے طواغیت کے نام بھی بتائے گئے ہیں مثلاً علی ابن طلحہ نے عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے بتایا ہے کہ کعب بن اشرف طاغوت تھا یہ مدینہ منورہ کا ابتدائی اسلامی دور میں بہت بڑا فتنہ تھا جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ اور کثیر الافراد قبیلے سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے سے تھا۔ دولت مند تھا۔ زندگی کے سارے اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بداخلاق، خود پسند، متکبر اور اسلام کا دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے اور معاشرتی اور مالیاتی مسائل میں ان کے فیصلے کرتا تھا۔

اس روشنی میں ایمان بالطاغوت کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ لوگ اس کو مانتے ہیں اور یہی ان کا حاکم ہے یعنی جو شخص بندگی کی حدود سے نکل کر خود آقائی کا مدعی ہے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کراتا ہے۔ یہ حاملین کتاب ہو کر اسے مانتے ہیں اور یہ آپ البقرہ آیت نمبر ۲۵۶ میں پڑھ چکے ہیں کہ کوئی شخص صحیح معنوں میں مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔

یہودیوں پر ایک اور فرد جرم

ایمان بالجبت اور ایمان بالطاغوت کے ساتھ یہودیوں پر قرآن نے تیسری فرد جرم یہ لگائی ہے کہ ان کا اہل کفر کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ یہ اہل ایمان سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ یہ گراوٹ اور پستی اخلاق کی انتہا ہے۔ یہ انقلاب انگیز تبدیلی جو یہودیوں کی ذہنیت و نفسیات میں ہوئی تھی۔ یعنی ایمان بالجبت اور ایمان بالطاغوت کے ساتھ اور نتیجہ کے طور پر یا مستقلاً جیسا کہ دیقولون کے انداز کا

تقاضا ہے ان میں اُصول اور صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلے عاجل کو اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا تھا۔ ان کا ایک ہی عملی مذہب تھا اور وہ مادہ پرستی اور مفاد کیشی کا مذہب تھا۔ دنیوی فوائد اور مادی ترقی منتہائے نظر بن کر رہ گئی۔ اصول و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت اتنی گھٹ گئی کہ ایمان کے مقابلے میں کفر صریح کو ترجیح دینے لگے۔ اور جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے ان کو وہ مشرکین عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو مشرکین ہی زیادہ ہدایت یافتہ ہیں حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے اور دوسری طرف کھلی بُت پرستی ہے جس کی بُرائی سے تورات اٹی پڑی ہے۔ بہر حال اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے انہیں انتہائی پستی میں گرا دیا تھا یہاں تک کہ اہلِ کتاب ہونے کے باوجود مشرکین کے مسلک کو پیروانِ اسلام کے طور طریقے سے بہتر اور قابلِ ترجیح بتاتے تھے۔ گویا ان کا تصورِ حق و صداقت ہی تبدیل ہو گیا تھا اور اہلِ کتاب ہونے کا دعویٰ بھی محض برائے نام رہ گیا تھا جس کی حقیقی حیثیت کوئی نہ تھی۔

اس سے یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ توہمات سے فکری اور طاغوت عملی وابستگی ایسی سنگین بُرائی ہے کہ دعویٰ ایمان اور نبی کی اُمت ہونے کے باوجود آدمی دین و ایمان کو وقتی مفادات پر قربان کر دیتا ہے اور مادی و سیاسی اغراض و مقاصد کی بجا آوری کے لیے دین و ایمان تک کھو بیٹھتا ہے۔ لادینی عقائد و نظریات کو حق کا لباس پہنانے کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اگر ہم بھی اس روشنی میں اپنی ایمانی اور اسلامی زندگی کا جائزہ لیں تو لے سکتے ہیں۔ اس آئینے میں ہم اپنا چہرہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

دنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت

۹۲۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو جاتی ہے تو تم کو اس کا کوئی مددگار نہ ملے گا۔ یعنی یہ لوگ جنہوں نے اہلِ کتاب ہو کر اغراض نفسانی کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اور طریقہ کفر کو طریقہ اسلام سے افضل بتایا ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے اس کا دُنیا و آخرت میں کوئی مددگار اور حامی نہیں ہو سکتا سو اب انہوں نے اپنی

اعانت کی طمع میں جو مشرکین مکہ سے موافقت کی بالکل لغو ہے چنانچہ دُنیا میں یہود نے ازحد ذلتیں اٹھائی ہیں اور آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جن کا چہرہ پہلے پیش کیا گیا ہے اللہ نے ان کو اپنے قانون کے مطابق اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔ رحمتِ الٰہی تو ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو ایمان باللہ رکھتے ہیں اور جبت وطاغوت سے پرہیز کرتے رہتے ہیں اور جو اپنے افکار کی عمارت اوہام پر اٹھاتے ہیں اور اپنے عابدانہ اعمال میں طاغوت کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا استقبال اللہ کی رحمت نہیں بلکہ لعنت کرتی ہے۔

غور طلب یہ بات ہے کہ یہاں اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں یہود کے کس کردار کی بنا پر ان کو مستحق لعنت قرار دیا گیا ہے اور لعنت بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی، آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے الم نشرح ہو کر آجائے گی کہ اجتماعی لعنت ان پر اس لیے آئی ہے کہ:

اولاً، انہوں نے اپنی زندگی کا رشتہ اللہ کی کتاب سے منقطع کر لیا تھا۔

ثانیاً، انہوں نے دین کو روحانی رشتہ کی بجگہ کاروباری نظام کی حیثیت دے دی تھی۔

ثالثاً، وہ حق کی عداوت میں جھوٹ اور بے لگام ہو کر رہنمائے ضلالت ہو کر رہ گئے تھے۔

رابعاً، وہ نبوت کے گستاخ اور بے ادب ہو گئے تھے۔

خامساً، انہوں نے مشرکانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ اس طرح کے مشرک نہ تھے جس طرح عام مشرکین ہوتے ہیں۔ قرآن کی کسی آیت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ وہ شرک جس میں وہ مبتلا تھے یہ تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں خدا کو مانتے ہوئے، نبوت موسیٰ کا اقرار کرتے ہوئے ہدایت کا سر رشتہ کتابِ الٰہی کی بجگہ انسانوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ وہ لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتے تھے اپنی نفسانی غرضوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ قرآن نے اس گمراہی کو شرک قرار دیا ہے۔ وہ یہودیوں سے کہتا ہے کہ سارے گناہ بخشے جاسکتے ہیں مگر شرک کے لیے کوئی بخشش نہیں ہے۔

سادساً، ان کو اپنے پارسا ہونے، نجات یافتہ ہونے کا گھمنڈ تھا۔ ایمان و عمل سے دُوری کے باوجود وہ بنی اسرائیل ہونے پر نازاں تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور آخرت کی نجات ہمارے لیے لکھ دی گئی ہے۔ علم و عمل سے محرومی کے باوجود اس غرور باطل میں مبتلا تھے۔

سابعاً، انہوں نے اوہام کا نام عقائد رکھ چھوڑا تھا اور اعمال و اخلاق کی حدود میں وہ عصیان و

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عدوان کے بیمار تھے اور طاغوت کے ہاتھ میں ان کی قیادت تھی اور اسی کو وہ مانتے تھے۔

ثامناً، ان کے قلوب میں حق کا نہیں بلکہ باطل کا مقام تھا اور اہل ایمان کے مقابلے میں اہل کفر کو ترجیح دیتے تھے۔

ان اسباب کی بناپر وہ اجتماعی طور پر خدا کی بارگاہ میں ملعون قرار پائے۔ آخر میں فرمایا کہ جس پر اللہ کی لعنت ہو جائے خدا کے ہاں سے اس کی خیر کٹ جاتی ہے یعنی اللہ ان کی ہرگز مدد نہیں کرتا ہے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ ملعون ہونے کے اسباب جہاں موجود ہوتے ہیں اللہ کی امداد و نصرت کے دروازے وہاں بند ہو جاتے ہیں۔ یہود کی لعنت کی پوری تاریخی داستان انشاء اللہ جلد ششم میں آئے گی۔

یہودیوں کا اعتراف حق میں بخل

۹۴۔ کیا یہ بات ہے کہ ان کا حکومت میں کچھ حصہ ہے پس اس لیے وہ لوگوں کو رائی برابر بھی کچھ دینے کے روادار نہیں ہیں۔ یہود اپنے خیال میں جانتے تھے کہ پیغمبری اور دین کی سرداری ہماری میراث ہے اور ہمیں کو لائق ہے اس لیے عرب کے پیغمبر کی متابعت سے عار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آخرکار حکومت اور بادشاہت ہمیں کو پہنچ کر رہے گی۔ برائے چندے اوروں کو بھی مل جائے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ کیا یہود کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں، یعنی ہرگز نہیں، اگر یہ حاکم ہو جائیں تو لوگوں کو تل کے برابر بھی نہ دیں یعنی ایسے بخیل ہیں کہ بادشاہت میں فقیر کو تل برابر بھی نہ دیں[1]

آیت میں استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے جیسا کہ ان کے پاس کتاب کا ایک حصہ موجود نہیں ہے ایسا ہی اقتدار میں بالفعل ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ظلم و طغیان کی پاداش میں ان سے یہ چھین لیا گیا ہے۔ یہ تو حال کا نقشہ ہے اور مستقبل کی تصویر یہ ہے کہ اگر ان کو اقتدار مل جائے تو وہ اس میں سے کسی کو بادشاہ ہو کر بھی رائی برابر دینے کو تیار نہ ہوں گے۔ نقیر کے لفظی معنے اس باریک سے نشان کے ہیں جو کھجور کی گھٹلی کے کنارے پر ہوتا ہے جیسے فتیل اس باریک دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گھٹلی میں ہوتا ہے محاورے میں دونوں سے مراد حقیر سے حقیر تر چیز ہوتی ہے جیسے اردو میں رائی بھر، رتی بھر وغیرہ بولتے ہیں۔ تل برابر شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ہے۔ فاذاً لا یوتوا الناس نقیرا۔ یہ شرط محذوف

[1] افادات شیخ الاسلام

کی جزا ہے۔ زمخشری نے شرطیہ بتائی ہے لو کان لھم نصیب یعنی اگر بالفرض ان کو حکومت مل جاتی لیکن یہ شرط صحیح نہیں ہے کیونکہ لو کے جواب میں فا نہیں آتی ہے اس لیے صحیح یہ ہے ان کان لھم نصیب یعنی بالفعل تو نہیں اگر مستقبل میں ان کو کبھی اقتدار میں سے حصہ مل جائے گا تو یہ اس قدر بخیل ہیں کہ کسی کو رائی برابر بھی کچھ نہ دیں گے۔

آیت کی یہ تشریح بھی کی گئی ہے۔

کیا خدا کے اقتدار میں ان کی بھی کچھ حصہ داری ہے کہ اس کے فضل و انعام میں سے یہ جس کو چاہیں حصہ دیں جس کو چاہیں محروم کر دیں۔ چنانچہ اپنے اسی اختیار کی بنا پر مسلمانوں کو خدا کے فضل و کرم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے تو پھر تمام اس بوالفضولی سے کیا حاصل؟ تقدیرِ الٰہی سے پنجہ آزمائی کر کے کون جیتا ہے[1]

کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصہ ان کے قبضہ میں ہے کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی کیونکہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انہیں اس میں سے کچھ حصہ نہیں دینا چاہتے۔ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال ہے اور اس میں بھی یہ بخل سے کام لے رہے ہیں[2]

مطلب خواہ کوئی ہو، خلاصہ یہ ہے کہ یہود سرمایہ دار ہو کر انتہائی بخیل ہیں ان سے کسی شخص کو فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کو اقتدار بھی مل جائے تو کسی انسان کو کوئی حقیر سے حقیر تر فائدہ پہنچانا بھی ان کو شاق ہوگا۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو ان کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی ہو کر پیغمبر ہوں اور آپ کے صحابہ کو اقتدار ملے۔

یہود کو حکومت ملنے کے جس امکان پر یہاں اشارہ ہو رہا ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ پندرھویں پارے میں ملے گی۔

یہود کا بنی اسماعیل سے حسد

۹۵- یا پھر اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ ان لوگوں کو دے رکھا ہے اس پر یہ جل رہے ہیں۔ اگر یہی

---

[1] تدبرِ قرآن۔ [2] تفہیم القرآن

بات ہے تو ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب وحکمت عطا کی تھی اور ہم نے ان کو عظیم حکومت دی تھی۔ یعنی کیا یہود حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب پر اللہ کا فضل وانعام دیکھ کر حسد میں مرے جاتے ہیں سو یہ تو ان کی بالکل بیہودگی ہے کیونکہ ہم نے حضرت کے گھرانے میں کتاب وعلم اور سلطنت عظیم عنایت کی ہے پھر یہود آپ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں اب بھی تو ابراہیم کے گھرانے میں ہے[1]

مسلمانوں کے ساتھ یہود اس لیے حسد کرتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کی برتری کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ یہودی حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے۔ سامان واسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا عرب کے تمام مادی ذرائع کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ وفساد سے اکھاڑ دے گی چنانچہ قریظہ، بنی نظیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی، زمیندار، سوداگر، مہاجن، علماء اور قلعہ نشین سرمایہ دار دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور اس کی بیخ کنی کر دیں۔ منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس لیے جب ریاست کی دیوانگی نے ان کو اسلام کے خلاف دیوانہ بنا دیا۔ ان کی یہ عداوت قسم قسم کے روپ بدل کر آتی تھی۔ ان میں ایک روپ وہ ہے جسے قرآن نے یہاں حسد سے تعبیر کیا ہے۔ الناس کے معنے لوگوں کے ہیں مگر یہاں مراد بنی اسماعیل ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کو اللہ نے رسالت کا منصب جلیل عطا فرمایا تھا اس لیے ان کو جلن یہ تھی کہ انبیاء تو ہمیشہ بنی اسرائیل میں ہوئے ہیں اب نبوت ایک عرب کو کیسے مل گئی۔

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے مثلاً اس کو علم وفضل، مال ودولت، عزت وشہرت یا اور کوئی دینی ودنیوی نعمت سے سرفراز کرے تو ان چیزوں کو دیکھ کر دوسرے شخص کے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک اور منافست کہتے ہیں لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن حکیم کی اس آیت سے یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو نبوّت دے کر اپنا خاص احسان فرمایا تھا جس کو دیکھ کر یہودی حسد کر رہے تھے ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت بنی اسماعیل سے چھن جائے یہاں آیت میں فضل سے نبوت ہی مراد ہے۔

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں جلنے اور بگڑنے کی کون سی بات ہے۔ ہم نے آلِ ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ ان کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم دیں گے۔ آل ابراہیم میں نسل ابراہیمی کی دونوں شاخیں داخل ہیں بنی اسحاق اور بنی اسماعیل، کتاب و حکمت روحانی نعمتیں ہیں اور ملک عظیم مادی نعمت ہے۔

اس فقرے کے دو مطلب بتائے گئے ہیں ایک یہ کہ آلِ ابراہیم سے بنی اسحاق مراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ ہم نے ہی بنی اسحاق پر یہ انعامات کیے تھے اور اب ہم ہی بنی اسماعیل پر انعام کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آل ابراہیم سے بنی اسماعیل مراد ہوں۔ شیخ الاسلام کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات میں ہے کہ ابراہیم کی اولاد اسحاق کے نام سے پکاری جائے گی۔ اس کے برعکس اہلِ عرب ہمیشہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے اس لیے کہ حضرت ابراہیم نے وہیں قیام کیا وہیں بیت اللہ کی تعمیر کی اور وہیں مناسک حج ادا کیے گویا اس طرح اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے اس وعدہ کی طرف اشارہ کیا جو حضرت ابراہیم سے حضرت اسماعیل کے بارے میں فرمایا تھا تورات میں یہ وعدہ مذکور ہے :-

اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دو بار ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کہ تو نے میری بات مانی۔　　　(کتاب پیدائش باب ۲۲-)

تورات کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدۂ برکت حضرت ابراہیم سے اس وقت فرمایا ہے جب انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل کی قربانی کے امتحان میں کامیابی

حاصل کی ہے اس لیے لازماً یہ وعدہ حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد سے متعلق ہو سکتا ہے ۔

اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے ۔

ایک یہ کہ اللہ ان کو ایک عظیم امت بنائے گا ۔

دوسری یہ کہ ان کو عظیم فتوحات حاصل ہوں گی ۔

تیسری یہ کہ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گے ۔

یہ تینوں وعدے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پورے ہوئے ۔ آپ کی بعثت سے ایک عظیم امت ظہور میں آئی یہ امت دشمنوں کے پھاٹکوں کی مالک بنی اور آپ کی دعوت سے تمام عالم انسانی کو دین کی برکت ملی [1]

حاصل یہ ہے کہ اگر بنی اسماعیل پر حسد کی وجہ سے یہ لوگ اس نبی کی مخالفت کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا ہے کر لیں ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب وحکمت اور عظیم حکومت دے دی ہے ۔

اس آیت میں یہ لطیف نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ کتاب وحکمت کے ساتھ جب عظیم سلطنت بھی دیتے کا اعلان ہوا ہے تو دونوں کو جداگانہ فعل لا کر بیان کیا ہے ۔ اس میں اشارہ ہے کہ سلطنت وحکومت کتاب و حکمت کا لازمہ نہیں ہے بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے کا ثمرہ اور نتیجہ ہے یہ ممکن ہے کہ کتاب وحکمت ہو ۔ لیکن سلطنت نہ ہو ۔ یہاں خاص طور پر سلطنت کو مستقل فعل لا کر اس لیے بیان کیا ہے کہ یہود کا سارا حسد اسی وجہ سے تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ جن کو کتاب وحکمت یعنی نبوت کے علم وعمل کی نعمت مل رہی ہے وہ اپنے حسن قبول کی وجہ سے اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں گی ۔ ان کے اسی حسد پر آتینا ھم ملکاً عظیماً سے ضرب کاری لگائی ہے فرمایا کہ ہم نے ان کو صرف کتاب وحکمت ہی نہیں دی ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک عظیم سلطنت بھی دی ہے ۔

نبوت پر ایمان اور اس سے روگردانی

۹۶ ۔ پھر ان میں سے کچھ نے مانا اور کچھ ہٹ گئے اور ہٹ جانے والوں کے لیے دوزخ کی دہکتی آگ کافی ہے یعنی حضرت ابراہیم کے گھرانے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ سے بزرگی دی ہے اور اب بھی اسی گھرانے میں ہے لہٰذا جو کوئی بلا وجہ محض حسد سے اس کو نہ مانے اس کے عذاب کے لیے دوزخ کی بھڑکتی

---

[1] تدبر قرآن

آگ کافی ہے۔

یہ اجمال ہے آئندہ دو آیتوں میں اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ اس آیت میں تفریع ہے پہلی بات کی یعنی جب یہ بات تم کو معلوم ہو چکی کہ اللہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آل ابراہیم ہونے کی وجہ سے کتاب وحکمت اور عظیم سلطنت سے نوازا ہے تو اب سن لو کہ کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے علم وعمل کو مان چکے ہیں اور کچھ نے نہیں مانا ہے۔ امام مجاہد سے بھی یہی تفسیر منقول ہے گویا بنی اسماعیل میں سے الگ گروہ تو اس کتاب وحکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ اس سے ابھی روگرداں ہے۔ یاد رہے کہ یہ آیت پہلی آیت کا نتیجہ ہے کوئی مستقل اور علیحدہ بات نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل کو کچھ نے مانا ہے اور کچھ نے نہیں مانا اور بس۔ آئندہ آیات میں ان ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی جزا اور سزا کی تفصیل ہے۔ حضور انور کے آل ابراہیم سے ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نسل ابراہیم سے تھے بلکہ یہاں کتاب وحکمت کے اضافہ سے یہ اشارہ کیا ہے کہ ابراہیم اس خدا پرست تہذیب کے بانی وامام تھے جس کی بنیادیں خدا کی توحید اس پر ایمان اور اس کے ذکر، فطرت مستقیم اور قلب سلیم اللہ تعالیٰ کے لحاظ وتقویٰ نوع انسانی پر رحم اور ذوق سلیم پر رکھی گئی ہیں۔

ابراہیمی اخلاق وطرز حیات اس تہذیب کے رگ وریشہ میں سرایت کیے ہوتے ہیں۔ اگر حضرت ابراہیم ایک طرف اس تہذیب کے بانی وموسس تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان کے نسلی وارث بھی تھے۔ اس تہذیب کے مجدد اور مکمل تھے جنہوں نے اس تہذیب میں از سر نو جان ڈالی ہے۔ اور اس میں بقائے دوام کا رنگ بھرا اور اس کے اصول وارکان اس طرح مضبوط کیے کہ اسے ایک دائمی اور عالمگیر تہذیب کی شکل دے دی۔ اس لیے یہاں یہ سوچنا بے معنے ہے کہ امن بہ کا مرجع کیا ہے۔ آل ابراہیم ہو یا ابراہیم، کتاب وحکمت ہو یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کا حاصل ایک ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

(یاد رکھو) جن لوگوں نے ہماری آیات کے ساتھ کافرانہ رویہ اختیار کیا تو عنقریب ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے، جب بھی ان کی کھالیں پک گل جائیں گی تو ان کو دوسری کھالوں میں بدل ڈالیں گے تاکہ عذاب کا مزہ خوب چکھ لیں، بلاشبہ اللہ سب پر غالب ہے اور اپنے ہر کام میں حکمت والا ہے ۵۶۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے ان کو ہم ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں

ہمیشہ رہیں گے، ان کو ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور ہم ان کو بڑے گنجان سائے میں رکھیں گے۔ ۹۸

نبوت پر ایمان و کفر کے لازمی نتائج

جس طرح دُنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب وہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور و خاکساری، بخل و فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فجور، ایمان و کفر، اخلاص اور نفاق ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو ان سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جُدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعیاتی اشیا میں ہے۔

الغرض یہ مادی اور جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل ردِ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام قرآن میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔

ان آیات میں ایمان و عمل صالح اور کفر کے عالمِ آخرت میں نتائج بتائے گئے ہیں اور ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہی اس آیت کی رُوح ہے۔ یہ بات کہ اس کی کیفیت اور نوعیت کیا ہو گی؟ تو اصل یہ ہے کہ ہم ان ہی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس عالمِ مادی میں ہماری نگاہوں سے گزرتی ہیں وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دُور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے ان کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دُنیا کے قیاس پر آخرت کا ہر خاکہ اور نقشہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی قرآن کا کام ہے۔

۹۷- یاد رکھو جن لوگوں نے ہماری آیات کے ساتھ کافرانہ رویہ اختیار کیا تو عنقریب ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے جب بھی ان کی کھالیں پک گل جائیں گی تو ان کو دوسری کھالوں سے بدل دیں گے

تاکہ عذاب کا مزہ چکھ لیں بلاشبہ اللہ سب پر غالب اور اپنے ہر کام میں حکمت والا ہے۔ پہلی آیت میں مومن و کافر کا ذکر بمقابلہ مطلق مومن و کافر کی جزا و سزا بطور قاعدہ کلیہ کے ذکر فرماتے ہیں تاکہ ایمان کی طرف پوری ترغیب ہو اور کفر سے پوری ترہیب ہو جائے۔ کافروں کے عذاب میں کمی اور نقصان نہ آنے کی وجہ سے ان کی کھال جل جانے کے وقت دوسری کھال بدل دی جائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ کافر ہمیشہ عذاب میں یکساں مبتلا رہیں گے۔ اللہ غالب ہے یعنی کافروں کو ایسی سزا دینے میں اس کو کوئی وقت و دشواری نہیں اور حکمت والا ہے یعنی کافروں کو یہ سزا دینی عین حکمت ہے۔[1]

یہ آیات گرامی مہمات معارف پر مشتمل ہے۔ یہاں سب تو نہیں مگر کچھ کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ اولاً جیسے اس سے پہلے پڑھ آئے ہو کہ شرک کے لیے بخشش نہیں ہے یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفر کے لیے بھی بخشش نہیں ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ :

> کفر و شرک کا عذاب دائمی ہے جیسا کہ نصوص قطعیہ اس کی رہنما ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ کفر کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کی عداوت ذاتی ہے اس لیے اللہ کی رحمت و رافت میں سے جو اللہ کی صفات جمال سے تعلق رکھتی ہیں کافر کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اللہ کی صفت رحمت اللہ کی عداوت ذاتی کو دُور نہ کرے گی۔ کیونکہ جو چیز ذات سے تعلق رکھتی ہے وہ بہ نسبت اس چیز کے جو صفات سے تعلق رکھتی ہے زیادہ طاقتور اور زیادہ بلند ہوتی ہے لہٰذا صفت کا تقاضا ذات کے تقاضے کو نہیں بدل سکتا۔ اور حدیث قدسی سبقت رحمتی غضبی میں غضب سے غضب ذاتی نہیں بلکہ غضب صفاتی مراد ہے۔ غضب صفاتی کا گنہ گاروں سے تعلق ہے جبکہ غضب ذاتی کا کفر سے تعلق ہے اور ارشاد باری رحمتی وسعت کل شیء میں رحمت کی وسعت کا مومنوں اور کافروں سے تعلق دنیا تک ہے۔ آخرت میں کفر رحمت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔
>
> (مکتوبات امام ربانی)

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ کفر وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے اس لیے اس کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی اللہ کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔ دراصل کفر ایمان کی ضد ہے۔ ان دونوں کا تعلق دل سے ہے۔ دل میں ایمان کی ایک کرن بھی ہو تو اس کی روشنی کی امید کی جا سکتی ہے مگر جس کا نشانہ دل میں اس نور ایمان کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ناامیدی ہے۔ اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے البتہ اعمال بد بھی ساتھ اگر ہوں تو ان کی تلافی دُنیا میں توبہ سے اعمال صالحہ سے مصائب و محن سے اور آخرت میں عذاب دوزخ یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے۔

الغرض ایمان کے مجرم جس کا دوسرا نام کفر ہے اپنے ناقابل تلافی نتیجہ بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کی دنیوی زندگی کا ایمانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا ہے۔

ثانیاً، یہاں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کیا شرک و کفر کے مجرمین کے لیے شرک و کفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب اس پر موقوف ہے کہ کیا دوزخ ہمیشہ آباد رہے گا؟ اس پر تو سب کا قطعیت کے ساتھ اتفاق ہے کہ جنّت کا وجود دائمی ہے لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے۔ گنہ گار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے فقہا و محدثین کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے جو مومن ہوگا اور گنہ گار بھی ہوگا وہ دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز کیا جائے گا اور شروع ہی سے جنّت میں داخل ہوگا۔ یہ مرجیہ ہیں۔ اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے گا وہ بھی کافروں کی طرح ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اہل السنت والجماعت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں کچھ صحابہ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن القیم جوزی ہیں یہ خیال ہے کہ جب گنہ گار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو دوزخ فنا کر دی جائے گی۔ حافظ ابن القیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں قرآن حدیث آثار صحابہ اور پچیس عقلی دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے۔ ایک زیدی عالم شیخ مقبلی نے بھی اپنی مشہور کتاب العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ میں اس کو قبول کیا ہے۔ صوفیا کرام میں شیخ محی الدین بن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت محسوس ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں کو پسند کرتے ہیں اور ان میں ہی لطف اٹھاتے ہیں۔ ہمارے معاصرین میں سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی میں اور سید مناظر حسن گیلانی الدین القیم میں اسی نظریہ کے حامی ہیں۔ جو کچھ کہا گیا ہے یہ ان لوگوں کا خیال ہے

جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد تھے۔ جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے۔ ان کے نزدیک جنت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ رہے گا اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔ شارحین قرآن نے اس آیت میں کھالوں کے پک جانے کے بعد بدل جانے سے یہی سمجھا ہے کہ عذاب منقطع نہ ہوگا اور احساسِ عذاب ہمیشہ تازہ ہوتا رہے گا۔ یہ امام رازی کی رائے ہے۔ ابوحیان اندلسی نے بھی اسے نقل کیا ہے اگرچہ پسند نہیں کیا ہے۔

ایمان و عمل صالح کی جزا

۹۸ - اور جن لوگوں نے ہماری بات کو مان لیا اور انہوں نے اعمالِ صالح کیے ان کو ہم ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کو ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور ہم ان کو بڑے گنجان سائے میں رکھیں گے۔ یعنی مومن ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور ان کو بیویاں ایسی ملیں گی جو حیض اور دیگر آلائشوں سے پاک ہوں گی اور ان کو گہری اور گنجان چھاؤں میں داخل کریں گے جو آفتاب کی دھوپ سے بالکل محفوظ ہوں گی۔[1]

پہلی آیت میں آخرت کی زندگی میں ان لوگوں کے حالات کی عکاسی کی گئی تھی جو اس زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے باغی ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور بتایا کہ اس باغیانہ زندگی کے آخرت میں نتائج کس قدر ہولناک ہوں گے۔ اب اس آیت میں ان لوگوں کے حالات کی تصویر پیش کی گئی ہے جو نبوت کے علم و عمل کو مانتے ہوئے اس سے طاعت و فرمانبرداری کے تعلقات رکھتے ہیں۔ ایمان و عمل صالح کو عطف کے ذریعے جوڑ کر اشارہ کیا ہے کہ وجود کے اعتبار سے اگرچہ دونوں مغائر ہیں ایک سرتاسر فکر ہے اور دوسرا سرتاسر کردار ہے لیکن ظہور کے اعتبار سے دونوں کی ہم آہنگی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ وعدے کے وقت ساتھ لا کر بتا دیا کہ یہ ناگزیر نتائج ہیں۔ افکار، اعمال اور اخلاق اگر نبوت کے علم و عمل سے وابستہ ہوں گے تو عالمِ آخرت میں ان کے نتائج پر بہار باغات، دوامِ راحت اور بے میل سکون کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

یہاں جنت کی خاص طور پر دو خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جنت بقائے دوام کی جگہ ہے۔ علامہ آلوسی نے بالکل بجا لکھا ہے کہ خلود یہاں دوام کے معنے میں ہے اور اس پر اجماع ہے یعنی یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مکان

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہے: جہاں کی راحتیں دائمی اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کی خوشی ناپیدا کنار اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ قرآن نے اس کی تصریح سولہ مقامات پر کی ہے۔ یہاں ذرا تاکید پر تاکید اور پرزور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا اور قرآن میں دوسرے موقع پر وعد اللہ حقاً، کا اضافہ کیا۔ پھر اسی جگہ مزید تاکید کا اضافہ کیا ومن اصدق من اللہ قیلا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہاں ازواج مطہرہ ہوں گی۔ ازواج کے ساتھ تطہیر کی قید بڑی گہری معنویت رکھتی ہے۔ وہاں کی جو لذتیں بھی ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت، شربت و شراب، ازدواجی زندگی اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ و مسرت اور اطمینان و سکینت کے علاوہ کسی معنے میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی۔ یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے یہاں انسان زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہو گی، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھنگار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہو گا۔ وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، بیویاں پاک صاف جسم کی روح کی ہر ممکن گندگی اور آلودگی سے ستھری، پاکیزہ، عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں گندگی اور تکلیف سے صاف، برے اخلاق کے داغ سے پاک، جو جنت میں داخل ہو گا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہو گی، نہ ان کے کپڑے میلے ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہو گی۔ وہاں منادی ہوگی یہ وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوں گے، وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے کوئی ستارہ کی طرح اور کوئی چودہویں رات کی طرح۔

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ انسان کبھی شکم مادر میں بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس اور اس کے لوازم حیات، بیرون شکم کے اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس کی بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہیں ہے۔ ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب و گل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہو گا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا
حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا
يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٥٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ
فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ
كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ
تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾　　رکوع ۶

بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کے حوالے کر دو، اور جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے کرو، بلاشبہ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے یقیناً اللہ سب کچھ سن رہا ہے دیکھ رہا ہے۔ اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو

صاحب امر ہوں ان کی اطاعت کرو[101]۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اسے لوٹا دو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو[102]۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے[103]۔

سیاسی نظام اور مصادرِ قانون

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن عائلی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام اور اخلاقی نظام بیان کرنے کے بعد چونکہ اسلام سیاسی نظام اور قانونی نظام سے روشناس کرانا چاہتا ہے اس لیے خاص طور پر اوتوا نصیبا من الکتاب کہہ کر یہود کا چہرہ پیش کر کے دین و سیاست کی تفریق کے باطل نظریہ پر پہلے ضرب لگا دی۔ تاکہ مسلمان اپنے اصل مقصد کو نہ بھول جائیں اور یہودیوں کی طرح دینداری کے معنے یہ نہ سمجھ لیں کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی اطوار و اقدار کو اپنانا ہی اسلام ہے خواہ مقاصد زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں خواہ نظام اجتماع کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار و فساق کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول و نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا کافرانہ، اس جُرم کے مرتکب یہودی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس جُرم کی سزا اس طرح دی کہ ان کی آبادیاں کفار کے تابع فرمان ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے اور ان کے علماء نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی جس کی پاداش میں ان کو یہ سزا ملی تھی تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ فیصلہ کر دیا کہ نظامِ کفر ہی نظامِ ایمان سے زیادہ صحیح ہے۔ یہودیوں کی داستان میں دین و سیاست کی تفریق کے باطل نظریہ پر متنبہ فرمانے کے بعد اب ان آیات میں اسلام کا نظامِ سیاسی اور نظامِ قانون پیش کیا جا رہا ہے اور اولین طور پر یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ اس نظام کے تمام اجزاء جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہ کی ذات و صفات کا تصور ہے۔ اسلامی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار

اسی تصور کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ اسلام نے صفاتِ الٰہی کی تصریح و توضیح میں جس جامعیت سے کام لیا ہے وہ دُنیا کے دوسرے مذاہب میں مفقود ہے اس کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام رسُول کی شخصیت اور اس کا منصب اسلامی معاشرہ کا اخلاقی ضابطہ، اعمال و فرائض کی تمام شاخیں غرض کہ اسلامی نظام کا ہر معمولی سے معمولی جزو بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی مرکزی تخیل سے وابستہ ہے۔

۹۹۔ بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کے حوالے کر دو۔ یہود میں عادت تھی کہ امانت میں خیانت کرتے اور فصلِ خصومات میں رشوت وغیرہ کی وجہ سے کسی کی خاطر اور رعایت کر کے خلافِ حق حکم دیتے اس لیے مسلمانوں کو ان دونوں سے اس آیت میں روکا گیا۔ منقول ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ نے خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونا چاہا تو عثمان بن طلحہ کلید بردار خانہ کعبہ نے کنجی دینے سے انکار کیا تو حضرت علی نے اس سے چھین کر دروازہ کھول دیا۔ آپ فارغ ہو کر جب باہر تشریف لائے تو حضرت عباس نے آپ سے درخواست کی کہ یہ کنجی مجھ کو مل جائے اس پر آیت نازل ہوئی اور کنجی عثمان بن طلحہ کے سپرد کی گئی۔[1]

دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں کہ یہود کی خیانت پر تنبیہہ ہے دوسری بات کا تعلق آیت کی شانِ نزول سے ہے جہاں تک یہود کے امانت میں خیانت کا تعلق ہے واقعی یہود کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے دورِ انحطاط میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے مناصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سربراہی کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نا اہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں۔ یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ اس آیت کے پسِ منظر میں عام شارحینِ قرآن نے "شانِ نزول" کے نام سے وہی بات پیش کی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے لکھی ہے۔

یہ واقعہ السیوطی نے لباب النقول میں ابن مردویہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ اور ابن مردویہ نے اس کا تاریخی نسب یہ بتایا ہے کہ کلبی کہتے ہیں کہ مجھے ابوصالح کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے اور ابوصالح کا بیان ہے کہ مجھے ابن عباس کے ذریعے پتہ لگا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کو بلایا، ان سے کہا کہ چابی مجھے دکھاؤ۔ جب عثمان حضورِ انور کو چابی دینے لگے تو حضرت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عباس بول پڑے کہ سقایہ میرے پاس ہے چابی بھی مجھے عنایت فرما دیجئے۔ عثمان نے چابی دیتے دیتے ہاتھ روک لیا۔ آپ نے فرمایا کہ عثمان چابی لاؤ۔ یہ اللہ کی امانت ہے دروازہ کھولا اندر تشریف لے گئے، باہر تشریف لائے طواف کیا۔ جبریل نے حضور کو حکم دیا کہ چابی عثمان کو دی جائے۔ آپ نے عثمان کو بلایا چابی دے دی اور یہ آیت تلاوت کی ان اللہ یامرکم ... الخ لیکن روایتی طور پر عبداللہ بن عباس کا یہ بیان ثابت نہیں ہے کیونکہ جس راہ سے عبداللہ بن عباس کا یہ بیان نقل ہو کر آیا ہے وہ محدثین کے نزدیک سب سے زیادہ کمزور طریق ہے۔

آیت اپنے معنے میں کسی پس منظر کی محتاج نہیں ہے اور علماء کا فیصلہ ہے کہ العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب آیاتِ قرآنی کے مطالب میں خاص واقعات کا نہیں بلکہ عام الفاظ ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

اس آیت کی عظمتِ شان کو علماء نے بہت سراہا ہے۔ علامہ قرطبی رقمطراز ہیں۔ یہ آیت گرامی مہماتِ معارف میں سے ہے۔ دین و قانون کی ساری دفعات کا یہ آیت گہوارہ ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآنی قانون کے بنیادی مسائل پر مشتمل ہے اور علامہ سید رشید رضا کہتے ہیں کہ یہ دونوں آیتیں اسلام کے سارے سیاسی نظام کے لیے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر پورے قرآن میں ان کے سوا کوئی آیت اس موضوع پر نہ ہوتی تو امت کو اسلام کے نظامِ سیاسی کے لیے یہ ہی کافی ہوتیں۔

الامانات امانت کی جمع ہے۔ لفظ امانت یہاں خاص معنے میں نہیں بلکہ عام معنے میں آیا ہے۔ اس میں تمام حقوق و فرائض انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے تعلق رکھتے ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات ہوں یا سیاسی معاہدات، سب لفظ امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے زیرِ آیت انا عرضنا الامانۃ امانت کی یہ تعریف کی ہے۔ امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر۔ اس معنے میں علم بھی امانت ہے، رائے بھی امانت ہے، عہدے اور مناصب بھی امانت ہے حکومت اور اقتدار بھی امانت ہے۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت

قرآن کے نقطہ نظر سے حکومت اور سیاسی اقتدار کی حیثیت سرتاسر امانت کی ہے۔ یعنی مسلمان اس کے مالک نہیں ہیں بلکہ امین ہیں۔ جیسے مالک کی مرضی کے خلاف کبھی بھی امانت میں تصرف خیانت ہے ایسے ہی اقتدار و حکومت میں اللہ کی مرضی کے خلاف تصرف امانت میں خیانت ہے یعنی اقتدار و حکومت

میں اللہ کی مرضی کے خلاف تصرف امانت میں خیانت ہے یعنی اقتدار و حکومت میں سے جو کچھ بھی کسی کی ملک میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس کا استعمال ان مقاصد کی خاطر ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ہونا چاہیئے جو مالک نے مقرر کر دیے ہیں۔ ریاست اور ریاستی اموال املاک کی حیثیت بھی یہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی ریاست قائم کی تھی اس کی حیثیت آپ نے یہی بتائی تھی آپ بحیثیت صدر اس ریاست کے امین تھے۔ چنانچہ سنن ابو داؤد میں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نہ خود سے تمہیں دیتا نہ کسی چیز کو تم سے روکتا ہوں میں تو صرف ایک خازن ہوں وہاں خرچ کرتا ہوں جہاں مجھے حکم دیا گیا ہے۔

آپ نے اہل ایمان پر یہ واضح کر دیا تھا کہ مملکت میں جو کچھ جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی ہے وہ امانت ہے۔ صدر مملکت اس کا امین محافظ اور نگران ہے ایسے ہی جیسے یتیم کے سرمایہ میں اس کا نگران اور متولی ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت عمر نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

میری حیثیت تمہاری دولت میں وہی ہے جو کسی یتیم کے سرپرست کی ہوتی ہے۔

طبقات ابن سعد میں ہے :

میری نظر میں سرکاری اموال کی وہی حیثیت ہے جو کسی یتیم کے مال کی ہوتی ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر حضرت عمر نے مسلمان حکمران کی حیثیت اس غلام کی بتائی ہے جس پر ادائے امانت اسی طرح فرض ہے جس طرح غلام پر اپنے آقا کے لیے۔ فرمایا کہ :

جو شخص مسلمانوں کے امور کا نگران بنا وہ ان کا غلام ہے۔ ان کی خیر خواہی اور امانتوں کا پاس اس پر اسی طرح فرض ہے جس طرح غلام پر اپنے آقا کے بارے میں۔

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں حضرت عمر کی مجلس مشاورت میں ایک تقریر نقل کی ہے جس سے حکومت کے امانت ہونے کے تصور پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔

قرآن نے یہاں حکومت کے لیے لفظ امانت بول کر یہ رہنمائی کی ہے کہ خدا کا تعلق صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لیے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ مملکت کے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول بھی اللہ سبحانہٗ کے صحیح تعلق سے ہی وابستہ ہے۔ یہ بات آپ جانتے ہیں کہ مملکت ایسا ادارہ ہے جو افراد کی تکمیل ذات اور ارتقائے شخصیت کے وسائل مہیا کرتا ہے اور شخصیت کی تکمیل نام ہے قابو یافتہ ارادہ کا۔ ایسا ارادہ جس میں بے قیدی اور بے آئینی معدوم ہو اور اعلیٰ درجہ کا ضبط پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ وہ ہی ہو سکتا ہے جو خارجی موثرات کی مدد سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس بنا پر افراد مملکت کی تکمیل ذات ممکن نہیں ہے۔ جب تک خدا کا تصور، اس کی ذات، صفات کا تصور اور اس کے قانون مکافات کا تصور انسانی ذہن و عمل پر مکمل نہ ہو۔ اس طرح مملکت میں خدائی امانت کا اعتقاد مملکت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا مملکت کے وجود کے لیے فوج اور پولیس کا ہونا ضروری ہے۔

بہرحال اس آیت کی روشنی میں حکومت اور اس کی ذمہ داریاں اہل حکومت کے ہاتھ میں امانت کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں حکومت اس کے مناصب، اس کے عہدے اور اس کی ذمہ داریوں کے تذکرے میں لفظ امانت ہی استعمال ہوا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر کو حکومت کی ذمہ داریوں کے بارے میں جو وصیت فرمائی تھی اس میں ہے:

انها امانة وانها يوم القيامة خزي وندامة

حکومت کے امانت ہونے کا تقاضا

جب یہ بات از روئے قرآن و سنت الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ حکومت اور اس کی ذمہ داریوں کی حیثیت امانت کی ہے تو آپ قرآن کا یہ حکم جو اس آیت میں ہو رہا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت امانت والوں کے سپرد کر دو۔ یعنی تمہاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ امانت امانت والوں کو دو۔ یعنی جن میں اس امانت کو لینے کی اہلیت، صلاحیت اور قابلیت ہو، اس کے امانت ہونے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ یہ اس کو دی جائے جس میں اس کی اہلیت ہو۔ اس موقعہ پر قرابت داری کا خیال، خاندان و نسل کا پاس و لحاظ اور رشتہ اخوت و مودت ہرگز دھوکا نہ دے۔ اسی طرح حرص و ہوس، بے جا خوشامد و چاپلوسی اور غلط اخلاقی دباؤ کا شکار نہ ہو۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی روح کو کھول کر سمجھایا ہے، ارشاد ہے:

جو بھی لائق تر فرد کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو کام سپرد کرتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول

سے خیانت کرتا ہے۔ (السیاسۃ الشرعیہ)

حکومت اور اس کی ذمہ داریاں اگر امانت نہ ہوں تو خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ایک دوسری حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ایک بہتر شخص کی موجودگی میں اس کو چھوڑ کر جس کسی نے کسی اور کو محض دھڑے کی وجہ سے کام کی ذمہ داری دے دی اس نے اللہ اور اس کے رسول اور سارے اہل ایمان سے خیانت کی ہے۔

(السیاسۃ الشرعیہ)

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جس شخص نے نیک ترین اور پسندیدہ شخص کو چھوڑ کر امت کا کام دوسرے کو سپرد کر دیا اس نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ)

حافظ ابن تیمیہ نے اس ساری بحث کو پیارے انداز میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

اگر کسی نے قرابت داری، رشتہ داری، دوستی، ہم شہری، ہم مذہبی اور ہم جنسی کی وجہ سے اصلح اور احق کو چھوڑ کر دوسرے کو ذمہ داری سونپ دی یا کسی مالی منفعت کی امید پر اس نے بے انصافی سے کام لیا یا اس وجہ سے حقدار اور باصلاحیت افراد کو نظر انداز کر دیا کہ اس سے اس کی عداوت تھی ان تمام صورتوں میں اس نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔ (السیاسۃ الشرعیہ)

حاکمیت اللہ کی ہے

اس آیت میں اقتدار اور حکومت کی ذمہ داریوں کو امانت قرار دینے کے ساتھ یہ کہہ کر کہ ان اللہ یامرکم یہ بھی جتا دیا ہے کہ اسلامی ریاست میں حاکمیت صرف اللہ کی ہوتی ہے۔

علم سیاست کی اصطلاح میں حاکمیت کا لفظ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار مطلق کے معنے میں بولا جاتا ہے۔ ریاست صدر وزیر اعظم اور قومی اسمبلی کے حاکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں خواہ بطوع و رغبت یا بکراہت اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں اسی کے دیے ہوئے ہیں وہ جس حق کو بھی سلب کر دے وہ آپ سے آپ معدوم ہو جاتا ہے۔ قانون صاحب حاکمیت کے ارادے سے وجود

میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند بناتا ہے مگر خود صاحب حاکمیت کو پابند نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذات قادر مطلق ہے اس کے احکام کے بارے میں خیر و شر صحیح اور غلط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جو کچھ وہ کرے وہ ہی خیر ہے جو کچھ کہے وہ صحیح ہے اس لیے ناگزیر ہے کہ وہ سبوح قدوس اور منزہ عن الخطا ہو، علم سیاست کے ماہرین حاکمیت کا یہ واضح تصور لے کر انسانی سوسائٹی میں جب اس کا مصداق تلاش کرتے ہیں تو ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن بتاتا ہے کہ آمر اور حاکم فی الواقع اللہ سبحانہ، ہے وہ ہی مختار مطلق ہے فعال لما یرید وہی غیر مسئول ہے لا یسئل عما یفعل وہی تمام اقتدار کا مالک ہے بیدہ ملکوت کل شیئ وہی ایک ہستی ہے جس پر قانون کی حکومت نہیں بلکہ قانون پر اس کی حکومت ہے واللہ غالب علی امرہ اور وہ ہی ذات ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والا کوئی نہیں وھو یجیر ولا یجار علیہ، اور اسی کی ذات منزہ عن الخطا ہے۔ الملک القدوس السلام بہرحال اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ آمر اللہ کی ذات ہے۔ اسی بنا پر ہمارے اصولیین نے یہ پالیسی طے کی ہوئی ہے اور اس موضوع پر کبھی ان میں دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ حافظ ابن الہمام اپنی مشہور اور دقیق کتاب 'التحریر' میں لکھتے ہیں:

الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ رب العالمین

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حاکمیت صرف اللہ رب العالمین کی ہے۔

اور مشہور اصولی علامہ محب اللہ اپنی کتاب مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں

حاکم کی حیثیت صرف اللہ سبحانہ، کی ہے۔

الغرض اسلام کے سیاسی نظام کے سارے اجزاء جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کر رہے ہیں۔ وہ قرآن کی اس آیت کی رو سے اللہ کی حاکمیت ہے۔ اسلامی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اللہ سبحانہ، کے بارے میں تصور آمریت پر استوار ہیں، امت کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام، اسلامی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ، اعمال و فرائض کی ساری شاخیں غرض کہ اسلامی زندگی کا ہر معمولی سے معمولی جزو بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی مرکزی تخیل سے وابستہ ہے اور یہ بالکل ٹھیٹھ عقلی بات ہے کہ جو خالق ہے وہی آمر ہے الالہ الخالق والامر یہ بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے اس کے ہر گوشہ میں اسی کا امر ہے۔

امانت کے دائرے کی پہنائیاں

امانت کا لفظ اپنے معنے کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر یکساں بولا جائے گا۔ اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی پنہائیوں میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جسے اصولیین کی زبان میں "تکلیف شرعی" کہتے ہیں اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیا تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں، اور کچھ باتیں وہاں دوسروں کے متعلق سنیں تو ان کو اسی مجلس تک رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے۔ کسی نے آپ سے اپنے نجی کام میں مشورہ طلب کیا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے علم کے مطابق صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے۔ اگر آپ کسی جگہ ملازم ہیں تو آپ کو نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے انجام دینا بھی امانت ہے۔ اگر آپ کسی کے آٹھ گھنٹے کے ملازم ہیں اور آپ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتے ہیں یا بے سبب سستی کرتے ہیں تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

نبوت کی راہ سے جو علم و عمل آیا ہے وہ بھی امانت ہے اس علم و عمل کو ان کے ضرورت مندوں تک پہنچانا ایسا ہی ادائے امانت ہے جیسے کسی کے پیسے اس کو پہنچانا اور جیسے یہ واجب ہے یہاں سید رشید رضا نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ نبوت کے علم و عمل کی امانت کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ وقت کے احوال و ظروف کے مطابق اس امانت کو لوگوں تک پہنچانے کا طریقہ بھی سیکھے۔ ابھی یہ موضوع تشنۂ تحقیق ہے انشاء اللہ اس پر تفصیلی مباحث نویں پارے سورۂ انفال میں اور بائیسویں پارے سورۂ احزاب کے آخر میں ہدیہ ناظرین ہوں گے۔

عدل و انصاف کا حکم

۱۰۰۔ اور جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے کرو بلاشبہ اللہ سبحانہٗ تم کو عمدہ نصیحت

کرتا ہے یقیناً اللہ سب کچھ سن رہا ہے دیکھ رہا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس پوری آیت کی اس طرح تشریح کی ہے۔

اے اہلِ حکومت خواہ تھوڑوں پر حکومت ہو خواہ بہتوں پر بے شک اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتا ہے کہ اہلِ حقوق کو ان کے حقوق جو تمہارے ذمہ ہیں پہنچا دیا کرو اور تم کو یہ بھی حکم دیتے ہیں کہ جب محکوم لوگوں کا تصفیہ کیا کرو ایسے حقوق میں جو ان میں باہم ایک دوسرے کے ذمہ ہیں تو عدل و انصاف سے تصفیہ کیا کرو بے شک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے۔ دُنیا کے اعتبار سے بھی اس میں بقا ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی کہ موجب قرب و ثواب ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو جو دربارہ امانت و تصفیہ کے تم سے صادر ہوتے ہیں، خوب سنتے ہیں اور تمہارے افعال کو جو اس باب میں تم سے واقع ہو رہے ہیں خوب دیکھتے ہیں تو اگر کمی و کوتاہی کرو گے تو مطلع ہو کر تم کو سزا دیں گے[1]

حافظ ابن تیمیہ نے السیاسۃ الشرعیہ میں لکھا ہے کہ:

اس آیت میں اہلِ حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دینا اور لوگوں کے درمیان انصاف کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہی دونوں چیزیں بہترین انتظامیہ اور عمدہ ترین عدلیہ کی ضمانت ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں اسلامی نظامِ حکومت کا جو خلاصہ بیان کیا گیا ہے وہ اربابِ فکر و دانش کے لیے دستور کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روح کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو حکومت کو بقا عطا کرتی ہے اور جس سے عوام و خواص کو اطمینان و سکون کی دولت ملتی ہے۔

عدل کی لغوی تحقیق

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں عدل کہتے ہیں۔ اور اس سے وہ معنے پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے۔ اور علامہ قبولی مصباح میں

---

[1] بیان القرآن

فرماتے ہیں:

عدل کے معنے ہیں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جور کے خلاف ہے عدل فی امرہ عدلاً اور عدل علی القوم عدلاً باب ضرب سے آتا ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے نہایہ میں عدل بالفتح عدل بالکسر کو مثل کے اور عدیل کو مثیل کے معنے میں لکھا ہے

امانت کے ذکر کے بعد معاملات میں عدل کا حکم دے کر امانت کے سب سے اہم پہلو کی طرف اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جن کو اللہ سبحانہ' زمین کا اقتدار بخشتا ہے ان پر اولین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے معاملات کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ یہاں عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو۔ انصاف خریدنی و فروختنی چیز نہ بننے پاتے۔ اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے۔ کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقعہ نہ ملے۔

سیاسی نظام کی دو بنیادیں انتظامیہ اور عدلیہ

اس آیت میں بتا دیا ہے کہ سیاسی نظام کی دو اہم اور ناگزیر ضرورتیں ہیں ایک صالح انتظامیہ اور دوسرے اچھی عدلیہ۔ کوئی نظام سیاسی ان دو کے بغیر نہ مکمل ہوتا ہے اور نہ قائم ہوتا ہے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں کا ذکر کر کے ان کی بنیادی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

انتظامیہ کا مقصد زندگی کے بنیادی مفادات کا تحفظ کرتی ہے اور ناگزیر اجتماعی ذمہ داریوں مثلاً دفاع، امن و امان اور افراد معاشرہ کے فلاح و بہبود کے فرائض انجام دیتی ہے۔ انتظامیہ نظم، اقتدار، قوت اور مرکزیت کی امتیازی صفات کی حامل ہوتی ہے۔ اسلامی شعور اور زندگی کا اسلامی مزاج انتظامیہ کی ضرورت اور اہمیت کو اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے۔ انتظامیہ مسلمانوں کے مشترکہ مقاصد کی ضامن اور ان کے جذبۂ اخوت و تعاون کی اعلیٰ ترین مظہر بن کر ابھرتی ہے۔ قرآن نے انتظامیہ کو قیام دین، دعوت الخیر، شہادت علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں سونپی ہیں انتظامیہ ان کی اولین ذمہ دار قرار پاتی ہے۔ افراد کا اسلامی شعور انتظامیہ سے اپنے مقصد زندگی کے حصول میں ہر ممکن مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ انتظامیہ فرد کی جان و مال، عزت و آبرو، عقل و فہم اور دین و اخلاق کی محافظ بن کر رہتی ہے۔ افراد کے تزکیہ اور زندگی کی مادی تعمیر کی خاطر مختلف خدمات انجام دے کر

انتظامیہ افراد کو ان کے مقصد زندگی کے حصول میں مدد دیتی ہے۔

عدلیہ کا مقصد یہ ہے کہ قانون کی بنا پر حدود مملکت میں رہنے والے افراد کو جو حقوق حاصل ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں ظلم و جور سے محفوظ رکھا جائے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدلیہ کا تعلق انتظامی امور سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی حقوق سے ہوتا ہے اور ان دونوں کا یہ امتیاز بتانے کے لیے دونوں کو دو فقروں میں علیحدہ بیان کیا ہے۔ انتظامیہ کے لیے ان تؤدوا الامانات الی اھلھا کی تعبیر اور عدلیہ کے لیے اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عدلیہ اپنے فرائض عدل و قضا میں انتظامیہ کے اثر سے آزاد ہے۔ انتظامیہ یا اس کے کسی افسر اور عہدہ دار چاہے وہ وزیر اعظم اور صدر مملکت ہی کیوں نہ ہو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عدلیہ کو کسی خاص فیصلے پر مجبور کرے۔ یہی نہیں بلکہ سربراہ مملکت عدلیہ کو کسی مقدمہ کی دوبارہ سماعت پر بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ فتاویٰ ہندیہ کے باب آداب القاضی میں ہے:

> عدالت جب کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کر دے اس کے بعد سربراہ مملکت اسے حکم دے کہ وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو عدالت پر اس حکم کا ماننا واجب نہیں ہے۔

فرائض عدل و انصاف کی حد تک عدلیہ کے لیے بجز اسلامی قوانین کی پیروی کے اور کوئی پابندی نہیں ہے اور آیت میں بین الناس کی عمومی تعبیر بتا رہی ہے کہ قرآن کے نزدیک صدر مملکت، گورنر، وزیر اعظم، وزراء، اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں ہے۔ کسی کے لیے خاص عدالتیں نہیں ہیں اور کوئی عدالت کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

عدل کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قرآن نے نبوت کی بعثت کا مقصد عدل و انصاف کے قیام کو بتایا ہے۔ خود قرآن کے نزول کا مقصد بھی عدل و انصاف کو قائم کرنا ہے۔ اسی پر معاشرہ بلکہ دنیا کا سارا کارخانہ قائم ہے۔ اگر عدل و انصاف ختم ہو جائے تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ قرآن نے جس تفصیل سے عدل کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا ہے اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد مباحث تفصیل طلب ہیں معاشرتی عدل، اجتماعی عدل، عدالت کے فرائض، عدالت کے ججوں کے اوصاف، عدالت کا دائرہ کار وغیرہ وغیرہ پر انشاء اللہ تبصرہ سورہ مائدہ میں آئے گا۔

اسلام کے استنادی مصادر قانون

۱۰۱۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبِ امر

ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پہلی آیت میں حکام کو عدل کا حکم فرما کر اب اوروں کو حکام کی متابعت کا حکم دیا جا رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کی متابعت جب ہی واجب ہوتی ہے جب وہ حق کی اطاعت کریں گے حاکم اسلام بادشاہ یا اس کا صوبہ دار یا قاضی یا سردارِ لشکر اور جو کوئی کسی کام پر مقرر ہو ان کے حکم کا ماننا ضروری ہے جب تک وہ خدا، اس کے رسول کے حکم کے خلاف حکم نہ دیں۔ اگر خدا و رسول کے حکم کے صریح خلاف کرے تو اس حکم کو ہرگز نہ مانے [1]

اس سے پہلے اسلام کے نظامِ سیاسی کے موضوع پر قرآن کی سابقہ آیت میں انتظامیہ اور عدلیہ کا چہرہ پیش ہو چکا ہے لیکن کوئی انتظامیہ اور کوئی عدلیہ اپنے وجود کے لحاظ سے بیکار محض ہے اگر اس کی پشت پر اس کی رہنمائی کے لیے دستور نہ ہو۔ اسلامی ریاست کی انتظامیہ اور عدلیہ کا دستور کیا ہے یا دستوری قانون کے ماخذ کیا ہیں جس پر چل کر دنیا میں عدل اور حق قائم کیا جا سکے۔ قرآن نے یہاں اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا بطور استیناف بیانی جواب دیا ہے۔

اس آیت میں بالترتیب تین طاعتوں کا حکم دیا گیا ہے، اللہ کی، رسول کی اور مسلمانوں میں اولوالامر کی۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ طاعت میں اللہ سبحانہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ اللہ کی طاعت کتاب اللہ کی طاعت ہے۔ رسول کی طاعت سے مقصود آپ کی سنت اور اسوہ حسنہ کی طاعت ہے۔ یہی دونوں قانون کے اصلی سرچشمے ہیں۔ ان کے اندر جس قدر قوانین واضح شکل میں موجود ہیں وہ قطعی اور اٹل ہیں اور ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت ہیں۔ ان میں کبھی معمولی رد و بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی انتظامیہ اور نہ کوئی عدلیہ، نہ کوئی مقننہ اور نہ کوئی کابینہ۔ انتظامِ مملکت کے چلانے میں ان سے بال برابر انحراف کر سکتی ہے نہ کسی جج کے لیے جائز ہے کہ معاملات کا فیصلہ ان سے ہٹ کر کرے، ایسا کرنا اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف ہے ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔

قانون کے ان دونوں ماخذوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یا ایھا الذین اٰمنوا سے فقرے کا آغاز یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ جو لوگ الہامی ہدایات پر ایمان رکھتے ہیں انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جن قانونی ماخذوں کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے وہ کسی انسان کے ساختہ پرداختہ نہیں ہیں بلکہ ان کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق و صداقت ہے جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

جس کی ہمہ تن آنکھ زمین و آسمان کی ہر شے کو محیط ہے ۔ پھر چونکہ ان ماخذوں پر وہ یہ سمجھ کر ایمان لاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں خواہ یہ کتاب اللہ ہو یا رسول اللہ اس لیے اس کا کوئی امکان نہیں پیدا ہوسکتا کہ وہ کبھی ان سے اختلاف کرے کیونکہ ان سے اختلاف کرنے کے معنے یہ ہیں کہ وہ الہامی ہدایات سے منکر ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس سوسائٹی سے خارج ہو جاتا ہے جس کا وہ اس بنا پر رکن ہوا تھا کہ اس نے اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کو بلا رد و قدح تسلیم کر لیا تھا جن پر اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے اور جن کے متعلق تمام مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے روانہ کیے گئے ہیں اس لیے انسانی اختلافات اور تمدن و معاشرت کی نزاعوں میں اہل ایمان قرآن اور اسوۂ حسنہ کو حکم اور مرجع تسلیم کرتے ہیں ۔ خدا کی ذات و صفات کائنات اور انسان سے اس کے تعلق کی نوعیت سیاسی اقتدار کی حقیقت اور اس کا اصلی مستقر حکمرانوں کی ذمہ داریاں، ان کے اقتدار کے حدود ۔ افراد کے حقوق و فرائض اور ان کی ذمہ داریاں ان سب کے بارے میں قرآن و سنت کا فیصلہ صریح اور محکم ہے ۔

قرآن و سنت کی موجودگی میں عقلی مداخلت

اسلامی نظام میں قانون کا ماخذ عام رائے یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں ہیں اس لیے اس نظام میں قوانین کی بابت مختلف اغراض رکھنے والے طبقوں یا مختلف تصورات و خیالات رکھنے والی جماعتوں کے مابین کشمکش پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ قانون کا ماخذ یہاں تمام تر قرآن و سنت ہیں ۔ جن کے احکام و ہدایات اور جن کے مقرر کردہ اصول کار اور مقاصد جملہ افراد معاشرہ کو یکساں تسلیم ہیں خواہ وہ کسی ادر گروہ سے تعلق رکھتے ہوں ۔ اسلامی نظام میں قانون کا پہلا ماخذ قرآن ہے ۔ جن امور کی بابت قرآن نے صاف اور صریح احکام دیے ہیں ان کی نسبت اور کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی ۔ الّا یہ کہ کسی ایسے حکم کے تحت ضمنی قوانین و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئے ۔ ایسی صورت میں احادیث و سنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اس کی روشنی میں یہ قوانین و ضوابط مرتب کیے جائیں گے ۔ اسی طرح جہاں کسی معاملہ کے متعلق قرآن ساکت ہو اس سے کوئی ہدایت نہ ملتی ہو وہاں سنت سے مدد لی جائے گی ۔ ان حدود کے اندر اسلام نے عقل کی مداخلت کو بالکل رد کر دیا ہے اور کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس دائرے میں اپنی عقلی موشگافیوں سے فکر و عمل کا انتشار پیدا کرے ۔ جب قرآن و سنت سے کسی معاملہ میں صاف و صریح ہدایت موجود ہو تو یہ قطعاً ناجائز ہے کہ اس کو چھوڑ کر افراد اپنی عقل و فہم کی رہنمائی قبول کریں ۔

اسلامی نظام میں عقل کا مقام

اس آیت میں مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد تیسری اطاعت پر زور دیا گیا ہے یعنی اولی الامر کی اطاعت، اس اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک بات قرآن وسنت میں موجود نہ ہو تو پھر اولوالامر کو موقع دیا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی حدود سے باہر اپنی عقل وفہم کو کام میں لائیں۔ جہاں کسی صورت حال کی نسبت قرآن وسنت دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل واستدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم وفضل کی وسعتوں کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں لیکن اولی الامر کو فکر واجتہاد کی یہ آزادی غیر مشروط اور بے قید نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہیں چنانچہ اسی آیت میں یہ قید لگا دی گئی ہے کہ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم واطلاع اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں یہ قید اولی الامر سے سمجھی جارہی ہے ظاہر ہے کہ اُمت ان تؤدوا الامانات الی اھلھا پر عمل کرتے ہوئے ان کو ہی امارت کا منصب جلیل دے گی جن میں اس کی صلاحیت ہو گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ان کا قرآن وسنت پر جو قانون کا ماخذ ہیں ایمان راسخ اور یقین کامل ہو۔ یہ شرط آمت میں لفظ منکم سے معلوم ہو رہی ہے اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ متبع اور مطیع کتاب وسنت ہوں۔ یہ شرط اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے بعد بلا فصل لانے سے معلوم ہو رہی ہے۔ ان شرطوں کے عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر استنبادی اصول طے کرنے کے اجتہادی اصول میں انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس وبنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین وضوابط مبنی ہیں اور ایسی صورت میں اسلامی احکام وقوانین ایک بے ربط مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتے جن کی اصل واساس اور فروع وتفصیلات کے درمیان کوئی موافقت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کی ترتیب اور اصولوں کے عملی انطباق میں بھی اجتہاد اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس عمل میں اصل کی اسپرٹ ہاتھ سے نہ جانے پاتے یعنی ایسا اجتہاد جو اسلام کی رُوح اور قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں سے متعرض ہو جائز نہیں ہے۔

اولوالامر کون ہیں

اس موضوع پر بہت کچھ کہا گیا ہے مگر ہمارے خیال میں یہاں اولی الامر سے مسلمانوں کے وہ حکمران

مراد ہیں جو قرآن وسنت کے احکام نافذ کرنے والے نظام اُمت قائم رکھنے والے اور تمام امور اجتہادی میں حکم وامر کی طاقت رکھنے والے ہوں۔

کیونکہ

اولاً اس لیے کہ اولوالامر کا لفظ اسی سورت میں دوبارہ آرہا ہے۔

واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں ذکر امن اور خوف کے حالات کا ہے یعنی صلح وجنگ اور فتح وشکست کا۔ ان حالات کا تعلق صرف حکام وامراء ملک ہی سے ہو سکتا ہے۔ معاملہ ملک کے نظم اور قیام امن کا ہے استنباطِ مسائل اور حلال وحرام کا معاملہ نہیں ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ اولی الامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جن کے سپرد ملک کا انتظام ہے اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں جن کا اثر ملک کے امن وخوف پر پڑ سکتا ہے۔

ثانیاً، کتاب وسنت اور صدر اول کے آثار عربیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ امر جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جاتے تو یہ عموماً حکومت وسلطنت ہی معنوں میں آتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے ہے کہ ایک صاحبِ نظر کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ نیز لغت کی بنا پر ظاہر ہے کہ امر کے معنے حکم کے ہیں اور اولی الامر کے معنے حضرت امام بخاری نے ذوی الامر کے کیے ہیں یعنی حکم والا اور معلوم ہے کہ حکم والا حکومت والا ہی ہو سکتا ہے۔

ثالثاً۔ احادیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس پس منظر میں آئی ہے وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری اور مسلم میں عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ:

یہ آیت عبداللہ بن حذافہ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ نے ایک دستہ میں ان کو روانہ کیا تھا۔

امام محمد بن جریر طبری نے تفسیر میں ایک روایت کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن الولید کی باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے ان کے حکم کے بغیر ایک شخص کو مزدوری پر رکھ لیا۔ دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت وعدم اطاعت کا تھا نہ کہ احکام ومسائل کے حکم وانتقام۔

رابعاً اکثر اقوال مرویہ صحابہ وتابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے بلکہ دورِ اول میں صرف یہی تفسیر معلوم ومشہور تھی۔ بہت سی موشگافیاں بعد کی پیداوار ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن عیینہ کا قول

نقل کیا ہے کہ :

میں نے مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہیں دیکھا میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس آیت سے پہلی آیت پڑھو ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ معلوم ہوا کہ اولوالامر سے مراد حکام ہیں۔

یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت کا ہو رہا ہے اس لیے اولوالامر سے مراد ارباب اقتدار ہیں۔ طبری نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہؓ اور میمون بن مہران سے نقل کیا ہے کہ ھم الامراء مراد حکام ہیں۔ اور حافظ ابن حزم نے ان تمام صحابہ و تابعین کو شمار کیا ہے جن سے یہ تفسیر منقول ہے یہ ۱۲ سے زیادہ ہیں۔ باقی کچھ صحابہ و تابعین کا یہ کہنا کہ اولوالامر سے مراد اہل علم ہیں مثلاً حضرت جابر کا ارشاد کہ ھم اھل العلم اور مجاہد، عطاؔ اور ابوالعالیہ کا فرمان کہ ھم العلماء تو ان کا مشہور تفسیر سے کوئی تعارض نہیں ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔ دراصل اسلام کے نظامِ حکومت کی ترکیبی ہیئت یہ تھی کہ حکومت و ولایت کا منصب تمام شرعی اور علمی قوتوں سے مرکب ہو۔ جو شخص حاکم ہوتا وہ عالم اور فقیہ بھی ہوتا تھا۔ لہٰذا جن بزرگوں نے اولوالامر کی تفسیر علماء سے کی وہ احوال و ظروف کے مطابق تھی۔ گویا انہوں نے یہ بتا دیا کہ اُمتِ اسلامیہ کی سربراہی اور فرماں روائی ایسے ہی افراد میں ہونی چاہیئے جو اہلِ علم ہوں۔

خامساً، حدیث و سیرت کے سب سے بڑے امام یعنی امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری کا بھی یہی مذہب ہے۔ کتاب الاحکام میں عنوان ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ اور اس میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت درج کی ہے من اطاع امیری فقد اطاعنی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کے نزدیک اولوالامر سے امراء مراد ہیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ نے امام بخاری کے انداز سے یہی بات سمجھی ہے فرماتے ہیں :

یہ امام بخاری اشارہ کر رہے ہیں کہ میرے نزدیک یہ آیت امراء کی طاعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے نہ کہ علماء کی۔

سادساً، سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ امام ابن جریر طبری کی ہے اور صحابہ و تابعین کی تفاسیر پر ان کا احاطہ اور استیعاب معلوم ہے انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کرنے کے بعد ترجیح اسی کو دی ہے کہ اولوالامر سے حکام مراد ہیں۔

اسلام کے اجتہادی مصادرِ قانون

۱۰۲ - پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جاتے تو اللہ اور اس کے رسُول کی طرف اسے لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یعنی تمہارے اور اولی الامر میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور اس کے رسُول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف تو اس کو کتاب اللہ اور سنّت رسُول کی طرف رجوع کر کے طے کر لیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ و رسُول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہو جاتے اسی کو بالاتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہیے اور اختلاف کو دُور کر دینا چاہیے۔ اگر تم کو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان ہے کیونکہ جس کو اللہ اور قیامت پر ایمان ہوگا وہ ضرور اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسُول کے حکم کی طرف رجوع کرے گا اور ان کے حکم کی مخالفت سے بے حد ڈرے گا جس سے معلوم ہو گیا کہ جو اللہ و رسُول کے حکم سے بھاگے گا، وہ مسلمان نہیں۔ اس لیے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں۔ ایک نے کہا چلو شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا کہ میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں ہے تو اس کو بے شک کافر کہیں گے۔[1]

اس آیت سے اوّلاً یہ بات معلوم ہوئی کہ جن مسائل اور معاملات کے بارے میں واضح ہدایات قرآن و سنّت میں موجود نہ ہوں۔ ان کے لیے حالاتِ زمانہ اور ضروریاتِ وقت کے مطابق قوانین وضع کیے جائیں گے۔ یہ قوانین اولوالامر وضع کریں گے۔ یہ قانون سازی جس طرح عام نہ ہو گی بلکہ صرف ان ہی امور میں ہو گی جن کے بارے میں قرآن و سنّت کے واضح احکام موجود نہیں۔ اسی طرح یہ قانون سازی آزاد بھی نہ ہو گی بلکہ دین کے مزاج اور قانون کے متعینہ مقاصد کے تحت ہی ہو گی اور کتاب و سنّت کے واضح احکام کو سامنے رکھ کر انہی کی بنیاد پر کی جائے گی۔

اس قانون سازی میں اگر اولوالامر میں کہیں اختلاف ہو جائے تو اولی الامر کا فرض ہے کہ ان مسائل کا حل اکثریت سے نہیں بلکہ اس طرح تلاش کریں کہ ان کو ان لوگوں کے سپرد کر دیں جو اُصول و استناد یعنی قرآن و سنّت سے واقف ہوں۔ وہ اُصول استناد کے قواعد اور عمومی احکام کے تحت اس کا حل تلاش کریں۔ ہماری رائے میں ان تنازعتم فی شیئ کے مخاطب اولی الامر ہیں۔ یہ اولی الامر کے صوابدید پر موقوف ہے کہ اصول استناد سے واقف کاروں کی جماعت خود اپنے میں سے بنائیں یا عام شہریوں میں سے ان لوگوں کو بنائیں جو اپنے علم و تقویٰ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اپنی دینی بصیرت، اپنی قانونی مہارت اور متقضیاتِ زمانہ سے اپنی گہری واقفیت کی بناپر اس کے اہل ہوں۔ اس بات کی دلیل اس کے مخاطب اولوالامر ہیں خود قرآن کی آیت استنباط ہے ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم اور اولوالامر کو ردوہ الی اللہ والرسول کی ہدایت کرکے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ اسلام کے سیاسی نظام میں اولوالامر کا درجہ مسیحیت کے پوپ سے مختلف ہے۔ مسیحیت میں پوپ زمین کا فرماں روا نہیں آسمانی و دینی فرماں روا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے لیکن اسلام کے سیاسی نظام کی اصلی بنا زمین کی فرماں روائی ہے۔ وہ صرف اصول استناد قرآن و سنت کی حفاظت کرنے والا اور ان کو نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ اس کی ذات کو اصل قانون میں کوئی دخل نہیں ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوہ الی اللہ والرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر قانون سازی میں ایسی صورت پیش آجائے جس میں تم میں باہم نزاع و اختلاف ہو تو پھر اس کے آخری فیصلے کی قوت نہ تو سربراہ مملکت کا حکم ہے اور نہ نمائندوں کی اکثریت ہے بلکہ اس کا مرکز پھر بھی اصول استناد یعنی قرآن و سنت ہیں اگر اصول استناد میں منطوقاً اور صراحتاً اس کا حل موجود نہ ہو تو اس کو ان لوگوں کے فکر و مطالعہ کے حوالہ کر دینا چاہیے جو اپنی بصیرت اور علم و تقویٰ کی وجہ سے اس کی اہلیت رکھتے ہوں وہ قرآن و سنت کے مدلول اور مفہوم سے قواعد عامہ اور اصول معلومہ کی روشنی میں اس کا حل تلاش کریں۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں اصول استناد کتاب و سنت کو سند، مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلام کے سیاسی نظام کی وہ خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے ممتاز کرتی ہے جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جاتے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

سنتِ رسول کا مطلب

دونوں فقروں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور ردوہ الی اللہ والرسول میں اصول استناد کا تکرار کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نزاعات میں منطوقاً مدلولاً اور مفہوماً فیصلے کے لیے یہی مرجع ہیں۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور رسول کی طرف لوٹنے سے مقصود سنتِ رسول کی طرف لوٹنا ہے۔ سنت سے مقصود یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے دیے ہوئے مقامات کی پابجائی کرتے ہوئے آپ نے جو کچھ کہا ہے اور سامنے ہوتا دیکھ کر جس پر خاموشی اختیار فرمائی ہے اور پھر اسے صحابہ نے اپنی انفرادی، اجتماعی زندگی میں برتا ہے سب سنت ہے۔ قرآن نے آپ کو صاف صریح اور غیر مشتبہ الفاظ کے ساتھ خدا کا رسول ہونے کی حیثیت میں معلم، مربی، مزکی، ہادی، حاکم،

قاضی، آمر، ناہی، مبین قرآن، تالی قرآن، امام رشد، واعظ، بشیر، منذر، مقامات دیے ہیں۔ یعنی آپ مسلمانوں کے لیے محض ایک پیر و مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد بھی تھے۔ حاکم قاضی، شارح، مربی، معلم سب کچھ تھے۔ اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم معاشرے کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتاتے سکھاتے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رائج ہوتی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہو گئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں۔ اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر فرمائے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا۔ لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے۔ لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی اسلامی مملکت کے ضابطے بن گئے اور آپ کے بعد خلافتِ راشدہ اور اس کا نظام اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا۔ اس لیے آپ کی محسوس مرئی زندگی اور خلافتِ راشدہ کا تعامل سنتِ راشدہ ہوئی بلکہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابہ کرام نے بالاتفاق کی ہیں اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفاءِ راشدین نے کیے ہیں ان کی حیثیت سنت ہی کی ہے یعنی ان کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور مجتہدینِ امت کے وہ فیصلے جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آنے پر کیے ہیں یہ اگرچہ سنت نہیں ہیں مگر سنت کی روح سمجھنے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ایک موقعہ پر امت کے مناقشوں اور تفریقات کے ذکر میں پیمانہ نجات بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

> نجات پانے والی جماعت وہ ہے جو عقیدہ و عمل میں اس چیز کو اپنائے جو اصول استناد کتاب و سنت سے ظاہر ہو اور جس پر جمہور صحابہ اور تابعین کا عمل ہو۔

قانون سازی میں فکری اجتہاد کے تین بڑے اصول

فان تنازعتم فی شیئ اولی الامر کو مخاطب کر کے جن معاملات کے بارے میں قرآن و سنت میں واضح ہدایات موجود نہ ہوں اجتہاد کرنے کی آزادی دی ہے فکر و اجتہاد کی اس آزادی نے بالعموم تین صورتیں اختیار کی ہیں جنہیں بالترتیب اجماع، قیاس اور استحسان سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت فکری اجتہاد کے تین بڑے

اصول ہیں جنہیں اسلامی فکر نے زمانہ کے تغیر پذیر مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دیا ہے۔

فکری اجتہاد کا پہلا اصول اجماع

اجماع سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی تصریح نہ ہو۔ یا قرآن و سنت کا کوئی اصول زیرِ بحث مسئلہ پر منطبق تو ہوتا ہو لیکن اس کی تعبیر میں اختلاف ہو تو ایسی صورت میں مسلمان علماء مجتہدین جس رائے اور فیصلہ پر پہنچیں۔ اسلامی معاشرے کے جملہ افراد اس فیصلہ کو قبول کر لیتے ہیں اس طرح ایک متنازعہ فیہ مسئلہ متفق علیہ ہو جاتا ہے۔ آئندہ اگر حالات اس امر کے مقتضی ہوں تو اس پر نظرِ ثانی کی جائے اور مسئلہ زیرِ بحث کا ازسرِ نو تصفیہ کیا جائے تو ایسا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لفظ اجماع سے یہ مراد نہیں ہے کہ معاشرے کے افراد کی اکثریت جس رائے۔ فیصلہ یا قانون پر چاہے عمل شروع کر دے یا اپنی زندگی کے لیے جو ضابطہ عمل مفید سمجھے اسے اختیار کرے اجماع کے معنے یہ بھی نہیں ہیں کہ انتخابات ہوں اور منتخبہ نمائندے کسی مجلسِ قانون ساز یا پارلیمنٹ میں جمع ہوں اور رائے شماری کی بنا پر اکثریت جو قانون چاہے وضع کر لے اجماع کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے قانون کی اصول استناد قرآن و سنت پر مبنی ہونا چاہیے۔ دوم اجماع میں صرف ان لوگوں کی رائے کا وزن ہوتا ہے جو باعتبارِ علم و فضل اور صلاحیت فکر اس کے اہل ہوں۔ ہر تعلیم یافتہ خواہ وہ یونیورسٹی کا فاضل ہو یا کسی مدرسہ عربی کا فارغ التحصیل اور علامہ ہو یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ وہ اجماع میں اپنا وزن کسی طرف ڈال سکے۔ تعلیم یافتہ طبقوں کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مجتہدین اور اہلِ فکر کی رائے پر اعتماد کریں۔ البتہ اگر وہ تشکوک و شبہات میں مبتلا ہوں تو وہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ علماء ان کے تشکوک دور کریں اور مضبوط دلائل سے ان کی تشفی کریں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس تحدید سے آزادی رائے کا اصول باطل نہیں ہوتا۔ کیونکہ علماء کا گروہ کوئی پنڈتوں اور برہمنوں کا پیدائشی گروہ نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو کتاب و سنت کا علم اور دین میں بصیرت رکھتا ہو علماء کے زمرے میں شامل ہو سکتا ہے۔ اجتہاد کے لیے صرف صلاحیت فکر اور وسعتِ علم اور دین کی حقیقی روح سے واقفیت ضروری ہے اور یہ آخری جزو سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر علم کی وسعت اور فکری صلاحیت بھی بے سود ہے۔

فکری اجتہاد کا دوسرا اصول قیاس

قیاس سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو جو کسی خاص امر سے متعلق ہے کسی دوسرے امر پر منطبق

کیا جائے بشرطیکہ ان دونوں امور کے مابین کوئی علت میں مشترک ہو۔اس طرح جب دو امور میں کوئی مشابہت پائی جائے اور ان میں کسی ایک کی نسبت شریعت کا کوئی حکم موجود ہو تو دوسرے کے متعلق بھی یہ مان لیا جاتا ہے کہ اس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے۔ ابتداءً قیاس کے باقاعدہ مدون نہ تھے مگر قیاس سے کام ضرور لیا جاتا تھا کیونکہ بہت سے معاملات ایسے پیش آتے تھے جن کی نسبت قرآن کا کوئی حکم موجود نہ تھا۔ ایسی صورت میں چارۂ کار یہی تھا کہ معاملہ زیر بحث اور کسی حکم شریعت کے مابین کوئی وجہ اشتراک ہوتی تو اس حکم کو معاملہ مذکور پر بھی چسپاں کر دیا جاتا۔اس طرح آزادیٔ رائے اور اجتہاد کے اس طریقہ سے برابر کام لیا جا رہا تھا لیکن قیاس کے نام سے اس کے اصول نہ تو منضبط تھے اور نہ مسلّم، پھر جب اسلامی حکومت کی توسیع کے ساتھ مسلمان قاضیوں کو عراق، فلسطین اور شام وغیرہ میں جہاں کے حالات مختلف تھے نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا جن کے متعلق قرآن و سنت میں صریح احکام نہ تھے تو ان کو قیاس کے اصول مقرر کر کے ان کے مطابق اجتہاد و آزادیٔ فکر سے کام لینا پڑا۔ مکہ اور مدینہ کے فقہائے نے ابتداء میں اس کی پرزور مخالفت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان حالات سے ناواقف تھے جن سے عراق اور شام کے فقہاءَ دوچار تھے۔اس طرح اہل روایت اور اہل درایت کے مابین یہ بات وجہ نزاع رہی۔ یہاں تک کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اپنے زبردست دلائل سے اس طریقہ کو ایسا منضبط و مبرہن کر دیا کہ امت کی اکثریت کو اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ حقیقت میں نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی مخالفت کر کے خود اہل روایت اپنے مقصد کو مجروح کر رہے تھے کیونکہ جب فقہی استنباط، فقہی قیاس کا قاعدہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کے اصول و شرائط متعین نہ ہوئے تھے۔اس وقت بھی شخصی رائے کا استعمال بہرحال ناگزیر تھا بے شمار مسائل ایسے پیدا ہوتے تھے جن کے متعلق قرآن و سنت خاموش تھے۔ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ شخصی رائے کو کام میں لا کر معاملات کا تصفیہ کیا جائے مگر اس وقت ہر فقیہ کے لیے آزادی تھی کہ جس طرح چاہے قیاس سے کام لے لیکن حضرت امام ابوحنیفہ نے قیاس کے اصول و قواعد مقرر کر کے اس آزادی کو محدود کر دیا۔ان اصول کی تفصیلات کا یہاں محل نہیں ہے۔

اصولِ استناد اور اصولِ اجتہاد

اس آیتِ قرآنی نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ اسلامی ریاست قانون سازی کی بنیاد دو ہیں ایک اصول استناد دوسرے اصول اجتہاد۔ جیسا کہ شارحینِ قرآن نے اس آیت سے سمجھا ہے علامہ

آلوسی فرماتے ہیں ھی متضمنۃ لجمیع الادلۃ الشرعیۃ یہ قرآنی آیت تمام مصادر قانون کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اصول دین اور ادلہ شرعیہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ علماء اصول نے لکھا ہے کہ ادلہ شرعیہ چار ہیں۔ ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے قانون سازی میں اصول استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کو بھی قائم رکھا ہے اور معاشرے کے لیے اس امر کی گنجائش رکھی ہے کہ وہ قانون سازی میں احوال و ظروف کی تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کر سکے۔ ہاں جس بات کو اسلام گوارا نہیں کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نصب العین، اس معیار خیر و شر اور زندگی کی بابت اس نقطہ نظر میں کوئی تبدیلی پیدا کی جائے جو اسے اپنے پیرو دین نے عطا کیا ہے یا ان اصول و مقاصد کو بدلا جائے جنہیں اس آخری اور قطعی طور سے شعبہ حیات میں متعین کر دیا ہے جہاں تک تبدیل پذیر حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا سوال ہے اجماع سے بھی حل ہو سکتا ہے اور قیاس واستحسان سے بھی۔ کیونکہ ایک اجماع دوسرے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اسی طرح قیاس واستحسان کے اصولوں کے صحیح استعمال سے اسلامی معاشرہ زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ شریعت کے مقاصد کی تکمیل سب سے اہم چیز ہے۔ اگر زمانہ کی تبدیلی یا حالات کے باعث کوئی اصول اس مقصد کو نہ پورا کر رہا ہو جس کے لیے اس کا قیام ہوا تھا تو یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ مذکورہ اصل حالات پر صحیح منطبق نہیں کیا گیا ہے۔ اور پھر اسے اس طرح حالات پر منطبق کرنا ہو گا کہ اسلام کا مقصد حاصل ہو جائے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی نظام کے دونوں اصولوں یعنی اصول استناد اور اصول اجتہاد پر یکساں زور دیں۔ کیونکہ اس زمانے میں ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو یورپ کی تقلید میں اصول اجتہاد اور آزادی فکر پر غیر متوازن زور دے کر مذہب کی اساس و بنیاد کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔ اس طبقہ کے افراد انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات و مسائل میں سرے سے قرآن و حدیث کی ہدایت ہی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم نے صراحت کر دی ہے کہ جو شخص خدا اور رسول کے فیصلوں کو اپنی زندگی کے معاملات اور تمدنی مسائل میں آخری فیصلہ نہیں مانتا۔ اس کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ زندگی کے مسائل میں قرآن و سنت کی ہدایت سے انحراف اس اساس و بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے جس پر اسلامی معاشرہ قائم ہے اور اس اساس کے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی زندگی کی حقیقت کو باقی رکھنا ہے تو قرآن و سنت کے مرکز سے وابستہ رہنا ہو گا اور اصول اجتہاد کے ساتھ اصول استناد کو ترتیب دینا ہو گا۔ کیونکہ

اسلامی نظام کے قالب میں بیداری اور حرکت کی رُوح اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب استناد کے ساتھ اجتہاد کا عمل جاری رہے۔ ابھی اس آیت کی روشنی میں ہمیں کچھ اور کہنا ہے مثلاً حکومت کی تشکیل کیسے ہو، صدر مملکت کا انتخاب، مجلس شوریٰ کی تشکیل، اولی الامر کے اوصاف، مجالس قانون ساز کے حدود، انتظامیہ کے حدودِ عمل، عدلیہ کے حدودِ عمل، اصُولِ مشاورت، اصُولِ انتخاب اولی الامر اور اصولِ اطاعت، وغیرہ وغیرہ، ان سب موضوعات پر اجمالی تبصرہ انشاءاللہ اسی پارے میں آرہا ہے لیکن انتخاب کے بارے میں تفصیلی بحث انشاءاللہ ۲۵ پارے میں آئے گی۔

اسلام کے سیاسی نظام کی خوبی

۱۰۳۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔ یعنی اپنے تنازعات اور اختلافات میں اللہ ورسُول کی طرف رجوع کرنا اور اللہ ورسُول کی فرمانبرداری کرنی مفید ہے آپس میں جھگڑنے یا اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے سے اس رجوع کا انجام بہتر ہے [۱]

اس آیت میں ذالک اسم اشارہ ہے اس کا مشارالیہ کچھ کے خیال میں ردوہ الی اللّٰہ والرسول کا مضمون جملہ۔ یعنی اللہ ورسُول کی طرف رجوع کرنا شیخ الاسلام کا میلان بھی یہی ہے لیکن کچھ کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں جو کچھ بتایا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس کا مشارالیہ ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی کے حسن کا اقرار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ یعنی تمہارے سیاسی نظام کا خاکہ ہم نے پیش کیا ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے دوسرے تمام نظاموں کے مقابلے میں تمہارے لیے بہترین ہے۔ اس سے تمہیں دُنیا میں استحکام ملے گا اور اس میں تمہاری منفعتوں اور مصلحتوں کی پوری پوری ضمانت موجود ہے اور ذاتی طور پر بہتر ہونے کے ساتھ یہ انجام کے لحاظ سے بھی اپنے اندر حسن کا بیش بہا خزانہ رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہارے اختلافات ختم ہوں گے اور فتن و مفاسد کا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہو جائے گا۔

زیرِ تشریح فقرے سے پہلے اس نظام کی کامیابی کے لیے یہ بنیادی اور اہم شرط بتائی ہے کہ اس نظام کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ تمہارے اندر اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین کی رُوح موجود ہو۔ اصل ارشاد یہ ہے ان کنتم تؤمنون باللّٰہ والیوم الاٰخر شارحین قرآن نے تو اس فقرے کو ایک دھمکی سمجھا ہے لیکن اس موقعہ پر اس بات کو جتانے کا صرف دھمکی ہی مقصد نہیں ہے بلکہ اس میں یہ بتانا ہے کہ

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ نظام جس کا خاکہ اس آیت میں پیش کیا گیا ہے ایمان باللہ والیوم آخر پر مبنی ہے۔ اسلام کا نظامِ سیاسی صرف قومی تقاضا نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایمان باللہ والیوم الآخر کے بعد وجود میں آیا ہے۔ ایمان یعنی وہ عہد و میثاق جو ذاتِ الٰہی اور مسلمانوں کے درمیان منعقد ہوا ہے یہ ایمان اس اقرار سے عبارت تھا کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اس مقصدِ حیات کو اپنی زندگی اور اپنے افکار و اعمال کے لیے قبول کرتے ہیں جسے اللہ سبحانہٗ نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے۔ نیز اس مقصدِ حیات کی تکمیل جو دستورِ زندگی اور ضابطہ عمل رسُول کے ذریعے ان تک پہنچایا گیا ہے اس کی رہنمائی اور ہدایت بھی ان کو تسلیم ہے۔ یہ اقرار تھا اس بات کا کہ آئندہ سے مسلمان کسی اور مقصد پر اپنی عملی اور فکری قوتیں صرف نہیں کریں گے بجز اس ایک مقصد کے جو ان کے فرماں روائے حقیقی نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے اور اسی طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ مسائل میں وہ کسی قانون و ضابطہ یا کسی دوسرے آئین و دستور کی رہنمائی قبول نہیں کریں گے صرف اس دستورِ زندگی اور آئین عمل میں اپنے لیے ہدایت تلاش کریں گے جو انہیں رسُول کی وساطت سے قرآن و سنت کی صورت میں عطا ہوا ہے۔ اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ نے جس کی اطاعت کا عہد مسلمانوں نے ایمان کے ذریعہ سے کیا تھا ان کی زندگی کے مقاصد، ان کے اصُول کا نیز ان کی معیشت و سیاست اور حیاتِ عائلی کا پورا خاکہ تیار کر دیا۔ لہٰذا اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام قانونی، سیاسی، عائلی اور دیگر مسائل میں جو اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ کے حدود میں آتے ہیں مسلمانوں کی صرف ایک ہی رائے ہونی چاہیے اور وہ اسے اپنانے اور قبول کرنے اور عملاً قائم کرنے کی راہ ہے اور بس۔

یہاں یہ بات بھی بڑی برمحل ہے کہ قرآن مجید چونکہ محض کتابِ آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفہ وعظ و ارشاد بھی ہے اس لیے پہلی دو آیتوں میں جو قانونِ اصُول بیان کیے گئے ہیں اب اس فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ مذکورہ بالا چاروں اصُولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دُنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی دُرست ہو سکتی ہے [1]

...

[1] تفہیم القرآن

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا
أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ
أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ
الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ
مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ ۖ بِاللَّهِ
إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا
فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ
قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

کیا تو نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جو اپنے تئیں دعویٰ تو یہ
کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے
اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے یہ ہیں

کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ ان کو طاغوت
کے نہ ماننے کا حکم ہو چکا ہے اور شیطان کی خواہش ہے کہ ان کو
صراطِ مستقیم سے بھٹکا کر دُور لے جائے۔[104] اور جب ان سے کہا جاتا
ہے کہ آؤ تم اللہ کی طرف اور اللہ کے رسُول کی طرف تو تم ان منافقین
کو اپنے سے کتراتے دیکھو گے۔[105] اس وقت ان پر کیا گزرے گی جب
ان کے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑے گی۔ پھر
آپ کے پاس یہ کہہ کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ
بخدا ہم تو صرف بھلائی کے خواہاں اور میل ملاپ چاہتے تھے۔[106]
یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے حال کو اللہ خوب جانتا ہے
تم ان سے بے رخی برتو ان کو نصیحت کرو اور ان سے اس انداز
سے بات کرو کہ بات ان کے جی میں اتر جائے۔[107]

سیاسی زندگی میں اسلام کی اپوزیشن

یہ بات تو پہلے صاف ہو چکی ہے کہ اسلام زندگی کا ایک ایسا مکمل نظام ہے جس کا سیاسی نظام بھی

ایک حصہ ہے لیکن یہ بات ابھی واضح ہو کر سامنے نہیں آئی کہ نظام سیاسی کی اسلام میں کیا حیثیت ہے اور کیوں ہے۔ ان آیات میں اسی بات کی پوری قوت سے وضاحت کی گئی ہے۔ خاص طور پر اس بات کی وضاحت اس لیے کی گئی ہے کہ سیاست خود زبان حال سے کہتی رہتی ہے کہ میرا دین سے کوئی رشتہ نہ ہونا چاہیے۔ دین تو انتہائی بلند اور مقدس چیز ہے اس لیے یہ اس کے تقدس اور اس کی عظمت کی توہین ہے کہ اسے سیاسی بکھیڑوں میں داخل کر دیا جائے۔ یہودی ذہن ایسا ہی تھا اس لیے قرآن نے روز اول ہی اس بات کو بڑی قوت سے سمجھا دیا ہے کہ اللہ سبحانہ انسانوں کا صرف رب اور الٰہ ہی نہیں ہے بلکہ ملک، آمر اور حاکم بھی ہے یعنی وہ ایسا رب اور الٰہ ہے جس کی ربوبیت اور الوہیت میں بادشاہت اور حاکمیت بھی شامل ہے۔ اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی فرماں روا اور قانون ساز صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ جب یہ حقیقت ہے کہ انسان کا حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ اور قانون ساز اللہ تعالیٰ ہے۔ تو یہ اس کی تلقین ہے کہ انسان کی سیاسی زندگی کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ہونی چاہیے نہ کہ کسی اور حاکمیت پر۔ جو لوگ اپنے تئیں ایمان کے مدعی تھے ان میں سے کچھ کا خیال یہودیوں کی صحبت سے یہ ہو گیا تھا کہ اسلام سے سیاست اور حکومت کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجہ کا ہے۔ دین میں اسے کوئی بنیادی اہمیت کا مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ نہ حکومت اس کے لیے ناگزیر ہے نا گزیر ہونا تو درکنار وہ اس کے لیے مطلوب بھی نہیں ہے۔ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ ایک شخص ایمان خدا کی کتاب پر رکھے اور رسوم عبادت نبوت کی ہدایت کے مطابق ادا کرے لیکن زندگی کے مسائل اور تمدن کے معاملات میں حاکم کسی اور کو مان کر اپنے معاملات کا فیصلہ اس سے کرائے۔ ان آیات قرآن نے اسی ذہنیت پر ضرب کاری لگائی ہے اور بتایا ہے کہ سیاست اور حکومت کو اگر اسلام سے الگ کر دیا جائے تو پھر اسلام وہ اسلام نہ ہوگا جو اللہ کا بھیجا ہوا، قرآن کا بتایا ہوا، محمد رسول اللہ کا لایا ہوا اور صحابہ کرام کا اپنایا ہوا اسلام ہے۔ اسلام اپنی صحیح شکل میں اسی وقت دیکھا جا سکتا ہے جب اسے کامل اقتدار کے تخت پر بٹھایا جائے۔

۱۰۴۔ کیا تو نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جو اپنے تئیں دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ ان کو طاغوت کے نہ ماننے کا حکم ہو چکا ہے اور شیطان کی خواہش ہے کہ صراط مستقیم سے ہٹا کر دور لے جائے۔ یہود فصل خصومات میں رعایت و رشوت کے عادی تھے اس لیے جو لوگ جھوٹے اور خائن ہوتے وہ اپنا معاملہ یہودیوں کے پاس لے جانا پسند کرتے کہ وہ خاطر کریں گے اور آپ کے پاس ایسے لوگ اپنا معاملہ لانا پسند نہ کرتے کہ آپ حق کی رعایت کریں گے۔

اور کسی کی اصلاً رعایت نہ کریں گے، سو مدینے میں ایک یہودی اور ایک منافق کہ ظاہر میں مسلمان تھا کسی امر میں دونوں جھگڑ پڑے یہودی جو سچا تھا اس نے کہا چل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور منافق جو جھوٹا تھا اس نے کہا کہ چل کعب بن اشرف کے پاس جو یہودیوں میں عالم اور سردار تھا۔ آخر وہ دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ نے یہودی کا حق ثابت فرمایا، منافق جو باہر نکلا تو کہنے لگا کہ اچھا حضرت عمر کے پاس چلو جو وہ فیصلہ کریں وہی منظور اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ ہوا۔ غالباً یہ سمجھا ہو گا کہ میں مدعیٔ اسلام ہوں اس لیے یہودی کے مقابلے میں میری رعایت کریں گے اور حضرت عمر آپ کے حکم سے مدینہ میں فیصلے کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے۔ جب حضرت عمر نے یہ جھگڑا سنا اور یہودی کے یہاں سے ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ معاملہ حضور انور کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے اور آپ اس معاملہ میں یہودی کو سچا اور غالب کر چکے ہیں۔ تو حضرت عمر نے اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا کہ جو کوئی ایسے قاضی کے فیصلے کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی ہے۔ اس کے وارث حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور حضرت عمر پر قتل کا دعویٰ کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ حضرت عمر کے پاس تو صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شاید وہ اس معاملہ میں صلح کرا دیں۔ یہ وجہ نہ تھی کہ حضرت کے فیصلے سے انکار تھا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی اور حضرت عمر کا لقب فاروق ہوا۔[1]

اس آیت کا یہ پس منظر ابن کثیر کو چھوڑ کر دوسرے تمام شارحین قرآن نے ذکر کیا ہے۔ اردو تفاسیر میں صاحب معارف القرآن، مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد ادریس بھی اس معاملہ میں شیخ الاسلام کے ہم زبان ہیں۔ اصل واقعہ امام بغوی کی معالم میں کلبی کے حوالہ سے آیا ہے۔ کلبی کہتے ہیں کہ مجھے ابو صالح سے معلوم ہوا ہے اور ابو صالح کا بیان ہے کہ مجھے ابن عباس سے معلوم ہوا ہے۔

مفسر قرآن کلبی کا حسب نسب

کلبی کا پورا نام ابو النضر محمد بن السائب بن بشیر بن عمرو بن عبد الحارث بن عبد العزی کلبی ہے۔ ۱۴۶ھ ان کی وفات کا سال ہے۔ یہ قبیلہ بنو کلب سے تعلق کی وجہ سے کلبی کہلاتے ہیں۔ کوفہ کے باشندے تھے تاریخ وانساب اور تفسیر میں مشہور ہیں۔ علماء ان کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں۔ ان پر سب سے زیادہ سنگین الزام جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے۔ سلیمان کہتے ہیں کہ کوفہ میں دو کذاب

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے ان میں ایک کلبی ہیں۔ تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابوصالح سے مروی ہیں ابوجناب کلبی کا بیان ہے کہ ان کے استاذ تفسیر ابوصالح نے قسم کھاکر بتایا ہے کہ میں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کے متعلق نہیں سنائی۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ کلبی نے ایک مرتبہ خود اعتراف کیا کہ میں نے ابوصالح سے ابن عباس کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں تم انہیں روایت نہ کرو۔ ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی شیعہ تھے، حضرت ابوحمزہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت علی وہاں بیٹھے تھے تو جبریل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علی پر نازل کر دی۔ ابوحمزہ کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریع کے سامنے نقل کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں۔ اور حافظ ابن حبان فرماتے ہیں کلبی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو کہتے ہیں کہ حضرت علی کی وفات نہیں ہوئی دوبارہ واپس آئیں گے۔ حافظ ذہبی اس کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج بہ کتابوں میں اس کا ذکر بھی نہ آنا چاہیے چہ جائیکہ ان کو استدلالی شخصیت کہا جائے۔

یہ ہے اس روایت کا حال جو اس آیت کے پس منظر میں ہمارے شارحین قرآن نے لکھ رہا ہے اور جس کا ہمیں احساس بھی نہیں ہے کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں۔

آئیے قرآن کو اس منظر سے الگ ہو کر پڑھیے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کو جب انقیاد میسر نہیں آتا ہے وہ اسلام کے سیاسی نظام کی موجودگی میں دوسرے نظاموں پر متوجہ رہتا ہے۔ لیکن جب مقام انقیاد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر قلب ہر طرف سے ہٹ کر اسلام ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن پر بھی ایمان ہو، رسول کی بھی تصدیق ہو پھر اپنے معاملات میں، اپنے تمدنی مسائل میں کسی اور کی طرف نظر بھی ہو کیا یہ بیک دو متضاد باتیں نہیں اور کیا یہ یہود کی طرح ایمان و کفر کا اجتماع نہیں ہے۔ کیا وثوق و اعتماد اسی کا نام ہے کہ قرآن جو راہ بتائے اور اللہ کا رسول جو کچھ پیش کرے اسے قبول نہ کیا جائے۔ قرآن کا فتویٰ ہے۔

ویقولون آمنا باللہ و بالرسول و اطعنا ثم یتولیٰ فریق منھم من بعد ذالک وما اولئک بالمومنین واذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق

یاتوا الیہ مذعنین فی قلوبھم مرض ام ارتابوا ام یخافون ان یحیف اللہ علیھم و رسولہ بل اولئک ھم الظالمون انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا و اولئک ھم المفلحون۔

اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم مے اللہ اور اس کے رسول کو مان لیا اور ہم ان کے فرمانبردار ہو گئے اس کے بعد پھر ان میں سے ایک جماعت پھر جاتی ہے اور یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ اور جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ و رسول کی طرف تاکہ ان میں فیصلہ کرے تب ایک فریق ان میں منہ موڑ لیتا ہے اور اگر ان کا کچھ بنتا ہو تو یہ اس کی طرف مطیع ہو کر آئیں۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی روگ ہے یا شک میں پڑ گئے ہیں اور یا پھر ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ و رسول زیادتی کرے گا کچھ بھی نہیں بلکہ یہی لوگ ظلم کار ہیں۔ اہل ایمان کا بول تو یہی ہوتا ہے جب بھی ان کو اللہ و رسول کی طرف بلایا جاتے تاکہ ان کا فیصلہ کرے تو ان کا کہنا یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے کہا مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

قرآن کی ان آیات کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے کہ قرآن کے نزدیک اس ایمان کی کیا قیمت ہے جس میں اسلام کے سیاسی نظام کے لیے انقیاد نہ ہو۔ یہاں قرآن بتا رہا ہے کہ ظاہر و باطن ایسے دو جدا گانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ دونوں کا باہم ایسا گہرا ربط ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعتقادِ باطن اعمالِ ظاہرہ کا مقتضی ہے تو اعمالِ ظاہرہ اعتقادِ باطن کے ممد و معاون ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص اعتقاد رکھتا ہے ان الحکم الا للہ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ تو اس کے عقیدہ کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے معاملات اور تمدنی مسائل میں اللہ کی بندگی کا نمونہ بن جائے جب وہ اس اعتقاد و یقین کے مطابق عمل کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر ایک نئی روح داخل ہو رہی ہے اور جتنا اس کا یہ عمل ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں طاعت و بندگی کا جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کو مثال سے سمجھیے کہ ایک شخص تواضع کو نیک خصلت سمجھتا ہے تو اس کا مخلوق سے تواضع کا معاملہ یقیناً اس کے اعتقاد میں اور پختگی کا باعث ہوتا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صفاتِ قلبیہ جس قدر بھی ہیں ان میں ایمان بما انزل اللہ بھی داخل ہے سب کا حال یہی ہے۔ پہلے وہ انسان کو جنبشِ عمل کے لیے مضطر کرتی ہیں اور جب جوارح مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں تو ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کر دیتے ہیں۔ ایمان ایک عقیدہ ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اعمال کا رخ اس کے

مطابق ہو اور جب اعمال اس تقاضا کو پورا کرنا شروع کر دیں تو یہ عقیدہ تروتازہ اور راسخ ہونے لگتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ حسن بصری سے نقل کرتے ہیں۔

ایمان صرف ظاہرداری کا نام نہیں ہے اور صرف آرزوؤں کو بھی ایمان نہیں کہتے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جاتے اور اعمال بھی اس کی تصدیق کریں۔

مقصد یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیات قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ اب اگر بندہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے قلبی تصدیق کی دلیل ہوگی ورنہ اس کی بدعملی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد ہوگی۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ ایک شخص اسلام کے سیاسی نظام کو مانتا ہے۔ یہ ایمان بما انزل اللہ ہے۔ اس کے ساتھ اگر وہ معاملات زندگی اور تمدنی مسائل میں قرآن وسنت کو جج تسلیم کر کے اپنے مسائل کا فیصلہ اس سے کراتا ہے تو یہ نیک عملی ہے اور تحاکم الی اللہ والرسول ہے اور اگر ایمان بما انزل اللہ کا مدعی ہو کر اپنے معاملات طاغوت کے پاس لے جاتا ہے تو یہ بدعملی ہے اور تحاکم الی الطاغوت ہے۔

یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو لہٰذا یہ آیت اس معنے میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم وملزوم ہیں اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے [1]

دراصل یہاں قرآن نے الم تر کی تعبیر اختیار کر کے اپنے مخاطبوں کو یہ بتا دیا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی ایک اپوزیشن وہ تھی جس کا چہرہ تمہارے سامنے یومنون بالجبت والطاغوت میں پیش ہو چکا ہے یہ کفر خالص ہے اور ایک اپوزیشن یہ ہے جو خدا کو، قرآن کو خدا کے رسول کو مان کر بھی یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت یعنی اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ یہ اپوزیشن منافقوں کی ہے یعنی ہر ایسا شخص جو ایمان کا مدعی ہو کر اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ان کی مد مقابل قوتوں کو حاکم مانتا ہو منافق ہے۔ احادیث صحیحہ سے اس کی توضیح ہوتی ہے۔ اس موضوع پر اس کثرت سے

---

[1] تفہیم القرآن

حدیثیں موجود ہیں اور عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ تدوینِ کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہو گی۔

مسندِ امام احمد کی ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے پورے سیاسی نظام کے لیے اسلام کا نظامِ عمل یہ بیان فرمایا ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لوگو! میں تم کو ان پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کر دو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہو گا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو۔ اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

اس ارشادِ نبوت میں جس بات پر بنیادی طور پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے تئیں ایمان و اسلام کا مدعی ہو کر اسلام کے سیاسی نظام سے منسلک نہیں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ بات بالکل قرآن کی اس آیت کی رُوح کے مطابق ہے۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جو اپنے ایمان کا زعم رکھتا ہے اور اپنے معاملات اور تمدنی مسائل کو اسلام کے سیاسی نظام سے وابستہ کرنے کی جگہ طاغوتی نظام سے وابستہ کرتا ہے وہ ایمان کا جھوٹا مدعی ہے اور ارشادِ نبوت میں بھی یہی بات ایمان کی جگہ اسلام سے متعلق کہی گئی ہے۔ ایمان کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور اسلام کا عالمِ شہادت سے۔ اللہ کی ذات دانائے غیب ہے اس نے عالمِ غیب کے بارے میں بات فرمائی اور نبی کی ذات کے سامنے عالمِ شہادت ہے اس لیے آپ نے اسی عالم کی بات فرمائی ہے۔

آخر میں فرمایا وقد امروا ان یکفروا بہ مطلب یہ ہے کہ حالانکہ ان لوگوں کو اللہ نے طاغوت کا منکر بن کر رہنے کا حکم دیا تھا یعنی ان سے کہا گیا تھا کہ اسلام کے سیاسی نظام کے مقابلے میں تمہیں اپنی زندگی میں افکار میں اعمال و اخلاق میں طاغوت کا باغی بن کر رہنا ہو گا اور پوری زندگی طاغوت سے کافرانہ تعلقات کی اساس پر قائم کرے گا۔ تمام نبیوں کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا گیا تھا۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔

بلاشبہ ہم نے ہر اُمت میں پیغمبر روانہ کیا تاکہ لوگوں کو بتائے کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ مدعیانِ ایمان، زبانی دعوے کی حد تک تو ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے اعمال گواہی دے رہے ہیں کہ اللہ سے ان کے کافرانہ اور طاغوت سے ان کے مومنانہ تعلقات ہیں۔
آخری فقرے میں اس ایمان بالطاغوت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کو اس معاملہ میں شیطان کی قیادت حاصل ہے اور شیطان کی خواہش یہی ہے کہ وہ ان کو ہدایت سے ہٹا کر ضلالت میں ایسے فاصلے پر رے جائے جہاں سے پیچھے ہٹنے اور ہدایت پر آنے کا امکان نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت حاصل ہے اور انہوں نے اسی قیادت کی برکت میں اسلام کا سیاسی نظام حاصل کیا ہے اور ان کے مقابلے میں ان مدعیانِ ایمان کو پیش کیا ہے جن کو شیطان کی قیادت حاصل ہے اور اسی قیادت کے نتیجہ میں ان کی نگاہوں نے طاغوت کا سیاسی نظام پسند کیا ہے۔ اور اپنے معاملات میں اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے یہود کے سرداروں اور ان کی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ ما انزل الیک یعنی جو کچھ محمد رسول اللہ لے کر تشریف لائے ہیں کے مقابلے میں انسانوں کا بنایا ہوا نظام حیات تو درکنار اگر خود ما انزل من قبلک بھی پیش کیا جائے یعنی حضرت موسیٰ کا نظام حیات بھی لایا جائے یہ بھی ضلالت ہے ارشاد ہے:

والذی نفس محمد بیدہ لو بدا لکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل　　(رواہ الدارمی)

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر آج موسیٰ کا بھی ظہور ہو جائے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے چل پڑو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسلام کے مصادرِ قانون سے روگردانی

۱۰۵۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تم اللہ کی طرف اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو اپنے سے کتراتے دیکھو گے۔ یعنی جب کسی جھگڑے میں منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو حکم نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور اس کے رسول کے روبرو اپنے جھگڑے لاؤ تو ظاہر ہیں چونکہ اسلام کے مدعی ہیں اس لیے صاف طور پر تو انکار نہیں کر سکتے مگر آپ کے پاس آنے سے اور حکم الٰہی پر چلنے سے بچ جاتے اور رکتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے۔ اور رسول کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اپنا جھگڑا لے جائیں۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مقدمہ میں انہیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو گا اس کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے تھے مگر جس مقدمہ میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو گا اس کو آپ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر ورنہ ہر اس قانون، ہر اس رسم و رواج اور ہر اس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انہیں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔[1]

سنت کے ماخذ قانون ہونے کی اہمیت

یہ بات اسی جگہ تیسری بار دہرائی گئی ہے پہلے فرمایا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول دوسری بار فرمایا ردوہ الی اللہ والرسول اب تیسری بار ارشاد ہو رہا ہے تعالوا الیٰ ما انزل اللہ والی الرسول۔ ظاہر ہے کہ ما انزل اللہ سے اگر قرآن مراد ہے تو الرسول سے سنت مراد ہے۔ یہاں الی ما انزل اللہ والرسول کی تعبیر کو چھوڑ کر والی الرسول کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ رسول کی سنت اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کا دوسرا ماخذ ہے اور بڑا ہی اہم ماخذ ہے افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے ایک گروہ اس کی اہمیت کم کرنے اور اس کے قانونی حجت ہونے کے پہلو کا انکار کر کے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار برپا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب ان لوگوں سے جو ایمان کے مدعی ہو کر طاغوتی نظام کو عملاً اپنانے میں کہا جاتا ہے کہ آؤ اسلام کے اس سیاسی نظام کو اپناؤ جس کے قانونی ماخذ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہیں تو یہ منافقین طرح دے جاتے ہیں۔

اس آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ جو ایمان کا دعویٰ کر کے اسلام کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ معاملات تمدن، اور زندگی کے مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو وہ قرآن کی نظر میں منافق ہے۔ اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی اسلام کا سیاسی نظام ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان طاغوت کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور

[1] تفہیم القرآن

اس کی راہ میں ہر قربانی کے لیے آمادہ ہو جائے۔

اسلام کے سیاسی نظام کی کامیابی

۱۰۶۱۔ اس وقت ان پر کیا گزرے گی جب ان کے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑے گی۔ پھر آپ کے پاس یہ کہہ کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ بخدا ہم تو صرف بھلائی کے خواہاں اور میل ملاپ چاہتے تھے یعنی یہ تو سب کچھ ہوا مگر یہ منافق لوگ اس وقت کیا کریں گے جس وقت پہنچنے لگے ان کو ان کے کرتوت کا یعنی فصل خصومات میں آپ کے پاس جو آنے سے رکتے اور بچتے ہیں جب اس کا عذاب ان پر آنے لگے تو پھر یہ منافق اس وقت کیا کر سکتے ہیں اس کے سوا کہ آئیں رسول کی خدمت میں قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں صرف اس لیے گئے تھے کہ شاید وہ باہم صلح اور ملاپ کرا دیں۔ رسول کے ارشاد سے اعراض کرنا اور جان بچانا ہرگز ہم کو منظور نہ تھا۔ [1]

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمارے خیال میں اس تصویر میں حضرت عمرؓ کو داخل کرنے کی خوبصورت کہانی کلبی کے دماغ کی اختراع ہے جسے ہمارے مفسرین نے شرف پذیرائی عطا کر رکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آج تو ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات میں طاغوت کی طرف نہ جاؤ۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آؤ یعنی اسلام کا سیاسی نظام اپناؤ، ایمان کا تقاضا یہی ہے مگر وہ کترا جاتے ہیں لیکن اس وقت وہ کیا کریں گے جب ان کی شرارتوں کی پاداش میں ان پر ایسا وقت آئے گا کہ یہ لوگ آپ کے پاس آئیں گے اور قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں کسی بری نیت سے نہیں بلکہ بھلائی اور باہمی سازگاری کی خاطر کرتے رہے ہیں۔

جس عذاب کے آنے کی یہاں ان کو خبر دی گئی ہے۔ اس کا تعلق بعد میں آنے والے اس زمانہ سے ہے جب کہ اسلام کا سیاسی نظام غالب ہو جائے گا اور طاغوت کی سیاسی طاقت بالکل کمزور ہو جائے گی اور اہل ایمان سے کہہ دیا جائے گا کہ منافقین کے بارے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش بدل دو۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اسلام کا سیاسی نظام طاقتور ہو گیا اور مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کی جامہ تلاشی ہونے لگی۔ منافقین اس صورت حال سے پریشان ہوئے نہ طاغوتی نظام میں جو یہودیوں کا قائم کردہ تھا اتنا دم خم باقی رہا تھا کہ ان کی سرپرستی کر سکے اور نہ مسلمان ان کی

[1] افادات شیخ الاسلام

جہالتوں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں آتے اور قسمیں کھا کھا کر آپ کو یقین دلاتے کہ وہ یہود کے طاغوتی نظام سے اب تک جو ربط و ضبط رکھتے تھے اور گاہ گاہ اپنے معاملات میں ان کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس میں کسی فسادِ نیت کو دخل نہیں ہے بلکہ ان کی خواہش صرف یہی رہی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور مسلمانوں اور یہود کے مابین اختلاف کی جو خلیج حائل ہو گئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس کو احسان و توفیق کے خوبصورت الفاظ سے تعبیر کرتے لیکن واقعات کے طشت از بام ہو جانے کے بعد اس سخن سازی کا موقعہ بالکل نکل چکا تھا۔

منافقین کو نصیحت کرنے کی ہدایت

۱۰۷ - یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے حال کو اللہ خوب جانتا ہے تم ان سے بے رُخی برتو۔ ان کو نصیحت کرو اور ان سے اس انداز سے بات کرو کہ بات ان کے جی میں اتر جائے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی قسم اور ان کی معذرت سابقہ کی تکذیب فرمائی کہ منافقین جو کچھ زبانی باتیں بنا بنا کر بتاتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کی باتیں خوب معلوم ہیں۔ یعنی ان کے نفاق اور ان کے جھوٹ کو خوب جانتا ہے لہٰذا آپ بھی علمِ خداوندی پر بس کر کے منافقوں کی بات سے تغافل کیجئے اور ان کی بات کی پروا نہ کیجئے۔ مگر ان کو نصیحت کرنے اور کام کی باتیں بتانے میں ہرگز کوتاہی نہ فرمائیے۔ اور ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہو جیئے۔[1]

اس آیت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ان کا نفاق اور ان کے دلوں کے روگ کا معاملہ تو آپ اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ احسان و توفیق سے یا منافقت اور طاغوت پرستی کا جذبہ ہے۔ اس معاملہ کو تو اللہ پر چھوڑ دیں کہ اس کا تعلق مافی قلوبھم سے ہے آپ تو ان سے وہ معاملہ فرمائیے جو قانون کا تقاضا ہے۔

اوّل یہ کہ آپ ان کی اس حرکت سے بے رُخ ہو جائیں اور ان پر اس کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کریں اور اس پر ان کی کوئی گرفت نہ کریں۔ ابن کثیرؒ نے فاعرض عنھم کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ لا تعنفھم

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

علی ما فی قلوبھم بلکہ بعض شارحین قرآن نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اپنے علم کے مطابق آپ ان کے سامنے ان کے منافق ہونے کو بھی نہ جتائیں اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اب تک جس کریمانہ اخلاق کا آپ ان کے لیے اظہار فرما رہے تھے۔ اب ذرا وہ اکرام و بشاشت نہ اختیار کیجئے مگر زبان سے ان کو کچھ نہ فرمائیے۔

دوم یہ کہ ان کو نصیحت و وعظ فرمائیے۔ یعنی ان کو نصیحت اور فہمائش خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کیجئے اور ان کی ایمان فروشیوں پر پند و نصیحت کی ایسی باتیں کہیئے کہ ان کے دلوں میں اتر جائیں۔ یہ اعراض، یہ وعظ اور یہ قول بلیغ کی احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ ان لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ
ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَــرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِــيْمًا ۝ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْھُمْ ۭ وَلَوْ
اَنَّھُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝
وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰھُمْ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ
اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِــيْمًا ۝ ع ۹

اور جو رسول بھی ہم نے روانہ کیا ہے وہ اسی لیے روانہ کیا ہے کہ

اس کی بحکمِ خدا اطاعت کی جائے اور اگر ایسا ہوتا کہ جس وقت انہوں نے اپنا نقصان کیا تھا تو اسی وقت اگر آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسولِ خدا بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتے تو وہ بلاشبہ اللہ کو اپنے گناہوں کے لیے بخشنہار اور رحمت کرنے والا پاتے[108]۔ لہٰذا قسم ہے آپ کے رب کی کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام جھگڑوں اور قضیوں میں آپ کو اپنا حاکم اور فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سراپا تسلیم ہو جائیں[109]۔ اگر ہم ان کو حکم دے دیتے کہ اپنے کو قتل کر ڈالو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل پیرا ہوتے۔ اور اگر جس بات کی ان کو نصیحت کی جاتی اس کو اپناتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری ہوتی اور یہ ان کی زیادہ

ثابت قدمی کا باعث ہوتا اور جب یہ لوگ ایسا کرتے تو ہم ان کو اپنی جانب سے اجرِ عظیم عطا کرتے اور ان کو سیدھی راہ دکھا دیتے"[۱۱] - اور جو شخص بھی اللہ اور رسول کی طاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور ان لوگوں کی رفاقت کیسی اچھی ہے"[۱۱۱] - یہی وہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور اللہ ہی بندوں کا حال جاننے کے لیے کافی علم کافی ہے"[۱۱۲] -

نبی کی طاعت شرطِ ایمان ہے

اسلامی مملکت کی فطرت و ماہیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد اصلی افراد کی تکمیل ذات اور انسانی کی اجتماعی خودی کی نشو و نما ہے اس لیے اس مملکت پر معاشی اغراض اور مادی آسائشوں کا تصور غالب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انفرادی شخصیت اور اجتماعی سیرت کا کوئی مکمل نمونہ پہلے ہی سے افرادِ مملکت کے سامنے موجود ہو کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرۃ کا معیار متعین کرنا دشوار ہو جاتے گا۔ نیز یہ سوال کہ شخصیت کے لوازم و صفات اور اجتماعی سیرۃ کے نقش و نگار کیا ہوں اور کس طرح کی شخصیت کا ارتقا مطلوب ہے۔ بحث و نظر اور اختلاف و نزاع کا ایک ایسا دروازہ کھول دے گا جس کی وجہ سے مملکت اور افراد کے اخلاق نصب العین کی بابت لوگ کسی ایک رائے پر متفق نہ ہوں گے۔ یورپ کی اجتماعی زندگی کو جس

یہ چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور جس کی وجہ سے مغربی یورپ کی جمہوریتوں میں انتشار آفرین عناصر تقویت حاصل کرتے گئے وہ اس اتفاق رائے کا فقدان ہے۔ اول تو ابتداء ہی سے مذہب و اخلاق کو مملکتی اور اجتماعی زندگی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ پھر جن دائروں میں شخصیت کی نشو و نما کے لیے مذہبی اصولوں اور اخلاقی مقاصد کو تسلیم کیا گیا ان میں بھی آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس قسم کی شخصیت کا ارتقا مطلوب ہے اور کس طرح سیرت کو معیار قرار دیا جائے۔ اسلامی مملکت میں اس قسم کے نزاع کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اس مملکت کے افراد پہلے ہی اس امر پر متفق ہیں کہ سیرت کا معیار اور شخصیت کے لوازم و صفات کیا ہونے چاہئیں۔ قرآن نے مسلمانوں کے سامنے رسُول کی شخصیت و سیرت کو ایک نمونہ بنایا ہے اور بتایا ہے کہ شخصیت کا نشو و ارتقا اسی نمونہ کے مطابق ہونا چاہیے۔

رسُول کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہے اور شرطِ نجات ہے۔ ان آیات میں قرآن نے رسُول کی اسی حیثیت کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ نبوت آتی ہی اس لیے ہے کہ بحکم خدا اس کی طاعت کی جائے اور پھر بتایا ہے کہ یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہونی چاہیے بلکہ دل کی پوری رضا سے ہونی چاہیے۔ اس کے بعد واضح کیا ہے کہ ایسا ہونا کیوں ضروری ہے۔

۱۰۸۔ اور جو بھی رسُول ہم نے روانہ کیا ہے وہ صرف اسی لیے روانہ کیا ہے کہ اس کی بحکمِ خداوندی طاعت کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا کہ جس وقت انہوں نے اپنا نقصان کیا تھا تو اسی وقت اگر آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگ لیتے اور رسُول خدا ان کے لیے معافی کی درخواست کر لیتے تو وہ بلاشبہ اللہ کو اپنے گناہوں کے لیے بخشنہار اور رحمت کرنے والا پاتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس رسُول کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے سو اسی غرض سے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں تو اب ضرور تھا کہ یہ لوگ رسُول کے ارشاد کو بلا تامل پہلے ہی سے دل و جان سے تسلیم کرتے اور اگر گناہ اور بُرا کرنے کے بعد بھی متنبہ ہو جاتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسُول بھی ان کی معافی کی دعا کرتا تو پھر بھی حق تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتا مگر انہوں نے یہ غضب کیا کہ اول تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو بعینہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا ہٹے اور نیچے پھر جب اس کا وبال ان پر پڑا تو اب بھی متنبہ اور تائب نہ ہوتے بلکہ لگے جھوٹی قسمیں کھانے اور تاویلیں گھڑنے پھر ایسوں کی مغفرت ہو تو کیوں کر ہو[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت کی یہ تشریح اُس ذہنی تحفظ کی بنا پر ہے جو اس آیت کے پس منظر کے متعلق کلبی کی روایت نے پیدا کیا ہے ورنہ اگر آپ آیت قرآنی کا اس پس منظر سے علیحدہ ہو کر مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں کسی انفرادی اور شخصی واقعہ پر تبصرہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک گروہ کے متعلق بات ہو رہی ہے گروہ بھی وہ جو ایمان کا مدعی ہے یعنی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ خدا کو بھی مانتا ہے خدا کے رسول کو بھی مانتا ہے اور قرآن کو بھی خدا کی کتاب مانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کو بطور دین اختیار کرنے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہیں جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ لیکن ان کا گناہ قرآن کی نظر میں یہ اور صرف یہ تھا کہ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت یعنی اپنے معاملات کو فیصلہ کے لیے اسلام کی عدالت میں نہیں بلکہ طاغوت کی عدالت میں لے جاتے تھے اور وہ ایسا شیطان کے اغوا سے کر رہے تھے۔ ان کی عام روش یہ تھی کہ جس مقدمہ میں انہیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کو نبوت کی سرکار میں لے آتے اور جس مقدمہ میں ان کو اندیشہ ہوتا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو نبوت کی سرکار میں لانے سے کتراتے۔ حاصل یہ کہ ان کے دامن میں قرآن کے بیان کے مطابق تحاکم الی الطاغوت کا سنگین گناہ تھا۔ قرآن نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ منافق ہیں کیونکہ ایمان کے مدعی ہو کر وہ ایمان کے سیاسی نظام کو قبول نہیں کرتے۔ ایمان کے لیے ان میں اخلاص وصداقت نہیں ہے۔ قرآن کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوشی خوشی عمل کرتے جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگتے جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا وہ سب سے پہلے مومن تھے۔ جب قربانیوں کا وقت آجاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی نظر نہ آتے۔ طاغوتی نظام سیاست سے سازگاریاں رکھنے میں ان کو کوئی تامل نہ ہوتا وہ سمجھتے تھے کہ دونوں طرف ملے رہنے میں ہی مصلحت ہے اور گرفت ہونے پر وہ اپنی اس مصلحت کوشی کو اس طرح پیش کرتے ان اردنا الا احسانا وتوفیقا۔ یہ وہ نفاق ہے جو ایمان بمعنے اخلاص کے مقابلہ میں آتا ہے۔ یہ وہ نفاق نہیں ہے جو ایمان بمعنے تصدیق کا مدمقابل ہے۔ یہ کفر خالص ہے اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں حکم ہوا ہے کہ

۱- آپ ان سے اعراض کرلیں یعنی ان کو سزا دینے کے بارے میں کوئی قدم نہ اٹھائیں

۲- ان کی ایمان فروشیوں پر ان کو نصیحت کریں اور نصیحت بھی ایسی کہ ان کے جی میں اتر جائے

اب اس آیت میں ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ نبی تو روانہ ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کی بلا قید اور بلا شرط اطاعت کی جاتے اور زندگی کے ہر گوشہ میں کی جائے۔ یہ الفاظ اپنے اندر کیسا بلیغانہ

عموم رکھتے ہیں ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ یعنی تم لوگوں کو جو پیغمبر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جس کسی کو بھی ہم نے منصب رسالت دے کر روانہ کیا ہے تو اسی لیے کیا ہے کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ یعنی ہر نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہی لوگوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے فاتقوا اللہ واطیعون اور ایسا ہونا ضروری ہے۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس کی عبادت کا طریقہ معلوم کرنے اور اس کے احکام جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور بغیر اللہ کی عبادت کے کوئی شکل ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل پر نہیں پہنچ سکتے اور آلات پرواز استعمال کیے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے تو نبی کی ساری باتوں کے مانے بغیر اللہ کی عبادت بھی نہیں کر سکتے۔

رسُول کی عصمت

پھر آیت میں بلا قید اور بلا شرط رسُول کی طاعت کا اعلان بتا رہا ہے کہ رسُول معصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں نہ اعمال و اخلاق کی لغزشیں، نفس و شیطان کی دراندازیوں سے اس کے جذبات، اخلاق و افکار اور اعمال سبھی پاک ہوتے ہیں۔ نبی معصوم اس لیے نہیں ہوتا کہ اس میں غلط سوچنے اور غلط کام کرنے کی استعداد ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس حقیقت واقعی یہ ہے کہ ہر شخص کی طرح نبوت میں بھی یہ استعداد طبعی طور پر لازماً موجود ہوتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس صلاحیت کو اپنی کارکردگی دکھانے میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نبی کی فکر و بصیرت حد درجہ کامل ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکام الٰہی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعے مزید احکام نکال لینے کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی حس، اس کا خوف خدا اور اس کا اندیشۂ آخرت اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ گناہ کے محرکات سر ہی نہیں اٹھا پاتے۔ لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ نبی کے معصوم ہونے کی صرف یہی وجہ نہیں ہے بلکہ یہاں ایک اور چیز بھی ہے جو انہیں اس مقام عصمت تک پہنچاتی ہے اور وہ ہے اللہ سبحانہٗ کی خصوصی نگرانی یہی نگرانی ہے جو انہیں فکر و اجتہاد کی غلطیوں سے بھی بچائے رکھتی ہے اور اخلاق و عمل کی کوتاہیوں سے بھی۔

غور کرو تو خود محسوس ہوگا کہ نبوت کی عصمت اس مقصد کے لیے بالکل ناگزیر تھی جس کی خاطر رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے ایسا شخص لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ کیوں کر بن سکتا ہے جو خود معصوم نہیں ہے جس کا اپنا دامن دھبوں سے پاک نہ ہو وہ دوسروں کو کیا دکھا کر تلقین کر سکتا ہے کہ تمہیں اپنے دامنوں کو اس طرح پاک رکھنا چاہیے۔ حالانکہ نبوت کا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک نبی اپنے پیروؤں کے سامنے اسلام کا اور احکام الٰہی کی کامل طاعت کا عملی نمونہ پیش نہ کرتا رہے۔

بہرحال نبی کے مطاع ہونے اور زندگی کے ہر گوشہ میں واجب الطاعت ہونے کا تقاضا اور لازمہ یہ ہے کہ نبی معصوم ہو۔

یہ سمجھانے کے بعد کہ رسالت پر ایمان لانے کا یہ ایک کھلا ہوا اور بڑا بنیادی تقاضا ہے کہ رسول کی کامل اطاعت کی جائے۔ ایسی طاعت جس میں کوئی قید و شرط نہ ہو ان کو ان کی اس بے راہ روی پر جس کا مظاہرہ وہ تحاکم الی الطاغوت کی صورت میں کر کے نبی کی طاعت سے روگرداں ہوتے ہیں بڑے بلیغ اور موثر انداز میں سمجھایا ہے کہ اگر وہ اپنی اس بدعنوانی پر غلط تاویلوں کا پردہ ڈالنے کی جگہ سیدھے طور پر کھلے بندوں اپنے جرم کا اقرار کرتے اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اللہ سے اپنے اس سنگین جرم کی معافی مانگتے اور اللہ کا رسول بھی ان کے لیے مغفرت مانگتا تو پھر ان کے اس گناہ کی بخشش ہو جاتی اور آئندہ کے لیے اللہ ان کو نیکیاں کرنے کی توفیق عطا کر دیتا۔ دیکھئے وعظ و نصیحت کے لیے کیسا قول بلیغ اختیار کیا گیا ہے ایسا اسلوب، ایسا طریق خطاب، ایسا لب و لہجہ اس طرح کے الفاظ اختیار کیے گئے ہیں جو مخاطب کے دل کو دکھ پہنچانے والے نہیں ہیں۔ اس قول بلیغ کے ذریعے ان لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ آؤ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اعذار لنگ چھوڑو۔ گزشتہ گناہوں کی معافی مانگ لو۔ گنہ گار کی گنہ گارانہ زندگی کو ظاہر کرنے کے لیے ظلموا انفسھم کیسا لطیف اور محبت سے لبریز انداز ہے۔

ظاہر ہے کہ جب رسول خدا کی حاکمیت قانونی کا مظہر ہے تو اس امر کی گنجائش کسی صاحب ایمان کے لیے نہیں رہ جاتی کہ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے کسی معاملہ کو فیصلہ کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جائے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر بہت بڑا ظلم کرتا ہے اس لیے کہ فی الحقیقت یہ چیز خدا کی حاکمیت کا انکار اور بالواسطہ شرک اور کفر کا ارتکاب ہے۔ چنانچہ ان منافقین سے جو اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ان کے لیے اس کی اصلاح اور اس کے عواقب سے نجات حاصل کرنے کی

واحد صورت یہ تھی کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، خدا سے مغفرت کے طالب ہوتے اور حضور اقدس بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کے ذریعے ان کی سفارش کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کر لیتا۔ اس کے سوا اس سنگین گناہ کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

معافی کے لیے استغفارِ رسول کی شرط

اس جگہ قبول توبہ کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعائے مغفرت کرنے کی شرط غالباً اس لیے ہے کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر حملہ کیا تھا اور آپ کے فیصلہ کو نظر انداز کر کے آپ کو ایذا پہنچائی اس لیے ان کے جرم کی توبہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری اور حضور انور کے استغفار کو شرط کر دیا گیا۔[1]

اس کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ رسول کا یہ استغفار ان کے لیے اس دنیا میں بمنزلہ شفاعت ہے جس سے ان کے اس گناہ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے ان کا تحاکم الی الطاغوت رسول کی صریح توہین ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ وہ رسول کی رضا اور ان کی دعا بھی حاصل کریں۔[2]

اسلام کے سیاسی نظام کو ماننا شرطِ ایمان ہے

۱۰۹ ۔ لہٰذا قسم ہے آپ کے رب کی کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام جھگڑوں میں آپ کو اپنا حاکم اور فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سراپا تسلیم و رضا ہو جائیں۔ یعنی منافق لوگ کس بیہودہ خیال میں ہیں اور کیسے بیہودہ حیلوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ تم کو اے رسول اپنے تمام چھوٹے بڑے مالی جانی نزاعات میں منصف اور حاکم نہ مان لیں گے کہ تمہارے فیصلے اور حکم سے ان کے جی میں کچھ تنگی اور ناخوشی نہ آنے پائے اور

---

[1] معارف م ش [2] تدبر قرآن ۔

تمہارے ہر حکم کو خوشی کے ساتھ دل سے نہ قبول کریں گے اس وقت تک ان کو ہرگز ایمان نصیب نہ ہوگا اب جو کچھ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرلیں۔[1]

اس آیتِ گرامی میں نبوت کو حاکم اور قاضی کی حیثیت سے پیش کرکے یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک رسول کو حاکم اور قاضی نہ مان لے اور صرف مان لینا ہی مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ مان لینے کے بعد عملی زندگی میں اس کے فیصلہ پر اپنے اندر کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اپنے آپ کو اس کے لیے سراپا تسلیم ہوجائیں۔ اصل یہ ہے کہ جب تک افراد کے باہمی تنازعات اور مملکت اور افراد کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے کوئی حاکم نہ موجود ہو اس وقت تک معاشرہ یا مملکت میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس حکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ افرادِ مملکت اور مملکت یا خود افراد کی مختلف جماعتیں اور پارٹیاں اس کے عدل وانصاف اس کی غیر جانبداری پر مطمئن ہوں۔ نیز اس کی اصابتِ رائے اور صحتِ فکر ان سب کے نزدیک اتنی مسلم ہو کہ وہ اس کے فیصلوں میں غلطی یا خطا کے امکان کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ اس شرط کی تکمیل کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت سے نہیں ہوسکتی کیونکہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی صاحب الرائے کیوں نہ ہو غلطی سے بری نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً جبکہ تمدنی اور معاشرتی امور میں انسان کے شخصی امیال وعواطف اس کا انفرادی نقطہ نظر جو خود اسی کے ذاتی تجربات پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی ذہنی خصوصیات اس کی رائے یا فیصلہ کی تشکیل میں دخیل ہوتے ہیں۔ جماعت کے فیصلوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ان حالات میں ان شرائط کی تکمیل صرف وہ ہی ذات کرسکتی ہے جو معصوم ہو کیونکہ انسانی جذبات وخواہشات اور انسانی تعصبات اور جنبہ داریوں سے صرف ایسی ہی ذات پاک ہوسکتی ہے جو نبوت کے زیور سے آراستہ ہو۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس مملکت کی اساس نبوی ہدایات اور وحی پر مبنی قوانین وضوابط نہ ہو وہ انسانیت کی فلاح معاشرے کے استحکام اور تمدنی امن وعافیت کا ذریعہ نہیں ہوسکتی۔ نبوت کی ذات ہی وہ حکم ہے جسے ایک مرتبہ تسلیم کرلینے کے بعد انسان اپنے اختلافات اور نزاعوں میں اس سے رجوع کرسکتا ہے کیونکہ رسالت کا ماخذ ایک مافوق الانسان ہستی کا ارادہ ہے اور اس کی نسبت ایک ایسی ذات کی طرف ہوتی ہے جو خطا اور لغزش سے پاک ہے۔ جس مملکت کے افراد اپنی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

سیاسی زندگی کی بنیاد نبوت کی راہ سے آئے ہوئے قوانین پر رکھتے ہیں اس کے اندر اختلافات کبھی اس حد تک نہیں پڑھ سکتے کہ وہ پورے معاشرتی اور سیاسی نظام کو خطرہ میں ڈال دیں کیونکہ ایسی سوسائٹی میں افراد کی مختلف جماعتوں یا افراد اور مملکت میں کوئی نزاع واقع ہو جاتے تو نبوت ان میں تصفیہ کرنے کے لیے موجود ہے۔

اس آیت میں نبوت کی جس حاکمانہ حیثیت کو بتایا ہے اس کا حکم صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اس بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں [1]

اس آیت میں بتایا ہے کہ ایمان کی شرط یہ ہے کہ ہر معاملہ میں اپنا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرانا چاہیئے اور جو فیصلہ وہ فرمائیں اس کو حق جان کر دل وجان سے اس کو مان لے اور دل سے اس پر راضی ہو اور دل میں اس سے کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائے جب تک دل وجان سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر راضی ہو اس وقت تک ایمان صحیح نہیں محض ظاہری اطاعت ایمان کے لیے کافی نہیں بلاشبہ نفاق ہے [2]

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علو مرتبت کے اظہار کے ساتھ آپ کی اطاعت جو بے شمار آیات قرآنیہ سے ثابت ہے اس کی واضح تشریح فرمائی ہے۔ اس آیت میں قسم کھا کر حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈے دل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے کہ اس کے دل میں بھی اس فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائی جائے [3]

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے ،

[1] تفہیم القرآن [2] معارف م ا [3] معارف م ش

جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والے تمام نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں۔ پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جاتے کہ وہ تمہارے فیصلے کو بلا چون وچرا پورے اطمینان قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثنا و تحفظ کے تمہارے حوالہ کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنے ہے اس وجہ سے اس کا حق صرف طاعت سے ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے[1]

چونکہ اسلامی نظام ایک الہامی نظام ہے اور اس کے مقابلے میں طاغوتی نظام انسانوں کا بنایا ہوا نظام ہے خواہ وہ جمہوری ہو یا اشتراکی یا آمریت پر مبنی۔ اسلامی نظام کی بنیاد قرآن حکیم اور اسوۂ رسول پر ہے۔ قرآن اگر انسانی فکر کی نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہے تو پیغمبر بھی انسانوں کا فرستادہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہے جس کے بارے میں تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے اس لیے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ رسول کو خدا کا رسول ماننے کے بعد انسانی اختلافات تمدن و معاشرت کی تمام نزاعوں اور زندگی کے سارے مسائل میں طاغوتی نظام سے ہٹ کر اللہ کے رسول کو حکم اور حج تسلیم کریں اور اس کا جو بھی فیصلہ ہو اس کو بخوشی قبول کریں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اختلافات اور مسائل زندگی کے حج اور فیصل تسلیم نہ کرے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کی حقیقت اور اس کا اصلی مستقر، حکمرانوں کی ذمہ داریاں، ان کے اقتدار کے حدود افراد کے حقوق و فرائض اور ان کی ذمہ داریاں ان سب کے بارے میں رسالت کا فیصلہ ہی اصل فیصلہ ہے۔ اس کی موجودگی میں اب مسلمانوں کا کسی اور طرف دیکھنا ایمان بالرسالت کے منافی ہی نہیں بلکہ شرک فی الرسالت کے مترادف ہے۔

آخر میں ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما کہہ کر اشارہ کر دیا کہ اس طاعت گزاری اور نبوت کے لیے فرمانبردار ہونے اور اس کو حاکم ماننے کی بنا جبر، طاقت، استبداد نہیں بلکہ محبت، شفقت، رحمت ہونی چاہیے۔ یعنی یہ طاعت جو ایک مسلمان نبوت کی کرے وہ خالص محبت کے تقاضے سے کرے نہ کہ کسی جبر سے اور حالات کی سازگاری سے۔

---

[1] تدبر قرآن

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

چنانچہ ایک حدیث میں اسی بات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کے انداز پر ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے یہ ارشاد نقل کیا ہے؛

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ
والناس اجمعین

تم میں کوئی مومن نہیں ہے جب تک کہ میں اسے اپنے بیٹے، اپنے باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔

حافظ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں کمال، جمال اور جود وسخا، یہ تینوں اوصاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں۔ آپ کا کمال اسلام کے نظام حیات سے ظاہر ہے۔ آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے، آپ کی روحانی و جسمانی جود و سخا کا تو اندازہ ہی کون لگا سکتا ہے۔ پھر آپ کی محبت تمام مخلوقات سے زیادہ کیوں نہ ضروری ہو، ماں، باپ، بیٹے کی محبت طبعی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عقلی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آئے ایمان صرف عقائد عملی کا نام نہیں بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے شدہ مومن کا قلب مزین و رنگین ہوتا ہے۔ شفا میں سیرۃ محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ، بھائی، شوہر تینوں شہید ہو گئے، جب اسے خبر ملی تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضرت تو بخیر ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں بخیر ہیں اس نے کہا چلو مجھے دکھاؤ۔ جب اس نے آپ کو دیکھ لیا تو بولی کل مصیبۃ بعدک جلل جب آپ زندہ ہیں تو آپ کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہمیں اپنے مال، اولاد اور والدین اور پیاس میں سرد پانی سے زیادہ پیاری تھی۔ اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کے لیے حرم سے باہر لے چلے تو ابوسفیان بولا کہو زید قسم کھا کر بتلاؤ کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ حضور انور تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے۔ زید نے قسم کھا کر کہا مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے۔ ابوسفیان کہنے لگا میں نے کسی کو اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اس سے محبت کرتے ہیں یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے

صحابہ کرام کو ایسی ہی محبت تھی جیسا کہ حدیث میں موجود ہے۔ بد قسمتی سے اگر کسی کو محبت کا یہ مقام حاصل نہیں ہے تو وہ ان کی محبت میں تاویل نہ کرے جن کو یہ مقام حاصل ہے۔ یہ نبوت کی محبت ہی ہے کہ وہ نبوت کی طرف سے آئی ہوئی بات کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرا بھی دل میں تنگی محسوس کریں تو ان کو اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

اسلامی نظام سے تعلق کا اصلی تقاضا

۱۱۰۔ اگر ہم ان کو حکم دے دیتے کہ اپنے کو قتل کر ڈالو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل پیرا ہوتے۔ اگر وہ اس بات کو اپناتے جس کی ان کو نصیحت کی جا رہی ہے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری ہوتی اور یہ ان کی مزید ثابت قدمی کا باعث ہوتی اور جب یہ لوگ ایسا کرتے تو ہم ان کو اپنی جانب سے اجر عظیم عطا کرتے اور ان کو سیدھی راہ دکھا دیتے۔ یعنی سب جانوں کا مالک چونکہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کے حکم میں کسی کو جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے سو اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو کہیں کہ اپنی جانوں کو ہلاک کر ڈالو اور جلا وطن ہونے کا حکم فرما دیتا جیسے کہ بنی اسرائیل پر حکم کر دیا تھا تو بجا نہ لاتے مگر گنے چنے صرف سچے اور پکے ایمان والے۔ یہ منافق ایسے حکم پر کیسے عمل کر سکتے تھے۔ اب ان کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو ہم نے جو حکم دے رکھے ہیں وہ محض ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ہیں نہ جان کی ہلاکت کا حکم دیا گیا نہ جلا وطن ہونے کا۔ اگر ان ہی سہل اور آسان حکموں پر چلیں تو نفاق بالکل جاتا رہے اور خالص مسلمان ہو جائیں مگر افسوس سمجھتے نہیں ہیں اور موجودہ حالت کو غنیمت نہیں سمجھتے ہیں کہ ذرا سی بات میں دین و دنیا دونوں درست ہو جاتے ہیں۔[1]

یہ خیال رہے کہ جن منافقین کا یہاں چہرہ پیش ہو رہا ہے یہ مہاجرین میں سے نہیں بلکہ زیادہ تو مسلم یہود اور مدینہ کے اطراف میں یہود کے زیر اثر قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کو دیکھ کر حالات کے تحت مسلمان ہو گئے تھے لیکن یہ لوگ اپنے تعلقات شہری زندگی اور تمدنی احوال میں یہود اور قبائلی سرداروں سے بھی، معاملات اور مقدمات کے ذریعے ان سے رکھنا چاہتے تھے۔ قرآن نے ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کو اپنے کو قتل کرنے اور اپنے گھر بار چھوڑ دینے کا حکم دیا جائے تو اس کے لیے ان میں سے بہت تھوڑے آمادہ ہوں گے ان اقتلوا انفسکم او

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اخرجوا من دیارکم ایک معنے میں تو دونوں حکم اب بھی موجود ہیں یعنی جہاد وقتال اور ترکِ وطن یا ہجرت اپنے اپنے موقع پر اور شرائط کے تحقق پر اب بھی واجب ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ احکام خود بھی مقصود ہوتے اور قتال و ہجرت ہر حال میں فرض ہوتے۔ جہاد اول تو خود ہی ایک سخت آزمائش ہے لیکن جب یہ تلوار ان کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے خون و قرابت کے رشتے ہوں اور ان کی حمیت و حمایت کا جذبہ رگ و ریشہ میں سمایا ہوا ہو تو یہ آزمائش سخت تر ہو جاتی ہے اس لیے کہ تلوار اس صورت میں اپنی ہی گردنوں پر چلانی پڑتی ہے چنانچہ بدر کے موقع پر مہاجرین اس آزمائش میں پورے اترے۔ ایسے ہی مہاجرین کو اسلام کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اسی حقیقت کی طرف ان منافقین کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اگر مہاجرین کی طرح ان پر بھی اپنوں کے خلاف تلوار اٹھانا اور گھروں کو چھوڑنا فرض کر دیا جاتا تو اس میدان میں ان میں سے تھوڑے ہی مردانگی کا مظاہرہ کرتی۔ اس صورت میں کتبنا علیھم کی ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تو ان حالات سے دوچار ہونا نہیں پڑا جن سے مہاجرین کا سابقہ پڑا ہے ان سے صرف رسول کی طاعت، آپ کے حکموں کی پابجائی کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ یہ اسی سے پہلو تہی کر رہے ہیں، مگر اکثر شارحین قرآن نے کتبنا علیہم میں ضمیر کا مرجع الناس قرار دے کر مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر ہم لوگوں پر اپنے کو مار ڈالنا اور گھروں سے نکلنا فرض کر دیتے تو چند ہی ہمارے اس مطالبہ کو پورا کرتے اور مطالب بھی بتائے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان کو سمجھایا ہے کہ لو انھم فعلوا یعنی اگر شک و تذبذب اور تزلزل کی راہ چھوڑ کر اطاعتِ رسول میں یکسوئی کے ساتھ لگ جائیں تو انہیں ایمان میں ثبات و استقلال اور اس کی برکتیں خود بخود ہونے لگیں۔ ذکر انہی منافقین اور کمزور ایمان والوں کا ہو رہا ہے فعلوا ما یوعظون یعنی اللہ و رسول کی اپنی زندگی کے سارے مسائل میں طاعت اگر کر لی ہوتی اور طاغوت کی طاعت اختیار نہ کرتے تو لکان خیرا لھم دنیوی، اخروی، انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے وہ کامیاب ہوتے اور تثبیتاً ان احکام پر عمل کر کے خود ایمانی قوت ضعیف سے، قوی اور قوی تر ہو جاتی۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ تجربہ سے ثابت ہے کہ دین کا کام کرتے رہنے سے اعتقاد و یقین کی باطنی کیفیت میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل عامل میں قوتِ یقین کے اضافہ کا سبب ہوتا ہے اعمال ہی کے ذریعے اجمالی علم واضح اور تفصیلی بنتا ہے اور اسی کی راہ سے انسان میں اخلاق و ملکات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اذا لاٰتینٰھم کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ طاعتِ رسول کرتے اور بجائے طاغوت کے اسلام کا سیاسی نظام اپناتے تو پھر ہم اپنے خاص فضل سے ان کو اتنا بڑا اجر

عطا کرتے جس کے اول و آخر کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہوا کہ جماؤ کے بعد کیا ہوگا جواب میں فرمایا تب اللہ کے خزانہ سے اجر عظیم ملے گا اور صراط مستقیم کو کھول دیا جائے گا جو الذین انعمت علیہم کی راہ ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے؟ صراط کے معنے راستہ کے ہیں اور مستقیم استقامت سے بنا ہے۔ اس کے معنے ٹھیک اور سیدھا ہونا ہیں۔ صراط مستقیم ایسا راستہ جو ٹھیک ہو، سیدھا ہو، جس میں اعتدال ہو، افراط و تفریط نہ ہو، زندگی کے تمام گوشوں میں کام آنے والا ہو۔ فرد اور جماعت دونوں کے حق میں اصلاح اور فلاح کی ضمانت دیتا ہو۔ اس میں کجی نہ ہو اور کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ زندگی کے ہر موقعہ پر اور ہر گوشہ کے لیے رہنما ہو، منزل تک پہنچانے والا ہو کشادہ ہو مقصد تک جانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو۔ صراط مستقیم کی یہ حقیقت حافظ ابن القیم نے بتائی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ نبوت کی راہ کا سیدھا ہونا اور طاغوت کی بنائی ہوئی راہوں کا ٹیڑھا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص بلا تکلف معلوم کر سکتا ہے۔ نبوت اگر انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی ہدایات بھی صاف اور واضح ہوں۔ اس میں گنجلک نہ ہو، ناقابل حل معمہ نہ ہو، اعتقاد میں سہل اور عمل میں آسان ہو۔

انعام یافتہ لوگ اور ان کی رفاقت

۱۱۱۔ اور جو شخص اللہ و رسول کی طاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین اور ان لوگوں کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔ نبی وہ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آتی۔ یعنی فرشتہ ظاہر میں آکر پیغام کہہ جاتے اور صدیق وہ کہ جو پیغام اور احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کو آئے اُن کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور بلا دلیل اس کی تصدیق کرے اور شہید وہ ہے کہ پیغمبروں کے حکم پر جان دینے کو حاضر ہو اور صالح وہ ہیں جن کی طبیعت نیکی پر پیدا ہوتی ہے اور بُری باتوں سے اپنے نفس اور بدن کی اصلاح اور صفائی کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چار قسمیں مذکورہ جو اُمت کے باقی افراد سے افضل ہیں ان کے ماسوا جو مسلمان ہیں اور درجہ میں ان کے برابر نہیں لیکن اللہ و رسول کی فرمانبرداری میں مشغول ہیں وہ لوگ بھی انہی کی شمار اور ذیل میں بیے جائیں گے۔ اور ان حضرات کی رفاقت بہت ہی خوبی اور فضیلت کی بات ہے اس کو کوئی حقیر نہ سمجھے۔ اس آیت میں اشارہ ہوگیا کہ

منافقین جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے وہ اس رفاقت اور معیت سے محروم ہیں۔

سورہ فاتحہ میں پڑھ آئے ہو کہ صراط مستقیم انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے۔ اب بات کو زیادہ موثر اور زیادہ بلیغ انداز میں کہا گیا ہے کہ جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا یعنی نبوت کے لائے ہوئے نظام کو زندگی کے مسائل میں اپنائے گا اور طاغوتی نظام سے ہٹ کر رہے گا تو اس کو انعام یافتہ لوگوں کی رفاقت حاصل ہوگی۔ یعنی یہ کوئی تباہی اور بربادی کا راستہ نہیں ہے بلکہ اس پر چلنے والے تو انعام یافتہ ہیں اور جو اس راہ پر چلتا ہے اس کو ان انعام یافتہ لوگوں کی رفاقت ملتی ہے دُنیا کا کوئی نظام حیات اپنے ماننے والوں کو مستقبل میں فلاح کی اتنی بڑی ضمانت دے نہیں سکتا جتنی بڑی یہاں قرآن دے رہا ہے۔

اس آیت میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کو انعام یافتہ قرار دیا ہے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان پر اللہ سبحانہ نے کیا انعام فرمایا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں انعام سے وہ عارضی اور نمائشی انعامات مراد نہیں ہیں جو دُنیا میں فرعونوں، نمرودوں اور قارونوں پر ہوتے رہتے ہیں اور اب بھی ہمارے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو مل رہے ہیں نعمت دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جس میں دل خوشی محسوس کرے۔ ان کو اللہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک علم اور دوسرا عمل۔ اسی لیے یہاں چار طبقوں کا ذکر کیا ہے دو طبقے یعنی انبیاء اور صدیقین علم کا اور شہداء وصالحین عمل کا کمالی نمونہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں۔ دونوں میں ایک باریک سا فرق ہے۔ جیسے انبیاء کی حیثیت علم میں فاعل اور منبع کی ہے صدیقین کا مقام مفعول اور مجمع کا ہے ایسے شہداء کی حیثیت عمل میں فاعل کی اور صالحین کا درجہ مفعول اور منبع کا ہے۔[1]

بہر حال انبیاء اور صدیقین علم کا اور شہداء وصالحین عمل کا نمونہ ہیں۔ قرآن نے علم وعمل کے اسی مجموعہ کو انعام قرار دیا ہے اور سورہ فاتحہ میں اس کے حامل بزرگوں کی راہ کو صراط مستقیم بتایا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن تمام انبیاء کی ہدایات کا مجموعہ بنا کر دیا گیا ہے اس لیے آپ جس نظام حیات کو لے کر تشریف لائے ہیں وہ کمال علم اور کمال عمل کا نمونہ ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔ اس موضوع کے سارے پہلوؤں پر ہم سورۂ فاتحہ میں بحث

[1] افادات شیخ الاسلام

کر چکے ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ اسلام علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ صرف ایک کائناتی نظریہ نہیں جو واقعات کی توجیہ و تشریح پر اکتفا کرتا ہو بلکہ وہ انسان کی حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی کی تعمیر و تاسیس کا ایک عملی پروگرام ہے۔ دین اور فلسفہ میں یہی فرق ہے۔ فلسفہ کا سارا دار و مدار نظریہ پر ہے مگر دین کا سارا محور نظریہ کی بنیاد پر رہتی ہوئی عمل کی عمارت پر ہے۔ عملی زندگی کو اگر اس کے دائرے سے خارج کر دیا جائے تو پھر دین کوئی معنویت نہیں رہتی۔ یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک خاص اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا ہے اور افراد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن اسلام اس بارے میں ایک خاص امتیازی نشان رکھتا ہے۔ اس نے کردار و عمل کی تبدیلی کو انسان کی خانگی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا۔ نیز اس نے اخلاق اور نیک عمل کے اصولوں کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ علم کی حد تک اسلام اپنے پیروؤں سے صرف خدا کی ذات و صفات، رسالت، قیامت، جنت و دوزخ، جزائے عمل کے زبانی اقرار اور قلبی تصدیق ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ عمل کی حد تک انہیں عالمِ انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئتِ اجتماعی میں وہ بنیادی تبدیلیاں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں سچے ہیں۔ یہاں علم و عمل کے نمونہ پیش کر کے ان کی رفاقت کی خوشخبری اسی حوصلہ افزائی کی خاطر ہے اور منافقین میں یہ ان کی بھی وہ کمزوری تھی جسے قرآن نے یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت سے بیان کیا۔ خبر نہیں لوگ اپنے آپ کو رعائتیں دینے میں اتنے کیوں سخی ہیں؟ خوب سمجھ لو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے۔

علم و عمل کی نعمت فضلِ خداوندی ہے

۱۱۲۔ یہی وہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملا ہے اور اللہ ہی بندوں کا حال جاننے کے لیے کافی ہے یعنی اللہ اور رسول کا حکم ماننے والوں کو انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کی معیت و رفاقت میسر آئی یہ اللہ کا بڑا انعام اور اس کا محض فضل ہے۔ ان کی طاعت کا معاوضہ نہیں جس سے منافقین بالکل محروم ہیں اور اللہ کافی ہے جاننے اور خبر والا۔ وہ ہر ایک مخلص و منافق اور ہر مطیع کی طاعت اور اس کے استحقاقِ اصلی اور مقدارِ فضل کو بالتفصیل جانتا ہے۔ اب کسی کو ان امور

کی تفاصیل کی وجہ سے وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے میں خلجان نہ ہو۔[1]

یہاں ذالک کا مشارالیہ کیا ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ مومنین کو جو کاملین کی معیت حاصل ہو گی۔ یہ محض فضل خداوندی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ انعام بزرگوں کی بزرگی اللہ کا فضل ہے۔ کچھ کی رائے میں اطاعت گزاروں کی جزا فضل ہے۔ دراصل انبیاؑ وصدیقین، شہداء وصالحین کے عنوان سے جس علم وعمل کو اللہ نے اس آیت میں اپنا انعام قرار دیا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں انسانی محنت وکاوش کو کوئی دخل نہیں ہے یہ محض فضل خداوندی ہے۔ ان کی راہ صرف علم وعمل کو مان لینا اور اپنی ذات کی حد تک اپنا لینا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کا بنیادی کام علم وعمل کی اس نعمت کو لوگوں تک پہنچانا اور دُنیا کو اس کی دعوت دینا ہے اس کو تمام نبیوں کی بعثت کا مقصد اور مشن قرار دیا ہے۔ اس میں وہ کامیابی اور ناکامی کے نتائج سے بے پروا ہو کر زندگی بھر لگے رہنے پر مامور تھے اس کام کو تمام نبیوں نے قاطبۃً امیروں، غریبوں میں، دکانداروں اور دستکاروں میں، کاشتکاروں، زمینداروں میں، مزدوروں کارخانوں میں، نوکروں آقاؤں میں، شوہروں، بیویوں میں، اولاد اور والدین میں، شاگردوں اور اساتذہ میں گھر باہر ہر جگہ کیا ہے۔ اس میں جان کھپائی ہے عزت کو تج کیا ہے مال لٹایا ہے، رشتہ داروں کو چھوڑا ہے اور وطن کو خیر باد کہا ہے۔ یہی وہ اصل عظیم ہے جو قرآنی دعوت کی اولین بنیاد ہے اسی کو قرآن نے اہل ایمان کو خوشیاں منانے کا حکم دیا ہے۔

قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا

اس آیت میں نبوت محمدی کی یہ امتیازی شان بتائی ہے کہ آپ نبیوں صدیقین کا علم اور شہداء وصالحین کا علم لے کر تشریف لائے، اور بلا قید آپ کی نبوت کا سب سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور بلا قید زمان و مکان کی جائے۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کے اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھتے اور پھر اس پر غور کیجئے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں کیا یہ کہ اس امتیازی شان کے باوجود اس نبوت کا بھی مقام ومرتبہ ہر پہلو سے وہی ہو گا جو دوسرے نبیوں کا ہے۔ اس سوال کے جواب میں عقل وانصاف اور قرآن وسنت ہر ایک کا فیصلہ صاف نفی میں ہے۔ بلاشبہ ان حقائق کے فطری تقاضے لازماً بالکل دوسرے ہوں گے۔ اس امتیازی حیثیت کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ گزشتہ انبیاؑ کے تمام ادیان، تمام شریعتیں اور تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف محمد رسول اللہ کا لایا ہوا ہے اور دوسرا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ صداقت، شہادت اور صالحیت کا محمد رسول اللہ سے علیحدہ ہو کر کوئی وجود نہیں ہے اور تیسرا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات صرف آپ کی پیروی پر موقوف ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا
جَمِيْعًا ۝ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ
قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝ وَلَئِنْ
اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ
يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَا لَكُمْ
لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ
النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ
الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا
مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ
الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو۔ پھر
نکلو تم مقابلہ کے لیے الگ الگ دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر [113]
ہاں تم میں کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے ضرور جی چرائے گا۔
بس اگر تم پر کوئی اُفتاد آ جائے تو وہ کہے گا کہ خدا نے مجھ پر احسان
کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر
کوئی مہربانی ہو جائے تو وہ ضرور کہے گا اور اس انداز سے کہے گا گویا
تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی علاقہ ہی نہیں کہ اے کاش
مجھے بھی ان کی رفاقت نصیب ہوتی تو میرا بھی کام بن جاتا۔ [114] لہٰذا ان
لوگوں کو جو اللہ سے آخرت کے بدلے میں دُنیا کا سودا کر چکے ہیں اللہ
کی راہ میں لڑنا چاہیے اور دیکھو جو بھی اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے
اور اس کے نتیجہ میں مرتا ہے یا مارتا ہے ہم ضرور اسے اجرِ عظیم سے
نوازیں گے۔ [115] اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس

مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے ہو جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندے ظالم ہیں نکال اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مدد کے لیے تیار کر۔[۱۱۶] جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا لڑنا طاغوت کی راہ میں ہوتا ہے۔ مسلمانو! تم شیطان کے ساتھیوں اور مددگاروں سے لڑو، یقین کرو کہ شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔[۱۱۷]

اسلامی نظام ہر نظام کا مدمقابل اور حریف ہے

اسلامی نظام کا اولین مقصدِ حیات یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے خواہ یہ کسی رنگ میں کسی بھیس میں ہو اور کہیں ہو۔ دنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقا کا آرزومند و کشمکشِ حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں اسلام اس کا تنہا مدمقابل اور حریف ہے۔ یہ کفر خواہ کسی صورت میں ہو کیونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلا فصل قائم ہے۔ یہ لڑائی دنیا کی دوسری تمام لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی نزاعیں اور لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ

کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور جا ملتا ہے کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر ارتقا میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا ذریعہ بن جاتی ہے جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اس کی قوتوں کو صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کفر سے جنگ آزما ہو کر اپنے قومی کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تصادم اور ان دونوں کی ازلی پیکار، اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و انحطاط پر منتہی ہوتی ہے۔ اور اس پیکار کی وجہ سے اسلام آگے بڑھتا ہے کفر و اسلام کا یہ تصادم جیسے اسلام کے اندرونی ارتقا کا سبب ہوتا ہے ایسے ہی وہ اپنے پیروکاروں کے لیے بہت آزمائش ہوتا ہے کیونکہ اسلام صرف ایک طرز فکر کا نام نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریق عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ اسی انقلاب اور تبدیلی کی کوشش کا قرآن کی زبان میں جہاد کہتے ہیں اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل الاصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضہ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے۔

پہلی آیات میں منافقین کی ان نافرمانیوں کا ذکر تھا جو اسلام کو زندگی کے تمام مسائل کے لیے بطور دستور، آئین اور قانون ماننے کی راہ میں ان سے ہوئی ہیں۔ اور ان آیات میں منافقین کی ان نافرمانیوں کا ذکر ہے جو کفر و اسلام کے مابین تصادم ہونے کی صورت میں ان سے ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۳۱- اے پیروان دعوت ایمانی! اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو لہٰذا نکلو تم مقابلے کے لیے الگ الگ دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر۔ یہاں سے جہاد کا ذکر ہے اس سے پہلی آیت میں یہ ذکر تھا کہ جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرے گا اس کو انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین کی رفاقت انعام میں ملے گی اور احکام خداوندی میں حکم جہاد چونکہ شاق اور دشوار ہے خصوصاً منافقین پر جن کا ذکر اوپر سے آرہا ہے اس لیے جہاد کا حکم فرمایا کہ ہر کوئی حضرات انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین کی رفاقت اور معیت کی امید نہ کرنے لگے۔ منقول ہے کہ شروع میں بہت سے ضعیف الاسلام بھی دعوت اسلام قبول کر چکے تھے۔ پھر جب جہاد فرض ہوا تو بعض متزلزل ہو گئے اور بعض کفار کے میزبان ہو کر آپ کی مخالفت کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! منافقوں کی کیفیت تو تمہیں پہلے معلوم ہو چکی ہے۔ اب خیر اسی میں ہے کہ تم ہر طرح سے اپنا بچاؤ کرو اور اپنی خبرداری اور احتیاط کر لو۔ ہتھیاروں سے ہو یا تدبیر سے، عقل سے ہو یا سامان سے اور

دشمن کے مقابلے اور مقاتلے کے لیے گھر سے باہر نکلو متفرق طور پر یا سب اکٹھے ہو کر جیسا موقع ہو۔[1]

وہی اوپر والا مضمون آگے چل رہا ہے پہلے داخلی امن کے سلسلے میں اسلامی حکومت کا سیاسی نظام، حکومت کی حیثیت قانون سازی میں حکومت کے قانون مصادر بنا کر ان کی جامہ تلاشی لی جو ایمان کا دعویٰ کر کے اسلام کے سیاسی نظام کو قبول نہیں کرتے اب خارجی امن کی خاطر دفاع کا حکم بیان ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں بھی ان لوگوں کی جامہ تلاشی ہو رہی ہے جو ایمان کے مدعی ہو کر اسلام کی خاطر قربانیوں سے گریز کرتے ہیں۔ اور جن کا اسلام کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس۔ جن میں اسلام کا تصور یہ ہو ان کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دینی اور اخلاقی تصورات کی قوت سے مستقبل کی تعمیر نو میں کوئی حصہ لیں گے۔ جن حالات میں اہل ایمان سے یاایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ اور تھے جبکہ یہودی مدینہ میں آباد تھے اور سیاسی طاقت پر قابض تھے۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ سیاسی نظام کی حیثیت سے تمہیں سب سے رشتہ توڑ کر اسلام سے جوڑنا ہوگا۔ اب حالات اور ہیں احد کی شکست کی وجہ سے اطراف و نواح میں قبائل کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ آئے دن خبریں آرہی تھیں کہ فلاں قبیلہ کے تیور بگڑ رہے ہیں، فلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اہل ایمان کے ساتھ پے در پے غداریاں کی جا رہی تھیں۔ مدینہ کے حدود سے باہر ان کے لیے جان و مال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی ان حالات میں مسلمانوں کی جانب سے زبردست محنت و کوشش کی ضرورت تھی تاکہ ان خطرات سے اسلام کی دعوت مٹ نہ جائے۔

حذر کے اصلی معنے کسی خطرہ اور آفت سے بچنے کے ہیں اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات کے لیے ہوتا ہے لیکن اپنے عام استعمال میں یہ ان ہتھیاروں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جو حملے کے کام میں آتے ہیں یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیار ہو جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دفاعی اسباب کی فراہمی ایمان کا تقاضا ہے اور توکل کے منافی نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس آیت کی روح کو سمجھا ہوتا تو اس اپاہج پنے میں مبتلا نہ ہوتے جسے انہوں نے توکل کے نام سے اختیار کر رکھا ہے۔ اس آیت میں جس تیاری کا حکم دیا گیا ہے اس میں حملہ کی صورت میں مقابلے کے سارے وسائل کو معلوم کرنا اور ان وسائل پر عمل کرنا اور دشمن

[1] افادات شیخ الاسلام

کی اجتماعی طاقت کا اندازہ، دشمن ملک کے جغرافیائی احوال سے آشنائی اور ان ہتھیاروں سے واقفیت اور ان کے استعمال سے باخبر ہونا سب اس میں داخل ہیں، جنگ کی تیاری زمان اور مکان کی تبدیلی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس دور میں تیاری کے لیے جیسے تلواریں، گھوڑے، کمانیں اور تیر ضروری تھے اور تیاری کے مفہوم میں یہ وقت کا تقاضا تھے اور ان کی بجا آوری خذوا حذرکم کا مطالبہ کرنے کے لیے ضروری تھی ایسے ہی آج کے زمانے میں تیاری کے مفہوم میں بندوقیں، توپیں، مشین گنیں اور تمام وہ آلات جو میدان جنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔ حمل و نقل کے وسائل ہوائی جہاز اور دخانی جہاز، ٹرک، بس کار اور تمام دوسری چیزیں جن کی فراہمی پر میدان جنگ کی کامیابی موقوف ہے اور ان آلات کو بنانے چلانے کا علم الغرض تمام جنگی علوم و فنون سے واقفیت مسلمان کے دینی واجبات اور ایمان کے تقاضے میں داخل ہے۔

سامان جنگ کی تیاری کے ساتھ قرآن نے اسی آیت میں جنگ کے لیے اقدام اور اس کی تنظیم کی طرف فانفروا ثبات او انفروا جمیعاً کہہ کر حکم دیا ہے۔ ثبات ثبۃ کی جمع ہے۔ ثبۃ کے معنے سواروں کی جماعت، ٹکڑی اور دستہ کے ہیں۔

عرب میں جنگ کے دو طریقے رائج تھے ایک منظم فوج کی صورت میں لشکر آرائی، دوسرا ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں دشمن پر چھاپہ مارنا، یہاں ثبات کے لفظ سے اسی طریقے کی طرف اشارہ کیا ہے مسلمانوں نے یہ دونوں طریقے استعمال کیے۔

عزم و ہمت سے تہی دامن لوگ

۱۴۴۔ ہاں تم میں سے کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے ضرور جی چرائے گا بس اگر تم پر کوئی افتاد آ جائے گی تو وہ کہے گا کہ خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر کوئی مہربانی ہو جائے تو وہ ضرور کہے گا اور اس انداز سے کہے گا کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی علاقہ ہی نہ تھا کہ اے کاش مجھے بھی ان کی رفاقت نصیب ہو جاتی تو میرا کام بھی بن جاتا۔ اور بڑی کامیابی حاصل کر لیتا۔ یعنی اے مسلمانو! تمہاری جماعت میں بعضے ایسے بھی گھسے ہوئے ہیں کہ جہاد کو جانے میں دیر لگاتے ہیں اور رکتے ہیں اور حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کرتے بلکہ نفع دنیوی کو تکتے رہتے ہیں اور اس سے مراد منافق ہیں جیسے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی کہ یہ لوگ گو ظاہر میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کو سب باتوں سے مقصود صرف

دنیا کا نفع تھا۔ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری سے ان کو کوئی غرض نہ تھی، یہ لوگ جہاد میں جانے والوں کی حالت تکتے رہتے ہیں جانے کے بعد اگر جہاد میں مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے مثلاً مقتول ہو گئے یا شکست ہو گئی تو بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کا بڑا ہی فضل ہوا کہ ہم لڑائی میں ان کے ساتھ نہ تھے ورنہ ہماری خیر نہ تھی الحمدللہ خوب بچے۔ اور اگر مسلمانوں پر اللہ کا فضل ہو گیا مثلاً فتح ہو گئی یا مال غنیمت بہت سا ہاتھ آگیا تو بہت پچھتاتے ہیں اور دشمنوں کی طرح غلبۂ حسد سے کہتے ہیں ہائے افسوس میں جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی، یعنی مال غنیمت ملتا۔ یعنی ان کو صرف اپنی محرومی پر افسوس نہیں ہوتا بلکہ اپنی محرومی سے زیادہ مسلمانوں کی کامیابی پر حسد اور قلق ہوتا ہے [1]

اس آیت میں منافقوں کی ان نافرمانیوں کا ذکر ہو رہا ہے جو جنگ کے معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دراصل ہر جماعت میں کچھ لوگ ایمان و یقین سے محروم اور عزم و ہمت سے تہی دست ہوتے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ عزم و ہمت کا کوئی قدم اٹھایا جا رہا ہے تو اپنی کمزوری سے خود بھی باز رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب جماعت قدم اٹھا دیتی ہے تو الگ تھلگ رہ کر غیروں کی طرح تماشہ دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آگیا تو خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم ان لوگوں کے ساتھ نہ تھے۔ اگر کامیابی ہوتی ہے تو رشک و حسد سے جل مرتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ کاش ہم نے بھی ساتھ دیا ہوتا تو آج کامیابی میں ہمارا بھی حصہ ہوتا۔ گویا ان کی شخصیت جماعت کی ہستی سے بالکل الگ ہے نہ تو اس کا نقصان ان کا نقصان ہے نہ اس کی کامیابی ان کی کامیابی۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ قرآن نے ان کے اعمال کو پیش کیا ہے اور ان کو مخلص مومن کی جگہ منافق قرار دیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ نفاق نہیں جو ایمان بمعنے تصدیق کا مدمقابل ہوتا ہے۔ بلکہ وہ نفاق ہے جو ایمان بمعنے اخلاص کے مقابلے پر آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جنگ سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کو بھی پست ہمت کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی مہم میں کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں خوب بچایا کہ ہم اس مہم میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے اور اگر تمہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ کہتے ہیں کاش ہم بھی اس میں شامل ہوتے ۔ اس بات کے ساتھ کان لم تکن بینکم و بینہ مودۃ

[1] افادات شیخ الاسلام

کے الفاظ سے ان کے باطن کی عکاسی کی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر یہ اپنی شامت اعمال سے کسی مہم میں شامل نہیں ہوتے ہیں تو ایمانی و اسلامی اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی پر خوش ہوں کہ اللہ نے ان کے دینی بھائیوں کو سرخرو کیا لیکن انہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوتی ہے بلکہ جس طرح حریف کی کسی کامیابی پر آدمی کا دل جلتا ہے کہ وہ اس میں حصہ دار نہیں ہو سکا اسی طرح یہ لوگ اس کو اپنی کامیابی نہیں بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے[1]

غور کرو یہاں منافقین کی کیا خصوصیت بیان ہوئی ہے۔

یہ کہ لڑائی سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کو پست ہمت بناتے ہیں۔ قرآن نے اسے نفاق کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اسلام کی سربلندی اور دین حق کے غلبہ کی کوششوں میں قدموں کا سست پڑ جانا اور اس کے لیے ادنی ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہ ہونا یہاں تک کہ دلوں کا اس تمنا اور آرزو سے بھی خالی ہو جانا کہ خدائی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانون سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو کیا آج اسلامی زندگی عملاً اسی طرح کفر کے غلبہ سے گری ہوئی نہیں جس طرح وہ مدنی زندگی میں کفر کی طاقتوں سے محصور تھی۔ اور کیا آج دین حق کے قیام اور اسلامی طرز زندگی کو ایک عملی حقیقت بنانے میں جانفروشی اور ایثار و قربانی کی کچھ کم ضرورت ہے۔ اگر ہے تو پھر اس بے رخی، اعراض اور پست ہمتی کا کیا نام رکھیں گے۔ کیا ایمان بمعنے التصدیق کی علمبرداری ہمیں اس دھمکی سے بچا سکتی ہے۔

اللہ کی راہ میں جہاد ایمان کی کسوٹی ہے

۱۱۵۔ لہذا ان لوگوں کو جو اللہ سے آخرت کے بدلے میں دنیا کا سودا کر چکے ہیں اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اور دیکھو جو بھی اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مرتا ہے یا مارتا ہے ہم ضرور اسے اجر عظیم سے نوازیں گے۔ یعنی اگر منافق لوگ جہاد سے رکیں اور اپنے نشیب و فراز دنیوی کو تکتے رہیں تو تکتے رہیں مگر جو لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا پر لات مار چکے ہیں ان کو چاہیے کہ اللہ کی راہ میں بے تامل لڑیں اور دنیا کی زندگی اور اس کے مال و دولت پر نظر نہ رکھیں اور سمجھ لیں کہ اللہ

[1] تدبر قرآن

تعالیٰ کی اطاعت اور حکم برداری میں ہر طرح نفع ہے غالب ہوں یا مغلوب، ملے یا نہ ملے [1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں لڑنا دنیا طلب لوگوں کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو جو اللہ اور آخرت پر ایمان کامل رکھتے ہوں اور دنیا میں اپنی کامیابی اور خوش حالی کے سارے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دنیوی مفادات اس اُمید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دُنیا میں نہیں تو آخرت میں بہرحال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دنیوی مفاد ہی کی ہو تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے [2]

پہلی آیت میں منافقین کا ذکر تھا۔ اس کے مقابلے میں اس آیت میں ان مخلصین کاملین فی الایمان کا ذکر ہے جو اپنی جان و مال اور دُنیا کو اللہ کے دین اور اسلام کے نظام کو برتر کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ کر دیتے ہیں۔ ان کا بیان دو پہلوؤں سے ہے ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آتے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے کہ سب تمہارے جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمہاری ہی آنکھوں کے سامنے وہ اللہ کے بندے بھی ہیں جو اپنا تن من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اپنی زندگی کا مقصد اللہ کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے، دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہو جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لیے جینے اور مرنے والے تھے۔ گویا ان دو نمونوں کو پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو زندگی کا کون سا نمونہ پسند ہے۔

اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا ہے کہ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودان باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ دنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہش نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ والدین کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔ غریب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] تفہیم القرآن

طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

اسلام میں جہاد کے بنیادی مقاصد

۱۱۶۔ اور نہیں کیا ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے ہو جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندے ظالم ہیں۔ نکال اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مدد کے لیے تیار کر یعنی دو وجہ سے تم کو کافروں سے لڑنا ضروری ہے ایک تو اللہ کے دین کو بلند اور غالب کرنے کے لیے دوسرے جو لوگ مظلوم مسلمان کافروں کے ہاتھ میں بے بس پڑے ہیں ان کو چھڑانے اور خلاصی دینے کی وجہ سے مکہ میں بہت لوگ تھے کہ حضرت کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے۔ اور ان کے اقرباء ان کو ستانے لگے کہ پھر کافر ہو جائیں۔ سو خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم کو دو وجہ سے کافروں سے لڑنا ضرور ہے تاکہ اللہ کا دین بلند ہو اور مسلمان جو کہ مظلوم اور کمزور ہیں کفارِ مکہ کے ظلم سے نجات پائیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے کیوں نہیں اٹھتے جو کفار کے اندر بے بسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ رات دن بے قراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال۔[2]

اس میں ان مظلوم بچوں، عورتوں، مردوں کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے یہ غریب طرح طرح سے تختۂ مشق ستم بنائے جا رہے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انہیں اس ظلم سے بچائے۔[3]

اسلام زندگی کا جامع دستور ہے

آیت میں مالکم استفہام سے مقصود ترغیب و تحریص ہے اور خطاب اہلِ ایمان، مخلصین اور صادقین سے ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ دین کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرزِ فکر کے بالکل مغائر ہے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبرِ قرآن [3] تفہیم القرآن

جس میں محض عبادات، ریاضات اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ شخصی نجات کے حصول کا یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں تبدیلی کرنے کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ حالانکہ اسلام انفس و آفاق دونوں کو مرضی الٰہی کے مطابق بدلنا چاہتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جب کبھی انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور خارجی ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے۔ اس لیے صرف ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے اسباب مرض کبھی دفع نہیں ہو سکتے۔ جب کبھی انسان عبادات و ریاضات میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں تبدیلی کی ضرورت سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی سوسائٹی میں بداخلاقی اور بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔ جس سے بالآخر وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں کر سکتا ہے خواہ وہ راہبانہ اتقا اور زاہدانہ پارسائی کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بلند ہو۔ اسی طرح جب وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی تبدیلیوں میں یا معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈھتا ہے اور اپنی باطنی اخلاقی زندگی سے غفلت برتتا ہے۔ بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی ہیں اور بالآخر اپنے پورے زور و طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی معاشرت، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ ان کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عبادات و ریاضات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کے ساتھ ساتھ حضور نے کل نظام زندگی میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ اور جب کفار و مشرکین کی جانب سے آپ کی منظم مخالفت کی گئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض پند و وعظ سے کام لینے کے بجائے اپنی اجتماعی قوت سے ان کا مقابلہ کیا اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم الشان انقلابی قوت ہے جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف ظاہر میں اپنے خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی، سیاسی اور عمرانی زندگی کے امراض و مفسدات سے آمادۂ پیکار رہتی ہے۔

قتال کے دو مقصد

آیت میں والمستضعفین کا عطف لفظ اللہ پر ہے یعنی فی سبیل اللہ والمستضعفین۔ زجاج اور

زہری سے امام قرطبی سے بھی ترکیب منقول ہے۔

اس میں قتال کے دو بنیادی مقاصد کی طرف رہنمائی کی گئی ۔

ایک یہ کہ خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے۔ کفر وضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں قتال کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا میں حق غالب ہو اللہ کے نام کا بول بالا ہو۔ دُنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ بن کر بزور شمشیر مٹا دینا چاہیے۔ حق کا یہ حق ہے کہ باطل پر غالب آئے۔ حق کی راہ روکنے والوں کے ساتھ مسلح ہو کر جنگ کی جائے اور اس وقت تک کی جائے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہ جائے۔

دوسرے یہ کہ دنیا سے ظلم و فساد کا خاتمہ ہو۔ جبر و تشدد اور انسانیت سوز ستم گاریوں کا سدباب ہو۔ اسلام کے قانون دان طبقہ نے قتال کے بھی دو مقصد بتائے ہیں ایک یہ کہ اللہ کے نام کا بول بالا ہو۔ اللہ کی حکومت قائم ہو، دوسرے یہ کہ دُنیا ظلم و فساد سے خالی ہو کر امن و سلام کا گہوارہ ہو۔ قانون کی زبان میں پہلے مقصد کا نام اعلاء کلمۃ اللہ اور دوسرے مقصد کا نام دفع الشر عن العباد ہے۔ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے کتاب السیر میں ان دونوں کی قانونی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

انما فرض لاعزاز دین اللہ ودفع الشر عن العباد

قرآن کی یہ آیت گرامی اسلام میں جنگ کے ان دوگونہ مقاصد کی توضیح کر رہی ہے۔ یہاں اعزاز دین اللہ کو فی سبیل اللہ سے اور دفع الشر عن العباد کو والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے موقع پر پہلے کو یکون الدین للہ اور دوسرے کو لا تکون فتنہ سے تعبیر کیا ہے مقصد یہ بتانا ہے کہ قتال کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایات اور ہدایات پر مشتمل نظام طاعت قائم ہو اور پوری زندگی میں ظلم و فساد سے خاتمہ ہو۔

قومیت اور وطنیت اور قرآن

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ قرآن کی نظر میں زبان، قوم اور وطن کی ایمان و اسلام کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں ہے ہم نسب اور ہم زبان، ہم جنس اور ہم وطن لوگوں نے مل کر ایمان والوں کو جبر و تشدد اور ظلم و فساد کا نشانہ بنایا تو قرآن نے قوم سے جنگ کرنے کا اور وطن کو چھوڑ دینے کا حکم

دے دیا۔ وطن اسی وقت تک اہل ایمان کے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے اور قوم اسی وقت قوم ہے جب اس کے اندر ان کے دین و ایمان کے لیے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن اہل ایمان کا وطن نہیں۔ اور اگر ہم نسب اور ہم زبان ایمان کی اپوزیشن بن کر سامنے آجائیں تو ہم نسب ہونے کے باوجود اہل ایمان سے ان کا کوئی ربط نہیں ہے۔

اللہ کا راستہ اور طاغوت کا راستہ

۷۶۔ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا لڑنا طاغوت کی راہ میں ہوتا ہے۔ مسلمانو! تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو یقین کرو کہ شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔ یعنی جب یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں سو پھر تو مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں کے ساتھ لڑنا بلا تامل ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے کسی قسم کا تردد نہ کرنا چاہیے اور سمجھ لو کہ شیطان کا حیلہ اور فریب کمزور ہے۔ مسلمانوں پر نہ چل سکے گا۔ اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ترغیب دلانا اور ہمت بندھانا ہے جس کا ذکر آئندہ آیات میں بالتصریح آرہا ہے۔[1]

یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو یہ اہل ایمان کا کام ہے اور جو واقعی مومن ہے وہ اس کام سے کبھی باز نہ آئے گا اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو۔ یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔[2]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کی جدوجہد کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج ہو اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے اور اس کا قانون خالص انصاف پر مبنی ہے اور جب انصاف کی حکومت قائم ہوگی تو امن قائم رہے گا۔ دنیا کے امن کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے لہٰذا کامل مومن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے پیش نظر یہی مقصد ہوتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں کفار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو اور طاغوتی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

قوتیں برسرِ اقتدار آئیں تاکہ دنیا میں کفر و شرک خوب چمکے اور چونکہ کفر و شرک شیطان کی راہیں ہیں اس لیے کافر شیطان کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔[1]

فی سبیل اللہ اور فی سبیل الطاغوت کہہ کر جہاد اور فساد میں ایک امتیازی لکیر کھینچ دی ہے اور بتا دیا ہے کہ سچا مسلمان جب ہتھیار اٹھائے تو توسیع ملک کے لیے. قومی برتری کے لیے نہیں۔ تجارتی منڈیاں قائم کرنے کے نہیں، دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں، دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے نہیں. رشک و ہوس، جاہ پرستی کے جذبات سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ دنیا کے بلند ترین مقصد انسانیت کے بہترین نصب العین اللہ کے نام کی برتری اور بلندی کے لیے۔ رنگ، نسل، رزبوم اور قوم، وطن، زبان اور قبیلہ کی عزت و حمیت کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ سربلند کرنے اور اسلام کو غالب کرنے کے لیے۔ کائناتِ عالم میں خدائے واحد کی بندگی ہو، اسی کا قانون بالاتر ہو، اسی کی مرضی کی حکمرانی ہو۔ یہ ہے فی سبیل اللہ۔

اگر دنیا معبودانِ باطل میں لگی ہو۔ غیر الٰہی نظامات غالب ہوں اور اسلامی قدریں مٹ رہی ہوں پٹواری سے لے کر سربراہ مملکت تک کی ساری مشینری اور قلم سے لے کر الاذاعۃ المرئیۃ تک ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلی بغاوت کر رہے ہوں اور آپ کی محنتیں، آپ کے مال اور آپ کی جانیں اسے جما رہی ہوں اسے بچا رہی ہوں خواہ یہ آزادی کے نام پر ہو، وطن کے نام پر ہو۔ قوم کے نام پر ہو۔ یہ سب طاغوت کی راہ ہے اور اس میں جان کھپانا، وقت لگانا طاغوت کی راہ میں جان کھپانا ہے۔

---

[1] معارفِ قرآن م ش

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ
آتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا
لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا
تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ
فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ ۗ وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ ۚ
قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ
حَدِيثًا ۝ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ
سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ
شَهِيدًا ۝

اے پیغمبر کیا آپ نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جنہیں کہا گیا
تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روک لو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔[۱۱۸]
پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو اچانک ان میں سے ایک جماعت
انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ
اس سے بھی زیادہ، اور کہتی ہے اے ہمارے مولیٰ! تو نے ہم پر
جنگ فرض کیوں کر دی ہے، کیوں نہ ہمیں کچھ اور روز کی مہلت
دے دی[۱۱۹]۔ اے پیغمبر کہہ دو لوگو! دنیا کا سرمایہ تو بہت تھوڑا
ہے اور آخرت خدا ترس کے لیے بہترین سرمایہ ہے، وہاں تم
پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا[۱۲۰]۔ تم کہیں بھی ہو موت تمہیں پا کر
رہے گی چاہے تم اونچے اور مضبوط برجوں میں ہو[۱۲۱]۔ اور اے پیغمبر
جب ان کو کوئی خوشی کی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ
کی جانب سے ہے اور ان کو اگر بدحالی لپٹتی ہے تو کہتے ہیں

کہ یہ تمہاری طرف سے ہے۔[۱۲۲] تم کہہ دو کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات کو سمجھنے میں سوجھ بوجھ کے قریب نہیں پھٹکتے۔[۱۲۳] یاد رکھو بھلائی خواہ کچھ ہو جو تمہیں پیش آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ نقصان اٹھاتے ہو وہ خود تمہاری جانب سے ہے۔[۱۲۴] اور ہم نے لوگوں کے لیے تم کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے اور تمہارے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔[۱۲۵]

گفتار کے نہیں کردار کے غازی بنو

پہلی آیت میں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اور بتایا تھا کہ اہل ایمان کی جنگ خدا کی راہ میں ہوتی ہے اور اللہ ان کے سر پر ہوتا ہے برعکس اس کے اہل کفر کی جنگ شیطان کی راہ میں ہوتی ہے اور اور شیطان ان کے سر پر ہوتا ہے گویا اصل میں مقابلہ رحمان اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر اہل ایمان نے اللہ کی وفاداری میں کوئی کمزوری نہ دکھائی تو کامیابی ان کے لیے ہے۔ اب ان کمزوریوں کی ان آیات میں نشاندہی ہو رہی ہے جن سے اہل ایمان کی وفاداری مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس دور میں کفار کے علاقوں میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بے بسی کا جو حال تھا اس کا ذکر پہلی آیات میں آ چکا ہے۔ ان حالات سے مدینہ کے مسلمانوں میں جنگ کا احساس پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ مسلمان اپنے اس احساس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تو منافقین بھی پورے

جوش و خروش سے جذبہ جنگ کا اظہار کرتے بلکہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مخلصین اہلِ ایمان سے زیادہ جوش و خروش کا اظہار کرتے۔ اور قاعدہ کی بات ہے کہ جس کا عمل کمزور ہو وہ ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس لیے وہ لاف زنی کیا کرتا ہے۔ چنانچہ منافقین بھی زبان سے بڑے دلولے کا اظہار کرتے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں روکتے اور فرماتے کہ ابھی انتظار کرو۔ نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے اپنے تعلق باللہ اپنی تنظیم اور اپنے جذبہ انفاق کو ترقی دو لیکن جب اس کا وقت آگیا اور جنگ کا حکم دیا گیا تو زبان کے ان غازیوں کا سارا جوش سرد پڑ گیا ان کی اسی قسم کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے تاکہ اہلِ ایمان ان کے فتنوں سے آگاہ ہو جائیں اور ان کی وسوسہ اندازیوں سے مسلمانوں کے اندر جو غلط اور منافی توحید و اسلام رجحانات ابھر سکتے ہیں۔ ان کا اچھی طرح ازالہ ہو جائے۔ اور اہلِ ایمان کو پتہ لگ جائے کہ ان کا مقصد حیات اگر اللہ کی بندگی ہے اور اُمتِ مسلمہ اگر صرف اسی لیے وجود میں لائی گئی ہے کہ وہ دُنیا کے سامنے حق کی پوری شہادت دے تو اس کی بندگی اس سے بڑی کیا ہو گی اور اس کی شہادت سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنی جان دے کر انجام دی گئی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ کی یہ سب سے بڑی بندگی اور حق کی یہ سب سے اونچی شہادت ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہ مسلمان کے وجود کا جو مقصد ہے قتال اس مقصد کی انجام دہی کی سب سے بڑی معیاری کوشش ہے۔

۱۱۸۔ اے پیغمبر کیا آپ نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روک لو۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے۔ مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں۔ آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں ہوا بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کیے جاؤ کیونکہ جب تک آدمی طاعت خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔[1]

اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے یہ سوال بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن کا سیاق و سباق

[1] افادات شیخ الاسلام

تو یہی کہتا ہے کہ ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو ایمان و یقین سے محروم اور عزم و ہمت سے تہی دست ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ عزم و ہمت کا کوئی قدم اٹھایا جا رہا ہے تو اپنی کمزوری سے خود بھی باز رہتے ہیں ان کا بھی ذکر ہو رہا ہے اور یہاں ان کی ہی کمزوری بیان ہو رہی ہے کہ پہلے یہ لوگ قتل و خون ریزی کے عادی تھے۔ اسلام نے اس سے روکا اور اعمال حسنہ کی تلقین کی۔ جب حق و صداقت کی راہ میں جنگ کا حکم دیا گیا تو منافق اور ایمان کے کچے لوگ کہتے ہیں۔ اور کچھ کی رائے میں یہ کہنے والے مخلصین ہیں بلکہ بعض روایات میں تو اجلہ صحابہ جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوف کا نام بھی لے دیا۔ چنانچہ حاکم اور نسائی نے اپنی روایات میں بھی نام لیا ہے۔

اسی بنا پر کفوا ایدیکم کے مفہوم میں اختلاف ہوا ہے۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو لوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت بے نیام رہتی تھی اور رات دن کا مشغلہ ہی جنگ و پیکار تھا۔ اس وقت انہیں خون ریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز اور زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح کا حکم دیا گیا تھا۔ اب جو اللہ کی خاطر تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے خدا کی خاطر لڑنے میں بزدل بنے جاتے تھے وہ دست شمشیر زن جو نفس و شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا اب خدا کی راہ میں شل ہوا جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو مکہ میں قریش کے مظالم سہتے سہتے ایک زمانہ ہو گیا تھا اور قدرتاً انتقام کی خواہش ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ لوگ بھی آخر اسی خون اور گوشت کے بنے ہوتے تھے اور جوش میں آکر بار بار جنگ کی اجازت مانگ رہے تھے۔ ادھر وحی الٰہی بار بار ابھی عفو و حلم مصالحت اور درگزر کا سبق دے رہی تھی یہاں تک کہ ہجرت کا حکم آ گیا اور مسلمان مدینے کی پرامن فضا میں منتقل ہو گئے۔ ۱۳، ۱۴ سال کی صحبت رسول کی زبردست ٹریننگ کے بعد جب علم الٰہی میں مسلمانوں کے اخلاق فاضلہ پختہ ہو گئے اور تحمل اور بے نفسی ان کے کردار کے جز بن گئے تو حکم جہاد و قتال نازل ہوا۔ لیکن اُدھر مدینہ کی پُرامن فضا میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات انتقام دھیمے پڑ گئے اور وہ جوش و ولولہ قتال باقی نہیں رہا تھا اب طبعی تقاضا سے میدان جنگ میں جانے سے حیلہ حوالہ ڈھونڈنے جانے لگے۔ یہاں ذکر انہی عافیت کوش مسلمانوں کا ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے بار بار کہتے کہ ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ آخر ہم کب تک صبر کریں ہمیں مقابلہ کی اجازت دی جائے اس وقت ان سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو، نماز پڑھو، زکوٰۃ دو تو صبر کا یہ حکم ان پر شاق گزرتا تھا مگر اب جو لڑائی کا حکم ہوا ہے تو انہی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ دشمنوں کا ہجوم اور

جنگ کے خطرات دیکھ کر سہما جا رہا ہے۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے مفہوم کے اعتبار سے مخاطب منافقین ہیں اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے مخاطب مخلص اہل ایمان ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں ان مخلصین میں سے عبدالرحمان بن عوف اور ان کے ساتھیوں کا نام بھی لے دیا ہے۔

ہماری رائے میں پہلا مفہوم صحیح ہے کیونکہ

اولاً، زرقانی کے بیان کے مطابق قتال کی اجازت ۱۲ صفر المظفر سنہ ۲ھ مطابق ۱۵ اگست سنہ ۶۲۳ء کو ہوئی ہے۔ ہجرت کی تاریخ ۱۶ ستمبر سنہ ۶۲۲ء ہے اور ربیع الاول کی ۸ تاریخ ہے۔ گویا ہجرت سے پورے ایک سال کے بعد قتال کی اجازت ہو گئی اور اس اجازت کے بعد اگست ہی کے مہینے میں غزوۂ ابوا یعنی صفر سنہ ۲ھ میں ہوا ماہ ربیع الثانی مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۶۲۳ء کو حضرت عبیدہ کی مہم پیش آئی۔ اسی ماہ میں غزوۂ بواط ہوا۔ پھر جمادی الاولیٰ مطابق نومبر سنہ ۶۲۳ء غزوۂ عشیرہ ہوا۔ غزوۂ عشیرہ سے واپسی پر دس روز کے بعد غزوۂ بدر اولیٰ ہوا۔ اس کو غزوۂ سفوان بھی کہتے ہیں۔ اسی سال رجب میں عبداللہ بن جحش کی مہم پیش آئی اور اسی سال رمضان مبارک کی ۸ تاریخ کو حضور انور غزوۂ بدر کبریٰ کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ۱۷ رمضان سنہ ۲ھ کو جنگ ہوئی، یہ ۲۲ فروری سنہ ۶۲۳ء کے مطابق ہے اس کے بعد ۱۵ شوال سنہ ۳ھ میں یعنی بدر سے ایک سال کے بعد اُحد کی مہم پیش آ گئی۔ اس کے تین روز کے بعد ۱۸ شوال کو غزوۂ حمراء الاسد پیش آیا۔ ابھی ذی قعدہ اور ذی الحجہ سنہ ۳ھ کے مہینے اطمینان سے گزرے پھر اطلاع ملی کہ بنو اسد کے رئیس طلیحہ اور سلمہ اپنی قوم کو حضور کے خلاف جنگ کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضور نے اس فتنہ کو دبانے کے لیے ابو سلمہ عبداللہ بن الاسد کو ڈیڑھ سو صحابہ کے ساتھ ۴ محرم الحرام سنہ ۴ھ جون سنہ ۶۲۵ء میں روانہ کیا۔ صفر سنہ ۴ھ میں رجیع کا واقعہ پیش آیا۔

ثانیاً یہ سورت یعنی سورۂ نساء جس میں یہ آیت موجود ہے سنہ ۳ھ کے اواخر سے لے کر سنہ ۴ھ کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریر میں نازل ہوئی ہیں اور ان کا ٹھیک زمانہ نزول کیا ہے۔ لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہوتی ہیں اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف آیات کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور اشارے واقع ہوتے ہیں۔ مثلاً مدینہ سے بنی نضیر کا اخراج ربیع الاول سنہ ۴ھ میں ہوا اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ جن آیات میں

یہودیوں کو آخری تنبیہہ کی گئی۔ امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس۔ اس سے پہلے قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہوں گی اور اس کے بعد جو آیات منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں وہ بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ منافقین بھی اہلِ کتاب میں سے مسلمان ہو کر آتے ہوئے لوگ تھے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہجرت کے شروع سے لے کر ۵ھ تک اہلِ ایمان کو پُرامن فضا میں وقت گزارنے کا کب موقعہ ملا کہ ان کے اس فضا میں جذبات سرد پڑ گئے اور وہ جوش و ولولہ باقی نہ رہا۔ کم از کم تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے ۱ھ سے ۵ھ تک کا کوئی سال کوئی ماہ کوئی ہفتہ اور کوئی دن ہمارے علم میں ایسا نہیں جسے ہم ان کے حق میں پُرامن فضا کہہ دیں جس میں رہ کر معاذ اللہ وہ میدان جنگ سے بچنے کے لیے حیلے حوالے ڈھونڈھنے لگے۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن میرا ذوقِ ایمان تو صحابہ کرام کے بارے میں یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں۔ یہ تو تاریخی حقائق کی تکذیب ہے۔ عکرمہ کی روایت خواہ سند کے اعتبار سے کتنی صحیح ہو مگر قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہ ایک طرف صحابہ کے کردار پر حرف لاتی ہے دوسری طرف تاریخ کی تکذیب کرتی ہے۔ حاکم کا محدثین کی بارگاہ میں خواہ کوئی مقام ہے لیکن صحابہ کے معاملہ میں اس کی تشیع والی حس ضرور پھڑ پھڑاتی ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اس کے مخاطب بھی کمزور قسم کے لوگ ہیں۔

جنگ گریز رجحانات کی نمائش

۱۱۹۔ پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو اچانک ان میں سے ایک جماعت انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی۔ کیوں نہ ہمیں کچھ اور روز کی مہلت دے دی۔ یعنی ہجرت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کا حکم ہوا تو ان کو تو خوش ہونا چاہتے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی اور مراد ملی مگر بعضے کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے یا اس سے زیادہ آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدت میں اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا[1]

جن شارحینِ قرآن نے اسے مخلصین کے حق میں بتایا ہے ان کو یہاں تشریح و تفسیر میں قدم قدم

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پر مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ کسی نے کہا کہ یہ خوف طبعی تھا اس لیے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور کسی نے قالوا کی یہ تاویل کی کہ مسلمانوں کی زبان سے یہ قول بطور تمنا کے کہا بطور اعتراض نہ تھا اور کوئی بولا کہ یہ قول اگر زبان سے تھا جب بھی چونکہ درجہ تمنا میں تھا اعتراض و انکار اس سے مقصود نہ تھا اس لیے قابل مواخذہ جب بھی نہ تھا لیکن خود لفظ قالوا سے یہ لازم نہیں آتا کہ زبان سے بھی ادا کیا گیا ہو۔ قول عربی جس طرح کلام لسانی کے لیے آتا ہے اسی طرح حدیث نفس کے لیے بھی اور علم الٰہی میں یہ دونوں برابر ہیں اور حدیث نفس یا وسوسہ کا معصیت نہ ہونا بالکل ظاہر ہے اس لیے شارحین قرآن نے یہاں حدیث نفس مراد لی ہے۔ لیکن ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آیت میں فریق سے مراد وہی منافقین ہیں۔ یہ ان صحابہ کے احوال کی عکاسی نہیں ہے جن کے جنتی ہونے کی دنیا میں اللہ کی وحی نے گواہی دے دی ہے۔

اسلامی جنگ کا نماز سے تعلق

اس پوری آیت سے کہ پہلے اہل ایمان کو نماز اور روزے کا حکم دیا گیا تھا بعد ازیں قتال کی فرضیت آئی یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی جنگ کی رُوح اور نماز اور زکوٰۃ میں نہایت گہری مناسبت ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو رہے ہوں ان کے لیے اسلحہ کی ٹریننگ سے زیادہ ضروری اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ جہاد میں جو للہیت، اخلاص اور نظم و طاعت کی جو پابندی مطلوب ہے اس کی بہترین تربیت نماز سے ہوتی ہے اور اس کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کا جو جذبہ درکار ہے وہ ایتائے زکوٰۃ کی پختہ عادت سے نشوونما پاتا ہے۔ ان صفات کے بغیر اگر کوئی گروہ جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس جنگ سے کوئی اصلاح وجود میں نہیں آسکتی ہے۔ اس سے صرف فساد فی الارض میں اضافہ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے اسلامی جنگ کے سخت سے سخت حالات میں بھی نماز کے اہتمام و التزام کی تاکید ہوتی ہے۔

دنیا و آخرت کا تقابلی مطالعہ

۱۲۰۔ اے پیغمبر کہہ دو لوگو! دنیا کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے اور آخرت خدا ترس لوگوں کے لیے بہترین سرمایہ ہے، وہاں تم پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ یعنی چونکہ حیات اور منافع دنیوی کی رغبت کے باعث ان لوگوں کو حکم جہاد بھاری معلوم ہوا تو اس لیے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ دنیا کے تمام منافع حقیر اور سریع الزوال ہیں اور ثواب آخرت کا بہترین ہے ان کے لیے جو اللہ کی

نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں لہٰذا تمہیں چاہیے کہ منافع دنیوی کا لحاظ نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں کوتاہی نہ کرو اور جہاد کرنے سے نہ ڈرو اور اطمینان رکھو کہ تمہاری محنت و جانفشانی کا ثواب ادنیٰ سا بھی ضائع نہ ہوگا لہٰذا تم کو ہمت اور شوق سے جہاد میں مصروف ہونا چاہیے [1]

یہاں دو باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

آخرت لامحدود اور دنیا محدود ہے

ایک یہ کہ آخرت کے مقابلے دنیا کو قلیل کہا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے لامحدود خواہشیں لے کر آیا ہے۔ اتنی لامحدود خواہشیں ہیں کہ ان کی پابجائی دنیا کا موجودہ سرمایہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ محدود ہے۔ انسانی فطرت کے لامحدود تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لامحدود سامان کی ضرورت ہے۔ آخرت کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے:

لکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون

تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو اور وہ سب کچھ ہے جو تم مانگو گے

موجودہ زندگی میں انسان کے اندر لامحدود تمنائیں رکھی گئی ہیں اور محدود شکل میں یہاں کچھ آرزوئیں پوری کر دی گئی ہیں۔ اس طرح انسان میں آخرت کی لامحدود طلب کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ گویا پیاس بھی ہے اور پیاسے کو چند گھونٹ پلا بھی دیے گئے ہیں۔ پینے کی اس لذت سے مانوس ہوتے بلکہ پیاس کے بھڑک جانے کے بعد نہ ختم ہونے والی لامحدود تمناؤں اور آرزوؤں کے متعلق ایک طرف یہ اعلان کر دیا کہ متاع الدنیا قلیل الس لیے اس سے اس کی تسکین ناممکن ہے۔ دوسری طرف بتا دیا کہ آدمی کو اس کی خاطر اس قوت و قدرت کے لازوال چشمہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے۔ جس کی لامحدودیت کی شہادت کائناتی حقائق کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ جہاں لامحدود کمالات رکھنے والی اپنے لامحدود کمالات کا مظاہرہ کرے گی۔ انسانی احساسات اپنے اردگرد پس و پیش اندر باہر ہر لمحہ ہر لحظہ ایسے نت نئے تجلیات کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پاتے جائیں گے جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا۔ اور اس طرح لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع ہونے اور لذت یاب ہونے کا موقعہ ابدالآباد تک ملتا جائے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخرت کا حقیقی منظر یہ کیا ہے

دوسری یہ کہ آخرت کا تصور جس پر اسلام کا کل عملی اور فکری نظام قائم ہے اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لیے سودمند ہے۔ جب کبھی تاریخ کے کسی دور میں انسان نے اس تصور کو اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ مخلصانہ طور پر قبول کیا اور اس کے مقتضیات کو پورا کرنے کی کوشش کی اس کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا۔ آخرت کا صحیح تصور یہ نہیں ہے کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے لہٰذا یہاں جیسی بھی گزرتی ہے گزر جانے دو بلکہ آخرت کا حقیقی نظریہ یہ ہے کہ کائنات عالم کو اللہ سبحانہٗ کی مرضی کے مطابق چلانے میں مخالف قوتوں کے خلاف جو جدوجہد کرنی پڑے گی اور اس میں جو مصائب جو تکالیف اور آزمائشیں آئیں گی ان سے زیادہ متاثر نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ تمام تکالیف و مصائب یہ تمام جانکاہیاں اور مایوسیاں آخرت کے اس اجر و انعام کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں جو اللہ سبحانہٗ نے ان انسانوں کے لیے مختص کر دیا ہے جو کائنات عالم میں اس کے منشاء کو پورا کرنے کے لیے اپنے جان و مال کی بازی لگاتے ہیں۔ قرآن نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ دُنیا بے حقیقت ہے لیکن اس نے اس بات پر یقیناً زور دیا کہ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا ہیچ ہے قل متاع الدنیا قلیل والاخرۃ خیر لمن اتقیٰ یعنی جس طرح ایک اعلیٰ حقیقت کے سامنے ادنیٰ تر حقیقت کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے اسی طرح آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا بے قیمت ہے لیکن اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ دنیا مطلقاً بے حقیقت ہے کیونکہ انسان ادنیٰ تر حقیقت سے گزر کر اعلیٰ تر حقیقت تک پہنچ سکتا ہے اسی طرح آخرت اگرچہ اس دنیا سے بہتر اور زیادہ حقیقی ہے مگر اسی دُنیا کی زندگی میں حصہ لے کر انسان اپنی آخرت سنوار سکتا ہے نہ کہ اس دُنیا سے بے تعلق اور الگ ہو کر۔ آخرت کے اس تصور کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان دُنیا کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے، مادے کو اپنی رُوح کے قفس نہ گمان کرے۔ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت نہ خیال کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو کر رہنے دنیا چھوڑ دینے اور اللہ کو پالینے کے لیے گوشہ نشینی کی روش اختیار نہ کرے جسے رہبانیت کہتے ہیں بلکہ اسے چاہیے کہ مسائل حیات سے پوری طرح متعلق رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف رہے اور یہ سب کچھ اس عزم و یقین کے ساتھ کرے کہ آخرت میں مجھ سے اس کی باز پرس ہو گی۔

فرائض کی ادائیگی میں موت سے نہ ڈرو

۱۲۱۔ تم کہیں بھی ہو موت تمہیں پا کر رہے گی چاہے تم اونچے اور مضبوط برجوں میں ہو۔ یعنی کیسے ہی مضبوط اور محفوظ و مامون مکان میں رہو مگر موت تم کو کسی طرح نہ چھوڑے گی کیونکہ موت ہر ایک کے واسطے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے۔ اپنے وقت پر ضرور آئے گی کہیں ہو لہٰذا اگر جہاد میں نہ جاؤ گے تو بھی موت سے ہرگز نہیں بچ سکتے تو اب جہاد سے گھبرانا اور موت سے ڈرنا اور کافروں کے مقاتلہ سے خوف کرنا بالکل نادانی اور اسلام میں کچے ہونے کی علامت ہے۔ [1]

اس سے یہ بات ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے جنگ میں نہ جانا فضول ہے کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوتے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے اور نہ مضبوط تر حفاظت کا سامان موت سے کسی کو بچا سکتا ہے لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت تمہیں ملی ہے اس میں فریضہ کی ادائیگی ہو جاتے۔ اگر جنگ میں مرنے سے بچ بھی جاؤ تو بالآخر موت سے تو نہیں بچ سکتے خواہ زندگی کے لیے کتنا ہی حفاظت کا سامان کر لو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زندگی کی حفاظت نہ کرنی چاہیے۔ زندگی اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اس کی قدر کرنی چاہیے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ جس مقصد کی خاطر دینے والے نے زندگی عطا فرمائی ہے اس کی بجا آوری کہاں تک ہو رہی ہے۔

علامہ قرطبی نے آیت کے مدلول سے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ جان و مال کی حفاظت کی خاطر شہروں کی تعمیرات اور ان کی بناوٹ قرآن کے نقطہ نظر سے توکل کے منافی نہیں ہے۔ قرطبی نے تو اس آیت کے مدلول سے یہ معلوم کیا ہے کہ شہروں کی آبادکاری توکل کے منافی نہیں ہے۔ دوسرے علماء نے تو زمین کی آبادکاری کو ان فرائض میں داخل کر دیا ہے جن کی بجا آوری پر جنت کی آبادی کے وعدے ہیں۔ آخرت کو آباد کرنے کے لیے دنیا کو آباد کرو کے نظریہ کی قرآن کے سوا کسی نے دعوت نہیں دی ہے۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے حضرت علاء الدولہ سمنانی نے اسلامی نظریات کی شرح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

اگر کوئی اپنی کاہلی سے زمین کی آبادکاری چھوڑ بیٹھا ہو اور اس کا نام اس نے توکل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور زبادر کھ لیا ہو تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (نفحات الانس)

رسالت خدا کی رہنمائی میں کام کرتی ہے

۱۲۲۔ اور اے پیغمبر جب ان کو کوئی خوشی کی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے اور ان کو اگر بدحالی پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری طرف سے ہے۔ یعنی ان منافقین کا اور عجیب حال سنو۔ اگر تدبیر لڑائی کی درست آئی اور فتح ہوئی اور غنیمت کا مال ہاتھ آگیا تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی اتفاقی بات ہو گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے۔ اور اگر تدبیر بگڑ جاتی اور ہزیمت و نقصان پیش آجاتا تو الزام رکھتے تھے آپ کی تدبیر پر۔ ؎

مطلب یہ ہے کہ ان کا حال یہ تھا کہ جب تک بات بنی رہتی یہ لوگ برابر اہل ایمان کے ساتھ رہتے اور کہتے کہ یہ تو عین فضل خداوندی ہے جس میں ہم تم سب شریک ہیں اور جب بات بگڑ جاتی تو فوراً الزام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ دیتے کہ یہ جو کچھ بھی پیش آیا ہے، سب آپ ہی کی بے تدبیریوں کا نتیجہ ہے۔ گویا جب فتح و ظفر اور کامیابی و سرخروئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے اور بھول جاتے ہیں کہ ان پر یہ فضل نبی ہی کے ذریعہ سے ہوا ہے مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹنے لگتے ہیں تو سارا الزام نبی کے سر تھوپ دیتے ہیں اور خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ نہ تو یہ مانتے تھے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کی مشیت کار فرما ہے اور نہ یہ مانتے تھے کہ رسول کا ہر کام خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے بظاہر تو آپ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے لیکن باطن میں ان کے یہی خیال چھپا رہتا تھا کہ آپ سارے کام اپنی رائے اور تدبیر سے کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص جماعت کی پیشوائی و ریاست کا منصب رکھتا ہے اسے کیسے کیسے دشواریوں میں سے گزرنا پڑتا ہے وہ جب عزم و عمل کی دعوت دیتا ہے تو ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو جاتا ہے جو یقین کا کچا اور ہمت کا کمزور ہوتا ہے وہ اطاعت کی جگہ مخالفت کی روش اختیار کرتا ہے۔ پھر جب اس صورتِ حال کی وجہ سے کوئی ناکامی پیش آتی ہے تو بجائے اس کے کہ اپنی بدعملیوں پر نادم ہوں سارا الزام رئیس جماعت کے سر ڈال دیتے ہیں اور مخالفت کا ان کو ایک نیا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔

؎ افاداتِ شیخ الاسلام

اللہ کے قوانین سے ناواقفیت

۱۲۳۔ تم کہہ دو کہ جو کچھ ہوتا ہے سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات کو سمجھنے میں سوجھ بوجھ کے قریب نہیں پھٹکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دے دو کہ بھلائی اور برائی سب اللہ کی طرف سے ہے سب باتوں کا موجد اور خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو دخل نہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کا الہام ہے تمہارا الزام رکھنا نبی پر سراسر غلط اور کم فہمی ہے اور بگڑی کو بگڑی نہ سمجھو یہ اللہ کی حکمت ہے وہ تم کو سدھاتا ہے اور آزماتا ہے، تمہارے قصوروں پر۔ یہ جواب اجمالی ہوا منافقین کے الزام کا آئندہ آیت میں اس کی تفصیل آ رہی ہے [۱]

مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ اسباب کے تحت ہو رہا ہے سب کچھ اللہ کر رہا ہے، حسنہ ہو یا سیئہ ہو کامیابی ہو یا ناکامی سب کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اسباب اور مسببات کی یہ لڑی اللہ نے اپنے قوانین کے تحت قائم کر رکھی ہے۔ خبر نہیں کہ ان کی عقلوں کو کیا ہو گیا کہ بات کی تہ کو نہیں پہنچتے، ہر بات کو محض سطحی مطالعہ کرنے میں اس کی گہرائی میں نہیں پہنچتے ہیں۔ ان میں مادی مزاج اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔ یہ مزاج ہمیشہ ساری خوشحالیوں اور خوش بختیوں کو اپنے علم و لیاقت اور اپنی ذہانت و محنت کی طرف منسوب کرتا ہے لیکن ایمانی طرزِ فکر یہ ہے کہ اس کائنات میں تصرف کرنے والا صرف اللہ کا ارادہ ہے وہی اسباب کا خالق ہے اور جب چاہے حالات کو پلٹ سکتا ہے کیونکہ اسباب کی اس پر حکومت نہیں بلکہ اسباب پر وہ حکمران ہے۔ دیکھنے کی چیز ظاہری اسباب نہیں بلکہ وہ خالق و مالک ہے جس کے ہاتھ میں ان سارے اسباب و وسائل کی ڈور ہے۔

لا یکادون یفقھون حدیثا میں اشارہ ہے کہ ہوشیار اور عقل مند آدمی بات کی تہ تک پہنچتا ہے ظاہر کے حرفی ڈھانچہ تک نہیں رہتا ہے۔

فقاہت اور روایت

یہیں سے فقاہت اور تحدیث میں فرق سمجھ میں آجاتا ہے روایت نام ہے الفاظ کو محفوظ کر لینے کا

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اور فقاہت کہتے ہیں مدلول ظاہری سے گزر کر بات کی گہرائی اور متکلم کی مراد کو پالینے کو۔ اس لیے قدرتی طور پر علماء کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالم جزئیات اور دوسرا عالم کلیات۔ یعنی ایک وہ جو نص کے ملفوظ ظاہری کا نگران ہو اور جس کی مدلول ظاہری تک محدود ہوں اور دوسرا وہ جس کی عمیق نگاہ اس کی ظاہری سطح تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ لگاتے جس کے وسیع سلسلے میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے موجود ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

آپ کی امتوں میں علماء دو قسموں میں منحصر ہیں ایک حفاظ حدیث دوسرے فقہا جو احکام کے استنباط کا کام کرتے ہیں۔ حلال وحرام کے قواعد منضبط کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اہل زمین کے لیے آسمان کے ستاروں کی ہے۔ لوگوں کو ان فقہائ کی کھانے اور پینے سے زیادہ ضرورت ہے اور لوگوں پر ان کی اطاعت والدین کی اطاعت سے زیادہ فرض ہے۔

اس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ فقہاء کلام الٰہی اور کلام نبوی کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتے ہیں۔ گویا ایک فقیہ کے ذریعے کلام الٰہی کی وجوہ اعجاز نمایاں ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم ادنیٰ حفظ وروایت ہے اور علم حقیقی فقہ ودرایت ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ کے آغاز میں اسے نہایت شاندار انداز میں سمجھایا ہے۔ ارشاد ہے:

اس علم کے کچھ طبقے ہیں اور اس کے جاننے والوں میں باہم کچھ درجات ہیں۔ اس علم میں کچھ چھلکے اور کچھ مغز یا کچھ سیپی اور کچھ موتی کے درجے کے ہیں۔

آگے اپنے نقطہ نظر کو کھول کر سمجھاتے ہیں:

چھلکوں میں ظاہر کے بہت نزدیک احادیث کے بارے میں یہ علم کہ صحیح ہے یا ضعیف، مشہور ہے یا غریب اس کے علم بردار بڑے بڑے محدثین اور حفاظ حدیث ہوئے ہیں اس کے بعد ایک اور بھی علم ہے جس کے ذریعے حدیث کے معانی تک دسترس ہوتی ہے۔ احکام استنباط کیے جاتے ہیں۔ منطوق، مدلول اور مفہوم کلام سے منصوص حکم پر قیاس کیا جاتا ہے۔ منسوخ اور محکم راجح اور مرجوح کا علم ہوتا ہے۔ اس علم کی حیثیت عام علماء کے نزدیک مغز اور موتی کی ہے۔ فقہاء محققین کا یہی کام ہے۔

اچھائی فضل الٰہی اور برائی انسان کا عمل ہے

۱۲۴ ــ یاد رکھو کہ بھلائی خواہ کچھ ہو جو تمہیں پیش آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ نقصان

اٹھاتے ہو وہ خود تمہاری جانب سے ہے یعنی اصل بات یہ ہے کہ بھلائی اور برائی کا موجد ہر چند اللہ تعالیٰ ہے مگر بندے کو چاہیئے کہ نیکی اور بھلائی کو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان سمجھے۔ اور سختی اور برائی کو اپنے اعمال کی شامت سمجھے۔ اس کا الزام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ رکھے۔ پیغمبر ان امور کے لیے نہ موجد ہے نہ سبب بلکہ موجد تو اللہ تعالیٰ ہے اور سبب تمہارے عمل[1] یہاں عام ذہنوں میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ — اس سے پہلی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کل من عند اللہ بھلائی ہو یا برائی اللہ کی جانب سے ہے اور اس آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ بھلائی اللہ کی جانب سے ہے اور برائی بندے کی جانب سے ہے۔ اس خلش کو دور کرنے کے لیے شارحین قرآن نے متعدد جوابات دیے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں من عند اللہ ہے اور یہاں من اللہ ہے۔ زبان وادب کے ماہرین نے دونوں میں فرق یہ کیا ہے کہ من عند اللہ برے بھلے سارے افعال تکوینی کے لیے عام ہے بر خلاف اس کے من اللہ کا استعمال صرف محل رضا میں ہوتا ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ یہاں حسنہ سے مراد نعمت اور خوشحالی ہے اور سیئۃ سے مصیبت اور بدحالی ہے۔ گویا یہ آیت خاص ہے اور پہلی عام ہے۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ خیر و شر ہر چیز کا ظہور خدا ہی کی مشیت سے ہوتا ہے اس کے حکم واذن کے بغیر کوئی چیز بھی ظہور میں نہیں آتی لیکن خیر و شر میں یہ فرق ہے کہ خیر خدا کی رحمت کا اقتضا ہوتا ہے اور شر انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔ اس پہلو سے شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے اور کچھ نے بتایا ہے کہ اگر عالم اسباب سے قطع نظر کر کے فاعل حقیقی اور مسبب الاسباب کی طرف خیال کرو تو ہر بھلائی اور برائی کا خالق اور موجد صرف وہی ہے۔ اس اعتبار سے تمہارا بھلائی اور برائی میں تفرقہ کرنا کہ یہ بھلائی تو اللہ کی طرف سے ہے اور یہ برائی رسول کی طرف سے ہے سراسر حماقت ہے۔ اور اگر عالم اسباب پر نظر کرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ عالم اسباب میں تم کو جو خیر اور بھلائی پہنچتی ہے وہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے اور اگر تم کو کوئی برائی اور تکلیف پہنچتی ہے تو سمجھ لو کہ وہ تمہارے اعمال بد کا نتیجہ ہے۔

دراصل یہ آیت یہاں جس موقعہ پر آئی ہے اس میں دو باتوں کو بیان کرنا مقصود ہے ایک یہ کہ یہاں شگون اور شوم کی تردید مقصود ہے اور بتانا یہ ہے کہ برائیاں جس قدر ہیں ان کا شوم اور شگون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا جہالت اور نادانی ہے۔ دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ جس شخص پر جو افتاد آتے اسے چاہیئے کہ اس کا سبب اپنے اندر تلاش کرے اپنے سے باہر دوسروں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے جیب دامن میں نہ تلاش کرے۔

رسالت پوری انسانیت کے لیے بھلائی ہے

۱۲۵۔ اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لیے پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے اور تمہارے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔ حق تعالیٰ رسول سے منافقوں کے الزام کو دور فرما کر ارشاد کرتا ہے کہ ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے رسول کر کے روانہ کیا ہے اور ہم کو سب کچھ معلوم ہے ہم سب کے اعمال کا بدلہ دیں گے تم کسی کے بیہودہ انکار و الزام کی پروا نہ کرو اپنی رسالت کا کام کیے جاؤ۔[1]

پہلے ارشاد ہوا تھا کہ حسنہ اور خوشحالی اللہ کی جانب سے ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے لوگوں کی بھلائی کی خاطر آپ کو روانہ کیا ہے۔ یعنی اللہ نے آپ کو روانہ فرما کر لوگوں کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔ آپ کا وجود گرامی پوری انسانیت کے لیے اللہ کی بہت بڑی بھلائی ہے۔ اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے ارسلنٰک الی الناس کی تعبیر چھوڑ کر خاص اندازِ بیان اختیار کیا ہے یعنی ارسلنٰک للناس لام منفعت کے لیے آتا ہے۔

اور للناس فرمایا للعرب نہیں فرمایا۔ بتانا یہ ہے کہ آپ کی رسالت پوری انسانیت کے لیے ہے اور آپ کا پیغام کسی قوم، کسی ملک کے لیے خاص نہیں بلکہ معیاری قوموں اور سارے ملکوں کے لیے عام ہے۔ گویا آپ کی ذات کو روانہ فرما کر اللہ سبحانہٗ نے پوری کائنات کے لیے ارادۂ رحمت فرمایا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ
حَفِيظًا ۝ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ
طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝
أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا
فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝

"جس نے بھی رسول کی اطاعت کی اس نے فی الواقع اللہ کی اطاعت کی ہے اور جس کسی نے روگردانی کی تو اے پیغمبر ہم نے تم کو ان پر نگران بنا کر روانہ نہیں کیا"[۱۲۶]۔ یہ لوگ آپ کے سامنے تو طاعت کا دم بھرتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے ہٹ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ راتوں کو اپنی مجلسی زندگی میں آپ کے ارشادات کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اللہ ان کی سرگوشیاں

لکھ رہا ہے، آپ ان سے بے رُخ ہو جائیے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے اللہ کی کارسازی کافی ہے[127]۔ کیا یہ لوگ قرآن کے معانی پر غور نہیں کرتے ہیں۔ اگر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اس میں بہت اختلاف پاتے[128]۔

اسلام کے نظامِ حیات کی اصلی اساس

تاریخی حیثیت سے ہی اور قرآن کے نقطۂ نظر سے اسلامی نظامِ حیات کا قیام اور اسلام کے سیاسی نظام کی تکوین ایک عہد و پیمان کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و بعثت کے بعد جو لوگ مکہ میں اسلام لاتے وہ اس نظام کے اولین ارکان تھے جس نے مکہ کی ابتدائی و منتشر صورت سے نکل کر مدینہ میں منظم اور مربوط صورت اختیار کر لی اور جس سے بطورِ نتیجہ اسلام کا سیاسی نظام وجود میں آیا۔ یہ لوگ جو مکہ میں اسلام لاتے تھے۔ اسلام لانے سے قبل ایک ایسے معاشرے کے افراد تھے جسے قرآن کی زبان میں جاہلیت کہتے ہیں۔ عرب میں نہ اس وقت کوئی سلطنت تھی اور نہ کوئی قانونی ضابطہ تھا۔ اسلام لاتے ہی انہوں نے خدائی قانون اور خدائی حکومت کی اطاعت کا عہد کیا۔ اور اپنے نفس وارادہ کو بالکلیہ احکامِ الٰہی کے تابع کر دیا۔ نتیجۃً وہ ان جملہ حقوق سے دستبردار ہو گئے جو ان کو زمانۂ جاہلیت میں حاصل تھے اس طرح وہ معاملہ ہوا جسے قرآن نے ایمان کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک عام دستور ہے کہ ہر نظام کی ابتداء اس کے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے سے ہوتی ہے۔ اسلامی نظام بھی اپنے ہمنواؤں سے سب سے پہلے اپنے لیے حلف وفاداری اٹھانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے اور اسی عہد کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے بیعت لی جاتی ہے۔ ایمان اگرچہ بظاہر توحید و رسالت کے اقرار کا نام ہے مگر فی الواقع وہ پورے اسلامی نظامِ حیات کے وفاداری کا ایک مضبوط میثاق ہے مکہ میں یہ اسلامی معاشرہ بہت منتشر صورت میں تھا لیکن مدینہ پہنچ کر اس کے خال و خد نمودار ہو گئے جیسا

جیسا زمانہ گزرتا گیا اس کے لیے ایک قانونی اور اخلاقی ضابطۂ عمل مدون ہوگیا اور اس قانونی و اخلاقی ضابطہ کو نافذ کرنے کے لیے ایک سیاسی نظام وجود پذیر ہوا جس کی حکمرانی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں میں تھی۔ ایمان کی حدود میں یہ معاہدہ چونکہ خدا اور بندوں کے درمیان ہوا تھا اور حضور انور کی حیثیت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ایک نمائندہ کی تھی اس لیے اصل طاعت اللہ سبحانہٗ کی تھی۔ حضور انور کی اطاعت ایک انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسول خدا کی حیثیت سے تھی۔ ان آیات میں قرآن نے یہ بات سمجھائی ہے کہ رسول کی حیثیت میں آپ کی اطاعت براہِ راست خدا کی اطاعت ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں ملکی قوانین وضوابط اور اخلاقی اصول جن کو نبوت پیش کر رہی ہے براہِ راست ارادۂ الٰہی سے ماخوذ ہیں۔ اس قانون اور اخلاقی نظام سے وابستگی ہی اسلام کے نظام سے وابستگی اور اس سے روگردانی اسلام سے روگردانی ہے۔ اسلامی نظام کی دو بنیادیں ہیں ایک رسول اللہ دوسرے کتاب اللہ۔ عمل کی حد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علم کی حد تک کتاب اللہ ہے۔ ان آیات اللہ میں رسول اللہ کے بارے میں بتایا ہے کہ مخاطبوں میں ایسی جماعت موجود ہے جو زبان کی حد تک طاعت کا دم بھرتی ہے اور کتاب اللہ کے متعلق کہا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب پر غور و فکر سے مطالعہ نہیں کرتے۔

۱۲۶ ۔ جس نے بھی رسول کی اطاعت کی اس نے فی الواقع اللہ کی طاعت کی اور جس کسی نے روگردانی کی تو اے پیغمبر ہم نے تم کو ان پر نگران بنا کر روانہ نہیں کیا ہے۔ آپ کی رسالت کو محقق فرما کر اب خدا تعالیٰ آپ کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسول کی فرمانبرداری کرے گا وہ بے شک ہمارا تابعدار ہے اور جو اس سے روگردانی کرے گا تو ہم نے تجھ کو اے رسول ان لوگوں پر نگہبان بنا کر روانہ نہیں کیا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دے۔ ہم ان کو دیکھ لیں گے۔ تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے آگے ثواب اور عقاب یہ ہمارا کام ہے۔[1]

دراصل اسلامی نظام کی فطرت اور ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور انسان کی اجتماعی خودی کی نشو و نما ہے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انفرادی شخصیت اور اجتماعی سیرت کا کوئی ایسا نمونہ مکمل افراد کے سامنے موجود ہو کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرت کا معیار متعین کرنا دشوار ہو جائے گا۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ رسول کی شخصیت و سیرت ایک نمونہ ہے اور ایسا نمونہ ہے کہ قرآن رسول کی اطاعت کو

---

[1] ۔ افاداتِ شیخ الاسلام

براہِ راست خدا کی طاعت بتا رہا ہے۔ اس کا کھلے لفظوں میں مطلب یہ ہے جیسا کہ امام رازی نے سمجھا ہے کہ رسُول سے ذرا غلطی اور خطا کا امکان نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی طاعت عین طاعت الٰہی کیسے ہوتی۔ رسُول کی طاعت کا طاعتِ الٰہی ہونا رسُول کے معصوم ہونے کی واضح دلیل ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

لوگوں کے لیے ایک معصوم اور متفق علیہ کی ضرورت ہے۔ اور نبی کا خطا سے معصوم ہونا اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ضروری علم و یقین کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے سبب نبی سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے جو چیز پا رہا ہے اور سمجھ رہا ہے وہ حقیقت کے عین مطابق ہے اور اسے ایسا یقین ہوتا ہے گویا حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور دیکھتے وقت اپنی آنکھوں کو غلط بین نہیں سمجھ رہا ہے ۔۔۔ اکثر حقائق کے بارے میں نبی کو ایک فطری ملکہ حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعے ہمیشہ صحیح طریقے سے علم وجدانی حاصل ہوتا ہے اور اسے اپنے وجدانی تجربہ کی صداقت کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے ۔

اس طرح نبی کی ذات موردِ عنایات الٰہی اور مرکز الطاف و توجہات ہوتی ہے اس کے اخلاق و عادات اور اس کی زندگی کے طور طریقے سب خدا کی نظر میں محبوب زندگی کے تمام طریقوں میں سے اس کا طریقۂ حیات، لوگوں کے اخلاق میں اس کا اخلاق اور لوگوں کی گوناگوں عادتوں میں اس کی عادتیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی تمام پسندیدہ چیزوں اور شعائر اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے اللہ کی محبت و پسندیدگی متعلق ہو جاتی ہے اور نبوت کی اتباع و اطاعت اور اس کے شعائر اور خصوصیات کو اپنانا اور اس جیسا اخلاق پیدا کرنا اللہ کی محبت کو پانے کا مضبوط طریقہ اور قرب و آسان راستہ ہو جاتا ہے۔ اور جو ان کی اتباع کرتا اور ان کی کاپی بنتا ہے وہ خدا کی محبتوں ہی میں نہیں بلکہ محبوبوں میں ہو جاتا ہے۔ ان پیغمبرانہ اطوار کا نام شریعت کی زبان میں سنن الہدیٰ ہے۔ بہر حال شخصیت کا نشو و ارتقاء اسی نمونہ کے مطابق قرآن کا مطالبہ ہے اور جو جماعت اس نمونہ کو اپنا لیتی ہے وہی اجتماعی سیرت کی تشکیل میں انسانوں کے لیے بطور ایک معیار ہوتی ہے۔ شخصی اور اجتماعی سیرت کے ان دونوں نمونوں کو قرآن نے انسانیت کے سامنے پیش کیا ہے ۔

تعامل صحابہ اور اسلام کا سیاسی نظام

شخصی ارتقاء میں محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی شخص کا عمل حجت و دلیل نہیں ہے

لیکن اجتماعی سیرت کی تشکیل میں صحابہ کرام کے اعمال و اقوال کو اسلامی قوانین کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ اسی ماخذ سے ماخوذ ہے۔ تعامل صحابہ اس حیثیت سے کوئی درجہ نہیں رکھتا کہ وہ صحابہ کا تعامل ہے نہ اس حیثیت سے اسے دلیل و حجت قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ صحابہ کا تعامل قانون اسلامی کا اس حیثیت سے ماخذ ہے کہ وہ اجتماعی سیرت کی تشکیل میں سنت نبوی کی ایک علامت اور دلیل ہے۔ صحابہ کرام چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے آپ کے فیضان صحبت سے مستفیض ہونے والے اور آپ کی کامل اتباع کرنے والے تھے اس لیے ان کا کوئی عمل ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا جو براہ راست سراج رسالت منیر سے ماخوذ نہ ہوا۔ اسی لیے ان کے ارشادات و اعمال کو قانون اسلامی کا ماخذ اور مسائل کے لیے دلیل و حجت کہا گیا ہے کیونکہ ان کے اقوال و افعال خود نبوت کے اقوال و افعال کا عکس ہیں وہ رسول کی تزکیہ و تعلیم کی سرگرمیوں کا نمونہ ہیں۔

بہرحال آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نظام حیات میں رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے یہ گویا قرآن نے طاعت رسول کے لیے فلاح و نجاح کی بہت بڑی ضمانت دی ہے۔ اس عظیم ضمانت کے باوجود اگر کوئی فرد اپنے شخصی ارتقاء اور کوئی جماعت اپنی اجتماعی سیرت کی تشکیل میں رسول سے روگرداں ہوتی ہے تو ہو جائے۔ رسول پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہٹنے والے اور دامان رسول چھوڑنے والے اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں، ان کے اعمال کے بارے میں رسول سے نہ پوچھا جائے گا۔ رسول کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام اور ہدایات ان تک پہنچائے جائیں اور بس۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنے شخصی ارتقاء اور اجتماعی سیرت کی تشکیل میں آپ کی طاعت نہیں کرتے ہیں تو نہ کریں آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے کیونکہ آپ کو مبلغ بنا کر روانہ کیا ہے ان کا حفیظ اور نگران بنا کر روانہ نہیں کیا ہے۔ ان کے اعمال کی نگرانی آپ کا نہیں ہمارا کام ہے ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم۔

یہاں امام رازی نے مقاتل کے حوالہ سے اس آیت کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میرے سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے اور جو میری طاعت کرتا ہے وہ اللہ کی طاعت کرتا ہے۔ اس پر منافقین بولے کہ یہ شخص تو ہمیں آہستہ آہستہ شرک کے قریب لے جا رہا ہے۔ ایک طرف خود ہی ہمیں غیر اللہ کی عبادت سے روکتا ہے اور دوسری طرف ہم سے اپنے کو رب بنانے کا مطالبہ کرتا ہے جیسا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو بنا چکے ہیں۔ اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔ اگرچہ تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے کیونکہ جس راہ سے یہ روایت آئی ہے یعنی مقاتل وہ محدثین کے یہاں قابل اعتبار شخصیت نہیں ہے۔ ان کا چہرہ ارباب جرح و تعدیل نے یہ بتایا ہے۔ امام جوزجانی کہتے ہیں کہ بڑا اپائی قسم کا جھوٹا ہے۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ فلاس کہتے ہیں کہ متروک الحدیث ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ محدثین اس کی حدیث سے بچتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن حکم اس کو قصہ گو بتاتے ہیں، نسائی نے کذاب قرار دیا ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر شارحین قرآن کے نزدیک یہی پس منظر ہے تو مقاتل کی بات کا مطلب یہ ہے کہ مومن صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اللہ کے سوا اس کے عابدانہ تعلقات کسی سے نہیں ہوتے۔ شرک دو قسم کا ہے ایک الوہیت میں دوسرے ربوبیت میں، الوہیت میں شرک یہ ہے کہ پرستش اور پوجا میں اللہ کے ساتھ کسی سے عابدانہ تعلقات ہوں، ربوبیت میں شرک یہ ہے کہ بندگی و طاعت میں اللہ کے ساتھ شریک کر لیا جائے یعنی اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو حلال و حرام اور قانون سازی کا حق دے دیا جائے۔ منافقین یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ ہم سے شرک فی الربوبیت کرانا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں منافقین کے اسی شبہ اور مغالطہ کا جواب دیا ہے کہ رسول کی طاعت رسول ہونے کی حیثیت میں ایک انسان کی طاعت نہیں بلکہ اللہ کی طاعت ہے۔

دو غلی اسلامی زندگی

۱۲۷۔ یہ لوگ آپ کے سامنے تو طاعت کا دم بھرتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے ہٹ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ راتوں کو اپنی مجلسی زندگی میں آپ کے ارشادات کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اللہ ان کی سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ آپ ان سے بے رخ ہو جائیے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ اللہ آپ کو کارساز ہونے کے اعتبار سے کافی ہے۔ ان منافقین کی او رمکاری سنو۔ آپ کے روبرو تو آکر کہہ جاتے ہیں ہم نے قبول کیا حکم تیرا اور باہر جا کر مشورہ کرتے ہیں اس کے خلاف یعنی تیری نافرمانی اور مخالفت کا مشورہ کرتے ہیں۔ اور اللہ کے یہاں ان کے سب مشورے لکھے جاتے ہیں، ان کو سزا دینے کے لیے۔ لہٰذا اے نبی ان سے منہ پھیر لے اور کسی بات کی پرواہ مت کر اور اپنے سب کام اللہ کے حوالے کر دے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طاعت یہاں مبتدائے محذوف کی خبر ہے پورا جملہ امرنا طاعۃ یعنی آپ کی بات اور آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یا جملہ امرنا طاعۃ ہے یعنی ہمارا کام ہی آپ کی طاعت ہے۔ پہلی رائے حافظ ابن جریر کی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ بارگاہ رسالت میں ہوتے ہیں تو طاعت و فرمانبرداری کے پُر جوش نعرے لگاتے ہیں اور آپ کی مجلس میں ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں لیکن جب آپ کی مجلس سے ہٹتے ہیں تو اپنی مجلسوں میں ان آیات و احکام کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں جن کو اپنی خواہشات اور اپنے ذاتی مفاد کے خلاف پاتے ہیں۔ قرآن نے ان کے اس روّیے پر ان کو یہ دھمکی دی ہے واللہ یکتب ما یبیتون اللہ ان کی ساری سرگوشیوں کو لکھ رہا ہے وہ یہ خیال نہ کریں کہ اگر وہ یہ سرگوشیاں آپ سے چھپا کر کریں گے تو آپ سے ان کی یہ سرگوشیاں چھپی رہیں گی ایک وقت آئے گا اللہ آپ کو بتا دے گا اور اس طرح ان کی چالاکیاں سب کے سامنے بے نقاب ہو جائیں گی اور یا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی یہ سرگوشیاں خدا سے چھپی ہوئی ہیں۔ ایک روز ان کا یہ سارا دفتر لکھا ہوا ہے ان کے سامنے آجائے گا۔ پہلے مطلب کی صورت میں ان کو دھمکی ہے اور دوسرے مطلب میں ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔

آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو اسلام کی حد تک دو رخی زندگی اختیار کر لیتے ہیں، زبان سے کچھ کہتے ہیں اور دل میں کچھ ہوتا ہے۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ قلب و زبان میں ہم آہنگی ہو، یہ سامنے ہو کر فرمانبرداری کی لافیں مارنا اور علیحدہ ہو کر نافرمانی کے لیے ترکیبیں سوچنا نفاق ہے۔ قرآن نے یہاں اسے نفاق ہی قرار دیا ہے۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے فاعرض عنھم آپ ان سے اعراض فرمائیے یعنی آپ ان کی سرگوشیوں کی قطعاً پروا نہ کیجئے۔ ان کی سازشوں اور سرگوشیوں پر کوئی ایکشن نہ لیجئے۔ بلکہ و توکل علی اللہ ان کے معاملے میں اللہ پر بھروسہ کیجئے یعنی ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے اور اللہ کا بھروسہ ہی آپ کو کافی ہے۔ یہ بدبخت اپنی سرگوشیوں سے اسلام کا اور آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے جو کچھ بگاڑیں گے اپنا ہی بگاڑیں گے۔

اس جگہ مفتی صاحب کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے لوگ طرح طرح کے الزامات اس کے سر ڈالیں گے۔ دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے۔ ان سب باتوں کے باوجود رہنما کو عزم و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہیے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مواقع پر ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیے۔ اور ان سے انتقام نہ لینا چاہیے۔ اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار و منافقین سے عفو و درگزر کی نصیحت ہے عام شارحین قرآن کا خیال یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے چنانچہ اس آیت کو کچھ شارحین نے جاھد الکفار والمنافقین سے منسوخ کہہ دیا ہے لیکن شارحین قرآن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگزر کی نصیحت میں کوئی منافات نہیں سمجھتے۔ چنانچہ یہاں بھی امام رازی نے تصریح کی ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قرآن میں تدبر کی دعوت

۱۲۸۔ کیا یہ لوگ قرآن کے معانی پر غور نہیں کرتے ہیں۔ اگر اللہ کے علاوہ یہ قرآن کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔ پہلی آیات سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا اور آپ کی اطاعت کا بعینہٖ خدا کی اطاعت ہونا اور آپ کے نافرمانوں پر خدا کا عذاب ہونا تو خوب ظاہر ہو گیا۔ مگر منافق اور آپ کے مخالف کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی گواہی اور اس کے ارشادات کی تسلیم و تصدیق میں تو ہرگز تامل نہیں لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ خدا ہی کا کلام ہے بشر کا بنایا ہوا نہیں تو حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے جس سے صاف معلوم ہو جائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے دیکھو اگر یہ قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو ضرور قرآن میں بہت سے مواقع میں طرح طرح کا اختلاف ملتا۔ دیکھو آدمی ہر حالت میں اسی حالت کے موافق کلام کرتا ہے جو حالت پیش ہوتی ہے دوسری حالت کا دھیان نہیں ہوتا۔ غصہ میں مہربانی والوں کا دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصہ والوں کا۔ دنیا کے بیان میں آخرت کا لحاظ نہ رہے اور آخرت کے بیان میں دنیا کا۔ بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں اور عنایت میں بے پروائی کا۔ بالجملہ ایک حال کا کلام دوسرے حال سے مختلف نظر آئے گا لیکن قرآن شریف چونکہ خالق کا کلام ہے۔ یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی نظر رہتی ہے غور و فہم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک انداز پر ہے۔ دیکھئے یہاں منافقوں کا حال مذکور تھا جو سخت عتاب کا محل تھا سو یہاں بھی ان کی باتوں پر اسی قدر الزام ہے جتنا چاہیے اور جو الزام ان کی ایک خاص جماعت میں تھا وہ خاص ان پر ہی لگایا اور فرمایا کہ بعض ایسا کرتے ہیں یہ نہیں کہ غصہ وغیرہ کی حالت میں کلام اپنی حد سے نکل جائے اور دوسری حالت کے کلام سے

مختلف نظر آئے۔

نیز یہ مطلب بھی ہے کہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کوئی کلام طویل کرتا ہے تو وہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ کوئی جملہ فصیح کوئی غیر فصیح کوئی صحیح کوئی غلط کوئی سچا کوئی کاذب کوئی موافق کوئی باہم متناقض ضرور معلوم ہوتا ہے اور قرآن اتنی بڑی کتاب ہونے کے باوجود ان جملہ اختلافات سے پاک ہے جو طاقت بشر سے پاک ہے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو فہم اور تدبر سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے مگر فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو جو اسی جگہ تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرمایا قل کل من عند اللہ پھر فرمادیا وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک سو یہ تناقض اور تناقض ہو گیا۔ لہ

مقصد یہ ہے کہ منافق اور ضعیف لوگوں کی جس روش پر اوپر کی آیتوں میں تنبیہہ کی گئی ہے۔ اس کی بڑی اور اصلی وجہ یہ تھی کہ انہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک تھا۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ رسول پر واقعی وحی اترتی ہے اور یہ جو کچھ ہدایات آرہی ہیں براہ راست خدا ہی کے پاس سے آرہی ہیں اسی لیے ان کی منافقانہ روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں مختلف مواقع پر مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اول سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار، یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جز دوسرے جز سے متصادم نہ ہو۔ جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے۔ جس میں متکلم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں اور جس پر کبھی نظر ثانی تک کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لہ

دراصل اس آیت میں منافقین کو ان کے اس فکری تضاد پر متوجہ کیا ہے کہ ایک طرف قرآن پر ایمان اور پیغمبر کی باتوں پر طاعت کا نعرہ لگاتے ہو اور پھر اسی قرآن اور اسی پیغمبر کی باتوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ اپنے وہ اس مختلف طرز عمل کے لیے قرآن میں ان کو بیک وقت دو مختلف باتیں نظر آرہی ہیں۔ کیا ان کو قرآن میں بیک وقت دو اراد وں کی کارفرمائی دکھائی دے رہی ہے

لہ افادات شیخ الاسلام لہ تفہیم القرآن

اس کی کچھ باتیں قابلِ پذیرائی ہیں اور کچھ ناقابلِ پذیرائی، کچھ باتیں اچھی ہیں اور کچھ اچھی نہیں ہیں۔ کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر وہ قرآن کا بغور مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن کی ہر بات اپنے اصول اور کلیات میں مستحکم اور مربوط ہے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے وہ ایک دوسرے سے پوری طرح وابستہ ہیں۔ وہ جن عبادات وطاعات کا حکم دیتا ہے ان کا براہِ راست عقائد سے تعلق ہے۔ وہ جن اعمال اور اخلاق کی تلقین کرتا ہے وہ اپنے اصول سے براہِ راست نشوونما پاتے ہیں۔ اس کی مجموعی تعلیم سے زندگی کا جو نظام بنتا ہے وہ ایک وحدت کی صورت میں ہے۔ جس طرح کائنات کے اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اور ان کی سازگاری اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کے اندر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے کوئی اس میں شریک نہیں ہے ٹھیک ایسے ہی اس کتابِ عزیز کے مختلف اجزا کی باہمی سازگاری اور پھر اس کتاب کے علم کے ساتھ نبوت کے عمل کی ہم آہنگی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں علم وعمل کی صورت میں ایک ہی خدائے واحد کے ارادے کا پرتو ہیں۔ اگر قرآن خدا کی کتاب نہ ہوتی اور حضور انور کی ساختہ و پرداختہ ہوتی تو علم وعمل میں کبھی موافقت نہ ہوتی، سرتاسر اختلاف ہوتا۔ بلکہ خود کتاب تناقضات اور اختلافات کا ایک منتشر دفتر بن کر رہ جاتی۔

قرآن پر تدبر ہر مسلمان کا فرض ہے

اس آیت کا یہ مدلول بھی بالکل بے غبار ہے کہ قرآن کو پڑھنا، اس کے معنے جاننا اور اس پر غور و فکر کرنا ہر مسلمان کی اسلامی ذمہ داریوں اور ایمانی تقاضوں میں داخل ہے۔ قرآن کا ہر شخص سے مطالبہ ہے کہ وہ اسے پڑھے سمجھے اور اس پر غور وفکر کرے۔ اور اس کے جاننے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے ان کی تکمیل کرے۔ مثلاً قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا عربی جاننے پر موقوف ہے تو عربی کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ آج ہی نہیں روزِ اول ہی سے عجمیوں نے عربی سیکھی اور دین کا بیشتر ذخیرہ عجمیوں ہی کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔ محدثین، قرا، فقہا کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں بیشتر غیر عربی تھے۔ دین کے تقاضے سے دب کر انہوں نے عربی پر عبور حاصل کیا۔ قرآن پڑھا، سمجھا اور فکر وغور سے کام لے کر اس سے زندگی کے مختلف مسائل معلوم کیے۔

قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کا مخلصانہ اور گہرا مطالعہ کیا جائے جو خارجی اثرات اور غیروں کے تصورات سے بالکل آزاد ہو۔ اس طرح اس پر ہمارے ذاتی رجحانات اور خواہشات سایہ فگن نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ ہماری خواہشات معیوب نہ ہوں بلکہ مستحسن ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فطری اور طبعی ہوں لیکن یہ قطعاً

ضروری نہیں کہ قرآن سے ہر مستحسن چیز کے لیے دلیل و سند کا کام لیا جائے۔ قرآن کے مطالعہ اور تفہیم کو زمانہ کے محدود پیمانوں کا پابند نہیں بنانا چاہیے کیونکہ زمانے آتے جاتے رہتے ہیں۔ غور و فکر کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اشیا کی قدر و قیمت کو بھی کبھی قرار نہیں یہ چڑھتی اترتی رہتی ہیں۔ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے، مستقل ہے اپنی منفرد شخصیت رکھتی ہے۔ علومِ انسانی کا پورا خزانہ اور اس کے سارے نظریات ریت کے پھیلتے ہوئے ٹیلے کی طرح ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں تدبر کرنا اور اس کا مطالعہ کرنا صرف اماموں اور مجتہدین کا کام نہیں ہے لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ایک عامی کا مطالعہ اور مجتہدین کا تدبرِ قرآنی یکساں ہے۔ دونوں کے تدبر و تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہیں۔ ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا جبکہ عام علما کا تفکر ان مسائل کو صرف سمجھے گا۔

یہ بالکل درست ہے کہ یہ آیت ہر شخص کا یہ حق مان رہی ہے کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کرے لیکن مجتہدانہ تدبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مبادی و مقدمات سے گزر کر یہ کام کرے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تدبرِ قرآنی کے مقبول ہونے کا انحصار جس طرح اس بات پر ہے کہ تدبر کرنے والوں میں اس کی اہلیت ہو۔ اسی طرح اس امر پر بھی ہے کہ یہ تدبر صحیح طریقے سے کیا جائے۔ قرآن پر تدبر کے لیے ضروری ہے کہ ایک آیت کے وہ معنے لیے جائیں جن کے لیے عربی زبان کی لغت، قواعد اور معروف استعمالات میں گنجائش ہو جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے لگتے ہوئے ہیں۔ جو اسی موضوع کے متعلق قرآن کے دوسرے بیانات سے متناقض نہ ہوں اور جن کی تائید قولی اور عملی تشریحات سے ملتی ہو کم از کم سنت ان معنوں کے خلاف نہ ہو۔

تدبرِ قرآن کی راہ میں مشکلات

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ تحریری شکل میں مطبوعہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود اس کے تدبر میں چند رکاوٹیں ہیں۔

سب سے پہلی دقت اصطلاحات کی ہے۔ قرآن صرف عربی میں نہیں بلکہ عربی مبین میں ہے۔ قرآن میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ قانونی زبان کی اصطلاحات ہیں مثلاً سلطان ملک حکم، امر ولایت۔ ان الفاظ کے قانونی مفہوم کو عربی میں بھی لوگ کم سمجھتے ہیں کیونکہ ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو چکا ہے۔ ہمارے

متقدمین ان اصطلاحات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ امام محمد کی السیر الکبیر اور الجامع الکبیر اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اس کی گواہ ہے۔

دوسری شکل ایک اور ہے جواب بڑھتے بڑھتے ایک لطیفے اور مذاق کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک مجلس میں مجھ سے خود ایک سیاسی مذاق رکھنے والے دوست نے طنزیہ انداز میں کہا کہ صاحب قرآن پر ہر شخص تدبر کر سکتا ہے یہ کوئی چینی اور گھی کا ڈپو نہیں ہے کہ ڈپو ہولڈر ہی اس کو کرنے کا قانوناً مجاز ہے۔ قرآن پر مولوی کی اجارہ داری نہیں ہے کہ وہی تدبر کرنے کا مجاز ہے۔ جس طرح مولوی کو تدبر کرنے کا حق ہے اسی طرح ہم بھی یہ حق رکھتے ہیں۔ یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جو نہ قرآن کی زبان سے واقف ہیں نہ اسلام کی تاریخ پر ان کی نگاہ ہے۔ وہ اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں علم کے بغیر قرآن پر تدبر کرنے کا نہیں بلکہ قرآن کی صورت بگاڑنے کا پروانہ مل جانا چاہیے۔ بلاشبہ قرآن پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور مولوی کسی خاندان یا نسل کا نام نہیں ہے۔ جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے اور ہر شخص انجینئرنگ پڑھ کر انجینئر اور طب پڑھ کر حکیم بن سکتا ہے اسی طرح ہر شخص قرآن کے علم پر وقت اور محنت صرف کر کے قرآن میں تدبر کر سکتا ہے۔ قرآن کوئی بازیچہ اطفال نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے تدبر کرنے بیٹھ جائے اور اس کے احکام کے بارے میں جاہلانہ فیصلے کرنے لگے۔

تدبر ہی کے نتیجے میں وہ پیش یا افتادہ احوال و ظروف کے لیے اس سے احکام نکال سکے گا۔ اسی کی طرف علامہ قرطبی نے اشارہ کیا ہے اور تدبر کی دعوت سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ قرآن کی تشریح کسی امام کا حق نہیں ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ
إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ
وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

اور جب ان کو امن یا ڈر کی کوئی خبر معلوم ہوتی ہے تو اس کی تشہیر کرتے ہیں۔[129] اور اگر یہ لوگ اس خبر کو اللہ کے رسول کی بارگاہ تک یا ان لوگوں تک پہنچاتے جو ان میں سے اربابِ اختیار ہیں تو ان میں سے فکر و نظر رکھنے والے اس کی تہ تک پہنچ جاتے۔[130] اور دیکھو اگر اللہ کا تم پر فضل اور رحمت نہ ہوتا تو تھوڑوں کو چھوڑ کر سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔[131]

انسانی زندگی اور نبوت کا علم و عمل

اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ کی حدود تک سارے معاملات سارے مسائل کے لیے مرکزی طاقت اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اور یہ بھی اسی سورت میں پوری قوت سے بات سمجھائی جا چکی ہے کہ روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام اور معاشی نظام کا سررشتہ

اللہ ورسول کے ہاتھ میں ہے اب بتایا جارہا ہے کہ ہر قسم کے دفاعی اور سیاسی مسائل کا تعلق بھی اللہ کے رسول سے ہے یا پھر ان لوگوں سے جو اہل ایمان میں سے ان کے ارباب بست وکشاد ہوں۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ توحید ربوبیت، توحید عبادت، توحید قانون، توحید نظام، توحید معاشرت، توحید اخلاق، توحید سیاست، توحید اطاعت جیسی نعمتیں اس وقت تمہیں صرف اس لیے ملی ہیں کہ اللہ نے تمہیں نبوت کے علم وعمل کی صورت میں اپنے فضل ورحمت سے نوازا ہے۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو تم بھی استبداد کے شکنجے میں کسے ہوتے اور مختلف راہوں میں ہٹ کر شیطان کے پیروکار ہوتے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل اور اس کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے نبوت کے علم وعمل کے ذریعے تمہیں شیطان کی پیروی سے بچالیا۔ اور انسانوں کی بندگی سے چھڑا کر خدا کی بندگی پر لگا دیا اور دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لے آیا اور مذاہب کی کج روی اور بے اعتدالی سے نکال کر نبوت کے علم وعمل کے صدقہ اسلام کی صراط مستقیم پر لگا دیا۔ اور نبوت کے اسی علم وعمل نے ان کی ایمان کے ذریعے تربیت کی۔ روح کی بلندی قلب کی صفائی اخلاق کی خوبی، مادی گرفت سے آزادی اور خواہشات سے دستبرداری کا سبق دیا۔ یہ زبردست انقلاب انسانی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے۔ اس کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی۔ اس کی سرعت اس کا عمق اس کی وسعت وہمہ گیری حیرت انگیز تھی۔ اس کا باعث اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے نبوت کے علم وعمل کی صورت میں اپنا فضل ورحمت فرمایا ہے۔

۱۲۹۔ اور جب ان کو امن یا ڈر کی خبر معلوم ہوتی ہے تو اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ یعنی ان منافقوں اور کم سمجھ مسلمانوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی امن کی بات پیش آتی ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا یا لشکر اسلام کی فتح کی خبر سننا یا کوئی خبر خوفناک سن لیتے ہیں جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا تو ان کو بلا تحقیق کیے مشہور کرنے لگتے ہیں اور اس میں اکثر فساد ونقصان مسلمانوں کو پیش آجاتا ہے۔ منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے[۱]

کچھ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے جو ہر طرف افواہیں اڑاتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ کمزور مسلمانوں کے متعلق ہیں جو مبالغہ آمیز اطلاعیں آنے پر پریشان ہوجاتے اور ان کو نشر کردیتے ان خبروں سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ حافظ ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ یہ آیات اسی گروہ کے بارے میں ہیں جو حضور انور کے سامنے طاعت و فرمانبرداری

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کے جھوٹے دعوے کرتا اور اپنی نجی مجلسوں میں آپ کے ارشادات کے خلاف سرگوشیاں کرتا تھا۔

دراصل اس آیت میں عام زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جب حالات ہنگامی ہوتے ہیں، اور افواہیں ہر طرف اڑتی ہیں، کبھی خطرے کی بے بنیاد خبریں آتی ہیں، کبھی دشمن کسی خطرے کو راز بنانے کی خاطر اطمینان کی خبریں بھیج دیتا ہے۔ ان افواہوں میں رائے عامہ بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ نیتیں مختلف ہوتی ہیں منافق لوگ جو محض ہنگامہ پسند تھے جن کے لیے اسلام اور کفر کا یہ مقابلہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا۔ اور کچھ وہ لوگ جنہیں کچھ خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ خبریں پھیلانے کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور کچھ وہ لوگ جن میں محض خبریں معلوم کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے ان میں پھنس جاتے ہیں۔ انہی لوگوں کو اس آیت میں تنبیہہ کی گئی ہے اور سختی سے رد کیا گیا ہے۔ رائے عامہ جب بھی سیاسی اور دفاعی معاملات میں دراندازہوتی ہے اس سے اجتماعی نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ کیا چیز راز ہے اور کیا چیز راز نہیں ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب ان کو خبر ملتی ہے کہ فلاں فوجی دستہ کامیابی سے ہمدوش ہوگیا ہے اور دشمنوں کے نرغے سے بچ گیا یا ان کو پتہ لگتا ہے کہ فلاں فوجی مہم میں دشمن کا دباؤ بڑھ گیا تو ان خبروں کو وہ لوگوں میں خوب پھیلاتے ہیں۔ اصل ارشاد میں اذاعوابہ کے الفاظ آتے ہیں اذاعة کے معنے مشہور کرنے اور شائع کرنے کے ہیں اسی سے ریڈیو کو مذباع اور ریڈیو اسٹیشن کو دار الاذاعة کہتے ہیں۔ یعنی امن اور خطرے کی جو بات بھی ہوتی آن کی آن میں جنگل کی آگ کی طرح ان کے ذریعے سے لوگوں میں پھیل جاتی۔

جماعتی زندگی میں افواہیں عام حالات میں بھی بڑے خطرناک نتائج پیدا کرسکتی ہیں۔ اور جب حالات جنگ کے ہوں پھر تو ان کی خطرناکی دو چند ہو جاتی ہے۔

حوادث و واقعات میں اجتہاد و استنباط

۱۳۰۔ اور اگر یہ لوگ اس خبر کو اللہ کے رسُول کی بارگاہ تک یا ان لوگوں تک پہنچاتے جو ان میں سے اربابِ اختیار ہیں تو ان میں سے فکر و نظر والے اس کی تہ کو پہنچ جاتے ۔ یعنی کہیں سے کوئی خبر آئے تو چاہیے کہ اول پہنچا میں سردار تک اور اس کے نائبوں تک جب وہ اس خبر کو تحقیق اور تسلیم کرلیں تو ان کے کہنے کے مطابق اس کو کہیں نقل کریں اور اس پر عمل کریں[1]

---

[1] افادات بشیخ الاسلامؒ

مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ و رسول اور ملت کے خیر خواہ ہیں تو ان کے لیے ایسے مواقع پر صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس طرح کی جو باتیں ان کے علم میں آئیں ان کو عوام میں سنسنی پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو رسول خدا اور اُمت کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کریں تاکہ ان کے اندر جو لوگ معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان کے موقع و محل کا تعین کرسکیں، اور ان کے بارے میں صحیح پالیسی اختیار کرسکیں۔

استنباط کا اصل مفہوم کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا اور کسی پوشیدہ خبر کو ظاہر کرنا ہے اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی بات کی تہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت کو پانے کے معنے میں یہ استعمال ہوا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس نظامِ حیات کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی ہے اور ایسے آخری ابدی نظام کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور قانون کے کلی اور ابدی اصُول و مبادی پر دے۔ چنانچہ اس آخری وحی نے قرآن کو صرف اصُول و کلیات تک محدود رکھا۔ اور جزئیات کے لیے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے ہیں جن کے سہارے وہ لوگ جو علم و معرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائیدِ ربانی سے فیض یاب ہوں وہ علی قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں۔ یہ مرتبہ سب سے پہلے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا اور چونکہ آپ خطا سے معصوم ہیں اس لیے آپ کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے معصوم ہیں پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب اُمت کو ملا ہے۔ اسی کا اصطلاحی نام استنباط اور اجتہاد ہے جس کو ہر زمانے میں فیض یاب علوم نبوت اور حاملینِ اسرارِ شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ آپ پیچھے اسلام کے مصادرِ قانون میں پڑھ آتے ہیں کہ اسلامی نظام میں قانون کا ماخذ عام رائے یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں بلکہ یہاں قانون کا پہلا ماخذ قرآن حکیم ہے جہاں قرآن ساکت ہو وہاں سنّتِ رسُول یا صحابہ کا تعامل دوسرا ماخذ ہے۔ ان حدود کے اندر اسلام نے عقل کی مداخلت کو گوارا نہیں کیا۔ لیکن جہاں صورتِ حال کی نسبت قرآن و سنّت دونوں ساکت ہوں وہاں اسلامی معاشرہ کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کرسکتے ہوں یعنی جن میں استنباط کی قابلیت ہو۔

قانون سازی کے طریقوں میں وسعت

اصول اگرچہ اسلامی نظام میں اصول استناد کی حد تک قانون کا ماخذ قرآن و سنت اور اصول اجتہاد کی حد تک اجماع و قیاس ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی قوانین کی دریافت کے کچھ اور طریقے ہیں۔ جس مسئلہ میں منطقی استدلال اور براہ راست اجتہاد کے ذریعے قانون معلوم کرنا ممکن نہ ہو یا جہاں قیاس کے قیاس اخذ کردہ حکم مصالح کے منافی ہو یا تقاضائے ضرورت کے خلاف نظر آئے وہاں اسلامی قانون وہ ہوگا جو قرآن و سنت کے دیے ہوئے مزاج کے مطابق ہو اور انہی مقاصد کے تحت وضع کیا جائے جو قرآن و سنت میں مضمر ہیں۔ قانون سازی کے اس آخری طریقہ کو کچھ فقہائے نے استحسان اور کچھ نے استصلاح سے تعبیر کیا ہے اصطلاحی طور پر استحسان اور استصلاح کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان فرق بھی کیا گیا ہے اور ان میں سے بعض اپنی نوعیت کے اعتبار سے بعض سے مختلف ہیں۔ ہم ان فنی مباحث کو نظر انداز کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ استنباط احکام کے یہ دونوں طریقے اپنے مزاج اور نتیجہ کے اعتبار سے یکساں واقع ہوتے ہیں۔ ان کی اصل توجہ شریعت کی روح، اس کے مقاصد اور لوگوں کی ضروریات اور مصالح کی طرف ہوتی ہے۔ استصلاح انہی عمومی مصالح پر مبنی قانون سازی کا نام ہے۔ استحسان کسی مسئلہ کو اس کے حکم کے باب میں اس کے نظائر سے کاٹ دینے کا نام ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تر فقہائے احناف نے اختیار کیا ہے۔ اس موضوع کی تفصیلات مصطفی احمد الزرقا کی المدخل الفقہی العام، الآمدی کی الاحکام فی اصول الاحکام اور الشاطبی کی الموافقات میں موجود ہیں۔ بہرحال استحسان ہو یا استصلاح قانون کے دائرے میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو کسی زمانے میں حالات و ضروریات کی مناسبت سے اس زمانہ کی اسلامی ریاست مرتب کرتی ہے۔ چونکہ دونوں طرح کے قوانین کا مقصد شریعت کے مقاصد کا حصول ہے لہٰذا ان کے درمیان عملاً کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

اسلام میں عادلانہ سیاست پر مبنی قانون سازی بھی اسلام کا ایک باب ہے۔

اس موقعہ پر حافظ ابن القیم الجوزی اعلام الموقعین میں بڑی مفید بات لکھ گئے:

انبیاؑ کی تشریف آوری اور کتابوں کے نازل ہونے کا یہ منشا تھا کہ لوگ اپنی زندگی میں جادۂ عدل سے نہ ہٹیں۔ کیونکہ عدل ہی کے سہارے زمین و آسمان قائم ہیں۔ لہٰذا جب حق کے نشان نمایاں ہو جائیں، عقلی دلائل سامنے آجائیں اور کسی طریق سے بھی حق واضح ہو جائے تو وہی اسلام اور دین الٰہی ہے اور وہی اللہ کا فرمان ہے اور اسی میں

اس کی رضا مضمر ہے۔ عدل تک پہنچنے کے طریقوں یا اس کے دلائل اور علامات کو اللہ نے کسی ایک قسم کے احکام میں محصور کر کے دوسرے قوی تر زیادہ واضح اور مدلل طریقوں کو باطل قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس نے جو طریقے بھی شروع فرمائے ہیں ان کے ذریعے یہ واضح کر دیا ہے کہ اصل مقصد حق اور عدل کا قیام اور انسانی زندگی کی متوازن اور منصفانہ تنظیم ہے۔ لہٰذا حق تک جس طریقے سے بھی پہنچا جا سکے اور عدل کو جس طرح بھی پہچانا جا سکے اس کے مطابق قانون سازی ضروری ہے۔ اسباب و وسائل اور طریقے مقصود نہیں ہیں بلکہ اصل وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر انہیں وضع کیا گیا ہے۔ البتہ مشروع طریقوں کو سامنے لا کر اللہ تعالیٰ نے مناسب مثالوں اور معقول اسباب کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ حق کے ثابت شدہ طریقوں میں سے ہر طریقہ آپ کو انہی مقاصد کی طرف لے جانے والا ملے گا۔ دین کامل سے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک سیاست عادلہ شریعت کاملہ کی مخالف نہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ اور اس کے مختلف ابواب میں سے ایک باب ہے اس کو سیاست کہنا محض ایک اصطلاحی بات ہے ورنہ اگر وہ عدل پر مبنی ہو تو شریعت میں داخل ہے۔

جدید اسلامی قانون سازی کی اصولی حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس نکتہ کا فہم بہت ضروری ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے جو قوانین مرتب کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ البتہ ان اجتہادی قوانین کو وہ حیثیت حاصل نہ ہوگی جو قرآن و سنت کے منصوص احکام کو حاصل ہے۔ اجتہادی قوانین اختلافی ہوتے ہیں۔ تفصیلی امور میں اسلامی مفکرین کی ان رایوں کو کوئی آخری اور قطعی بات نہ سمجھنا چاہیے جو کسی نص صریح پر مبنی نہ ہوں۔

قانون سازی کی سب سے بڑی مشکل

مملکتی زندگی میں قانون سازی کے لیے جو دقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اصولِ استناد اور اصولِ اجتہاد میں مصالحت کس طرح پیدا کی جائے۔ جمہوریت صرف اصولِ اجتہاد پر زور دیتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آمریت صرف اصولِ استناد کو صحیح تسلیم کرتی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں اصول اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور کسی ایک پہلو میں غلو برتنے سے دوسرا مجروح ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی فکر کو غیر محدود

آزادی عطا کر دی جاتی ہے تو تمدنی زندگی کی بنیاد اور اس کے مقصد و نصب العین پر کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا اور افراد متضاد نظریات رکھنے والے گروہوں میں بٹ جاتے ہیں جس میں سے ہر گروہ، سیاسی میدان میں دوسرے گروہ کا رقیب اور دشمن بن جاتا ہے۔ اس طرح سے اعمال و عقائد کی وہ یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو قانون کے موثر وجود کی شرط ہے۔ اس قسم کی بے قید آزادی سے تمدنی امور اور انسانی معاملات میں محض عقلی بنیادوں پر کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ عقل جذبات کی تابع خواہشات کی مغلوب، تعصبات کی اسیر اور انفرادی تجربات سے محصور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر صرف اصول استناد پر زور دیا جائے اور اصول اجتہاد کو نظرانداز کر دیا جائے تو انسان کی فکری ارتقاء کی راہیں بالکل مسدود ہو جاتی ہیں اور اس کی حیثیت صرف ایک مشین کے پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اصول استناد میں غلو برتنا انسان کی ذہنی موت ہے جو مغربی تمدن ان دونوں میں کبھی مصالحت پیدا نہ کر سکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی میں غلو کرتے رہے۔ انسانیت کی سعادت دوسرے تمام شعبوں کی طرح یہاں بھی عدل و توازن کے دامن سے بندھی ہوئی ہے اور جب تک کوئی ایسا نظام اختیار نہ کیا جائے جس میں اصول استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کی بھی رعایت رکھی گئی ہو اور افکار و اعمال کی بے قیدی کا سد باب کرنے کے ساتھ جائز حدود میں فکر و عمل کی آزادی بھی دی گئی ہو اس وقت تک انسانی زندگی کا قافلہ اسی طرح بھٹکتا رہے گا۔ زمانہ خلافت راشدہ میں ان دونوں میں ہم آہنگی قائم رہی۔ خلافت راشدہ کے بعد اس میں اعتدال باقی نہ رہا۔ اصول استناد پر زیادہ زور دینے والے ایک طرف اور اصول اجتہاد پر زور دینے والے الگ اہل حدیث اور اہل الرائے کے نام سے معاشرے میں پیدا ہو گئے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی، وہ نئے پیش آنے والے مسائل زندگی میں انفراداً یا اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد رکھتے تھے اور روح اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے آتنی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے تھے جس سے وہ امت کی مشکلات کو حل کرنے اور اشتباہ تحیر کے موقعہ پر ان کی رہنمائی کرنے پر وہ آتنی ذکاوت و مستعدی و عار رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو دفینے اور چشمے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لیتے ہیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بناتے لیکن دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصب جلیل پر وہ لوگ حاوی ہو گئے جنہوں نے اس کے لیے کوئی حقیقی تیاری نہ کی تھی۔ خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانے کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انہوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت نہیں پائی تھی ان کا دینی

روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملتِ اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایانِ شان ہے۔ ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکلیہ آزاد نہ تھیں۔ ان میں نہ روحِ جہاد تھی اور نہ قوتِ اجتہاد جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لیے ضروری ہے۔ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز کی ذات کو مستثنیٰ کر کے عام خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کا حال یہی تھا۔

بہرحال استنباط کے معنے لغت میں زمین کھود کر اس کی تہ سے پانی نکال لینے کے ہیں اور اصطلاح میں اصول و استناد کی تہ میں جو حقائق اور معارف مستور ہیں ان کو خداداد فہم و فراست سے نکالنے کا نام استنباط اور اجتہاد ہے۔ امام رازی نے اس موقعہ پر یہ بات برمحل کہی ہے کہ یہ آیت مدلولاً بتا رہی ہے کہ:

۱۔ یہ کہ نئے نئے مسائل جو پیش آئیں گے ان کی بابت اگر احکام نص میں نہیں تو استنباط کیے جائیں گے۔

۲۔ یہ کہ استنباط بھی ایک حجت شرعی ہے۔

۳۔ یہ کہ عوام پر اہلِ علم کی تقلید واجب ہے۔

۴۔ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ احکام کا استنباط کرتے رہے ہیں۔

اور الجصاص کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ اگر کسی امام معصوم کا وجود امت میں ضروری ہوتا تو قرآن میں استنباط احکام کی ہدایت نہ ہوتی۔ امام خود ہی ابہاماً ان احکام سے واقف ہوتا ہے۔

ہدایت کے دو چراغ

۱۳۱۔ اور دیکھو اگر اللہ کا تم پر فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تھوڑوں کو چھوڑ کر سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے یعنی اگر اللہ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح و تربیت کے لیے احکام نہ بھیجتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت ہدایت اور تنبیہہ نہ کرتا جیسا کہ اس موقعہ پر رسول اور سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم گمراہ ہو جاتے مگر چند خواص جو کامل العقل اور کامل الایمان ہیں ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور پوری تعمیل کرو۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو امام، ہادی، معلم فرمایا ہے۔ یعنی نبوت سے سرفراز

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہونے کے بعد آپ کی ذات گرامی مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو گئی ہے آپ کی تشریف آوری اسی لیے ہوئی ہے کہ آپ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں۔ آپ نے اُمت کے سامنے ہدایت کے دو چراغ روشن کیے ہیں۔ ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت سے گمراہ کرنا چاہتے تھے فرمایا:

کیف تکفرون و انتم تتلی علیکم آیات اللہ و فیکم رسولہ

تم کفر کیسے کرتے ہو حالانکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات تلاوت ہوتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسُول ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں اہل ایمان کو ملی ہیں ایک تو آیات الٰہی جو ان کو سنائی جاتی ہیں۔ دوسرے خود رسُول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تربیت، فیضِ صحبت، نمونۂ تقلید، کتاب کی شرح و تفسیر، قانون سازی، فرماں روائی سے ان کو بھٹکنے نہیں دیتا اور گمراہی سے مانع ہوتا ہے اگر صرف کتاب الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسُول کی حاجت نہ ہوتی۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت قرآن ہے اور رسُول کتاب ناطق ہے، اور دونوں مل کر حبل اللہ ہیں اسی لیے اعتصام بحبل اللہ کا حکم ہے۔ غالباً اس حدیث کے بھی یہی معنے ہیں جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع میں کیا۔

انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں ایک کتاب اللہ دوسرے اپنی سنت

یہ بات میں پہلی جلد میں بتا چکا ہوں کہ نبوت کے کمال علم کو رحمت اور کمال عمل کو فضل سے تعبیر کرنا قرآن کی اصطلاح ہے۔ فضل ان خوبیوں کو کہتے ہیں جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کریں جس سے دوسرے متاثر ہو سکیں اور رحمت نام ہے اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت کے حاصل ہو۔ نبوت کا علم کتاب اللہ یعنی قرآن ہے یہ سرتاسر رحمت ہے کیونکہ وہبی ہے اور نبوت کا عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت و مشقت کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ اسی لیے رزق کو بھی قرآن نے بے شمار مقامات پر اللہ کا فضل کہا ہے۔ خاص نبوت کے موضوع پر قرآن میں ہے:

الا رحمۃ من ربك وکان فضلہ علیك کبیرا

اس میں بتایا ہے کہ علم وحی اور کتاب کا آنا اگر اللہ سبحانہ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے ذریعے آپ کے دامن میں عمل کا ظہور اللہ کا فضل ہے۔ علم اگر پڑھنے کی چیز

ہے یعنی قرآن تو عمل برتنے کی چیز ہے یعنی سنت۔ قرآن میں آگے آپ پڑھیں گے کہ نبوت کے علم و عمل یعنی اللہ کی رحمت و فضل ہی پر خوشیاں منانے، اترانے اور اقوام دنیا کے سامنے اکڑنے کا حکم ہے۔

قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذالک فلیفرحوا

کہہ دو کہ اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت ہی پر اہلِ ایمان کو خوشی منانی چاہیے

اسلام میں دو عیدیں قرآن کے اسی مطالبے کو پورا کرنے کا عمل شاہکار ہیں۔ ایک نبوت کے کمال علم اور دوسرے نبوت ہی کے کمال عمل کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔

قرآن کے شارحین نے یہاں فضل و رحمت کی قرآن اور حضور کی تشریف آوری سے تفسیر کی ہے صرف ابو مسلم اصفہانی نے فضل و رحمت سے مراد مدد اور کامیابی بتائی ہے۔

یہاں چونکہ اس آیت میں استنباط کا ذکر ہوا ہے اس لیے موقعہ کی مناسبت چاہتی ہے کہ فضل و رحمت سے قرآن و سنت مراد ہو۔ یعنی اصول اجتہاد کی نفی تصریح کے بعد ضروری تھا کہ اصول استناد کا صراحۃً ذکر آتے۔ اس طرح مصادرِ قانون کا پورا تذکرہ آگیا ہے۔ فرق صرف یہ کہ اسلام کے سیاسی نظام میں مصادر قانون والی آیت یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں اصول استناد کو پہلے اور اصول اجتہاد کو بعد میں پیش کیا تھا اور یہاں اصول اجتہاد کو پہلے اور اصول استناد کا بعد میں ذکر کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ اسلام میں قرآن و سنت اصول استناد ہیں۔

اصولِ استناد میں باہم رشتہ

اگرچہ قرآن و سنت دونوں الگ الگ ہیں لیکن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اسی اعتبار سے ان کے مجموعہ کو حبل اللہ کہا گیا ہے۔ دونوں میں الگ الگ ہونے کے باوجود قرآن کا بنایا ہوا رشتہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اگر ما انزل اللہ علیک اللہ کا اتارا ہوا علم ہے تو سنت رسول اسی علم کا پرتو اور نقش ما اراک اللہ اللہ کا دکھایا ہوا ہے اس لیے روشنی ہونے کی حیثیت میں اور خدا کی جانب سے ہدایت ہونے میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ان میں وجود کے اعتبار سے باہم اگر کچھ فرق ہے تو صرف نامہ اور پیام کا ہے۔ علم نبوت یعنی قرآن اگر نامۂ خداوندی ہے تو عمل نبوت یعنی سنت پیام خدا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے جو سرمایہ علم و عمل لے کر تشریف لائے ہیں وہ سب اللہ کی جانب سے ہے اور دونوں اُمت کو بطریق تواتر ملے ہیں۔ علم نبوت قرآن کا تواتر علمی ہے اور عمل نبوت سنت کا تواتر عملی ہے۔ اسلام میں جیسے علم نبوت کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی عمل نبوت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا قراء سبعہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا محدثین پر منحصر ہے۔ وہ تاریخ علم نبوت ہے یہ تاریخ عمل نبوت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے جلد اوّل میں سورۃ فاتحہ میں "برہانِ علم اور برہانِ عمل" کا مبحث مطالعہ فرمائیے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اصول استناد یعنی نبوت کا لایا ہوا علم و عمل نہ ہوتا تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ شراب نوشی، بداخلاقی، جنونِ سودخواری، لوٹ کھسوٹ اور مال کی محبت، سنگدلی اور بے رحمی کی تصویر ہوتے۔ تمہارے اموال بادشاہوں کے ہاتھ کا میل ہوتے اور تم ان کے خانہ زاد غلام ہوتے۔ صرف چند نفوس ہی ایسے ہوتے جن کے دامن ان برائیوں سے داغدار نہ ہوتے۔ اتباعِ شیطان توہمات اور جاہلانہ رسوم کے تحت زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ بار آیا ہے لا تتبعوا خطوات الشیطان یہاں شیطان سے مراد وہی ہے جس کا ذکر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں و یرید الشیطان ان یضلهم ضلالا بعیدا ۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ
عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَ
أَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿٨٤﴾ مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ
مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا ﴿٨٥﴾

بس آپ راہ خدا میں قتال کریں آپ پر اپنی ذات کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی ہے اور آپ اہل ایمان کو بھی جہاد کی ترغیب دیں کیا بعید ہے کہ اللہ سبحانہ اہل کفر کی لڑائی کو روک دے[۱۳۲]، اور اللہ کی ذات گرفت اور عذاب دینے میں بہت سخت ہے[۱۳۳]۔ جو شخص دوسرے شخص کے ساتھ نیکی کے کام میں ملتا اور لگتا ہے تو اسے اس کام میں سے ضرور حصہ ملے گا اور جو کوئی برائی میں دوسرے کے ساتھ ملتا اور لگتا ہے تو اس کے لیے

اس بُرائی میں حصّہ ہوگا[۱۳۴]، اور اللہ ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے[۱۳۵]۔

ہر حال میں حق کا بول بالا کرو

اگر اس علم صادق اور عمل حسن کے لیے کوئی ایسی پشت پناہ طاقت نہ ہو جو آپ کا ہاتھ بٹا سکے تو نبی ہونے کی حیثیت میں آپ کو تن تنہا ہی یہ کام انجام دینا ہوگا۔ یہ آپ کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ نبوت کا لایا ہوا علم و عمل صرف ایک طرز فکر نہیں ہے جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظام اجتماعی کی صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریق عمل ہے جس کے مطابق نبوت اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتی ہے یہ نبوت کی زندگی کا اصل اصول اور علم و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر اس فریضہ کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہاں نبوت کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ تنہا حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے کیونکہ نبوت کے علم و عمل کی رُو سے خدا کا صحیح تصور یہ نہیں ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہی اس کی عین مرضی ہے اس لیے رائج الوقت تصورات اور نظامات کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے بلکہ اس کے برعکس خدا کا تصور نبوت سے اور نبوت کو ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ دنیا کی ان قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جاؤ جو کائنات کے مادی اور انسانی وسائل کو اس کے بنانے والے کی مرضی اور منشا کے خلاف استعمال کر رہی ہیں۔

جو دعوت انسانیت کی سعادت و نجات کا مدار ہے اس کی عنداللہ یہ قیمت ہے کہ اس کے لیے نوامیس فطرت اور قوانین بھی توڑ دیے جاتے ہیں اور اس کے لیے وہ کچھ کیا جاتا ہے جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقا اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبادت اور طاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے۔ حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں۔ طاعت و جزا کی اُمید فرد کو دلائی گئی ہے۔ اس نظام علم و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جماعت اور اجتماعی نظام نبوت کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس آیت میں ان

کی اہمیت کو بتا رہا ہے کہ اگر کوئی بھی اس معاملہ میں آپ کا ساتھ نہ دے پھر بھی آپ تن تنہا اس کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ فرد کی شخصیت کا ارتقا اور اس کی ذات تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام کی بہتری پر موقوف ہے۔ انسان پیدا ہی فرد کی صورت میں ہوتا ہے مگر رہتا ایسا نہیں ہے گوناگوں اجتماعی تعلقات بھی فرد کی نشوونما کے ضامن ہوتے ہیں۔

۱۳۲۔ بس آپ راہِ خدا میں قتال کریں۔ آپ پر اپنی ذات کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے اور آپ اہلِ ایمان کو بھی جہاد کی ترغیب دیں کیا بعید ہے کہ اللہ سبحانہٗ اہلِ کفر کی لڑائی کو روک دیں۔ یعنی اگر اللہ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح اور تربیت کے لیے احکام نہ پہنچاتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت ہدایت اور تنبیہہ نہ فرماتا رہتا جیسا کہ اس موقع پر رسول اور سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم گمراہ ہو جاتے مگر چند خواص جو کامل العقل اور کامل الایمان ہیں ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور پوری تعمیل کرو۔[1]

مقصد یہ ہے کہ آپ خود جہاد پر آمادہ ہو جائیے خواہ کوئی دوسرا ساتھ دے یا نہ دے۔ آپ پر کسی دوسرے کے عمل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ جب غزوہ حمراء الاسد یا اُحد شوال میں ہو چکا تو اس کے معاً بعد ذی قعدہ میں آپ مشرکین کے وعدہ کا خیال کر کے بدر کی طرف پھر چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت لوگ ساتھ دینے میں پس و پیش کرنے لگے۔ کچھ تو اس لیے کہ ابھی اُحد کے زخم بالکل تازہ تھے، و کچھ اس لیے بھی کہ افواہی خبروں پر یقین کرتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ رنگ دیکھ کر تن تنہا چل کھڑے ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ قرآن کا یہ اندازِ بیان مادی اسباب کی ذاتی تاثیر کے خلاف سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ان اسباب اور ان کے ماننے والوں کی قوت کا مذاق اڑانے والا اور ان کی کمزوری اور غیر مفید ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مادیت اور اس کے حاملین کے استخفاف و استہزاء پر مامور ہو کر آئے تھے جو اس کی تقدیس کرتے، اس کا کلمہ پڑھتے اور اس پر ہر طرح بھروسہ کرتے تھے، ان کو حقیر سمجھنے اور خدا کی مدد سے ان پر فتح پانے اور ان کی تذلیل میں خاص لذت، قلبی تسکین اور روحانی غذا حاصل تھی اور گویا وہ اپنے ایمان و توحید کے طویل اور بابرکت سفر میں ہر قدم پر مادیت کو اپنے قدموں سے روندنے، اپنے عزم سے مسخر کرنے کا التزام کر کے شرک پر ایمان کی، مادے پر روح کی، نظامِ شرک پر توحید کی نئی فتح کا سرو سامان

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کر رہے تھے۔ نبوت نے اپنی زندگی میں اپنے ماحول کی قوت و بادشاہت مادہ اور معدہ کی عبادت، باطل خداؤں اور دھمکانے والی طاقتوں کے خلاف ہمیشہ علمِ بغاوت بلند رکھا۔ اس کا راز یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ مادی اسباب سے ہٹا کر اللہ کی طرف لگے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ حرض المومنین علی القتال یعنی درجہ ترغیب میں آپ کے فرائض میں تبلیغ داخل ہے۔ تحریض کے معنے کسی چیز کی خوبیاں بکثرت بیان کرکے اس کی جانب شوق و رغبت دلانا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام ان کو ترغیب دینا ہے۔ ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے ان کے کردار کے بارے میں آپ سے دریافت نہ کیا جائے گا۔

چونکہ تن تنہا میدانِ جنگ میں کود پڑنے سے خطروں کے استقبال کا یقینی اندیشہ تھا اس لیے فرمایا عسی اللہ ان یکف یعنی اس کی اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ روک دے اور ان کو مرعوب اور مغلوب کردے۔

اس تحریض کے نتیجہ میں آپ کی ہمرکابی میں ۷۰ صحابہ کرام نکلے۔ ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر نکلا۔ گھوڑے ساتھ تھے لیکن مرالظہران پہنچ کر اس کی ہمت نے جواب دے دیا اس نے کہا کہ قریش کے لیے شادابی اور ہریالی کا سال مناسب ہے کیونکہ اونٹ سبزہ اور درختوں کے پتے کھائیں گے لوگ ان کا دودھ پی کر گزارہ کرلیں گے اب خشک سالی ہے، یہ وقت لڑائی کے لیے مناسب نہیں ہے چنانچہ وہ سب واپس چلے گئے اور عسی اللہ ان یکف کی عملی تفسیر ہوگئی۔

اللہ کا عذاب سخت ہوتا ہے

۱۳۲۔ اور اللہ کی ذات گرفت اور عذاب دینے میں سخت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی لڑائی اور اس کا عذاب کافروں کے ساتھ لڑنے سے بہت سخت ہے لہٰذا جو لوگ کافروں کے ساتھ لڑنے اور ان کو مارنے اور ان کے ہاتھ سے مارے جانے سے ڈرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور اس کے عذاب کا کیوں کر تحمل کرسکتے ہیں۔

نبوت کی جانب سے اللہ کی گرفت اور عذاب کی دھمکی صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں ہوتی ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، نبوت کے طریقہ میں یہ ایمان وجدان، قلبی جذبہ و احساس ایسا عقیدہ ہے کہ جو انسان کے احساسات، خیالات و افکار اور اعمال پر پوری طرح قابو حاصل کرلیتا ہے اور دوسرے طریقہ میں صرف اعتراف، اقرار اور ضابطہ کی حیثیت رکھتا

ہے۔ اول الذکر کے یہاں عذابِ خداوندی کا ذکر ہوتا ہے تو تڑپ وارفتگی اور خوف کے ساتھ اور اس کو بیان کرتے ہیں تو جوش و قوت کے ساتھ، اور دوسرے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو محض اخلاقی یا معاشرتی ضرورت کی حد تک، اور اصلاح یا اخلاقی تنظیم کے جذبہ سے اور دونوں میں مشرق و مغرب کے فاصلہ سے زیادہ فرق ہے۔

آیت کی تشریح ختم ہوگئی ہے لیکن ایک ضروری بات کہنی باقی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں اکیلے جنگ کرنے کا حکم بتا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھروسہ تعداد نہ تھا بلکہ نصرتِ الٰہی پر تھا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ "جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میں ضرور جہاد کے لیے جاتا ہوں اگرچہ ایک بھی میرے ساتھ نہ ہو اور کل سترہ سو ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغریٰ کو بغرضِ جہاد تشریف لے گئے جس کا وعدہ ابوسفیان سے غزوۂ اُحد کے بعد ہوا تھا۔ حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفارِ قریش کے دل میں رُعب اور خوف ڈال دیا۔ کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وعدے سے جھوٹے ہوتے اور حق سبحانہٗ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی روک دی اور آپ ہمراہیوں سمیت خیر و سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت

یہ آیتِ قرآنی جیسے طبعی اسباب قانون اور علت و معلول کے عام قانون کی کارفرمائی کے خلاف ایک تاریخی شہادت ہے ایسے ہی یہ آیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال اور بے نظیر شجاعت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ شجاعت کا وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگ بنیاد ہے۔ عزم، استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، بزدلی یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سینکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے، لیکن پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی۔ غزوۂ بدر کی گھمسان کی لڑائی میں ۳۰۰ تھے مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکزِ نبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے۔ حضرت علی جن کے دست و بازو نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، کہتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی۔ آپ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا[1]

---

[1] مسند امام احمد

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک بار مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آ گئے، لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جلدی میں آپ نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ گھوڑے پر زین کس لی جاتے۔ گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آتے اور واپس آ کر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔[1]

اللہ کی راہ میں تعاون کی قدر و قیمت

۱۴۲۔ جو شخص دوسرے شخص کے ساتھ نیکی کے کام میں ملتا اور لگتا ہے تو اسے اس کام میں ضرور حصہ ملے گا اور جو کوئی برائی میں دوسرے سے ملتا اور لگتا ہے تو اس کے لیے اس برائی میں حصہ ہو گا یعنی اگر کوئی نیک کام میں سفارش کرے جیسے نبی کریم کا مسلمانوں کو جہاد کی تاکید کرنا یا کوئی بری بات میں ساعی ہو جیسا منافق اور سست مسلمانوں کا جہاد سے ڈر کر دوسروں کو بھی ڈرانا تو اول صورت میں ثواب کا اور دوسری صورت میں گناہ کا حصہ ملے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی محتاج کی سفارش کر کے دولت مند سے کچھ دلوا دے تو یہ بھی خیرات کے ثواب میں شریک ہو گا اور جو کوئی کافر مفسد یا سارق کو سفارش کر کے چھڑا دے پھر وہ فساد اور چوری کرے تو یہ بھی شریک ہو گا فساد اور چوری میں۔[2]

یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سربلند کرنے میں لوگوں کو ابھارے اور اس کا اجر پائے اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور ان کو اعلاء کلمۃ اللہ کی سعی و جہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صرف کرے اور اس کی سزا کا مستحق ہو سکے۔[3]

اس صورت میں آیت حرض المومنین علی القتال سے متعلق ہے۔ لیکن یہاں یہ لفظ جس انداز میں استعمال ہوا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ شفاعت عرفی معنے میں نہیں بلکہ لغوی معنے میں ہو۔ عربی میں شفع الشی کے معنے ہیں اس کے ساتھ اسی طرح کی دوسری چیز کو ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ اب وہ فرد یگانہ اور طاق نہیں رہا بلکہ جفت اور شفع ہو گیا۔ آیت بالا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا کہ آپ تن تنہا میدان جنگ میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جائیے۔ آپ پر اپنی [illegible] ہی اور کی

---

[1] صحیح بخاری [2] افادات شیخ الاسلام [3] تفہیم القرآن

ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ نبی ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام اہل ایمان کو کام کی دعوت دینا، تلقین کرنا اور ترغیب دینا ہے اور بس، یہ فرمانے کے بعد قرآن نے اہل ایمان کو مخاطب کیا ہے کہ ایک طرف نبوت خدا کی زمین میں خدا کا کلمہ بلند کر رہی ہے۔ اس کے عطا کیے ہوئے قانون سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا کر رہی ہے اور دوسری طرف نبوت کی راہ میں روڑے اٹکانے والا روڑے اٹکا رہا ہے۔ اب جو شخص نبوت کے ساتھ لگ کر نبوت کے ہاتھ بٹائے گا اور اسلام و کفر کی کشمکش میں اسلام کا بول بالا کرے گا اس کو ضرور اس کا حصہ ملے گا اور اس کے مقابلہ میں جو شخص نبوت کے مخالف کیمپ میں جا کر کام کرے تو اس کی پاداش میں ضرور اس کا حصہ ہو گا۔ اس آیت نے کھول دیا کہ ایمان باللہ کا حقیقی امتحان جہاد فی سبیل اللہ میں ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنی ذاتی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی یا قومی مفاد کی خواہش بھی ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من مات ولم یغزو لم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق، جس شخص کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔

اس صورت میں اس آیت کا سارا زور فقاتل فی سبیل اللہ پر ہے۔ آیت میں شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ کا ذکر ہے۔ شفاعت حسنہ تو بلا شبہ یہ ہے کہ نبوت کو تن تنہا یہ کام کرنے کا حکم ملا ہے اب جو بھی نبوت کے ساتھ ملے گا لگے گا نبوت کی تائید و تقویت کے لیے قدم اٹھائے گا سرفروشی اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرے گا۔ کافرانہ نظام تمدن سے غیر مطمئن ہو کر اسے اللہ کے حکم کے مطابق بدلنے کی کوشش کرے گا اس کو نبوت کے ساتھ ملنے کا ضرور اجر ملے گا۔ یہ شفاعت حسنہ ہے اس کے برعکس شفاعت سیئہ یہ ہے کہ اس کی ہمنوائی اور تائید و تقویت کا سامان کرے اور ذریعہ بن جائے اس کے ساتھ لگ جاتے یا مل جاتے جو خدا کی زمین میں طاغوت کا نظام قائم کر رہا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی سے نکال کر ارباباً من دون اللہ کی بندگی میں داخل کر رہا ہے۔ غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ نظام تمدن کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ اسلامی تہذیب سے بیزار ہو کر اس کی جگہ کافرانہ تہذیب پر محنت کر رہا ہے جو اس کام کرنے والے کے ساتھ لگے گا اس کو اس کام کی پاداش میں سزا ضرور مل کر رہے گی۔

س آیت کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ دین حق کے قیام اور اسلامی طرز زندگی کو ایک عملی بناتے ہیں جانفروشی اور ایثار و قربانی کریں گے اور ان کا ساتھ دیں گے جو اسلام کو برتر کرنے کے لیے کوشاں ہیں وہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ کے مصداق ہیں۔ اور جو لوگ حق کے قیام کی خاطر ان لوگوں کے ساتھ ہو کر جان و مال کی قربانی نہیں دیتے اور صداقت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مصیبتیں برداشت نہیں کرتے جو اسلام کا بول بالا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کی تمام کوششیں ان نظاموں کی حفاظت و بقا میں مصروف ہیں جن کو اللہ نے مٹانے کا حکم دیا تھا غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی جگہ اسلامی تہذیب و تمدن کے قیام کی نہ ان میں آرزو ہے اور نہ وہ اس کے لیے کسی قسم کی جد و جہد کرنے پر آمادہ ہیں تو ایسے لوگ شفاعت سیئۃ کے مصداق ہیں۔

اللہ کی حفاظت و نگرانی

۱۲۵ ۔ اور اللہ ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ تمام چیزوں پر قادر ہے اور ہر چیز کا حصہ بانٹنے والا ہے تو نیکی اور بدی کا حصہ دینے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہے[1] اصل ارشاد میں لفظ مقیت آیا ہے۔ یہ قوت سے بنا ہے جو انسان کے بقا کا سامان ہے اس کی جمع اقوات آتی ہے اسی سے اقات یقیت ہے۔ مقیت وہ ہے جو ہر چیز کو قوت دیتا اور اس کی نگرانی کرتا ہے۔ اور اس کے لزومی معنے قدرت والے کے ہیں۔ ابن جریر نے قدرت کے معنے کو راجح کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذات تمہارے جسم کی پرورش رکھوالی کر رہی ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ نیکی میں ہاتھ بٹانے پر اور برائی میں حصہ لینے پر جزا اور سزا دے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ
حَدِيثًا ﴿٨٧﴾ ع ۱۱

اور جب تمہیں سلامتی کی دُعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دُعا دو یا اسی کو لوٹا دو، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔[۱۳۶] اللہ ہی معبود ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تم سب کو روزِ قیامت ضرور جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کون کہنے والا ہے۔[۱۳۷]

حُسنِ معاشرت اور حُسنِ اخلاق

سیاسی اور دفاعی مسائل کے تذکرے میں یکایک حسنِ معاشرت اور حسنِ اخلاق کا ذکر یہ بتلانے کے

لیسے ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں والے انسانوں کی ضرورت ہے۔ دوسرے مدارس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں صرف ایک فن کی تعلیم ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگزر کے سوا کوئی سبق نہیں۔ بدھ کی خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں لیکن قرآن کو دیکھو اور قرآن لانے والے کی درس گاہ کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ یہاں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک پوری پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک قانون دوسرے اخلاق، اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان کے راستے مختلف ہیں۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا اور اخلاق کے ذریعے ہر شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے ایسا جامع ضابطہ پیش کیا ہے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کا جامع ہے۔ عین سیاسی مسائل کے ضمن میں حسن اخلاق اور حسن معاشرت کی تعلیم دی ہے اور اس میں سے حسن اخلاق و معاشرت کی اس اصل پر زور دیا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص تمہیں سلام کرے تو چاہیے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ بہتر جواب دو۔ اور اگر بہتر طور پر نہ دو تو کم از کم اسی جیسا۔ یہ حکم یہاں اس مناسبت سے آیا ہے کہ جنگ کی حالت ہو یا امن کی، منافق ہو یا ایماندار لیکن جو کوئی بھی تمہیں سلام کرے تمہیں بھی اس کا جواب ویسا ہی دینا چاہیے اس کے دل کا حال خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے ہو۔

۱۳۶۔ اور جب تمہیں سلامتی کی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے تو حق تعالیٰ شفاعت حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع و ذائع ہے صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ جب کوئی تم کو اے مسلمانو! دعا سے یا سلام کرے تو تم کو بھی اس کا جواب دینا چاہیے یا تو وہی کلمہ اس کو کہہ دو یا اس سے بہتر مثلاً

کسی نے کہا السلام علیکم تو واجب ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو اور زیادہ ثواب چاہو تو ورحمۃ اللہ بھی بڑھا دو اور اگر اس نے ورحمۃ اللہ بڑھا کر کہا ہو تو تم وبرکاتہ بڑھا دو۔ اللہ کے یہاں ہر ہر چیز کا حساب ہوگا اور اس کی جزا ملے گی۔ سلام اور اس کا جواب بھی اس میں آگیا۔ اس سے شفاعت حسنہ کی پوری ترغیب ہوگئی اور شفاعت سیئہ کی خرابی اور مضرت معلوم ہوگئی کیونکہ جو شفاعت حسنہ کرے گا اللہ اس کو ثواب دے گا اور جس کی شفاعت کی ہے اس پر اس کے ساتھ حسن سلوک اور مکافات کا حکم فرما دیا بر خلاف شفاعت سیئہ کے کہ بجز معصیت اور محرومی کے کچھ نہ ملے گا۔[1]

اسلامی معاشرے میں سلام کی اہمیت

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات مروج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد آپس میں ملتے جلتے وقت ابتدائی تعارف، اظہار محبت واعتماد، نشان اخوت ومودت اور علامت وحدت فکر وعقیدہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی اتصال وارتباط کے نقطہ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے کے افراد، خواہ ان کے اندر کتنی ہی دوری و بے گانگی ہو، آمنے سامنے ہوتے ہی ان کے واسطہ سے اس طرح باہم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں گویا ان کے اندر کوئی اجنبیت و بیگانگی تھی ہی نہیں۔ عربوں میں اس مقصد کے لیے بہت سے الفاظ اور فقرے معروف تھے مثلاً حیاك الله، اهلاً و سهلاً، صباح الخیر، مرحباً، سلام کا لفظ بھی معروف تھا۔ جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو بجز ان کلمات کے جن میں شرک کی کوئی آمیزش تھی باقی تمام کلمات باقی رہے۔ البتہ السلام علیکم کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ کلمہ گویا مومن و کافر کے درمیان ایک معاشرتی علامت فارقہ بن گیا۔ جب ایک شخص نے دوسرے کو السلام علیکم کہہ دیا اور اس نے وعلیکم السلام سے اس کا جواب دے دیا تو گویا باہم کی اجنبیت اٹھ گئی اور دونوں دو قالب و یک جان ہو گئے اور جواب نہ دیا تو اس کے معنے صرف یہی نہ تھے کہ اس نے سلام قبول نہیں کیا بلکہ اس کے معنے یہ بھی ہوتے تھے کہ اس نے اس کا اسلام بھی تسلیم نہیں کیا۔

کلمہ تحیت کی اس اہمیت کی وجہ سے اس موقعہ پر جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین سے اعراض کا حکم فاعرض عنھم کے ذریعے ہوا۔ مسلمانوں کو یہ تنبیہہ بھی کردی گئی کہ جب کوئی شخص

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمہیں سلام و تحیت سے مخاطب کرے تو اس کا معاشرتی حق یہ ہے کہ اس کے سلام و تحیت کا اس کو بہتر طریقہ پر جواب دو اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹا دو۔

اس تنبیہہ کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ زیادہ پر جوش لوگوں کی طرف سے اس مرحلے میں منافقین کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کی نوبت نہ آنے پائے۔[1]

اس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خلقی سے نہ پیش آنے لگیں اس لیے انہیں ہدایت کی گئی کہ جو تمہارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی کرو بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے بلکہ تمہارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے جو دنیا کو راہ راست پر لانے اور مسلک حق کی طرف ترغیب دینے کے لیے اٹھا ہو، درشت مزاجی، ترش روئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اس مقصد کو الٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اٹھا ہے۔[2]

اصل ارشاد میں حییتم بتحیۃ آیا ہے۔ لغت میں اس کے معنے زندہ رکھنے کے اور حیاک اللہ کہنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ ملاقات کے وقت میں دعائی پیمانے کے لیے استعمال ہونے لگا خواہ کچھ ہو۔ عرب میں اس کے لیے ایک سے زیادہ پیمانے رائج تھے لیکن اسلام نے ان سب پیمانوں سے ہٹ کر تحیت کے لیے سلام کا پیمانہ یہ بتانے کے لیے ایجاد کیا کہ اسلام سلامتی اور امن کا پیغام ہے اور اہل ایمان سلامتی پسند ہیں۔

ملاقاتی پیمانہ اور اس کی مصالح

نیز اس میں اور بھی حکمتیں ہیں مثلاً یہ کہ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے و سلام علی المرسلین قرآن نے اسے ملاقات کے لیے دعائی پیمانہ بنایا ہے تحیتھم یوم یلقونہ سلام قرآن نے اسی کو اپنانے کا حکم دیا ہے سلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے اور انسانی پیمانہ ہے یہ

---

[1] تدبر قرآن [2] تفہیم القرآن

اصل میں سلمت سلاماً علیک کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دوام اور ثبوت کے معنے پیدا کرنے کے لیے جملہ اسمیہ بنایا گیا ہے لیکن یہ طریقہ قانونی نہیں بلکہ سماعی ہے یعنی صرف ان پیمانوں تک محدود ہے جو اہل عرب سے سنے گئے ہیں جیسے الحمدللہ، سبحان اللہ، السلام علیکم۔ ہر لفظ کو آپ ایسا بنا لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ اگر آپ حیاہ کو الحیاۃ لکم کہیں گے تو یہ معنے پیدا نہ ہوں گے یا آپ الصلوٰۃ علیکم کہیں گے تو اس میں السلام علیکم والے دعائی معنے نہ ہوں گے۔ یہ دعائی پیمانہ خاص ہے۔ اس میں سلامتی سے مقصود وہ سلامتی ہے جو اللہ سبحانہ کی جانب سے بندوں پر نازل ہوتی ہے اور دنیا میں کسی انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ سلامتی کی ہے اور عرب کی اس دنیا میں جہاں جان مال آبرو کی سلامتی کو ہمہ وقت خطرہ لاحق تھا۔ یہ دعائی پیمانہ بالکل برمحل تھا جب دو آدمی آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کی وجہ سے چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے اب جب اسلام کے قاعدے کے مطابق دونوں یہ لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو آپ نے اہل مدینہ کو جو سب سے پہلی تعلیم دی وہ یہ تھی۔

لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ۔ کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں نماز پڑھو، یہ کرو گے تو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(ترمذی باب الزہد)

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرما دی اور فرمایا ہے کہ

تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام پھیلاؤ۔ (ترمذی باب افشاء السلام)

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس آیت کریمہ کا منطوق کیا ہے۔ کیا سلام کا یہی پیمانہ اس کا منطوق ہے۔ عام شارحین قرآن کا میلان یہی ہے کہ سلام کا یہی پیمانہ اس آیت کریمہ کا منطوق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سلام کا یہی پیمانہ آیت کا منطوق ہے تو پھر انداز تعبیر

یہ کیوں ہے کہ مسلمانو! جب تم کو کسی طرح پر دعا دی جائے تو تم اس سے بہتر دعا دو یا اس جیسی یہ انداز تعبیر بتا رہا ہے کہ قرآن اہلِ ایمان کو سمجھا رہا ہے کہ سارے اختلافات کے باوجود تمہارے اخلاق بلند سے بلند تر ہونے چاہئیں۔ منافقین خواہ کیسی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کریں اور علم وعمل میں خواہ ان کی زندگی میں کیسا تضاد رونما ہو جائے لیکن تمہارا فرض یہ ہے کہ تمہیں جب بھی کوئی دعا دے خواہ دعائیہ پیمانہ کچھ ہو اور کسی طرح کا ہو تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ اولاً اس کا جواب بہترین دو، اور اگر بہترین نہ ہو تو کم از کم اس جیسا تو ضرور دو۔

سلام کے آداب واحکام اور اس کے قانونی مباحث پر انشاء اللہ تبصرہ سورۃ نور ۱۸ پارہ میں آرہا ہے وہاں یہ بحث اصلاً آرہی ہے یہاں سلام کا ذکر ایک ضمنی موضوع کی حیثیت سے آرہا ہے۔

آوازِ قرآنی کی انقلابی تاثیر

۱۲۷۔ اللہ ہی معبود ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ تم سب کو روزِ قیامت ضرور جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا کون ہے۔ یعنی قیامت کا آنا اور ثواب وعقاب کے وعدوں کا پورا ہونا سب سچ ہے اس میں تخلف نہ ہوگا۔ ان باتوں کو سرسری خیال نہ کرو۔[1]

شارحین قرآن یہاں اول تو خاموش ہیں اور جنہوں نے کچھ لب کشائی کی وہ دُور دراز کار گوشوں میں نکل گئے، آلوسی، ابوحیان اندلسی، قرطبی، ابن کثیر، شوکانی، بیضاوی اور زمخشری وغیرہ خاموش ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس فقرے کا پچھلے فقرے سے پیوند دو طرح سے ہے۔ اوّل یہ کہ پہلی آیت میں سلام کے موضوع پر ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے کسی مسلمان کا خون نہ ہو جائے۔ اس پر پہلی وعید یہ ہے کہ ان اللہ کان علی کل شیئٍ حسیباً اسی وعید میں اس آیت کے ذریعے تاکید میں مبالغہ فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ تمہیں ہر شخص کے سلام وتحیت کا استقبال کرنا چاہیے اور اس سے معاملہ ظاہر کے مطابق کرنا چاہیے کیونکہ اس کے باطن کو اللہ سبحانہ کے سوا جاننے والا کوئی نہیں ہے جو اپنی معبودیت میں یگانہ اور جو ساری مخلوقات کا ایک روز حساب لینے والا ہے۔ علامہ مراغی فرماتے ہیں کہ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پہلے آیات میں اللہ سبحانہ' نے نبوت کو جہاد کا اور اس کی ترغیب دینے کا حکم دیا اور مسلمانوں سے کہا تھا کہ ملاقات کے وقت مودت و حمیت کا مظاہرہ کریں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ ان اعمال کی روزِ قیامت جزا ملے گی۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ اوپر بہت سے احکام مذکور ہوئے ہیں آگے ان کی تاکید و اہتمام کے لیے اپنی عظمت اور قیامت کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ حاکم کی عظمت سے اور دربار کی حاضری و حساب سے عمل کے لیے اہتمام زیادہ ہو جاتے۔ مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں گزشتہ آیت میں یعنی ان اللہ کان علی کل شیئٍ حسیباً، میں وعید اور تہدید تھی۔ اب اس آیت میں اسی کی تاکید کے لیے توحید اور عظمت اور قیامت کا ذکر فرماتے ہیں۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کافر و مشرک، ملحد اور دہریے جو کچھ کر رہے ہیں اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا خدائے واحد اور خدائے مطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدلی نہیں جا سکتی پھر وہ ایک روز سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھلائے گا۔ اس کی قدرت کے احاطہ سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا لہٰذا خدا ہرگز اس بات کا حاجت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالے اور کج خلقی و ترش کلامی کو زخم دل کا مرہم بنائے۔ یہ تو اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت سے ہے لیکن یہی آیت اس پورے سلسلہ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو شخص جس طریقے پر چاہے چلے اور جس راہ پر اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے۔ آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

ان سب بزرگوں کی بات سر آنکھوں پر لیکن میرا قرآنی ذوق اس معاملہ میں کچھ ان بزرگوں سے الگ ہے، اللہ سبحانہ' کی الاہیت اور ایمان بالآخرہ دینِ انبیا کے اساسی ارکان ہیں۔ قتال کے ذکر میں اور تحیات کے موضوع پر ان کی اہمیت بالکل واضح اور صاف ہے ماقبل میں دو ہی چیزیں مذکور ہیں ایک فقاتل فی سبیل اللہ وحرض المومنین اس کے بعد اللہ لا الہ الا ھو الخ لاکر قرآن نے اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتاری ہے کہ تمہاری اس ساری تگ و دو، محنت و ریاضت مشقت و ابتلا، جہاد اور قتال کا پس منظر یہ اور صرف یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کی حاکمیت کا ڈنکا پٹ جائے اور انسانوں کی بندگی سے چھڑا کر اللہ کی بندگی پر آمادہ کیا جائے اور یہ کام اس احساس سے کیا جائے کہ تم اس کام کے لیے دنیا میں روانہ کیے گئے ہو اور تم سے اللہ سبحانہ' روزِ قیامت فرائض کی ادائیگی کے بارے میں دریافت کرے گا۔

اور دوسری آیت واذا حییتم بتحیۃ سے اس کا ربط یہ ہے کہ لفظ تحیت ایک مشترک لفظ ہے انسان اور اللہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انسان کے لیے یہ زندگی کی دعا اور تہنیت کے معنے میں آتا ہے اور اللہ کے لیے ملک حکومت زبانی تعریف کے معنے میں آتا ہے اسی سے التحیات للہ ہے جمع لانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ زمین میں سربراہان مملکت کی مختلف اور متفرق تعریفیں ہوتی تھیں۔ اس لیے اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ التحیات للہ یعنی تحیت کی ساری انواع اور ایسے تمام الفاظ جس سے شاہانہ جلال کی مدحت سرائی ہو سکتی ہے وہ سب اللہ کے لیے ہیں۔ اس جگہ خاص طور پر اللہ کی الوہیت کو اس لیے یاد دلایا گیا ہے کہ لفظ تحیت سے کسی ذہن میں یہ خلش نہ ہو جائے کہ اللہ جیسی عظمت کسی انسان کو بھی حاصل ہو سکتی ہے فرمایا یہ باہم ملاقات میں عظمت نہیں بلکہ دعا ہے۔ عظمت تو صرف اس ذات کے لیے ہے جس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ ساری عظمتیں اور بڑائیاں اسی کے لیے ہیں۔

عقیدۂ آخرت کا اہتمام

قیامت کا ذکر اس موقعہ پر خاص طور پر اس لیے ہوا ہے کہ نبوت کے خدوخال نمایاں کرنے والی صفات اور اس کی علامتوں اور خصوصیات کی دوسری اہم چیز آخرت ہے۔ عقیدۂ آخرت کا اہتمام، اس سے دلچسپی اور شفتگی کا اظہار اس کی تبلیغ و تشہیر اور اس کی اہمیت پر اتنا زور کہ یہی قرآنی دعوت کا بنیادی نقطہ معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآن کے مطالعہ میں وقت گزارتے ہیں اور قرآن فہمی کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ قرآن پڑھتے ہوئے صاف محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آخرت ان کی نظروں کے سامنے ہے اور اس کی تصویر، نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ ان کی آنکھوں میں رہتی ہے وہ ہمہ وقت جنت کے شدید اشتیاق اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ قرآن کے ماننے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے یہ بات بالکل اور واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی جو ان کے شعور و احساس اعصاب اور قوت فکریہ پر غالب آجاتا ہے۔ اللہ اکبر یہاں لا ریب فیہ کے ساتھ ومن اصدق من اللہ حدیثا کی بلاغت کتنی موثر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے چھوٹے بڑے سارے ہی ارشادات سے متعلق دل میں یقین محکم اور اذعان کامل ہونا چاہیے۔ اگر ریب اور تذبذب ذرا بھی باقی رہ گیا تو عمل بلکہ عزم عمل میں بھی کوتاہی رہ جائے گی مطلب یہ ہے کہ اس بیان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں اللہ کی حاکمیت والوہیت کا عقیدہ اور آخرت میں جزا و سزا کے یقین

نے عہد اول کے مسلمانوں کی کایا پلٹ دی تھی ان میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح بے نظم نہ تھے بلکہ ایک جاندار قوت کے مالک تھے ان کو از سر نو زندگی ملی۔ ان کی دماغی تربیت بالکل نئے طریقے پر ہوئی، ان کے ذہنوں میں انقلاب آگیا۔ دُنیا ان کے لیے اور وہ دُنیا کے لیے بالکل بدل گئے۔ یہ توحید اور ایمان بالآخرہ کی فسوں کاری تھی کہ دُنیا ان کی نظروں میں حقیر ہو گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ دُنیا میں ہر طرف ظلم و فساد کا دور دورہ ہے۔ فسق و فجور کی گرم بازاری ہے، تاریکی کا غلبہ ہے انہوں نے قرآن کی یہ آواز سنی۔ "ھر تو الحیاۃ الدنیا" انہیں احساس ہوا کہ اللہ نے ان کو اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ ان کا ضامن ہے اس نے ان سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ حالات کی ساری ناخوشگواریوں میں اللہ کے بھروسہ پر وہ کام کرتے اور پورے یقین سے کہتے "و من اصدق من اللہ حدیثا"۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا ۚ
أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللّٰهُ ۖ وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً
فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ
تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا
مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۸۹﴾ إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ
وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَنْ
يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ
فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ
فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ
أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا
فِيهَا ۚ فَإِنْ لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ

فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۞ ع ۱۲ ۹

پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو گئے
ہو حالانکہ اللہ نے ان کو ان کی بداعمالی کی وجہ سے پلٹا دیا ہے
کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھاؤ جن کو اللہ نے بے راہ
کر دیا ہے اور یاد رکھو جس کسی پہ اللہ راہ گم کر دیتا ہے تو تم
اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے [۱۳۸]۔ ان کی دلی تمنا یہ ہے
کہ ان کی طرح تم بھی راہ کفر اختیار کر لو اور تم ایک جیسے ہو جاؤ
دیکھو جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر آئیں تم ان میں سے
ہرگز کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول
نہ کریں تو ان کو جہاں پاؤ گرفتار کر لو، قتل کر دو۔ اور تمہیں
ان کو اپنا دوست اور مددگار بنانے کی اجازت نہیں ہے [۱۳۹]

مگر ہاں جو لوگ کسی ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور اس میں عہد و پیمان ہو چکا ہے یا ایسے لوگ جو لڑائی سے تنگ آکر تمہارے پاس چلے آئیں نہ تم سے لڑیں نہ اپنی قوم سے لڑیں، اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو بھی تم پر مسلط کر دیتا کہ تم سے لڑے بغیر نہ رہتے۔ پس اگر وہ تم سے ایک طرف ہو جائیں اور نہ لڑائی کریں اور صلح کا پیغام روانہ کریں تو پھر اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف جنگ کرنے کی کوئی راہ نہیں رکھی ہے[۹۰]۔ ضرور ملیں گے تمہیں کچھ لوگ ایسے جو تمہاری جانب سے خود بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی، ہاں جب کبھی فتنہ و فساد کی طرف لوٹا دیتے ہیں تو اوندھے منہ اس میں گر جاتے ہیں لہٰذا اگر ایسے لوگ کنارہ کش نہ ہو جائیں اور تمہاری طرف پیغام صلح نہ روانہ کریں اور لڑائی سے ہاتھ نہ روکیں تو انہیں بھی جہاں پاؤ گرفتار کر لو اور

قتل کردو اور یہی لوگ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے۔[۱۴۱]

زمانۂ نبوت میں ایمان کی کسوٹی ہجرت تھی

پہلی آیات میں جن منافقوں کا ذکر تھا وہ مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے اور اب ان آیات میں جن منافقوں کا ذکر ہے وہ مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصّوں میں رہتے تھے وہ اسلام تو قبول کر چکے تھے لیکن ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف آنے کی بجائے اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے سہتے تھے اور ان تمام کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی ان کے بارے میں یہ بہت بڑی الجھن تھی کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ کچھ کی رائے میں یہ مسلمان تھے اور کچھ اس کے خلاف رائے رکھتے تھے۔ ان آیات میں اسی اختلاف کا اللہ کی وحی نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ قطعاً منافق ہیں، ان کی نسبت بحث اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر وہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اور دشمنوں کے حلقہ میں نہ رہیں تو وہ مسلمان ہیں لیکن اگر اس سے انکار کریں تو پھر ظاہر ہے کہ جو کوئی دشمنوں کے ساتھ ہوگا اس کا شمار دشمنوں ہی میں ہوگا اور جس طرح جنگ میں دشمنوں سے لڑنا ہے ان سے بھی لڑنا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں ہجرت کا عمل ہی ایمان کی کسوٹی بن گیا تھا۔ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو چھوڑ دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا، علم و عمل کا کون سا گوشہ ہے جس میں ہجرت کے جذبے کے بغیر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ہماری مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ہجرت سے گزرے بغیر نہیں ملتی۔ ساری دُنیا کی علمی، تمدنی ترقیاں حیرت انگیز انکشافات انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری نئی نئی آبادیوں کا قیام طرح طرح کے وسائل معیشت کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت فی الواقع انسان کے دُنیا میں عمل ہجرت کے نتائج ہیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ یہی کام جب نبوت کی رہنمائی میں اللہ کی رضا کی خاطر کیا جاتا ہے تو اس کو قرآن کی زبان میں ہجرت کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رکھیے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں جہاں جس جس علاقے میں اور جس جس قبیلے میں اہل ایمان موجود ہیں وہاں سے وہ ہجرت کریں اور مدینہ آجائیں اس وقت جو لوگ ہجرت کر سکتے تھے مگر صرف اس لیے نہ کرتے کہ انہیں اپنے گھر بار، اعزہ واقربا اور اپنے مفادات اسلام کے مقابلے میں عزیز تھے وہ سب منافق قرار دیے گئے اور جو لوگ فی الواقع کمزور تھے ان کو المستضعفین میں شمار کیا گیا۔

۱۳۸۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے پلٹا دیا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھاؤ جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور یاد رکھو جس کسی پر اللہ راہ گم کر دیتا ہے۔ تو تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ان منافقوں میں وہ لوگ داخل ہیں جو ظاہر میں بھی ایمان نہ لائے تھے بلکہ ظاہر و باطن میں کفر پہ قائم تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے میل جول اور ظاہر میں محبت کا معاملہ کرتے تھے اور غرض ان کی یہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج ہماری قوم پر چڑھائی کرے تو ہمارے جان و مال اس حیلے سے محفوظ رہیں۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا آنا جانا اس غرض سے ہے دل کی محبت سے نہیں تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ان شریروں سے ملنا ترک کر دینا چاہیے تاکہ ہم سے جدا ہو جائیں اور بعضوں نے کہا کہ ان سے ملے جائیے شاید ایمان لے آئیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضے میں ہے تم اس کی ہرگز فکر نہ کرو اور ان سے بالاتفاق وہ معاملہ کرو جو آئندہ مذکور ہے دو فریق مت بنو۔[1]

یہ آیت فا کے ذریعے پہلے بیان شدہ مضمون سے بالکل مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تم کو اپنی راہ میں قتال کرنے کا حکم دے چکا ہے اور اس معاملہ میں ڈھیلے پڑنے والوں کو اور ان لوگوں کو جو جہاد کے فرض ہونے کی تاخیر کی تمنائیں کرتے تھے ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی اور جب تم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اللہ کے سوا ایسا کوئی حاکم نہیں ہے جس کی خاطر اللہ کے اوامر کو چھوڑا جا سکے اور جس کی وجہ سے اللہ کی طاعت کو خیر باد کہا جا سکے تو پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں متردد ہو اور باہم دھڑے بن گئے ہو۔ وہ لوگ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

محض اپنے رشتوں اور قرابتوں یا جائداد و املاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں اور اب تک بدستور دارالحرب میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ مکہ میں تھے بظاہر مصلحۃً اسلام کا دم بھر رہے تھے لیکن دل میں قطعاً مخالف تھے۔ جنگ چھڑی تو مسلمانوں میں ان کے متعلق دو رائیں ہوگئیں، کچھ لوگ کہتے کہ مسلمان ہیں اور کچھ کہتے دشمنوں میں سے ہیں۔ قرآن نے یہاں ان لوگوں کو تنبیہ کی ہے جو ان کو مسلمان کہہ رہے تھے اور بتا دیا کہ جو لوگ ایسا سوچ رہے ہیں یہ ان کی غلط سوچ ہے۔ ان کی نسبت بحث و اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے اب یہ اسلام کی طرف بڑھنے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے اسلام کی طرف جو قدم بڑھایا تھا دُنیا کی محبت میں انہوں نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو پھر پیچھے ہٹا لیا جس کی سزا میں اللہ نے اپنے قانون کے مطابق ان کو پھر اسی کفر میں دھکیل دیا جس میں وہ پہلے تھے۔ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آچکے ہیں اب وہ راہ راست پر نہیں آسکتے کوئی لاکھ چاہے ان کو راہ ملنی مشکل ہے۔

آیت کا تاریخی پس منظر

یہاں صحیحین میں امام بخاری اور مسلم نے زید بن ثابت کے حوالہ سے اس آیت کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اُحد میں تشریف لے گئے تو کچھ لوگ میدان جنگ سے واپس آگئے یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

اگرچہ یہ صحیحین کی روایت ہے اور حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ھذا ھو الصحیح فی سبب نزولھا مگر شارحین قرآن نے اسے شرف پذیرائی نہیں دیا کیونکہ ان آیات میں جو احکام اور ہدایات منافقین کے بارے میں آئی ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد میں ان پر قطعاً عمل نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے ابن جریر نے ابن عباس کی اس روایت کو قبول کیا ہے جس میں آیا ہے کہ مکہ کے منافق تھے اور پھر زید بن ثابت کی یہ روایت قرآن کی بیان کردہ اس غایت کے خلاف ہے حتیٰ یہاجروا اُحد کے منافقین تو مدینے میں ہی تھے ان کی ہجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مسند احمد میں عبدالرحمان بن عوف کے حوالہ سے ایک اور روایت آتی ہے کہ:

مشرکین عرب میں سے کچھ لوگ مدینے آئے اور یہ ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں۔ کچھ دن مدینے میں مقیم رہے پھر مدینے کی آب و ہوا کے موافق نہ آنے کی وجہ سے مدینہ سے باہر چلے گئے۔ صحابہ کرام نے ان سے دریافت کیا کہ مدینہ سے

باہر کیوں آتے کہنے لگے کہ وبا کی وجہ سے آگئے صحابہ نے فرمایا کیا تمہارے لیے حضور انور کا نمونہ نہیں ہے۔ ان کے بارے میں صحابہ میں اختلاف ہوا، کچھ نے کہا کہ منافق ہو گئے اور کچھ بولے منافق نہیں ہوتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ روایت منقطع ہے اور اس کی سند میں تدلیس سے کام لیا گیا ہے اس لیے مدلس ہے یہ اور اسی قسم کی دوسری روایات کی مدد سے شارحین قرآن نے اس آیت کے منہ میں مطالب ڈالے ہیں لیکن آیتِ قرآنی اپنے معنے میں بالکل واضح اور صاف ہے اور تشریح کے لیے کسی روایت کی محتاج نہیں ہے۔ بہرحال یہ آیتِ قرآنی مدینہ کے منافقین کے بارے میں نہیں بلکہ مکہ کے منافقین کے بارے میں ہے اور اپنے مطالب میں بالکل صاف ہے۔

منافقین کی گرفتاری اور قتل کا حکم

۱۳۹۔ ان کی دلی تمنا یہ ہے کہ ان کی طرح تم بھی راہِ کفر اختیار کر لو اور تم ایک جیسے ہو جاؤ دیکھو جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر آئیں تم ان میں سے ہرگز کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ، پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں تو ان کو جہاں پاؤ گرفتار کر لو اور قتل کر دو اور تمہیں ان کو اپنا دوست اور مددگار بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی منافق تو کفر پر ایسے جمے ہوتے ہیں کہ خود تو اسلام کیا قبول کریں گے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی مثل کافر ہو کر ان کے برابر ہو جاؤ لہٰذا اب تم کو چاہیے کہ وہ جب تک ایمان قبول کر کے اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس نہ آ جائیں اس وقت تک ان کو دوست نہ بناؤ نہ اپنے کسی کام میں ان کو دخل دو اور نہ ان کی حمایت و اعانت کرو اور اگر وہ لوگ ایمان اور ہجرت کو قبول نہ کریں تو ان کو قید کرو اور قتل کرو جہاں قابو پاؤ اور اجتناب کلی رکھو اور ان سے کوئی تعلق نہ رکھو[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین جن سے مدد کی تمہیں آس ہے اور جن کی ہدایت کی توقع رکھتے ہو ان کا حال یہ ہے کہ وہ تمہیں بھی اسی کفر میں واپس لے جانے کی آرزو رکھتے ہیں جس میں وہ خود ہیں اس طرح وہ اسلام پر ہی شب خون مارنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ ہجرت نہ کریں اس وقت تک ان سے کوئی تعلق نہ رکھو یہ ہجرت ہی ان کے ایمان و اسلام کی کسوٹی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہے۔ اگر وہ اس سے گریز کرتے ہیں تو تم ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو اور ان کو جہاں پاؤ گرفتار اور قتل کرو۔ یعنی جنگ میں جیسے تمام دشمنوں سے لڑنا ہے ان سے بھی تمہیں لڑنا ہے۔ گویا جس دورنگی اور مصلحت پرستی اور ترجیح دنیا بر آخرت کو انہوں نے اپنایا ہے اس کی وجہ سے اللہ سبحانہ نے انہیں اسی طرف پھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انہوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی ضرور کی تھی لیکن اس کے لیے جس کسوٹی کی ضرورت تھی اس سے وہ تہی دامن تھے۔ اسلام کی خاطر اپنے مفادات کو قربان کر دینے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی روانہ ہو گئے۔ اب ان کا معاملہ صاف ہے کہ ایمان لائیں اور ہجرت کریں تو مسلمان ہیں اور اگر ایسا نہیں کرتے تو ان سے بھی وہی معاملہ کیا جائے جو میدان جنگ میں دشمن سے کیا جاتا ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ان لوگوں نے علانیہ کفر اختیار کر لیا تھا۔ قرآن نے ان کے بارے میں جو انکشاف کیا ہے یہ ہے کہ :

۱۔ وہ راہ حق سے ہٹ چکے ہیں والله ارکسھم بما کسبوا

۲۔ وہ گم کردہ راہ ہیں من اضل اللہ

۳۔ ان کے راہ پر آنے کی کوئی صورت نہیں من یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلاً

۴۔ یہ خود ہی کافر نہیں بلکہ تمہیں بھی کافر بنانا چاہتے ہیں۔ لو تکفرون کما کفروا

ان اوصاف کی موجودگی میں اب یہ منافق نہیں بلکہ دائرہ اسلام سے باہر ہیں۔ یعنی مردم شماری کے رجسٹر میں بھی مسلمان نہیں ہیں۔ علامہ نسفی نے مدارک میں اور آلوسی نے روح المعانی میں یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ یہ لوگ اسلام کو چھوڑ کر مشرکین سے جا ملے تھے۔ اسی بنا پر محققین نے حتیٰ یہاجروا سے پہلے یومنوا مقدر مانا ہے یعنی چونکہ دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں سو جب تک ایمان نہ لائیں اور ہجرت نہ کریں تمہیں ان سے تعلقات ولایت و نصرت قائم کرنے جائز نہیں ہیں۔

منافقین کے معاملہ میں سنگینی کی وجہ

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن نے منافقین کے بارے میں یہ سنگینی کیوں اختیار کی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ کوئی نظام اپنے افراد کو عمل کی غیر محدود آزادی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ غیر محدود آزادی روح نظام کی نفی ہے۔ اسی طرح نظام اپنے افراد کے ان مقاصد و عزائم کو بھی

گوارا نہیں کرتا جو اس کے مقاصد وجود سے متصادم ہوتے ہیں مثلاً ایک قومی حکومت جو خالص دنیوی اصولوں پر قائم ہو کسی ایسی جماعت کا وجود برداشت نہیں کر سکتی جس کا مقصد یہ ہو کر قومی حکومت کی جگہ خاندانی حکومت قائم کی جائے۔ کوئی مملکت یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کے افراد کسی ایسی وفاداری سے وابستہ ہو جائیں جو ان کے لیے مملکت کی وفاداری سے بالاتر اور اہم ہو۔ اسلامی نظام میں افراد کے مقاصد اور نظام کے مقاصد اسلام میں داخل ہونے کے بعد ایک ہو جاتے ہیں۔ مقاصد کی یہ ہم آہنگی اور یک جہتی اسلام میں اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ افراد کے اغراض و مقاصد کو اسلام کے نظامِ سیاسی میں ضم کر دیا گیا ہے۔ یعنی فرد کا مقصدِ زندگی صرف اسلام کی اغراض کا حصول اور اس کی ہدایات کی بھرپور اطاعت ہے۔ یہاں مسلمان ہونے کی حیثیت میں ذاتی حقوق یکسر ناپید ہیں اسے صرف ان فرائض کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے جو اسلام کی جانب سے اس پر عائد کیے گئے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا نظام ہے جس کے اغراض و مقاصد افراد کی زندگی اور ان کی اغراض و ضروریات کے مجموعہ سے ماورا حقیقت رکھتے ہیں۔ افراد کی یہ آزادیاں اس کل سے ماخوذ ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ اس سے الگ ہو کر فرد کی آزادی بالکل بے معنے ہے اس لیے فرد کی آزادی، اس کے مفادات کو اسلام کی آزادی اور اس کے مفادات میں گم ہو جانا چاہیے منافقین نے اپنی آزادی اور اپنے مفادات کو اسلام کی آزادی اور اس کے مفادات کے مقابلے میں ترجیح دی، اس لیے قرآن نے ان کے بارے میں یہاں یہ سنگین پالیسی اختیار کی ہے اور حکم دیا ہے خذوا ھم واقتلوا ھم حیث وجد تموھم اس دور میں فرد کی اسلام سے وفاداریاں جانچنے کا معیار ہجرت تھا۔ فرمایا کہ اگر ہجرت نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دشمن کے کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں وہی معاملہ کرو جو دشمن کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ حکم ان منافق مسلمانوں کا ہے جو برسرِ جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ کارروائیوں میں حصہ لیں ۔

دو قسم کے لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں

۱۴۰ ۔ مگر ہاں جو لوگ کسی ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہو چکا ہے یا ایسے لوگ جو لڑائی سے تنگ آ کر تمہارے پاس چلے آئیں نہ تم سے لڑیں اور نہ اپنی قوم سے لڑیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو بھی تم پر مسلط کر دیتا کہ تم سے لڑے بغیر نہ رہتے۔ پس اگر وہ تم سے ایک طرف ہو جائیں اور لڑائی نہ کریں اور صلح کا پیغام روانہ کریں تو پھر اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کرنے کی کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔ یعنی اس ظاہری ملنے جلنے سے ان کو قید اور قتل سے نہ بچاؤ مگر کل دو طرح سے

ایک تو یہ کہ جن لوگوں سے تمہاری صلح ہے ان سے ان کا بھی معاہدہ اور مصالحت ہو تو وہ بھی صلح میں داخل ہو گئے۔ دوسری طرح یہ کہ جو لوگ لڑائی سے عاجز ہو کر تم سے صلح کریں اور اس بات کا عہد کریں کہ نہ اپنی قوم کے طرفدار ہو کر تم سے لڑیں گے اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے اور اس عہد پر قائم بھی رہیں تو ایسے لوگوں سے بھی نہ لڑو اور ان کی مصالحت کو منظور کر لو اور اللہ کا احسان مانو کہ تمہاری لڑائی سے باز آ گئے اللہ چاہتا تو ان کو تم پر جری اور غالب تر کر دیتا[1]

اس آیت میں جو لفظ الا آیا ہے وہ استثنا کے معنے دے رہا ہے یہ استثنا نہ تو حتی یہاجروا سے ہے جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی کا خیال ہے اور نہ لا تتخذوا منھم اولیاء سے ہے جیسا کہ کچھ لوگوں کی رائے ہے بلکہ فخذوھم واقتلوھم کی خبر سے ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے ملک سے تعلق رکھتے ہوں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو تو اس علاقے میں جنگ میں ان کا تعاقب نہ کیا جائے حصر کے معنے تنگ ہونے، بے ہمت ہونے کے ہیں اور سلم کے معنے طاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ میدانِ جنگ میں دو قسم کے لوگوں کی پکڑ دھکڑ اور قتل کی تمہیں اجازت نہیں۔

ایک وہ لوگ جو کسی ایسی قوم اور قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں جن کے ساتھ مسلمانوں کے مصالحانہ تعلقات ہوں، ایسے لوگوں کی جان بخشی صرف معاہدے کے احترام کی وجہ سے کی گئی ہے کیونکہ معاہدے کے قیام تک ان کے کسی شہری کو گرفتار یا گرفتار کرنا عہد شکنی ہے خواہ وہ شہری کافر ہو یا منافق معاہدے کی رُوح یہی ہے کہ جو شخص تمہارے معاہدہ کی پناہ میں ہو وہ حکماً تمہاری پناہ میں بھی ہے حلیف کا حلیف بھی ایک درجہ میں حلیف ہی ہوتا ہے ان کو قتل کرنا ایک قسم کی عہد شکنی ہے۔

دوسرے وہ لوگ جو جنگ میں غیر جانبدار ہوں۔ اپنی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں سے درخواست کریں کہ وہ نہ اپنی قوم سے مل کر مسلمانوں سے لڑیں گے اور نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنی قوم سے مقابلہ کریں گے بلکہ حقیقتہً غیر جانبدار رہیں تو ان لوگوں کو بھی جنگ کے زمانہ میں قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ جب ان سے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر ان کے قتل کی اجازت نہیں ہے خود قرآن نے اس حکم کی یہ مصلحت واضح فرمائی ہے کہ ایسے کمزور لوگوں کی جانب سے غیر جانبداری کا رویہ بھی غنیمت ہے یہ بھی تو ممکن تھا کہ اللہ سبحانہٗ ان کو جنگ کرنے کا حوصلہ دے دیتا اور

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ لوگ کھلم کھلا دشمن بن کر سامنے آجاتے۔ یہ اللہ کا انعام ہے کہ باوجود قوت وقدرت کے ان کا دل تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے ہٹا دیا اور ان کے دلوں میں ہیبت ڈال دی۔

آخر میں ارشاد فرمایا ہے فان اعتزلوکم یعنی اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں اور جنگ نہ کریں بلکہ تمہاری طرف صلح کا ہاتھ دراز کریں تو پھر تمہیں ان کے خلاف ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے یعنی اصل یہ ہے کہ جو کوئی تمہارے خلاف جنگ و جدال پر آمادہ نہ ہو اور صلح و مصالحت کا ہاتھ بڑھاتے تو تمہارے لیے کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے کہ اس پر ہتھیار اٹھاؤ۔ تمہیں جنگ کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ تمہیں جنگ کا خواہش مند ہونا چاہیے بلکہ اس لیے کہ تمہارے برخلاف لوگوں نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے نہ لڑیں اور ان کے ساتھ صلح و سازگاری سے رہنا چاہیں اگرچہ وہ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کا بھی ساتھ نہ دیں ان سے جنگ و قتال جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اصل امن و صلح ہے نہ کہ جنگ و قتل۔

نفاق والا کہنے والا طبقہ

۱۴۱۔ ضرور ملیں گے تمہیں کچھ لوگ ایسے جو تمہارے جانب سے خود بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی، ہاں جب کسی فتنہ و فساد کی طرف لوٹا دیے جائیں تو اوندھے منہ اس میں گر جاتے لہٰذا ایسے لوگ اگر کنارہ کش ہوں اور تمہاری طرف پیغام مصالحت نہ روانہ کریں اور لڑائی سے ہاتھ نہ روکیں تو ان کو بھی گرفتار کرو اور قتل کرو اور یہی لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے۔ یعنی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم سے عہد کر جاتے ہیں کہ نہ تم سے لڑیں گے نہ اپنی قوم سے لڑیں گے تاکہ تم سے اور اپنی قوم دونوں سے امن میں رہیں لیکن اس عہد پر قائم نہیں رہتے بلکہ جب اپنی قوم کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ان کے مددگار ہو جاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے تم بھی درگزر مت کرو تمہارے ہاتھ تو صریح حجت آگئی کہ انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا ہے[1]

یہاں آخرین کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ منافقین والا ہیں یعنی وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے لیکن وہ اپنے ان تعلقات میں مخلص نہ تھے یہ گویا ان جھوٹے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حلفاء کی طرف اشارہ ہے جو ولا کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے خطرے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کے اندر شامل رہ کر اس سے بھی مامون رہنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر تو ولا کے مدعی تھے لیکن ان کی ولایت محض نمائشی تھی۔ جب ان پر قومی دباؤ پڑتا یہ ان شرارتوں میں شامل ہو جاتے جو وہ اسلام اور اہلِ ایمان کے خلاف کرتے۔ آیت میں فتنہ سے مراد کفر، شرک، معاشرتی بے راہ روی، اخلاقی فساد سب کچھ ہو سکتا ہے کہ سیاق قرآنی بتا رہا ہے کہ یہاں اس سے مراد کفار کے وہ جارحانہ اقدامات ہیں جو وہ اسلام کے خلاف کر رہے تھے۔

قرآن نے یہاں ان لوگوں کے بارے میں اہلِ ایمان کو یہ ہدایت دی ہے کہ یہ لوگ اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں جو پہلے دو طبقوں کو دی گئی ہے۔ یہ کھلے دشمن ہیں اگر یہ تمہاری مخالفت سے باز نہ آئیں۔ تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ اختیار نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم جہاں کہیں پاؤ ان کو گرفتار اور قتل کرو۔ ان کو گرفتار کرنے اور ان کو قتل کرنے کا اللہ نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔

اسلام میں جنگ کا مقصد

ان لوگوں کے بارے میں جنگ کی یہ اجازت بتا رہی ہے کہ جہاد کی مشروعیت مظلوموں کی حمایت جلا وطنوں کو حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے، عقیدے کی آزادی حاصل کرنے، دنیا سے ظلم و فساد مٹا کر اللہ کے بندوں سے بندوں کی بندگی ہٹانے اور اللہ کی بندگی قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اسلام نے میدانِ جنگ میں بھی یہ قانون بتایا ہے کہ عین میدانِ جنگ میں پہنچ کر صلح و آشتی کا خیال رکھا جائے اگر کسی قوم سے لڑائی آ پڑے تو تلوار کے فیصلے سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کر دی جائیں۔ اول یہ کہ تم اسلام قبول کر لو اور لڑائی سے ہاتھ ہٹا کر ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو اسلام کا سیاسی نظام قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی جائے گی۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے مناظر ہیں کہ کسی دشمن قوم نے اسلام یا محض اسلامی نظام کو قبول کر لیا اور جنگ رک گئی اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی۔ یہ قانون سر تا سر اسلام کی امن پسندی، سلامت طلبی اور خون ریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا

دستور تھا کہ جب کسی فوج کو مقرر فرماتے تو جرنیل کو ہدایت کرتے کہ :

جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لو اور ان پر حملہ نہ کرو۔ ان کو اسلام کی دعوت دو اگر مان لیں تو اس سے جنگ نہ کرو اور ان سے درخواست کرو کہ وہ مسلمان ریاست میں آکر آباد ہو جائے تو ان کے وہ ہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔ اگر اسلام قبول نہ کریں تو اسلامی نظام کو پیش کرو اگر وہ یہ بھی مان لے تو جنگ نہ کرو اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر اللہ سے مدد مانگو اور لڑائی شروع کر دو۔

یہ وہ اصول جنگ ہے جس سے خون ریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مسلمان ہونے کے لیے مجبور کرنا تھا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا
خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ
يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ
مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾
وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَ
غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٩٣﴾

اور کسی مسلمان کو زیب نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ اس سے غلطی سے ایسا ہو جائے[۱۴۲] ۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے مار ڈالے تو اس کا کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دینا ہے ۔ ہاں

مقتول کے وارثوں کو معاف کر دینے کا حق ہے[142]۔ اور اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہے تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے[144]۔ اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا اور جسے آزاد کرنے کے لیے غلام میسر نہ ہو تو وہ پے درپے دو ماہ کے روزے رکھے اللہ سے توبہ کرنے کی خاطر اور اللہ جاننے والا حکیم ہے[145]۔ اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے اسی میں پڑا رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی پھٹکار ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے[146]۔

غلطی سے قتل کی سزا

مسلمانوں میں باہم اصل اخوت رافت، رحمت اور بھائی چارہ ہے۔ ایمان کا رشتہ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو ایمان کا رشتہ لے کر تشریف لاتے۔ اس کے ذریعے

مدت کے بچھڑے ہوئے باہم مل گئے، دشمن بھائی بھائی بن گئے اور خاندانی، لسانی، ملکی یگانگت سے بڑھ کر ایمانی یگانگت ان میں پیدا ہو گئی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو دل سے ایسا بھلا دیا کہ وہ بھائی بھائی ہو گئے۔ اہل ایمان کی اس باہمی اخوت و محبت اور مہربانی کی تشریح اور تاکید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے کہ،

مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ [1]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا،

سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں بھی اگر تکلیف ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کا ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف ہو تو سارے مسلمانوں کو تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

جریر بن عبداللہ البجلی جو ایک مشہور صحابی ہیں کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا [2] کئی روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے [3] یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے اور جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا ہے اور یہ ایک معنے میں کفر ہے اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کی سزا دہی رکھی ہے جو میدان جنگ میں کافروں کے لیے ہے فرمایا کہ کسی مسلمان کو سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان کو قتل کرے الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے اور مومن خواہ کہیں کا رہنے والا ہو۔ ان آیات میں مومن کے غلطی سے قتل ہو جانے کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمان مقتول اسلامی مملکت کا شہری ہو تو قاتل کو غلام آزاد کرنے کے ساتھ

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] صحیح بخاری

مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی دینا ہوگا۔ اگر مسلمان مقتول اسلامی مملکت کا شہری نہیں بلکہ کسی ایسے ملک کا شہری ہے جو دار حرب ہے تو خون بہا نہیں صرف غلام آزاد کرنا ہوگا اور اگر مقتول اسلامی مملکت کا نہیں بلکہ کسی ایسے ملک کا شہری ہے جس سے اسلامی مملکت کے عہد و پیمان کے تعلقات ہیں تو قاتل کو خون بہا بھی دینا ہوگا اور غلام بھی آزاد کرنا پڑے گا۔ یہ مسئلہ یہاں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ پہلی آیات میں ان نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں قتل کا حکم دیا گیا تھا جنہوں نے مسلمانوں اور اسلامی مملکت کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اور مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہوگیا تھا کہ مقابلہ کریں ورنہ اگر جنگ کی حالت نہ ہو تو قتل نفس ایک بہت بڑا گناہ ہے اور ایک مسلمان کے لیے کسی حال میں جائز نہیں کہ کسی مسلمان کو دیدہ و دانستہ قتل کر ڈالے۔ اس کے بعد بتلایا ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے اور شبہ میں کسی مسلمان کو قتل کر دے تو اس کا کیا حکم ہے یاد رہے کہ قرآن نے دو حالتوں کے سوا اور کسی حالت میں قتل کو جائز نہیں رکھا ہے یا تو لڑائی کی حالت ہو یا قانون کی رو سے کسی مجرم کو سزا دی جائے اور بس۔

۱۴۲۔ اور کسی مسلمان کو زیب نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ اس سے غلطی سے ایسا ہو جائے۔ قتل خطأ یعنی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دینے کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً غلطی سے مسلمان کو شکار سمجھ کر مار ڈالا یا تیر اور گولی شکار پر چلائی چوک کر کسی مسلمان کو جا لگی۔ ایک صورت قتل خطأ کی یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کافروں میں ہو اور اس کو کوئی مسلمان کافر سمجھ کر بوجہ لاعلمی قتل کر ڈالے اور یہاں اسی صورت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ مجاہدین کو یہ بات اکثر پیش آجاتی ہے اور آیات سابقہ کے یہی مناسب ہے۔ گو قتل خطأ کی اور صورتوں کا حکم بھی یہی ہے وہ صورتیں بھی اس میں آگئیں۔ ؎

انداز بیان اور پیرایۂ تعبیر خود بول رہا ہے کہ گناہوں میں سنگین گناہ قتل مومن ہے۔ اتنے بڑے گناہ کی جسارت کوئی مسلمان ہوش و حواس کے ہوتے ہوئے نہیں کر سکتا۔ اس میں غلطی تو ہو سکتی ہے لیکن بالارادہ اور جان بوجھ کر یہ کام ایک مسلمان کے ہرگز شایان شان نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔

؎ افادات شیخ الاسلام

قرآن نے مسلمانوں کی جمعیت و جماعت کی بنیاد باہمی مواخات پر رکھی ہے یعنی ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا ہے فاصبحتم بنعمتہ اخواناً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقعہ پر جو یادگار عالم خطبہ دیا تھا اور جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ہمیشہ کے لیے تمام مسلمانوں کو وصیت فرمائی تھی لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم ایک دوسرے کو مارنے لگو۔ اس کی سنگینی کے پیش نظر حضور انور نے ان راہوں پر قدغن قائم کر دی جو قتل مومن کی طرف لے جانے والی تھیں۔ مثلاً بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے۔

کبھی اپنے بھائی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو ممکن ہے کہ ہتھیار لگ جائے اور تم دوزخ کے گڑھے میں گر پڑو۔

اور ابن ابی شیبہ نے ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ:

جب کبھی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی طرف تلوار سے اشارہ کرتا ہے تو فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

فتح الباری میں ابن العربی کا یہ تشریحی نوٹ نقل کیا گیا ہے کہ:

جب صرف ہتھیار اٹھا کر اشارہ کرنے کے بارے میں ایسی شدید وعید آئی ہے کہ فرشتے لعنت بھیجتے ہیں تو اس بد بخت کا کیا حال ہوگا جو صرف اشارہ ہی نہ کرے بلکہ سچ مچ اپنے ہتھیار سے ایک مسلمان کو قتل کر ڈالے اور یہ جو فرمایا کہ اشارہ کرنے والا مستحق لعنت ہے تو اس سے مراد وہی شخص ہے جو ڈرانے کے لیے ایسا کرے خواہ غصہ سے یا ہنسی میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہنسی دل لگی میں بھی کوئی شخص ہتھیار اٹھا کر کسی مسلمان کو ڈرائے گا تو وہ لعنت کا مستحق ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے امام ترمذی اور امام نسائی نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

اللہ کی نظروں میں تمام دنیا کے مٹ جانے سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ ایک مسلمان کا قتل ہونا ہے۔

اور اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

قیامت کے روز سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ چکایا جائے گا وہ انسان کا

خون ہے۔ (بخاری عن عبداللہ بن مسعود)

حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے جب ایک قاتل لایا گیا تو آپ نے فرمایا بن پڑے تو ٹھنڈے پانی کا کچھ توشہ لے لے کیونکہ تو جنت میں ہرگز نہ جائے گا۔

بہرحال آیت میں اندازِ بیان کہہ رہا ہے کہ قتلِ مومن اللہ کے نزدیک سنگین گناہ ہے۔

اسلامی مملکت میں مسلمان شہری کا قتلِ خطاء

۱۴۳۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے مار ڈالے تو اس کا کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دینا ہے ہاں مقتول کے وارثوں کو معاف کرنے کا حق ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے۔ فقہا نے قتلِ خطا کی دو بڑی قسمیں بتائی ہیں ایک یہ کہ غلطی قصد و ظن میں ہوئی، مثلاً دُور سے آدمی کو شکار سمجھ لیا یا آدمی تو سمجھا مگر مسلمان پر کافر حربی کا دھوکا ہوا۔ دوسرے یہ کہ غلطی خود عمل میں ہو گئی مثلاً نشانہ لگایا جانور پر مگر گولی جا لگی مسلمان کو۔ اس صورت میں مسلمان کے غلطی سے قتل کرنے کے گناہ کی توبہ یہ ہے کہ۔ اولاً۔ تحریر رقبۃ مومنۃ مسلمان غلام کو آزاد کرے چونکہ ایک مسلمان کی اس کے ہاتھ سے جان تلف ہوئی ہے اس لیے اس کا کفارہ یہی ہے کہ ایک مسلمان کی جان کی تخلیق کرے، آزاد کرنا بھی تخلیق ہے جیسے غلامی کی حقیقت عدم ہے غلام کے لیے رقبۃ کی تعبیر بھی بڑی بلیغ ہے۔ رقبہ کے معنے گردن کے ہیں چونکہ غلام ہمہ وقت طاعت و فرمانبرداری کے لیے آقا کے سامنے گردن جھکائے رہتا ہے یا بیل کی طرح اس کی گردن پر خدمت کا جوا رکھا ہوتا ہے اس لیے اس کو رقبہ کہا گیا ہے۔ اسی لیے جمہور علماء کی رائے میں مفلوج، مشلول غلام کی آزادی معتبر نہیں ہے ایسے ہی اندھا اور مجنون غلام بھی قتلِ خطا میں آزادی کے لائق نہیں ہے۔

غلام مسلمان ہونا چاہیے لیکن مسلمان کی تعیین میں اختلاف ہے۔ عبداللہ بن عباس، الحسن، شعبی اور نخعی کہتے ہیں کہ چاہیے کہ نماز پڑھتا ہو اور ایمان سمجھتا ہو۔ امام ابوحنیفہ، ابویوسف، امام محمد، زفر اور الحسن بن زیاد، الاوزاعی اور الشافعی فرماتے ہیں کہ بچہ بھی آزاد کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً غلام آزاد کرنے کے ساتھ دیت بھی ادا کرنی پڑے گی جو مقتول کے ورثا کو ملے گی۔ غلام کا آزاد کرنا کفارے میں حق اللہ ہے اور خون بہا مقتول کے ورثا کو دینا مقتول کے ورثا کا حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقتول کے عزیز اور وارثوں کا حق ہے کہ ان کو خون بہا ملے۔ قرآن کی نظر فطرتِ بشری کی گہرائیوں پر ہے اس نے اصولِ قانون میں یہ بات رکھی کہ قتل اگر غلطی سے ہو گیا تو جان کی تلافی

غلام کی آزادی سے کی جائے لیکن مقتول کے وارثوں کی اشک شوئی خون بہا سے کی جائے۔

دیت کیا ہے؟

دیت کا لفظ عربی زبان میں عدة کے وزن پر مصدر ہے۔ قانون میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ مالی معاوضہ جو کسی آزاد شہری کے خلاف اقدام سے واجب ہوا ہو۔ آج بھی بین الاقوامی قانون میں یہ بالکل جائز ہے کہ جب ایک ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک کے باشندوں کے ہاتھوں ہو جائے اور غیر ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانا دشوار ہو تو بجائے فوجداری استغاثہ کے صرف ہرجانہ کی رقم پر کفایت کر لی جائے۔ یہ ہرجانہ اسی دیت کے لیے ایک خوشنما اور جدید اصطلاح ہے۔

قرآن میں یہاں لفظ دیت کو بے قید بطور نکرہ لایا گیا ہے لیکن نبوت کی عملی زندگی نے اس کی تحدید کی ہے اور اس تحدید میں عرب کے عرف کو قانون کی حیثیت دے دی تھی۔ اس بنا پر فقہا کا اس پر اجماع ہے کہ دیت سو اونٹ ہے۔ اگر دوسری صورت میں کوئی خون بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار سو اونٹوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ حضور انور کے زمانہ میں نقد دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھے۔ جب حضرت عمر کا زمانہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ اب اونٹوں کی قیمت زیادہ ہو گئی لہٰذا اب سونے کے سکے میں ایک ہزار دینار یا چاندی کے سکے میں ۱۰ ہزار درہم خون بہا دلوایا جائے، یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

قتل خطا میں دیت کی ذمہ داری

قتل خطا میں غلام آزاد کرنے کی ذمہ داری اگر قاتل پر ہے تو دیت دینے کی ذمہ داری قاتل پر نہیں بلکہ قاتل کے قبیلہ پر ہوتی ہے یعنی اس کی قوم، جماعت یا شہر والوں پر ہوتی ہے جہاں قاتل رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی قوم، برادری، خاندان اور شہر والوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے چال چلن پر نظر رکھیں۔ اگر عقیلہ یعنی قاتل کی قوم غفلت اور بے پروائی نہ کرتی تو مجرم اس جرم کا مرتکب نہ ہوتا۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس معاملہ میں قانون نے قاتل اور مقتول دونوں سے ہمدردی کا پہلو اختیار کیا ہے۔ مقتول کے وارثوں کے ساتھ یہ ہمدردی کی ہے کہ ان کی دیت اور مال دے کر اشک شوئی کی ہے اور قاتل کے ساتھ غلطی سے قتل ہونے کی وجہ سے یہ ہمدردی کی ہے کہ قاتل کے رشتہ داروں کو اس معاملہ میں قاتل کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس موضوع پر

فقہائے امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اتفق الفقہاء علیہ مگر واضح رہے کہ رشتہ داروں پر ذمہ داری کا یہ بوجھ قتل عمد کی صورت میں نہیں بلکہ قتل خطا کی صورت میں ہے اور اس مسئلہ میں بھی علمائے امت کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں کہ خون بہا کی رقم یکبارگی وصول نہ کی جائے گی بلکہ تین سالوں میں لی جائے گی۔ الجصاص نے استفاض ذالک عن عمر یہ بات حضرت عمر سے شہرت کے درجہ میں نقل ہو کر آئی ہے اور صدر اول میں کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور تمام فقہائے نے اسے ہی اپنایا ہے۔

اگر مقتول مسلمان نہ ہو بلکہ یہودی، عیسائی، مجوسی، معاہد یا ذمی ہو تو پھر دیت کے موضوع پر ائمہ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد، زفر، عثمان اللیثی، سفیان ثوری، اور الحسن بن صالح کہتے ہیں کہ دیت کے موضوع پر مسلم اور غیر مسلم میں مساوات ہے۔ امام مالک کی رائے میں یہودیوں اور عیسائیوں کا خون بہا نصف ہے اور مجوسی کی دیت صرف آٹھ سو درہم ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں یہودی اور عیسائی کی دیت مسلمان کے مقابلے میں ایک تہائی ہے اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

دیت کو معاف کر دینے کا حق

آخر میں فرمایا ہاں مقتول کے وارثوں کو معاف کر دینے کا حق ہے۔ اصل ارشاد ہیں الا ان یصدقوا آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارثوں کو دیت کا دینا واجب ہے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو پھر واجب نہیں ہے۔ معافی کو تصدق کے ساتھ تعبیر کرنے میں ایسا کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا عنصر شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دناءت پسندی کے مرادف ہو کر رہ جائے۔ اسی لیے یہاں قرآن نے پہلے مقتول کے ورثاء کے حق کا اقرار کیا اور اس اعتراف کے بعد ان کو معاف کرنے کی ترغیب دی۔ قرآن نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ تعلیم کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دے جو ذلت اور طبعی پستی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن نے عفو و درگزر کی ایسی تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی برقرار رہتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ برائی کا بدلہ برائی اجتماعی تقاضا ہے لیکن عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے۔ جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے

ہوتے افراد کا آپس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاق کی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمہ داری اللہ سبحانہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں یا وہ جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں خدا کی محبت سے محروم ہیں۔ اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگزر خود داری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگزر کرتے ہیں اسی لیے ارشاد ہے ولمن صبر وغفر ان ذالک لمن عزم الامور۔

مسلمان مقتول اگر دارِ حرب کا شہری ہو

۱۴۴۔ اور اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہے تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔ یعنی اگر مقتول مسلمان ہو اور ایسی ملک کا شہری ہو جن سے اسلامی مملکت کے تعلقات حلیفانہ نہیں بلکہ حریفانہ ہیں تو اس صورت میں قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہو گا دیت اور خون بہا نہ ہو گا۔ کفار کے علاقوں میں بہت سے مسلمان بھی تھے جو خود تو ہجرت کے دل سے خواہاں تھے لیکن مجبوریوں نے ان کی راہ روک رکھی تھی۔ جنگ پیش آ جانے کی صورت میں اندیشہ تھا کہ مبادا ان کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچ جائے اس لیے قرآن نے قتل مومن کی سنگینی بھی واضح کر دی اور یہ بھی وضاحت کر دی کہ اگر مقتول مسلمان دشمن قوم یا قبیلہ کا فرد ہو تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا کافی ہے اور خون بہا کی ادائیگی ضروری نہیں ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قیاس و عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس صورت میں صرف کفارہ واجب ہو اور دیت واجب نہ ہو کیونکہ اگر دار الحرب کے شہری مسلمان کے قتل میں دیت واجب ہو تو جو دار الحرب میں جہاد کی خاطر جانے والے مجاہدین کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہو جاتی ہے کہ جہاد کے لیے قدم اٹھانے سے پہلے اس امر کی تحقیق کریں کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر اور یہ ایک ایسی الجھن ہوتی جس کا حل ممکن نہ تھا اس لیے اللہ سبحانہ نے دار الحرب کے مسلمان شہریوں کے قتل میں خون بہا واجب نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ جہاد ہی میں مخاط ہو جاتے۔ کفارہ ضرور واجب کر دیا کہ یہ حق اللہ ہے۔[1]

---

[1] معارف القرآن م ا۔

مقتول اگر معاہد قوم کا فرد ہو

۱۴۵- اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے اور ایک مومن غلام کو آزاد کیا جائے گا اور جسے آزاد کرنے کے لیے غلام میسر نہ ہو تو وہ پے درپے روزے دو ماہ کے رکھے اللہ سے توبہ کرنے کی خاطر اور اللہ جاننے والا حکیم ہے۔ اس آیت میں قتل خطا کے دو حکم بتاتے ہیں ایک تو آزاد کرنا غلام مسلمان کا اور اس کا مقدور نہ ہو تو دو ماہ کے متصل روزے رکھنا یہ کفارہ ہے خدا تعالیٰ کی جناب میں اپنی خطا کا، دوسرے اس مقتول کے وارثوں کا خون بہا دینا یہ ان کا حق ہے۔ ان کے معاف کرنے سے معاف بھی ہو سکتا ہے اور کفارہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق تین صورتیں ہو سکتی ہیں کیونکہ جس مسلمان کو غلطی سے قتل کیا اس کے وارث مسلمان ہوں گے یا کافر۔ اگر کافر ہیں تو ان سے مصالحت ہے یا دشمنی اول دونوں صورتوں میں مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا پڑے گا تیسری صورت میں خون بہا لازم نہ ہو گا اور کفارہ سب صورتوں میں ادا کرنا ہو گا۔[1]

اس آیت میں اور پہلی آیت میں ذرا سا فرق ہے اول یہ کہ پہلی آیت میں وھو مومن کی قید موجود ہے جبکہ اس آیت میں نہیں ہے دوسرے یہ کہ اس آیت میں فدیۃ مسلمۃ کا ذکر پہلے ہے اور غلام آزاد کرنا بعد میں ہے جبکہ پہلے اس کا عکس ہے تیسرے یہ کہ اس میں الا ان یصدقوا نہیں ہے جبکہ پہلی آیت میں صراحتاً موجود ہے۔

اس بنا پر شارحین قرآن کا اس آیت کی تفسیر میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس فقرے وان کان من قوم بینکم الخ میں ضمیر کا مرجع مقتول مومن ہے اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مقتول مومن ہو لیکن وہ غیر ملکی ہو اور ملک ایسا ہو جو تمہارا معاہد ہو تو تم پر اس مقتول کی دیت اور کفارہ دونوں واجب ہیں۔ تابعین میں سے حسن بصری، جابر بن زید اور ابراہیم نخعی کی رائے یہی ہے اور شارحین قرآن میں سے امام رازی، علامہ آلوسی اور ابوالسعود نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کا میلان بھی یہی ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع صرف مقتول ہے مقتول مومن نہیں۔ اگر مقتول مومن ہوتا تو پہلی آیت کی طرح وھو مومن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی قید ہوتی - یہ قید نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ مقتول مومن نہیں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر مقتول ایسے ملک کا شہری ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو اور اس میں وہ غیر مسلم بھی داخل ہیں جو اسلامی مملکت کے شہری ہیں کیونکہ ان سے بھی اسلامی حکومت تحفظِ جان و مال کا عہد کرتی ہے تو اس صورت میں تمہیں غلام بھی آزاد کرنا ہوگا اور خون بہا بھی دینا ہوگا۔ عبداللہ ابن عباس، امام شعبی، امام نخعی اور امام شافعی سے یہی تشریح منقول ہے اور حافظ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کیونکہ گزشتہ آیت کی طرح اس آیت میں وھو مومن کی قید نہیں - اردو مفسرین میں مولانا اشرف علی اور مولانا آزاد نے بھی اسی کو پسند کیا ہے لیکن جن لوگوں نے روایات کی بنا پر یہ طے کر لیا ہے کہ غیر مسلم کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہوتی ہے - ان کو اس تشریح سے اختلاف ہے لیکن روایات کے برعکس قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ کفارہ اور دیت کے لحاظ سے ذمی، مستامن اور معاہد کافر کا بھی ایک مسلمان کے برابر حق ہے -

غلامی کا رواج اگر نہ ہو

آخر میں فرمایا کہ فمن لم یجد اگر کسی کو آزاد کرنے کے لیے غلام نہ دستیاب ہو - اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ غلام دستیاب نہ ہو، یعنی بردہ فروشی اور غلامی کا رواج نہ رہے جیسا کہ آزادی کی ہدایات سے قرآن کا مقصد ہے یا یہ کہ غلام خریدنے کے لیے سرمایہ ہی نہ ہو - یہاں پہلی بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ قرآن نے غلامی کا رواج کم کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں ہے لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ غلاموں کی تعداد گھٹانے کے لیے قرآن نے مکاتبت کا طریقہ رائج کیا یعنی غلام کو حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ غلام رہنا نہیں چاہتا تو اپنے کتابت کا معاملہ کرے - کتابت یہ ہے کہ اپنے آقا سے کہے کہ اگر وہ اتنی رقم کما کر آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہے غلام کے اس عمل میں دوسرے مسلمانوں کی شرکت کو بہت بڑے ثواب کا کام بتایا ہے قرآن کے مصاریف میں ایک مصرف یہ بھی بتایا ہے - پھر مول کتابت ادا کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں کہ آقا اپنی زبان سے آزادی کے کلمات کہے بلکہ رقم کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ آزاد ہو جاتا ہے - اس کے علاوہ قرآن نے غلاموں کو آزاد کرنے کے مختلف قانونی طریقے بتاتے ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو آپ ان آیات میں پڑھ چکے ہیں - اسلامی مملکت کا مسلمان شہری، مستامن، ذمی، معاہد غیر اسلامی مملکت کا غیر مسلم شہری، غیر معاہد غیر اسلامی مملکت کا مسلمان شہری غلطی سے مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے تو مسلمان غلام کو آزاد کرنا

واجب ہے۔ کفارہ ظہار میں غلام آزاد کرنا ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ کے خیال میں اس کے لیے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں۔ کفارہ یمین میں غلام آزاد کرنے کی ترغیب ہے اسی طرح اگر کوئی شخص عمداً رمضان کا روزہ توڑ دے تو اسے بھی غلام آزاد کرنے کی ہدایت ہے۔ ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا منشا غلامی کے رواج کو کم کرنا ہے اس لیے یہاں فرمایا ہے فمن لم یجد جسے غلام آزاد کرنے کے لیے دستیاب نہ ہو تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے۔ یہ دو ماہ قمری ہونے چاہئیں۔ اگر چاند کی پہلی سے نہیں درمیان سے روزے شروع کرے گا تو پورے ۶۰ روزے رکھنے ہوں گے۔ اگر درمیان میں ایک بھی چھوڑے گا تو پھر از سر نو رکھنے ہوں گے توبۃ من اللہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ جرمانہ نہیں بلکہ توبہ اور کفارہ ہے۔ جرمانے میں ندامت و شرمساری اور اصلاح نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حقوق کے ذریعے سے اس کا اثر اپنی روح پر دھوئے اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے تاکہ نہ صرف یہ کہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادے سے بھی محفوظ رہے۔ کفارے کے لغوی معنے ہیں چھپانے والی چیز کسی کارِ خیر کو گناہ کا کفارہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہے اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔[1]

مومن کو عمداً قتل کی اخروی سزا

۱۴۶۔ اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ اسی میں پڑا رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور پھٹکار ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔
یعنی اگر مسلمان دوسرے مسلمان کو غلطی سے نہیں بلکہ قصداً اور مسلمان معلوم کرنے کے بعد قتل کرے گا تو اس کے لیے آخرت میں جہنم اور لعنت اور عذاب عظیم ہے۔ کفارے سے اس کی رہائی نہ ہوگی باقی رہا دنیوی سزا وہ سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔ جمہور علماء کے نزدیک خلود اس کے لیے ہے جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے کیونکہ اس کے کفر میں شبہ نہیں ہے یا خلود سے مراد یہ ہے کہ

---

[1] تفہیم القرآن۔

مدت دراز تک جہنم میں رہے گا یا وہ شخص مستحق تو اسی سزا کا ہے آگے اللہ مالک ہے جو چاہے کرے واللہ اعلم۔[۱]
یہ آیت اس موضوع پر نص قطعی ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی حق شرعی کے دوسرے مسلمان کو قتل کر دے وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اللہ کے غضب و لعنت کی آماجگاہ ہوگا اور عذاب الیم کا مستحق۔ اس سزا کی سنگینی سمجھنے کے لیے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہیں ہو سکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔ احادیث میں اس حقیقت کی جو بے شمار تشریحات و تمثیلات ملتی ہیں وہ مشہور ہیں اور مہاجرین و انصار اور عموم صحابہ کرام نے ان کی عملی تصویر بن کر بتلا دیا ہے کہ اخوت دینی کے کیا معنے ہیں۔ ہر مسلمان پر اس کی نماز اور روزے سے بھی بڑھ کر جو چیز فرض کر دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان سے محبت کرے، جہاں تک بن پڑے ان کی بھلائی چاہے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو ایمان و اسلام بھی نہیں ہے۔ پہاڑوں جتنا بھی زہد و عبادت ہو سمندر جتنی بھی دولت خرچ کر ڈالی جائے لیکن اگر یہ چیز نہیں تو بالکل بے کار و عبث ہے۔

فرمایا کہ:

کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو بات اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔

(رواہ الشیخان)

اور فرمایا کہ،

تم کبھی جنت میں نہیں جا سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ اور کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک باہم محبت و پیار نہ کرو۔ (رواہ الشیخان)

اور فرمایا کہ،

ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، باہم کینہ و عناد نہ رکھو، بدگوئی نہ کرو، اور آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ (رواہ الشیخان)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ:

تجھ پر صبح کا سورج چمکے تو اس حالت میں چمکے کہ اس کی کرنوں کی طرح

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

تیرا دل بھی سب کے لیے صاف ہو اور شام آئے تو اس طرح آئے کہ کسی کی طرف سے تیرے دل میں کھوٹ نہ ہو۔
(مسلم)

اور فرمایا کہ:

مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ (بخاری)

اور فرمایا کہ:

کسی مسلمان کے لیے روا نہیں ہے کہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے روٹھا رہے۔
(رواہ الشیخان)

اور فرمایا کہ:

اللہ کی اس پر پھٹکار جس نے کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا یا اس کو دھوکا دیا۔
(ترمذی)

ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا کہ جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو نہ چاہیے کہ اپنے بھائی مسلمان کی طرف تیز نظروں سے گھورے یعنی جب مسلمان بھائی کو دیکھے محبت اور پیار سے دیکھے۔ (رواہ الحاکم وصححہ)

جب اللہ ورسول نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی باہمی محبت وبرادری پر رکھی اسی کو ایمان کی جڑ قرار دیا اسی پر اسلام کی تکمیل موقوف ٹھہری تو ظاہر ہے کہ جو مسلمان خدا کے اس جوڑے ہوئے رشتہ کو توڑ دے اور اپنے انہی ہاتھوں سے جو مسلمانوں کی دستگیری و مددگاری کے لیے بنائے گئے تھے مسلمانوں کی گردنیں کاٹے اس سے بڑھ کر خدا کی زمین پر اس کے قانون کا کون مجرم ہو سکتا ہے اور اگر انسان کی برائیاں اور بدعملیاں اللہ کی لعنت کا مستحق ہو سکتی ہیں تو اس سے بڑھ کر اور کون سا کام ہے جو اللہ کے عرش جلال وغیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں بارش کی بوندوں کی طرح آسمان سے زمین پر برسنے لگیں؟

اللہ اکبر جس مومن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ ہو اسی کا خون خود ایک مسلمان کے ہاتھ سے ہو اس سے زیادہ اللہ کی شریعت اور اس کے قانون کی اور کیا توہین ہو سکتی ہے اور ان سارے گناہوں میں سے جو انسان کے ہاتھ پاؤں کر سکتے ہیں اور کون سا گناہ ہے جو اس سے زیادہ ملعون اور مردود ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس فعل کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی

یعنی فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا و غضب اللہ علیہ و لعنہ، اس میں خلود فی النار غضب لعنت تین چیزوں کا ذکر کیا ہے اور تمام قرآن و سنت میں یہ تینوں کلمات وعید کفار کے لیے مخصوص ہیں۔ اہل ایمان کے بارے میں کہیں نہیں بولے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قتل مومن کا گناہ تمام معاصی و فسوق سے بڑھ کر ہے۔ معصیت و فسق کا لفظ اس کی ناپاکی ظاہر کرنے کے لیے کافی نہ تھا جب مسلمان کو صرف گالی دینا فسق ہے تو پھر اس کو قتل کر دینا فسق کیوں کر ہو سکتا ہے۔ سُن آئے ہو کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کفر ہے۔

ایمان کی طرح کفر کے بھی درجات ہیں

جس طرح ایمان کی ستر سے اوپر کچھ شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اعلیٰ و ادنیٰ مراتب ہیں۔ اسی لیے صحابہ و سلف سے کفر دون کفر اور ظلم دون ظلم مروی ہے۔ امام بخاری نے کتاب الایمان میں عنوان قائم کیا ہے کفران العشیر و کفر دون کفر لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطا ابن ابی رباح کے طریق سے روایت کیا ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری نے المقالات الاسلامیہ میں تصریح کی ہے کہ یہ متعدد صحابہ سے منقول ہے اور صدر اول میں عام طور پر زبان زد تھا۔ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں یہ سارا ذخیرہ موجود ہے۔

اور جس طرح ایمان و اسلام اعتقادی اور عملی یعنی اعتقادات میں بھی، اعمال میں بھی، فکر میں بھی فعل میں بھی ہے اسی طرح کفر اور نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی شرک کفر اعتقادی ہے اور عمداً ترک صلوٰۃ کفر عملی ہے۔ لہٰذا قرآن و احادیث میں لفظ کفر دیکھ کر اور اس آیت میں جزاءہ جہنم خالداً فیہا و غضب اللہ و لعنہ، کوئی تاویل نہ کرنی چاہیے۔ قرآن و سنت میں جس فعل کو کفر کہا ہے وہ کفر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی ہے اور کفر ہی رہے گا۔ ہاں یہ کفر کفر عملی ہے۔ وہ کفر اعتقادی نہیں ہے جو مخرج عن اللہ ہوتا ہے۔ اس کا کرنے والا ویسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہوگا جیسا تارک صلوٰۃ مسلمان جس کے کفر پر صحابہ کرام کا اتفاق تھا۔ امام ترمذی نے صحابہ کا اتفاق نقل کیا ہے الفاظ یہ ہیں:

> کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفراً غیر الصلوٰۃ۔

یہاں من الاعمال کی قید کہہ رہی ہے کہ عمل کی باتوں میں جو بات کفر ہو سکتی ہے وہ ترک صلوٰۃ سمجھی جاتی تھی لیکن بلاشبہ یہ وہ کفر نہیں ہے جو ایک مسلمان کو ملت سے نکال دیتا ہے جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس سے وہ اسلام میں داخل ہوا تھا اس وقت تک وہ اس معنے میں کافر نہیں ہو سکتا۔

اس سے یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ مسلمان کو قتل کرنا قرآن کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملی کفریات کا حکم رکھتی ہیں اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی برائی نہیں ہے۔ قرآن کی اس وعید کو پڑھ کر جس دل میں رائی برابر بھی اللہ اور یوم الآخر پر ایمان ہے لرز اٹھتا ہے اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ ہو چکا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جاتے ہیں اس سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن اس کفر کے ارتکاب کا کبھی وہ دھیان بھی نہیں کر سکتا۔

مسلمان پر ہتھیار اٹھانے کی حدیث

وہ ارشادِ نبوت جسے امام بخاری اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا ہے۔

من حمل علینا السلاح فلیس منا، یعنی جس نے مسلمانوں کے مقابلے پر ہتھیار اٹھایا وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے، قرآن کی اسی آیت سے مستنبط ہے یہ حدیث نہایت اہم ہے اور اسلام کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے۔ لیس منا کے معنے ہیں 'ہم میں سے نہیں ہے'، یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازِ بیان اور طرزِ خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لیس منا وعید کا ایسا فقرہ ہے جو آپ ان مواقع میں بولتے تھے جہاں صریح کفر کی جگہ کفر سے بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت دور حالت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ عام گناہوں سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ان سب پر غور کیا جائے اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔ نبوت نے جن کاموں کے لیے جو احکام دیے ہیں اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور کم کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ارشادات میں ایسی تاویلوں کا انکار کیا ہے۔ اسی حدیث کی نسبت امام نووی اور حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ:

سفیان بن عینیہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ لیس منا کی تفسیر یوں بیان کی جائے کہ لیس علی ھدینا۔ اور اس تفسیر کے بارے میں کہتے تھے کہ کیا ہی بُرا قول ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی تاویل نہ کی جائے۔ شیخ عبدالوہاب الشعرانی نے میزان الکبریٰ میں امام سفیان ثوری کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ:

بارگاہِ نبوت میں ادب یہ ہے کہ جن ارشادات کا منشا لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ ہے ان کو بغیر تاویل کے پیش کیا جائے۔ اگر تاویل کروگے تو شارح کا منشا پامال ہوکر رہ جائے گا۔ جیسے یہ ارشاد من غشنا فلیس منا جو مسلمانوں سے فریب کرے گا وہ ہم سے نہیں ہے۔ اگر اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ اس خصلت اور اس کام میں وہ ہم سے نہیں ہے تو بدکار لوگوں کے لیے ایک قسم کی جسارت کا سامان ہوگا۔

قتلِ مسلم کی پہلی صورت

بہرحال قتلِ مسلم قرآن کی نظر میں ایک سنگین جُرم ہے اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان مسلمان کو قتل کرے لیکن اس فعل کو جائز نہ سمجھے، اس کی حرمت کو مانتا ہو اور اس کے ارتکاب پر شرمندہ ہو تو اس کا حکم یہی ہے کہ یہ کُفرِ عملی ہے مگر اس کا کرنے والا ملت سے خارج نہ ہوگا۔ دُنیا میں اسلامی احکام و معاملات اس پر جاری ہوں گے۔ آخرت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں اس آیت میں قاتلِ مومن کی جو سزا بیان ہوئی ہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہے، اللہ کی لعنت ہے، اس کی سزا جہنم ہے، جہنم میں اس کا ڈیرا ہے اس کے لیے اللہ کے یہاں عذابِ عظیم ہے اس کی روشنی میں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قاتلِ مومن کی توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر خود صحابہ و سلف سے اختلاف منقول ہے۔

ایک جماعت کی رائے ہے کہ سورۃ فرقان کی

والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون و من یفعل ذالک یلق اثاماً یضاعف لہ العذاب یوم القیامۃ و یخلد فیہ مھانا الا من تاب و آمن و عمل عملاً صالحاً فاولئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنات۔

اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے اور زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو بھی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جاتے گا، ہاں جو توبہ کرے، ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے۔ یہی ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے تبدیل کر دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سارے گناہوں کی طرح قتل نفس کے مرتکب کی توبہ بھی مقبول ہو سکتی ہے لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس سے بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ جو مسلمان مسلمان کو قتل کرے اس کی توبہ مقبول نہیں ہے وہ فجزاءہ جہنم خالداً کے معنے یہی کرتے ہیں کہ لا توبۃ لہ اس کی توبہ نہیں ہے۔ اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباس سے الا من تاب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ یہ آیت مکی ہے، سورۂ نسآء مدنی ہے۔ اس کی آیت من یقتل مومناً نے اسے منسوخ کر دیا لہٰذا قاتل مسلم کی قبولیت توبہ کا اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ صحیح مسلم کی روایت میں زیادہ تفصیل آئی ہے کہ جب سورۂ فرقان کی آیت اتری تو مشرکین مکہ نے کہا کہ ہم تو یہ سب کام کر چکے ہیں اب مسلمان ہوئے بھی تو نجات کیوں کر ملے گی، اس پر یہ آیت اتری الا من تاب و آمن یعنی ہاں لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا، اللہ اس کی برائیاں مٹا دے گا لیکن من یقتل والی آیت مشرکین کے لیے نہیں ہے مسلمانوں کے لیے اتری ہے یعنی جو شخص مسلمان ہونے کے باوجود مسلمان کو قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے اور اس کے لیے توبہ نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ عبداللہ بن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے طاقتور نظر آتا ہے۔

اولاً اس لیے کہ زیر تفسیر آیت کا منطوق عدم قبولیت کے لیے ظاہر و نص ہے۔ خالداً فیھا و غضب اللہ و لعنہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور منطوق مفہوم پر مقدم ہے جب تک اس کے خلاف کوئی سبب قوی موجود نہ ہو۔

ثانیاً یہ کہنا کہ سورۂ فرقان کی آیت نے اسے منسوخ کر دیا صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ سورۂ فرقان مکی ہے اور یہ سورت نسآء مدنی ہے۔ خود ابن عباس بتاتے ہیں کہ یہ سورت نزلت فی آخر ما نزل نزول کے اعتبار سے آخری ہے اور ظاہر ہے کہ ناسخ کے لیے زمانی تقدم ضروری ہے۔

ثالثاً دونوں آیتوں میں حکم مشترک نہیں ہے۔ دونوں کا منشا الگ الگ ہے۔ نسخ اگر ہو سکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہو سکتا ہے جیسا کہ ابن عباس نے کہا یعنی عام اور خاص کا

نسخ سورۃ فرقان کی آیت میں ذکر کفار کا ہے اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور چونکہ الایمان یھدم ما قبلہ یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کر دیتا ہے اس لیے جب شرک سے توبہ ہو سکتی ہے تو قتل نفس سے کیوں نہیں ہو سکتی۔ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے، ان میں کون تھا جس نے خود مسلمانوں سے قتال نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ الا من تاب کے بعد آمن کا لفظ بھی موجود ہے۔ یعنی توبہ کی اور ایمان لایا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے نہ کہ مومن کی توبہ معصیت بعد از اسلام۔

غرض کہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن عام طور پر علماء نے دوسرے مذہب کو اختیار کیا یعنی قبولیت توبہ کو۔ وہ فرماتے ہیں کہ قاتل مومن کا معاملہ بڑا ہی سخت ہے لیکن توبہ قبول ہو سکتی ہے اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے بخش دے چاہے نہ بخشے۔ اس میں شک نہیں کہ احتیاط حکم امید ہی میں ہے نہ کہ یاس و قنوط کے پیام میں یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کے حکم کا عموم بڑا ہی امید افزا ہے اور اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو کوئی شک نہیں کہ جمہور کا مذہب ہی محتاط معلوم ہوتا ہے۔ موضوع کے تمام پہلوؤں پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

قتل مومن کی دوسری صورت

قتل مومن کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کو حلال سمجھے اور اس پر نادم و متاسف نہ ہو۔ مثلاً کوئی مسلمان فوج ہو، وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہے مسلمان سامنے ہوں گے تو انہی سے لڑیں گے یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ ہمارے مالکوں کا حکم یہی ہے ہم نے ان کا نمک کھایا ہے اس لیے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے یعنی اگر کوئی نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل کر دو تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تو اس صورت میں تمام امت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً اور حتماً کافر ہے یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً وہی ہو گا جو تمام کفار و مشرکین کا ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حقدار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے یہ حکم خاص مسئلہ پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ ہر محلل حرام غیر ماول کے لیے یہی حکم ہے۔

قتلِ مومن کی تیسری صورت

قتلِ مومن کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح و نصرت کے لیے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان کی اعانت کرے اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے یہ صورت اس جرم کے کفر و عدوان کی انتہائی صورت ہے اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی اشد حالت ہے جس سے زیادہ کفر و کافری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا کے وہ سارے گناہ، ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں جو مسلمان جسم دُنیا میں کر سکتا ہے یا ان کا وقوع دھیان میں آ سکتا ہے سب اس کے آگے ہیچ ہیں جو مسلمان اس کا مرتکب ہو وہ قطعاً کافر ہے اور بدترین قسم کا کافر، اس کی حالت کو قتلِ مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا۔ اس نے صرف قتلِ مسلم ہی نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنانِ اسلام کی اعانت و نصرت کی ہے اور بالاجماع اور بالاتفاق کُفرِ صریح اور مخرج عن الملت ہے۔ جب قرآن ایسی صورت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقہ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتا تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور اہلِ ایمان کے خلاف تلوار اٹھانے کے بعد کیونکر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے [1]

---

[1] مسئلہ خلافت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًاۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَاؗ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ
اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْاؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿٩٤﴾

مسلمانو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تمہیں اچھی طرح چھان بین کر لینی چاہیے جو کوئی تمہیں سلام کرے تو یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو کیا تم دُنیا کے سر و سامان زندگی کے طلب گار بنتے ہو، اگر ایسا ہے تو اللہ کے پاس بہت غنیمتیں[۱۴۷] موجود ہیں۔ تمہاری حالت بھی تو پہلے ایسی ہی تھی پھر اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا تم لوگوں کے حال کی تحقیق کر لیا کرو[۱۴۸]، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔[۱۴۹]

غیر ملکی مسلمانوں کے تحفظ کی تلقین

ابتدائے اسلام میں اسلام علیکم کا لفظ اسلامی زندگی کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنے میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میرے پاس تمہارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا تم نہ مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو جس طرح فوج میں ایک لفظ شعار کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوتے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ مخالف فوج کے آدمیوں سے ممتاز ہوں۔ اسی طرح اسلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں اس شعار کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آجاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے السلام علیکم یا لاالٰہ الا اللہ کہتا مگر مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوتا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر ڈالتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کے متعلق تمہیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے تو قتل کر دینے میں اس کا بھی امکان ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے۔ بہرحال تمہارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

۱۴۷۔ مسلمانو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تمہیں اچھی طرح چھان بین کر لینی چاہیے اور جو کوئی تمہیں سلام کرے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ تم دنیا کے سرد سامان زندگی کے طلب گار

بنتے ہو اگر ایسا ہے تو اللہ کے پاس بہت غنیمتیں موجود ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کو ایک قوم پر جہاد کے لیے روانہ کیا۔ اس قوم میں ایک شخص مسلمان تھا جو اپنا مال و اسباب اور مواشی ان میں سے نکال کر الگ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسلمانوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کافر ہے اپنی جان اور مال بچانے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اس لیے اس کو مار ڈالا اور اس کے مواشی اور اسباب سب لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ اور تاکید کی گئی کہ جب تم جہاد کے لیے سفر کرو تو تحقیق سے کام لو بے سوچے سمجھے کام مت کرو۔ جو تمہارے سامنے اسلام ظاہر کرے اس کے مسلمان ہونے کا ہرگز انکار نہ کرو، اللہ کے پاس بہت کچھ غنیمتیں ہیں ایسے حقیر سامان پر نظر نہ کرنی چاہیے۔[1]

شیخ الاسلام نے جو واقعہ پس منظر کے طور پر پیش فرمایا ہے وہ سنن ترمذی میں ہے۔ صرف یہی نہیں اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن کو شارحین قرآن نے اس آیت کے تحت پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایک واقعہ بخاری نے مختصراً اور بزار نے بھی مفصلاً نقل کیا ہے۔ پس منظر خواہ کچھ ہو آیت میں مسلمانوں کو یہ قانونی ہدایت ہو رہی ہے کہ جب تم وطن سے باہر جہاد میں ہو تو چھان بین کیے بغیر محض شک و شبہ کی بنا پر قتل میں جلد بازی نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کافر کے خیال میں کسی مسلمان کو قتل کر دو۔ امام رازی نے یہ بات برمحل لکھی ہے کہ آیت کا منشا یہ ہے کہ مومن کے قتل سے قطعاً بچ کر رہو۔ تحقیق و احتیاط ہر حال میں واجب ہے۔ سفر جہاد کی قید صرف اس لیے ہے کہ آیت قرآنی کے نازل ہونے سے پہلے سفر جہاد میں ایسے واقعات پیش آ چکے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت اسامہ کی روایت ہے کہ ان کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو الحرقہ کی طرف ایک فوجی مہم کے لیے روانہ کیا۔ لڑائی میں اسامہ نے ایک آدمی پر حملہ کیا ساتھ ہی ایک انصاری حملہ آور ہوا۔ اسامہ کہتے ہیں کہ جب میری تلوار اس کی گردن پر چمکی تو وہ پکار اٹھا لاالٰہ الا اللہ میں نے کچھ پروا نہ کی اور قتل کر ڈالا لیکن کلمہ کی صدا سن کر انصاری نے تلوار روک لی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو نہایت ناراض و غمگین ہوئے اور فرمایا اقتلتہ بعد ما قال لا الٰہ الا اللہ تو نے اسے قتل کر دیا باوجودیکہ وہ لاالٰہ الا اللہ کہہ چکا تھا، میں نے عرض کیا انما کان متعوذا وہ تو محض اس نے میری تلوار سے بچنے کے

[1] افادات شیخ الاسلام

لیے کہا تھا، فی الواقع مسلمان نہ ہوا تھا لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم برابر یہی جملہ دہراتے رہے کہ تو نے باوجود لا الٰہ الا اللہ کہنے کے قتل کر ڈالا، یہاں تک کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حزن و ملال اور اس واقعہ کا تاثر دیکھ کر مجھے اس قدر ندامت ہوئی کہ میرے دل نے کہا کاش آج کے دن سے پہلے میں مسلمان نہ ہوا ہوتا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور انور نے اسامہ سے کہا کہ تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ واقعی دل سے اقرار کیا ہے یا نہیں یعنی جب زبان سے یہ کلمہ نکلا تو اس کا احترام واجب ہو گیا خواہ تلوار کے ڈر سے کہا ہو یا سچے دل سے اقرار کیا ہو۔ دل کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ یہی واقعہ صحیح مسلم میں جندب بن عبداللہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور اس میں کچھ اضافہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ سے کہا قیامت کے دن جب یہ شخص لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ تیرے سامنے آئے گا تو اس وقت تو کیا کرے گا؟ یعنی اللہ سبحانہ کو کیا جواب دے گا، اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ میرے لیے دعا کیجئے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہی کہتے رہے کہ قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللہ کا دعویٰ ہو گا تو تم کیا جواب دو گے؟ اور اس جملے کے سوا کوئی بات نہ فرمائی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت مقداد بن عمرو الکندی نے دریافت کیا کہ اگر ایسا ہو کہ ایک کافر سے مقابلہ ہوا اور وہ تلوار میرے ہاتھ پر اس طرح مارے کہ ہاتھ کٹ جائے پھر الگ ہو کر کہے کہ میں اللہ پر ایمان لے آیا تو یہ کہنے کے بعد اسے قتل کر دوں یا نہ کروں فرمایا لا تقتلہ، مت قتل کرو۔ حضرت مقداد نے کہا اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہے اور اس کے بعد اسلام لانے کا اقرار کیا پھر کیوں نہ اس سے بدلہ لے لوں۔ فرمایا جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن جب کلمہ توحید کا اقرار کر لیا تو پھر قتل نہ کرو۔ اقرار کرنے سے پہلے وہ کافر تھا اور تو مسلمان۔ لیکن اگر تو نے اقرار کے بعد اسے قتل کر دیا تو وہ تیری جگہ ہو جائے گا اور تو اس کی جگہ۔ یہ واقعات تشریح و تفسیر ہیں لا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومناً کی۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی جنگ کا مقصود فتوحات حاصل کرنا اور مال غنیمت جمع کرنا نہ تھا بلکہ اصل مقصد جیسا کہ واضح طور پر پہلے بیان ہو چکا ہے اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور مظلوم مسلمانوں کو کفار کے پنجۂ استبداد سے چھڑانا تھا۔ جب اصل مقصد یہ تھا تو اس کے لیے ہر خطرہ گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن یہ بات کیسی گوارا کی جا سکتی تھی کہ کسی مسلمان کی جان خطرے میں پڑے۔ سو اگر جب قرآن میدان جنگ میں ایک مشرک دشمن کا کلمہ پڑھ کر جنگ کی حالت میں قتل ہو جانا پسند نہیں کرتا تو پھر ان مسلمانوں کو

قتل کرنے کی کب اجازت دے سکتا ہے جن کی ساری زندگیاں اسلام و ایمان میں بسر ہوئی ہیں۔ اللہ اکبر یہ حقیقت کتنی بلند ہے جس کا اظہار قرآن کر رہا ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ حملہ آور لڑائی کے گھمسان میں اگر جان بچانے کے لیے بھی کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل نہ کرو۔

ایمان میں زبانی اقرار کی حیثیت

دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام پر ہو کبھی اپنے حریف پر اعتماد نہیں کر سکتا اور پھر میدان جنگ میں تو ایسا ممکن ہی نہیں۔ یہ قرآن ہے جو دعوت دے رہا ہے کہ تم اپنے مدِ مقابل اور حریف کی زبان پر بھی اعتماد کر لو اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ قرآن اخلاق عالیہ کا اوّلین معلم ہے وہ کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک شخص کو بلاوجہ جھوٹا قرار دے یا اس کے متعلق کسی اندرونی کمزوری کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے وہ اگر جھوٹ کہہ رہا ہے لا الٰہ الا اللہ، تو تم یہ مت کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے یہاں حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں یہ بات خوب لکھ گئے کہ :

> اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی ہی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم سب کو یکساں طور پر ہو سکے۔ اگر خدا کے رسول کے علم پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً منافقین کا گروہ کفار میں شمار ہوتا اب اگر ان کو قتل کیا جاتا تو ان کو ناحق یہ بدنام کرنے کا موقعہ مل جاتا کہ آپ اپنے ہمنواؤں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کلمہ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام کے قبول کرنے کا معیار قرار دے دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کا دارومدار رکھ دیا گیا۔ (کتاب الایمان)

فقہاء کی اصطلاح میں اسی کو اقرار باللسان کہتے ہیں۔ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا ہے؟ ایک جماعت رکن کہتی ہے دوسری جماعت شرط کہتی ہے۔ رکن ہو یا شرط یہ تو قانونی موشگافیاں ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ فقہاء نے ایمان کی تعریف میں اقرار کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ جو تصدیق قلبی، زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ جب زبان کے لیے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا تو اب انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو گی۔ حافظ ابن تیمیہ نے اس بات کو اس طرح سمجھایا ہے کہ جب تک اقرار نہ ہو ہمارے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ اس کے قلب میں حقیقتہً تصدیق موجود ہے لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے

باوجود بھی اقرار نہیں کرتا تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اسے تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان کو ایمان کا جزو قرار دیا جائے۔

بہرحال اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ جس طرح اسلام پر جبر و اکراہ کرنا صحیح نہیں ہے اسی طرح کسی کے اسلام میں بلاوجہ شک وشبہ پیدا کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ تم مسلمان ہونے پر کسی کو مجبور نہ کرو لیکن اگر کوئی شخص از خود مسلمان ہوتا ہے تو بے وجہ اس کے اسلام کو شک کی نظر سے بھی نہ دیکھو گویا اسلام کے معاملہ میں کسی پہلو بھی قرآن نے تشدد پسند نہیں کیا۔ کوئی اسلام لاتا ہے تو بسروچشم اسے قبول کرلو اور نہیں لاتا تو اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ کیا اس سے بڑھ کر آزادیٔ رائے کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے۔

مالِ غنیمت کا حصول مقصدِ جہاد نہیں

آیت میں تبتغون عرض الحیاۃ الدنیا میں اشارہ کردیا کہ تمہاری محنتوں اور کوششوں کا پیشِ نظر سرمایہ کی فراہمی نہیں ہے۔ تمہیں سامانِ دنیا کے طالب کی حیثیت سے میدانِ جہاد میں نہ آنا چاہیے بلکہ طالبِ رضائے خداوندی بن کر اس میدان میں جانا چاہیے۔ تمہاری تقدیریں نبوت کے علم وعمل کے اپنانے، اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے، ان کی سیرت کی کاپی کرنے سے وابستہ ہیں۔ سرمایہ و دولت تمہاری مشکلات کا حل نہیں ہے۔ عرب جاہلیت میں دستور تھا کہ لڑائی میں جو مال جس کے ہاتھ آتے وہ اسی کا ہے۔ رومیوں میں بھی ایسا ہی دستور تھا۔ اور آج کل بھی یورپ کی تمام قوموں میں ایسا ہی قانون رائج ہے۔ جس شہر یا قلعہ کو فوج حملہ کرکے فتح کر لیتی ہے ایک خاص وقت تک لوٹنے کا اسے حق ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں انگریزی فوج نے سرنگاپٹم، بھرت پور اور حیدرآباد (سندھ) کو بے دریغ لوٹا اور ۱۸۵۷ء میں جب دہلی فتح ہوئی تو سات دن تک فوجیوں کو لوٹ مار کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن قرآن نے یہ حکم دے کر کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے سرکار کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع و حرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔ اس آیت میں بھی اس پر متنبہ کیا ہے کہ مالِ غنیمت تمہارا مطمحِ نظر نہیں، تمہیں تو خدا کے پاس اجر و ثواب کے غنائم پر نظر رکھنی چاہیے جس کے اللہ کے پاس بڑے ذخیرے ہیں۔

صحابہ کرام کی ایمانی تربیت

۱۴۸ا۔ تمہاری حالت بھی تو پہلے ایسی ہی تھی پھر اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا تم لوگوں کے حال کی تحقیق کر لیا کرو۔ تم ایسے ہی تھے اس سے پہلے دنیا کی غرض سے ناحق خون کیا کرتے تھے لیکن اب مسلمان ہو کر ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے بلکہ جس پر مسلمان ہونے کا احتمال بھی ہو تو اس سے بچو یا یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے شروع اسلام میں تم بھی کافروں کے شہر میں رہتے تھے۔ تمہاری مستقل حکومت اور مستقل بودوباش نہ تھی تو جیسا اس حالت میں تمہارا اسلام معتبر سمجھا گیا اور تمہارے جان و مال کی حفاظت کی گئی ایسا ہی اب تم کو بھی اس طرح کے مسلمانوں کی حفاظت لازم ہے، بلا تحقیق ان کو قتل نہ کرو۔ احتیاط و غور سے کام کرنا چاہیے[1] مطلب یہ ہے کہ ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے اپنے اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے اور تمہارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت نہ تھا اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں ہیں ان کے ساتھ تم نرمی اور رعایت سے کام نہ لو[2]

بتایا یہ جا رہا ہے کہ تم روزِ اول سے ایسے نہ تھے ایک وقت تھا جب قریش کی طاقت مقابلہ پر تھی اور تمام ملک میں تمہارے خلاف آگ لگا دی تھی اور اسلام کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے اس وقت اسلام کو اپنانا اور نبوت پر ایمان لانا اسی کا کام تھا جو موت سے نہ ڈرتا ہو، جو اپنے عقیدے اور یقین کے لیے آگ میں کودنے اور انگاروں میں لوٹنے کے لیے تیار ہو، جو دنیا کی تمام ترغیبات سے منہ موڑ چکا ہو، یہ اللہ کا احسان تھا کہ اس نے تمہیں ایمان کے میدان میں قدم بڑھانے کی توفیق دی اور تم نے لا الٰہ الا اللہ کا آوازہ قبول کیا۔ قرآن کی غذا تم کو ملی ایمان کے ذریعے تمہاری تربیت ہوئی دوسروں کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لو اور کسی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے خوب حقیقت حال معلوم کر لو۔ گویا یہ کہہ کر قرآن نے مومن کی جان کے احترام کی آخری حد بتا دی کہ عین میدانِ جنگ میں بھی اگر کوئی اظہارِ اسلام کرے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

صحابہ کرام کے ایمان و عمل کی نگرانی

۱۴۹۔ سو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر اعمال اور دلی اغراض سب پر مطلع ہے تو اب جس کو قتل کرو محض اللہ کے حکم کے موافق قتل کرو اپنی کسی غرض کا اصلاً دخل نہ ہو اور یہ بھی مقصد ہے کہ اگر کوئی کافر فقط اپنی جان و مال کے خوف سے تمہارے روبرو اسلام ظاہر کرے اور دھوکا دے کر اپنی جان بچالے تو اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا مگر تم اس کو کچھ مت کہو یہ تمہارے کرنے کی بات نہیں ہے ہم دیکھ لیں گے۔[1]

یہ دراصل اولین مسلمانوں کی ایمانی تربیت کی منزلیں تھیں۔ ان ہی منزلوں سے گزر کر ان کے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ ان کو غنیمت کے موضوع پر ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں صحابہ کرام کی ایمانی تربیت و تکمیل کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن برابر ان کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس سے ان کو استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی ساری کروٹوں کی اللہ سبحانہٗ نگرانی فرماتے تھے۔ اسی نگرانی کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح تبدیل ہو گئیں جب بھی کوئی شخص لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لاتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہوتا۔ ایمان اس میں پیوست ہو جاتا۔ یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون و روح کی طرح دوڑ جاتا۔ جاہلیت کے جراثیم کو ختم کر دیتا اور اس کی جڑوں کو اکھاڑ دیتا، دل و دماغ اس کے فیضان سے معمور ہو جاتے۔ یہ ایمان ایک کامیاب نگرانی اور نفسیاتی تربیت تھی جو طالب علم کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ ارادی، محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی۔ تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سراغ نہیں ملتا۔ جو نفس کی ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی ہو۔

اگر کسی وقت کوئی چوک ہو جاتی اور کوئی غلطی سرزد ہو جاتی اور یہ چاہے میدانِ جنگ ہی ہوتا تو بھی ایمان سراپا سوال بن کر دربارِ نبوت میں ہوتا کہ حضرت اسامہ کے واقعہ میں پڑھ چکے ہو۔ دل کی پیاس چین نہ لیتی، پریشان کن خیالات کا سیلاب امنڈ کر آ جاتا۔ ہمارے سامنے مورخین نے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب وغریب واقعات پیش کیے ہیں جن کی نظیر اسلامی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ اس الٰہی نگرانی کا نتیجہ تھا جس کا قرآن نے ان اللہ کان بما تعملون خبیرا سے اعلان کیا ہے۔

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ
وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ
وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
ع ۱۳ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

اہل ایمان میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر جہاد کی سرگرمیوں میں حصّہ نہیں لیتے، اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں یکساں اور برابر نہیں ہیں۔[150] اللہ نے بیٹھنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑھایا ہے اور وعدہ اللہ نے سب سے بھلائی کا کیا ہے۔[151] لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھنے والوں کے مقابلے میں اجرِ عظیم

میں بزرگی دی ہے یعنی ان کے لیے اللہ کی جانب سے بڑے درجے ہیں اور رحمت ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔ ۱۵۲

فریضۂ جہاد اسلامی زندگی کی جان ہے

یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک مخصوص اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا ہے اور افرادِ انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویّہ تبدیل کریں لیکن قرآن اس بارے میں دیگر ادیان پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے کردار و عمل کی اس تبدیلی کا دائرہ جس کا مطالبہ ہر دین میں موجود ہے انسان کی خانگی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا۔ نیز اس نے اخلاق اور نیک عملی کے اصولوں اور مذہبی اقدار و غایات کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ حالانکہ دوسرے مذاہب نے نیکی اور حسنِ عمل کا صرف انفرادی اور معاشرتی تصور پیش کیا ہے اور اخلاقی اصولوں کو زیادہ سے زیادہ سماجی اور عائلی زندگی تک وسعت حاصل کرنے کا موقعہ دیا۔ اس کے برعکس اسلام اپنے پیرودں سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا ہے بلکہ انہیں عالمِ انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئتِ اجتماعی میں وہ بنیادی تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں صادق ہیں، جس حد تک انسان اپنی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی میں یہ تبدیلیاں پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے اسی حد تک اس کا ایمان ناقص رہتا ہے۔ غرض کہ اسلام صرف ایک طرزِ فکر نہیں ہے جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظامِ اجتماعی کے صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک مخصوص طریقِ عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ اس انقلاب و تبدیلی کی کوشش کو قرآن

کی زبان میں جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل اصول اور ایمان کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضہ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان والوں کی ایک ضروری یہ صفت قرار دیتا ہے کہ وہ راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ اسلام میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، مراقبہ، رہبان، اور الٰہیات کے فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی اور جزا و سزا کے اعتقاد کے ساتھ ان کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ اسی لیے اس آیت میں جہاد کا مقابل لفظ قعود استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی تغافل اور ترک فرض ہے۔

۱۵۰۔ اہل ایمان میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر جہاد کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں برابر اور یکساں نہیں ہیں۔ اس آیت میں غیر اولی الضرر کے لفظی معنے ہیں وہ جو تکلیف والے نہ ہوں یعنی معذور نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر عذر جہاد میں شریک نہ ہونے والے مسلمان اجر و ثواب میں ان مسلمانوں کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہو سکتے جو جہاد میں شریک ہیں۔ اس آیت میں تمام غیر معذور اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس کوئی عذر نہیں ہے پھر بھی اگر وہ جہاد کے لیے نہیں اٹھ رہے ہیں تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خدا کے یہاں اجر کے لحاظ سے ان کے برابر نہ ہوں گے جو آج خدا کی راہ میں جان و مال دونوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ سمجھایا جا رہا ہے کہ جس دعوت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور جس پر زندگی استوار کرنے کا تم سے مطالبہ ہو رہا ہے وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل ہے جس کا خمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا ہے جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ضرورت ہے اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ عالم انسانیت کا تصور کارفرما ہے۔ تم ایک نظام تمدن اور عالمگیر مقصد کے داعی ہو ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے ہو اور ایک جہانی اور عالمگیر مقصد کے علمبردار ہو۔ جہاد فی سبیل اللہ تمہارے اخلاص و اتقا کا پیمانہ ہے اور خدا کے اجر کی تقسیم اسی پیمانہ سے ہو گی۔ اگرچہ آیت میں جہاد سے مراد سیاق قرآنی کے قرینہ کی وجہ سے یہاں قتال ہی ہے لیکن جہاد کا مقابلہ قعود سے کر کے اشارہ کر دیا کہ جہاد اور قتال دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں کے ایک معنے نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام اور خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر

جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی قسموں میں سے ایک قسم قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں جہاد کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال۔ یعنی اپنی جان کے ذریعے جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا، جان کے ذریعے جہاد کرنا یہ ہے کہ اسلام کی حمایت کے لیے ہر قسم کی جانی تکلیف بے خطر اٹھائی جاتے یہاں تک کہ اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائی جانے، سولی پر لٹکائی جانے، نیزے سے چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔ مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ اسلام کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کو تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی غلط محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا راز یہی ہے۔

اس آیت میں صرف یہ بتایا ہے کہ جو لوگ معذور تو نہیں ہیں لیکن دین کے دوسرے مشاغل میں لگنے کی وجہ سے جہاد میں نہ جا سکے وہ بلا شبہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہیں جو میدانِ جنگ میں کام کر رہے ہیں۔

معذور قاعدین کا مجاہدین سے مقابلہ

۱۵۱۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑھایا ہے اور وعدہ اللہ نے سب سے بھلائی کا کیا ہے۔ پہلی آیت میں ان بیٹھنے والوں کا ذکر تھا جو بلا عذر جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ یعنی ان کو عذر تو کوئی نہ تھا مگر دین کے دوسرے مشاغل میں لگنے کی وجہ سے جہاد میں نہ جا سکے۔ اب اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ذاتی عذر کی وجہ سے میدانِ جنگ کی شرکت سے محروم رہے ہیں جیسے عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے اور جیسے حضرت عثمان غنیؓ اپنی اہلیہ کی بیماری کی وجہ سے حضور انورؐ کے کہنے پر جنگ بدر میں نہ جا سکے ان کے مقابلہ میں مجاہدین کا درجہ اونچا ہے یعنی درجہ عمل ورنہ بھلائی کا وعدہ اللہ کی جانب سے سب کے لیے ہے یعنی مجاہدین اور قاعدین دونوں کے لیے۔ کیونکہ جہاد کی نیت سب کی تھی مگر مجاہدین کو قاعدین پر ایک درجہ فضیلت ہے، اس لیے کہ یہاں نیت جہاد کے ساتھ عملِ جہاد بھی ہے۔ یہ معذور قاعدین وہ ہیں جو کسی عذر کی وجہ سے شریکِ جنگ نہ ہو سکے۔

یہاں ان اعذار کی تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے جن کی وجہ سے جہاد کی شرکت سے وہ مستثنیٰ ہوتے یہ تفصیل سورہ توبہ میں آئی ہے۔ وہاں بتایا ہے کہ اگر دفاع کے لیے نفیر عام ہو تو کن کن لوگوں کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے فرمایا ناتواں آدمی یعنی جو لوگ جسمانی طور پر مجبور ہوں، مثلاً بہت بوڑھے، اندھے، اپاہج دوسرے بیمار، تیسرے ایسے لوگ جو سفر کے لازمی اخراجات کے انتظام کی مقدرت نہ رکھتے ہوں۔ اس آیت میں ان ہی معذورین کا ذکر ہے ان ہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان سے اور مجاہدین سے اللہ نے الحسنیٰ کا یعنی اچھی جزا کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہاں مجاہدین کو ان کے مقابلہ میں صرف درجہ عمل میں برتری ہے۔ قرآن کا یہی اشارہ پاکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے کہ،

مدینہ میں کچھ لوگ ہیں، وہاں ہونے کے باوجود تمہارے ساتھ ہیں جتنا تم چل رہے ہو اور جتنی وادیاں تم قطع کر رہے ہیں سب میں تمہارے ساتھ ہیں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ تو یہاں نہیں مدینے میں ہیں فرمایا ہاں مدینہ میں ہیں مگر وہ خود نہیں رہے ان کو عذر نے نہیں آنے دیا۔

اس طرح کلا وعد اللہ الحسنیٰ سب کے بارے میں ہے خواہ پیچھے رہ جانے والے بغیر عذر کے کام سے رہے ہوں خواہ عذر کی بنا پر رہے ہوں اور خواہ آنے والے میدان جنگ میں آتے ہوں سب ہی سے اللہ نے جنت کا، ثواب جزیل کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز تفکر کی تبلیغ ان سب کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ساری ریاضتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جائیں۔ اگرچہ اس اعتبار سے سارے اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہیں کہ سب اسلام کے مخلص ہیں ان میں سے منافق اور اسلام کا بدخواہ کوئی نہیں ہے تاہم مجاہدین کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بلند ہے۔

حافظ ابن کثیر اور دوسرے شارحین قرآن نے کلا وعد اللہ الحسنیٰ سے یہ نکتہ خوب معلوم کیا ہے کہ جہاد فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں ان بیٹھنے والوں کا ذکر ہے جو جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورت میں میدان جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں، اگر فرض عین ہوتا تو بغیر عذر غیر اولی الضرر پر یقیناً عتاب ہوتا۔

فرض کفایہ، فرض عین اور جہاد

بعض ہدایات کے متعلق اسلام نے صراحتہً یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ اگرچہ افراد کے لیے ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی ہے لیکن پورے اجتماع کے لیے وہ فرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو افراد ان ہدایات کی تکمیل کے لیے ضروری وسائل اور استعداد رکھتے ہوں، ان کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کو بجا لائیں تاکہ متعلقہ اجتماعی مصلحت کا تحفظ ہو سکے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ حکم فرض کفایہ کہلاتا ہے اس کے تحت عموماً ایسے احکام آتے ہیں جن کا تعلق پورے اجتماع کے مفاد و مصالح سے ہے۔ ان مفادات و مصالح کا تحفظ ضروری ہے لہٰذا ان احکام کی تعمیل اور متعلقہ اُمور کا انجام پانا لازمی ہے۔ جہاد کی قسموں میں سے ایک قسم قتال ہے اور قتال کی دو صورتیں ہیں ہجوم اور دفاع۔ دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے یعنی جب تک دُنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے ضروری ہے کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع رہیں گے۔ فقہا کی اصطلاح میں اسی کے لیے فرض کفایہ اور فرض عین کی اصطلاحیں ہیں۔ یہی اعمال انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جس کو جماعتی فرائض اور شخصی فرائض کہا جاتا ہے۔ فرض کفایہ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بحیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں نہ کہ بحیثیت فرد و انفراد یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے کہ ان کا انتظام کریں۔ انتظام ہونا چاہیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر فرد بطورِ خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں پر سے اس وقت ساقط ہو گیا جیسے تجہیز و تکفین میت اور نمازِ جنازہ۔ البتہ عزمیت اسی میں ہے کہ ادائے فرض میں حصہ لیا جائے۔ فرائض کفایہ میں قرآن کا خطاب افراد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔

دوسری قسم اعیان کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہو سکتا جیسے پانچ وقت نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت یعنی ہجوم اور مقابلہ کا دائمی سلسلہ فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان اس میں حصہ لے، ہر عہد ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے

جو یہ فرض انجام دیتی ہے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ :

جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہو گئی تو باقی مسلمان ذمہ داری سے بری ہو گئے اور کوئی بھی اگر نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گنہ گار ہوں گے کیونکہ فرض سب پر ہے ۔

اور فتح الباری میں ہے کہ جہاد جیسا کہ مشہور ہے فرض کفایہ ہے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے :

جہاد کی یہ قسم یعنی قتال فرض کفایہ ہے لیکن نفس جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہے کسی کے لیے ہاتھ سے کسی کے لیے مال سے کسی کے لیے زبان سے اور کسی کے لیے دل سے ۔

یعنی جس وقت ایک گروہ ہاتھ اور تلوار سے مصروف جہاد ہو گا تو باقی مسلمانوں پر زبان ، مال اور دل سے ان کے لیے کوشش اور محنت فرض ہو گی ۔ مال و دولت والوں کا فرض ہو گا کہ مال سے مدد کریں ۔ ایسے ہی اقناع ، روضۃ الطالبین ، المغنی ، المحلی میں تصریحات ہیں ۔ یہ صورت تو اُس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ و ہجوم کی ہو گی ۔ دوسری قسم دفاع ہے ۔ یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں پر حملہ کا ارادہ کرے تو اس حملہ و تسلط کو ہر طرح کا مقابلہ کر کے روکنا یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ بالاتفاق فرض عین ہے ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ۔ ہدایہ میں ہے :

لیکن نفیر عام کی صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے

نفیر ، نفر سے بنا ہے نفر کے معنے ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے دُور جانے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع اور قیام کا وقت آ گیا تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے ۔ شیخ ابن الہمام لکھتے ہیں :

فرض کفایہ ہونے کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو اگر مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق ۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ گیارہ میں آ رہی ہے

مجاہدین کا اختصاصی مقام

۱۵۲ ۔ لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھنے والوں کے مقابلے میں اجر عظیم میں بزرگی دی یعنی ان کے

سلیے اللہ کی جانب سے بڑے درجے مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ بڑا ہی معاف کرنے والا مہربان ہے اس سے پہلے مسلمان کو نادانستگی اور چوک سے قتل کر دینے پر عتاب اور تنبیہہ فرمائی تھی اس لیے یہ احتمال تھا کہ کوئی جہاد کرنے سے رک جاتے کیونکہ مجاہدین کو ایسی صورت پیش آ ہی جاتی ہے اس لیے مجاہدین کی فضیلت بیان فرما کر جہاد کی رغبت دلائی گئی۔ خلاصہ ان آیتوں کا یہ ہے کہ لنگڑے، لنجے، اندھے، بیمار، معذور لوگوں کو تو جہاد کرنے کا حکم نہیں باقی سب مسلمانوں میں جہاد کرنے والوں کے بڑے درجے ہیں حق تعالیٰ بڑے غفور رحیم ہیں جہاد کرنے والوں کے بارے میں اجر و مغفرت و رحمت کے جو وعدے فرماتے ہیں وہ ضرور پورے فرمائے گا یا یہ کہ مجاہد کے ہاتھ سے نادانستگی میں اگر کوئی مسلمان قتل ہو گیا تو حق تعالیٰ معاف فرمائے گا، اس اندیشہ سے جہاد سے مت رکو۔ [1]

اصل میں جس مقصد کے لیے اہل ایمان کی جدّوجہد مطلوب ہے وہ اللہ کے اس قانون کا نفاذ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم و عمل کی صورت میں لے کر آئے اور جس کے غلبہ میں مسلمان مامور ہیں۔ جس کی مخالف طاقتیں اور دعوتیں دنیا میں ہمیشہ رہیں گی یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اس کی بکثرت قسمیں ہیں جن میں سے ایک جنگ بھی ہے۔ یہ اس کی بعض اوقات سب سے اعلیٰ قسم ہو جاتی ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ اسلام کے مقابلے میں کوئی برابر کی حریف طاقت باقی نہ رہے جو خواہشات اور طبیعتوں کو مخالف سمت کی طرف کھینچے اور بہت سے انسانوں کے لیے کفر و اسلام کے درمیان کشمکش پیش آتے۔

اس جہاد کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت کے بارے میں جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس کو گہری واقفیت ہو تاکہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی کفر ظاہر ہو اس کو پہچان سکے۔ یقیناً ہر مسلمان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کفر و جاہلیت سے گہری واقفیت رکھے اور اس کے مظاہر، صورتوں اور رنگوں کو پہچانتا ہو لیکن بلاشبہ اسلام کی رہنمائی اور کفر و جاہلیت کے خلاف اسلامی لشکر کی قیادت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عام اور متوسط مسلمانوں سے زیادہ کفر کو پہچانتا ہو۔

آیت میں مجاہدین کی برتری، ان کے مقام کی بزرگی بتانے کے لیے درجات کی تعبیر کے ساتھ مغفرت اور رحمت کے الفاظ آئے ہیں۔ آخرت کے درجات کا نقشہ بخاری و مسلم میں حضرت

[1] افادات شیخ الاسلام

ابو سعید خدری کے حوالہ سے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کیا ہے۔

اللہ سبحانہ نے مجاہدین کے لیے سو درجے تیار کیے ہیں، ہر دو درجہ کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان۔

جیسا کہ ابن جریر نے بتایا ہے کہ یہاں درجات سے بھی درجاتِ آخرت مراد ہیں کیونکہ یہ اجرِ عظیم کی تفسیر بن کر آئی ہے۔ ان درجات کا مصدر ان مجاہدین کی وہ قوتِ ایمان اور اپنی راحت و عیش کے مقابلے میں رضائے الٰہی کی طلب، ذاتی چاہتوں پر عمومی مصالح کی ترجیح ہے۔ ان کے اخلاقی، روحانی، دینی و علمی وسائل، صالح تمدن کے وجود میں لانے میں مددگار تھے۔ ان کے اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور ان کی اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظامِ حیات کے لیے میزان کا درجہ رکھتے تھے چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل کے باوجود جرائم و بداخلاقیوں کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے۔ یہ مغفرت و رحمت ہی کا اثر تھا کہ اس کے نتیجہ میں ایک ایسا معیاری معاشرہ، معیاری تمدن، معیاری تہذیب، معیاری نظامِ سیاست، معیاری نظامِ معیشت اور معیاری دور وجود میں آیا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکا اور اس سے زیادہ مبارک اور پُربہار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ
قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ
وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝
إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا
يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ فَأُولَٰئِكَ عَسَى
اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝ وَمَن يُهَاجِرْ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ
مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ
وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ۱۴ ع ۱۱

جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب ان کی روح فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے[۱۵۳] وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں بے بس تھے، فرشتے کہتے ہیں

کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے[۱۵۴]۔ ہاں وہ جو مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے واقعی بے بس ہیں نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ کوئی اور راستہ نکال پاتے ہیں تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف کر دے اور اللہ بڑا بخشش کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے[۱۵۵]۔ اور جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت آرام و آسائش کی جگہ اور فراخی پائے گا اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ و رسول کی خاطر ہجرت کے ارادے سے نکلے پھر اس کو موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے یہاں مقرر ہو گیا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے[۱۵۶]۔

ہجرت ایمان کا بنیادی تقاضا ہے

گزشتہ رکوع میں مجاہدین کا ذکر تھا اب اس رکوع میں مہاجرین کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب دشمنانِ حق کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو قدرتی طور پر ملک عرب دو حصوں میں بٹ گیا۔ دارالہجرت اور دارالحرب۔ دارالہجرت مدینہ تھا جہاں مسلمان ہجرت کرکے جمع ہو گئے تھے اور دارالحرب ملک کا وہ حصہ تھا جو دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ دارالحرب میں جو مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ اعتقاد و عمل کی آزادی سے محروم تھے، انہیں ہمیشہ دشمنوں کا ظلم وستم سہنا پڑتا تھا۔ اسی لیے انہیں حکم دیا گیا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ اگر باوجود استطاعت کے نہیں کریں گے تو اپنی کوتاہی عمل کے لیے جواب دہ ہوں گے۔

اگر غور سے دیکھو تو اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔ دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا پہلا عہد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے شروع ہوتی ہے اور غار ثور کے دہانہ پر اس کی تکمیل ہے۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔ دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور کا دور دوسرا دور تھا کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی۔ اور ظاہری طاقت و حشمت کا سروسامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگ فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح عرب کی فتح کا اعلان عام تھی لیکن قرآن کی نظر میں اسلام کی زندگی کا اصلی دور دوسرا دور نہیں پہلا دور تھا وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں ہجرت سے استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں۔ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فتح تھی لیکن اگر ہجرت کے ذریعے مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کے فتح کے لیے راہ کیوں کر نکلتی۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ ہجرت تخم ہے اور اس کے بعد اسی کا برگ و بار ہے۔ ہجرت بنیاد ہے اس کے بعد ستون و محراب ہے، ہجرت نشو ونما ہے اس کے بعد ظہور انفجار ہے۔ ہجرت اگر معنے اور حقیقت ہے تو اس کے بعد صورت و اظہار ہے، ہجرت روح ہے تو جہاد کی سرگرمیاں جسم ہیں، ہجرت کے بعد خواہ کچھ ہو لیکن اولین بنیاد و استعداد کی عظمت ہجرت کو حاصل ہے اس لیے ان آیات میں قرآن نے ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ حالانکہ ایک دارالاسلام

وجود میں آچکا تھا۔ فرمایا ہجرت نہ کرنے والے اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں ۔

۱۵۳- جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب ان کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے ؟ مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان رہتے تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے ۔ درآنحالیکہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا ۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلہ میں اس نیم کفر و نیم اسلامی زندگی پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی بلکہ محض اپنے نفس کے عیش ، اپنے خاندان ، اپنی جائداد و املاک اور اپنے دنیوی مفادات سے محبت تھی جسے انہوں نے اپنے دین پر ترجیح دی ۔ ان سے فرشتے قبض روح کے بعد دریافت کریں گے کہ دارالحرب میں رہ کر کن مشاغل میں لگے ہوئے تھے کہ ہجرت نہ کر سکے ۔

عصمت موثمہ اور عصمت مقومہ

اسلام قبول کرنے کی پہلی برکت یہ ہے کہ اس کی حلقہ بگوشی کے بعد ہی جان و مال کی عصمت فوراً حاصل ہو جاتی ہے ۔ فقہا کے نزدیک اس عصمت کی دو قسمیں ہیں عصمت موثمہ اور عصمت مقومہ ۔ جس کے ازالہ سے صرف گناہ ہو وہ موثمہ کہلاتی ہے اور جس کے ازالہ سے گناہ کے ساتھ دیت بھی لازم ہو وہ مقومہ کہلاتی ہے ۔ پہلی عصمت اسلام حاصل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری دارالاسلام میں سکونت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> میں ہر مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کی جماعت میں رہے لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیوں فرمایا کہ دونوں کو اتنے فاصلے پر رہنا چاہیے کہ ایک کو دوسرے کے آگ کی روشنی نظر نہ آئے ۔ (ابوداؤد)

اس لحاظ سے ایک مسلمان اگر دارالحرب میں رہتا ہے تو اس کو عصمت موثمہ تو حاصل ہے مگر عصمت مقومہ حاصل نہیں ہے اسی لیے جیسا کہ پڑھ چکے ہو اگر ایک مسلمان دارالحرب میں رہتا ہے اور وہاں قتل کر دیا جائے تو اس کے قاتل کو صرف گناہ ہوگا مگر اس پر خون بہا نہ آئے گا ۔ عصمت مقومہ اسی وقت حاصل ہوگی جبکہ اسلام لانے کے ساتھ سکونت دارالاسلام کی اختیار کرے یعنی دارالحرب سے ہجرت کرے ۔

دارِ حرب سے ہجرت کا حکم

۱۵۴۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں بے بس تھے فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے بس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ کیا اللہ کی زمین میں وسعت سمٹ چکی تھی کہ تم اس لیے ہجرت نہ کرتے تھے۔ اس بات کا اشارہ ہے کہ دارالحرب کی سکونت مسلمان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یعنی سمجھایا یہ گیا ہے کہ جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا کیوں نہ اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین میں منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن تھی۔ فقہا نے لکھا ہے کہ جب ایک ملک میں رہ کر اسلامی زندگی پر چلنا ممکن نہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک ہے جہاں پوری اسلامی زندگی پر عمل ہو سکتا ہے تو اس دوسرے ملک کی طرف ہجرت کر جانا واجب ہے الجصاص نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ زمینِ کفر سے اسلامی ملک کی طرف ہجرت واجب ہے۔

ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنے ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت وصداقت کے کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنی دنیوی محبوبات و مالوفات کو ترک کر دے مثلاً دولت کو آرام و راحت کو اعزّ و اقربا کے قرب کو وطن و مکان کو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسُول اور ان کے پیروؤں کو قیامِ حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی انی مھاجر الی ربی اور انی ذاھب الی ربی۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل وعیال، مال ومتاع، دوست واحباب ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت والفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہے اور زیادہ تر ہجرت کا اطلاق تارکینِ وطن ہی پر کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری کی سب سے پہلی حدیث ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسُول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسُول کے لیے ہے اور جس نے اس لیے ہجرت کی کہ دُنیا کمائے یا شادی رچائے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہے۔

لیکن یہ بات واضح رہے کہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی

خطہ پر دارالاسلام کا وجود بھی ہو اور اس کی طرف ہجرت کرنا ممکن بھی ہو۔ لیکن اگر بدنصیبی سے صفحۂ ہستی پر دارالاسلام کا وجود ہی نہ رہے یا مسلمانوں کی مسلسل غفلت کی وجہ سے دارالحرب میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ دارالاسلام میں ان کی کھپت کا امکان ہی نہ ہو تو پھر ہجرت کا وجوب نہیں بلکہ ایسے حالات میں مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہی ماحول میں اسلامی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جس میں آئینِ اسلامی اور دستورِ نبوت پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو جائے اور جب تک اسلامی نظامِ حیات پر عمل پیرا ہونے میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی باقی ہے اس وقت تک لگاتار اور مسلسل کوشش جاری رکھیں۔ مسلمانوں کی تعداد کا اضافہ اس ذمہ داری کو اور زیادہ وزنی بنائے گا۔ منتشر افراد اور اشخاص آج کے زمانے میں مستضعفین فی الارض ہونے کا عذر کر سکتے ہیں لیکن مقتدر اور بڑی جماعتوں کے لیے یہ عذر کرنا بھی غلط ہے اس لیے ان کا ایک ہی نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ ایک کافرانہ زندگی سے نکل کر ایسی زندگی کے لیے کوشش کریں جس میں اسلامی دستور پر عمل پیرا ہونے کی انہیں پوری پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ یہ مقصد اگر دفعۃً حاصل نہ ہو سکے تو بتدریج حاصل کریں لیکن اس کے بغیر کسی ناتمام اور ادھوری آزادی پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا ناقابلِ عفو جرم ہے۔

ہجرت سے معذور مسلمان

۱۵۵۔ ہاں وہ جو مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے واقعی بے بس اور مجبور ہیں نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ کوئی اور راستہ نکال پاتے ہیں تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف کر دے اور اللہ بڑا بخشش کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ یعنی جو لوگ ضعیف ہیں اور عورتیں اور بچے کہ وہ نہ ہجرت کی تدبیر کر سکتے ہیں نہ ان کو ہجرت کا راستہ معلوم ہے وہ قابلِ معافی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس ملک میں کھلا نہ رہ سکیں وہاں سے ہجرت فرض ہے اور سوائے ان لوگوں کے جو بالکل معذور ہیں اور کسی کو وہاں پڑا رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے معاملہ میں معذور صرف وہ لوگ ہیں جن کے ترکش میں ہجرت کے لیے تدبیر کا کوئی تیر نہیں ہے بے کسی اور بے بسی کے عالم میں ہیں کہ حالات کے غلط دھارے نے ان پر ساری راہیں بند کر دی ہیں خواہ یہ محتاجی اور مفلسی کی وجہ سے ہو یا راہ سے بے خبر ہونے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کی وجہ سے ہو یا جسمانی کمزوری اور بیماری اس کا سبب ہو۔ عورتوں اور بچوں کا ذکر تبعاً کیا گیا ہے تو ایسے لوگ فی الواقع معذور ہیں۔ اُمید ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو معاف کردے۔ غور طلب بات ہے کہ معذور قرار دینے کے باوجود یہ نہیں فرمایا کہ ایسی حالت میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ عجب نہیں اللہ ان لوگوں کو معاف کردے اس میں اشارہ ہے کہ ہجرت کا معاملہ اتنا عظیم ہے کہ اس کا معذور بھی مجرم ہی ہے لسے چاہیے کہ اس تگ ودو میں رہے کہ جب موقعہ ملے اس فرض کو ادا کرے۔

یہاں ہجرت کے عمل پر یہ زور دیا رہا ہے کہ اسلام کا سارا نظام اعلائے کلمۃ اللہ اور دین حق کے قیام کی سعی وطلب پر استوار ہے۔ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اسی غایت اصلی کے تابع ہیں کہ اللہ کی زمین پر بس اسی کی بندگی کی جائے۔ اور معبودان باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے۔ صدر اول کے مسلمانوں میں عمل ہجرت کی برکت سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے کر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی طلب و آرزو تھی۔ ان میں اسلام کے اخلاقی اقدار اور قرآن و سنت کے معیارِ خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران بنا کر اللہ کو راضی کرنے کی خواہش تھی۔ ان کی نمازوں میں روح تھی عبادات میں جان تھی اور اسلام کے سارے اجزا اس سے اپنی زندگی اور پرورش کا سامان حاصل کر رہے تھے۔ اس کے لیے وہ سارے مفادات، سارے منافع، سارے مصالح، برادری، خاندان، قوم اور ملک تک کو چھوڑ دیتے تھے۔ جب سے یہ مقصد نظروں سے اوجھل ہو گیا اسلامی زندگی کی ساری شاخیں مرجھا گئیں۔ غور کیجیے یہ بات کن لوگوں کے بارے میں کہی جا رہی ہے فاولٰئک عسی اللہ ان یعفو عنھم۔ صاحب روح نے مروزی میں عیاش بن ربیعہ، سلمۃ بن ہشام اور ولید بن الولید اور عورتوں میں ام فضل لبابہ بنت الحارث۔ ام عبداللہ بن عباس کے نام لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص و للہیت سے معمور تھیں ان کو کہا جا رہا ہے کہ معذور ہونے کے باوجود تم مجرم ہو، ہو سکتا ہے کہ اللہ معاف کردے۔

اسلامی زندگی کی خاطر ہجرت کی ترغیب

۱۵۶۔ اور جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت آسائش اور آرام کی جگہ اور فراخی پائے گا۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ و رسول کی خاطر ہجرت کے ارادے سے نکلے گا پھر اس کو

موت آجائے تو اس کا عمل ہجرت اللہ کے یہاں مقرر ہو گیا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس آیت میں ہجرت کی ترغیب اور مہاجرین کو تسلی دی جاتی ہے کہ جو شخص اللہ کے واسطے ہجرت کرے گا اور اپنا وطن چھوڑے گا تو اس کو رہنے کے لیے بہت جگہ ملے گی اور اس کی روزی و معیشت میں فراخی ہو گی۔ تو ہجرت کرنے میں اس سے نہ ڈرو کہ کہاں رہیں گے اور کیا کھائیں گے اور یہ بھی خطرہ نہ کرو کہ شاید راستہ میں موت آجائے تو اِدھر کے ہوں نہ اُدھر کے، کیونکہ اس صورت میں بھی ہجرت کا پورا ثواب ملے گا اور موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ وقت مقرر سے پہلے نہیں آسکتی [1]

اس آیت میں ہجرت کی راہ میں نکلنے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لیے اٹھ کھڑا ہو گا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا۔ یعنی رہنے کی بہت جگہیں ملیں گی اور معیشت کی فراخی اس کا استقبال کرے گی۔ گویا بتا دیا کہ وطن چھوڑنے سے یہ خیال نہ کریں کہ گھر سے بے گھر ہو جائیں گے اور پردیس میں تکلیف ہو گی۔ نہیں بلکہ ان کو گھر سے زیادہ آرام ملے گا کشادہ جگہ اور فراخ روزی ملے گی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ کفار سے دُور رہنے کا حکم صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ اسلامی معاشرت کُفر کے اثر سے متاثر نہ ہو۔ یہ خطرہ اسی مقام پر پیدا ہو سکتا ہے جہاں اسلام کو اقتدار و طاقت حاصل نہ ہو۔ باقی جہاں اسلام کو شوکت حاصل ہو وہاں عقلی اور نفسیاتی لحاظ سے تاثر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے من یہاجر فی سبیل اللہ کا منطوق بھی ہے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اور وہ مغلوبی اور مقہوری کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اس کے لیے نظامِ کُفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس زمین میں غالب کرنے اور نظامِ کُفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ ہر صورت میں دار الکفر کا قیام گناہ ہے۔ بلاشبہ ایسے ماحول میں اسلامی سپرٹ کو فنا کر دینے کے مترادف ہے اس لیے اگر علیحدہ ہونے کی طاقت نہ ہو تو کم از کم اس زندگی کی کراہت سے کسی وقت دل خالی نہ ہو اور صرف کراہت ہی نہیں بلکہ اس سے نجات پانے کا راستہ تلاش کرنا بھی زندگی کا نصب العین بنا لینا چاہیئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی دار الہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف آدمی ہجرت کے ارادے سے گھر سے نکل جائے خواہ راستہ میں اسے موت نے آپکڑا ہو اللہ پر اس کا اجر لازم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص صحیح مقصد سے ترکِ وطن کرے گا اور اللہ و رسول کی خوشنودی کی خاطر اپنے گھر سے نکل کھڑا ہو گا تو اگرچہ وہ منزل تک نہ پہنچ سکے اور راستہ ہی میں اس کو موت آپکڑے پھر بھی اللہ کے ذمہ اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ اگرچہ ابھی ہجرت کی تکمیل نہیں ہوئی لیکن اس کی نیت ہونے کی وجہ سے اس سے یہ وعدہ ہے کہ اس کو پورا صلہ عطا ہو گا۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی بشارت ہے جو کسی نیک کام کو نیک نیت سے شروع کر دیں اور اس کام کے پورا ہونے سے پہلے موت آجائے یا اچانک موت ہو جائے مثلاً سانپ کاٹ لے یا کوئی دشمن اس کو قتل کر دے یا سواری سے گر پڑے کسی بھی حادثہ کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا اجر عطا فرمائے گا۔

اگرچہ یہاں دار الحرب سے اپنے دین کی حفاظت کے لیے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے کا ذکر ہے لیکن کچھ اہل علم نے ہر وہ ہجرت جو طالب علم کے لیے ہو یا حج کے لیے ہو یا جہاد کے لیے ہو یا ایک ایسے شہر کی طرف ہو جس میں زہد و تقویٰ کے حصول کی امید ہو یا پاکیزہ حلال روزی تلاش کرنے کی غرض سے ہو اسے ہجرت کے حکم میں داخل کیا ہے اور اگر راستہ میں موت آجائے گی تو اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گا۔

ایک شبہ کا ازالہ

عام طور پر ایک حدیث کا غلط مفہوم لے کر یہ سمجھ لیا گیا کہ ہجرت آغازِ اسلام میں تھی اب یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کسی دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے کا حکم اب بھی موجود ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں :

صحیح یہ ہے کہ دارِ کفر سے ہجرت کرنا اس شخص پر ایک مضبوط فریضہ ہے جو اس پر قادر ہے ، یہ منسوخ نہیں ہے اور یہ آیت اس کی کھلی دلیل ہے کہ ہجرت ایسے مقام سے واجب ہے جہاں مسلمان کو اسلامی زندگی میسر نہ ہو۔

قرطبی رقمطراز ہیں :

یہ ہجرت یعنی دارِ حرب سے دارِ اسلام کی طرف ہجرت باقی ہے اور قیامت تک فرض ہے۔

کچھ لوگوں کو اس سلسلے میں ابوداؤد اور مسند احمد کی اس حدیث سے جو مجاشع بن مسعود کے حوالہ سے آئی ہے۔ میری مراد یہ ارشادِ نبوت ہے لا هجرة بعد فتح مكة فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اب اسلام میں کوئی ہجرت نہیں ہے حالانکہ اس ارشاد میں اس وقت کے احوال و ظروف کی عکاسی کی گئی ہے کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد چونکہ پورے کا پورا ملک دارالاسلام بن چکا تھا۔ حضور انور نے بتایا تھا کہ اب یہاں فتح مکہ کے بعد ہجرت کی حاجت نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پوری دُنیا کے مسلمانوں کے لیے حالات کچھ ہوں قیامت تک کے لیے ہجرت منسوخ ہو گئی ہے اور قاضی ثناء اللہ نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد چونکہ مکہ دارالاسلام بن چکا ہے اس لیے اب فتح کے بعد مکہ سے ہجرت واجب نہیں رہی۔ فتح مکہ کے بعد مکہ سے کوئی ہجرت کرے گا تو اسے ہجرت کا ثواب نہیں ملے گا۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ
الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا
لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ
طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا أَسْلِحَتَهُمْ ۖ فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا
مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۖ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ
وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ
عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۚ
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰى أَنْ تَضَعُوْا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٠٢﴾

اور جب تم سفر میں نکلو اور تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں کسی مصیبت میں ڈال دیں گے تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اگر

نماز میں قصر کر لو، بلاشبہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔[157] اور اے
پیغمبر جب تم مسلمانوں میں موجود ہو اور تم ان کے لیے نماز قائم
کرو تو چاہیے کہ فوج کا ایک حصہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے
اور اپنے ہتھیار لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر چکے تو پیچھے
ہٹ جاتے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہ تھا تمہارے
ساتھ شریک ہو جاتے اور چاہیے کہ پوری طرح چوکنا رہے
اور اپنے ہتھیار لیے رہے، جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار
کی ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامانِ جنگ
سے ذرا بھی غفلت کرو تو ایک بارگی تم پر ٹوٹ پڑیں۔[158] اور
اگر تمہیں بارش کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو پھر تم
پر کوئی گناہ نہیں اگر ہتھیار اتار کر رکھ دو لیکن اپنے بچاؤ
کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیے، بلاشبہ اللہ نے کفر پیشہ
لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔[159]

جنگ اور نماز، سفر اور نماز

نماز اسلام میں ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہی نہیں بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو مگر سر میں رکوع اور سجدہ کی تڑپ نہ ہو، ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے یہی کیفیت خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے اسی لیے جہاں ہو وہاں نماز ضرور ہو گی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔ یہ بات کہ نماز ایمان کا لازمہ ہے قرآن وسنت کا فیصلہ ہے کوئی قیاس نہیں ہے۔ قرآن میں ہے اقیموا الصلاۃ ولا تکونوا من المشرکین نماز قائم کرو مشرکین میں سے نہ بنو۔ اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت قرآنی کی روح اس طرح سمجھائی ہے:

ان بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلاۃ

بلاشبہ انسان اور کفر و شرک کے درمیان علیحدگی کرنے والی چیز نماز ہے۔

دراصل نماز پوری اسلامی زندگی کے جذبۂ اتباع کا سرچشمہ ہے اور اس کی محافظ بھی، وہ اگر ادا ہو گی تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا ہو سکیں گے۔ اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو باقی شریعت بھی غفلت کی نذر ہو جانے سے نہ بچ سکے گی۔ یوں سمجھئے کہ پورے اسلامی نظام میں نماز کی حیثیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ دل میں اگر حرکت اور گرمی اور زندگی موجود ہو تو جسم کے دوسرے تمام حصوں تک بھی خون کی روانی قائم ہوتی ہے اور وہ زندہ رہتے ہیں۔ لیکن جس وقت یہ دل اپنی حرکت اور زندگی کھو دیتا ہے۔ اس وقت دوسرے اعضا بھی سرد اور بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے عمال حکومت کو نماز کی یہی حیثیت اس طرح سمجھائی تھی:

بلاشبہ میرے نزدیک تمہارے سارے مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت والی چیز نماز ہے، جس نے اپنی نماز کی حفاظت کی اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا اس نے اپنے پورے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے اپنی نماز کو ضائع کر دیا وہ باقی چیزوں کو اور زیادہ ضائع

کر کے رہے گا۔

یہ نماز کی اہمیت ہے کہ بیماری، سفر اور جنگ کی حالت میں بھی قرآن نے اسے بجا لانے کی تلقین کی اور اس کی ادائیگی کی ترکیب بتائی۔ یہاں ہجرت اور جہاد کے ذکر میں نماز کے قصر کرنے کی رعایت عطا فرما کر اور صلوٰۃ خوف کی ترکیب بتا کر اشارہ کر دیا کہ نماز جو روح کی غذا اور مقصد حیات ہے اس سے کسی حال میں غفلت نہ ہو کیونکہ یہی دل کی روشنی ہے، یہی نبوت کی آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور یہی مومن کو دیدار الٰہی کے لیے تیار کرتی ہے۔

۱۵۷۔ اور جب تم سفر میں نکلو اور تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں کسی مصیبت میں ڈال دیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر نماز میں قصر کر لو بلا شبہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ یعنی جب تم جہاد وغیرہ کے لیے سفر کرو اور کافروں سے جو تمہارے صریح دشمن ہیں اس کا خوف ہو کہ وہ موقع پا کر تمہیں ستائیں گے تو نماز کو مختصر رکھو یعنی جو نماز حضر میں چار رکعت کی ہو اس کو دو رکعت پڑھو۔ ہمارے یہاں سفر تین منزل کا ہونا ضروری ہے اس سے کم ہو گا تو قصر نہ ہو گا۔ اور کافروں کے ستانے کا ڈر اس وقت موجود تھا جب یہ حکم نازل ہوا جب یہ ڈر جاتا رہا تو اس کے بعد بھی آپ سفر میں دو رکعت پڑھتے رہے۔ اور صحابہ کو بھی اس کی تاکید فرمائی اب ہمیشہ سفر میں قصر کرنے کا حکم ہے خوف مذکور ہو یا نہ ہو اور یہ اللہ کا فضل ہے شکریہ کے ساتھ قبول کرنا لازم ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے[1]

اس سلسلے میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

مسافت کیا ہے؟

اصل ارشاد میں اذا ضربتم فی الارض ہے جس کے لفظی معنے ہیں جب تم زمین میں مارو۔ مراد یہ ہے کہ جب تم کہیں کا سفر کرو کیونکہ مسافر زمین پر پاؤں، لاٹھی اور اپنے سواریوں کے پاؤں زمین پر مارتا ہے جیسے زمین پر گزرنے کے لیے طرق الارض اس مناسبت سے بولتے ہیں کہ گویا رہرو زمین پر ہتھوڑا مارنا چاہتا ہے۔

اس موقع پر ضربتم فی الارض فرمایا ہے جبکہ اس سے پہلے آیت میں ضربتم فی سبیل اللہ فرمایا تھا کیونکہ جو حکم یہاں بیان ہو رہا ہے وہ ہر مسافر کے لیے ہے خواہ اس کا سفر

[1] افادات شیخ الاسلام

راہ خدا میں ہو یا نہ ہو مثلاً تجارت اور سیاحت کی خاطر ہو اس سے ان لوگوں کے استدلال کی کمزوری معلوم ہوتی ہے کہ آیت میں جو حکم دیا جا رہا ہے ان کے لیے ہے جن کا سفر فی سبیل اللہ ہو جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ، صحابہ میں عبداللہ ابن عمر، عبداللہ بن مسعود، تابعین میں عطا ابن ابی رباح کا یہی خیال ہے اور ائمہ میں سے امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ ناجائز غرض کے لیے جو سفر کیا جائے اس میں قصر کی اجازت نہیں ہے اور فقہ جعفری کے ترجمان ابو جعفر الصدوق ابن بابویہ القمی کہتے ہیں کہ جس کا سفر معصیت کا ہو اسے نماز کو قصر کرنے کی اجازت نہیں ہے دیکھو من لا یحضرہ الفقیہ۔ امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ قرآن میں ضربتم فی الارض آیا ہے ضربتم فی سبیل اللہ نہیں ہے باقی رہی سفر کی نوعیت وہ اپنی جگہ اچھی اور بری ہو سکتی ہے مگر سفر کے اچھے اور بُرے ہونے کا نماز پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ضرب فی الارض کی تعبیر مطلق سفر کے لیے ہے اور قرآن نے اس کی کوئی تحدید نہیں کی ہے بلکہ جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے کہ

سفر کی تحدید نہ قرآن میں مذکور ہے اور نہ سنت میں اس کا ذکر آیا ہے لیکن علما نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے یہ معلوم کیا ہے کہ سفر کی مدت اتنی مسافت ہے جو متوسط چال سے تین دن میں طے ہو متوسط چال سے مراد آدمی یا اونٹ کی متوسط رفتار ہے۔ تین دن کی مسافت سے یہ مراد ہے کہ صبح سے دوپہر تک چلے۔ ارشاد نبوت یہ ہے:

یمسح المقیم یوما و لیلۃ والمسافر ثلاثۃ ایام و لیالیھا

مقیم ایک دن رات مسح کرے اور مسافر تین دن رات مسح کرے۔

اس سے استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ اس ارشاد میں مسافر کے لیے مسح کی مدت تین دن رات بتائی گئی ہے یہی مدت سفر ہے یعنی اتنی مسافت پر جانے والے کو مسافر کہتے ہیں۔ امام مالک نے مدتِ سفر ایک دن رات بتائی ہے ان کا استدلال اس ارشادِ نبوت سے ہے جس میں آپ نے عورت کو ایک دن سے نامحرم کے ساتھ سفر سے منع فرمایا ہے، ارشاد یہ ہے۔

لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الاخر ان تسافر مسیرۃ یوم الا مع ذی محرم منھا

کسی عورت کے لیے بغیر محرم کے ایک روز کی مسافت پر سفر کرنا جائز نہیں۔

ان کے خیال میں پورے دن کا چلنا مراد ہے۔ امام حسن اور امام محمد بن شہاب زہری کہتے ہیں کہ مسافت اتنی ہو کہ دو دن میں قطع ہو جاتے۔ انہوں نے بھی ارشاد نبوت سے استدلال کیا ہے۔ امام مالک کی ہمنوائی میں امام احمد، امام شافعی، لیث، اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے۔ احناف سے جن بزرگوں نے فرسنگ کا اعتبار کیا ہے ان کے نزدیک قصر کے لیے کم از کم ۴۸ میل کا سفر ضروری ہے۔ مولانا عبدالشکورؒ[1] نے ۴۶ میل لکھا ہے۔ مولانا مودودی نے ۴۸ میل بتایا ہے۔ اصل مذہب حنفیہ کا یہ ہے کہ تین دن کا سفر ہو۔ قرطبی نے امام مالک کی ترجمانی کرتے ہوئے فرسنگ کے اعتبار سے ۱۶ فرسنگ بتائے ہیں یہی چار برید ہیں اور میلوں کے اعتبار سے ۴۶، ۴۸، اور ۳۶ میل تک کا حساب درج کیا ہے۔ اس لحاظ سے قصر کی مسافت سے ائمہ اربعہ اور فقہاء محدثین کے درمیان اس موضوع پر فی الواقع اختلاف رائے نہیں ہاں البتہ ان اہل ظاہر سے اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ قریب بعید ہر سفر میں قصر جائز ہے۔ شوکانی نے اس معاملہ میں بڑی فراخ دلی سے ایک میل کم از کم بتایا ہے اور ایک میل کی پابندی بھی اس لیے لگائی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بقیع قبرستان میں جاتے قضائے حاجت کے لیے دور نکل جاتے مگر ان حالات میں آپ سے قصر ثابت نہیں ہے۔

سفر میں قصر کی نوعیت کیا ہے؟

قصر کے معنے لغت میں تضییق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ کچھ کی رائے میں قصر کے معنے کسی چیز کا اس کی اصل سے ملانا ہیں۔ ابن الجوزی نے قصر کی تفسیر نقص یعنی کمی کرنے سے کی ہے۔ لیکن اہل تفسیر و لغت میں سے کسی نے ان کی ہمنوائی نہیں کی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ قصر صلاۃ کے معنے یہ ہیں کہ بموجب رخصت نماز کی بعض رکعتوں یا بعض ارکان کو ترک کر کے نماز کو قصر کوتاہ کر لیا جاتے اسی لیے آیت میں قصر کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے ایک یہ کہ تعداد رکعات میں قصر ہے یعنی چار رکعت کی نماز کو دو رکعت کر لینا، دوسرے یہ کہ قصر سے مراد نماز کی ادائیگی میں تخفیف کرنا ہے بایں طور کہ رکوع و سجود کی جگہ ایماء و اشارہ پر اکتفا کیا جاتے۔ عام شارحین قرآن کا کہنا ہے کہ قصر سے مقصود چار رکعت کی نماز کو دو رکعت پڑھنا ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دوسری رائے کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

---

[1] علم الفقہ

مشہور آنست کہ ایں آیت در صلاۃ مسافر است و خوف قید اتفاقی است و
آنچہ نزد ایں بندہ رجحان یافتہ است آنست کہ ایں آیت در صلاۃ خوف
نازل شدہ است و سفر قید اتفاقی است و مراد از قصر قصر در کیفیت رکوع
و سجود است کہ بایماء ادا تواں کرد نہ در کمیت رکعات ۔ واللہ اعلم ۔

بہرحال جمہور بھی کہتے ہیں کہ قصر سے مراد تعداد رکعات کو کم کرنا ہے اور آیت میں سفر کی نماز مراد ہے ۔ پھر ان میں اس موضوع پر اختلاف ہے کہ جس قصر کا مسافر سے اس آیت میں مطالبہ کیا گیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے ؟ کچھ کہتے ہیں کہ قصر کرنا ضروری نہیں ہے محض اجازت ہے ۔ آدمی چاہے تو پوری پڑھے اور چاہے قصر کرے ۔ یہ امام شافعی کی رائے ہے اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور قصر نہ کرنے کو خلاف اولیٰ کہتے ہیں ۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قصر کرنا فرض ہے اور اشہب کی روایت میں یہی امام مالک کا مذہب ہے ۔ حدیث سے ثابت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں :

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ سفر میں مدینہ کی واپسی تک چار رکعت والی نماز قصر کرتے تھے اور آپ سے کبھی سفر میں پوری نماز ثابت نہیں ہے ۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان کے سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے قصر نہ کی ہو ، اسی کی تائید میں ابن عباس اور دوسرے متعدد صحابہ سے بھی روایات منقول ہیں ۔

اس موضوع پر سارے دفترِ حدیث میں صرف دو صحابی کا عمل اس کے خلاف ہے ایک حضرت عائشہ دوسرے حضرت عثمان ۔ حضرت عائشہ کے بارے میں تو حافظ ابن تیمیہ نے اعلان کر دیا کہ

یہ سب غلط ہے ام المومنین حضور انور اور جمیع صحابہ کے خلاف ہرگز نہیں کر سکتی ہیں ۔ حضرت عائشہ سے جب یہ بیان صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ نماز دو دو رکعت فرض ہوئی تھی ۔ جب حضور نے مدینہ میں ہجرت فرمائی تو حضر کی نماز میں اضافہ ہو گیا ۔ سفر میں اصل ہی باقی رکھی گئی اس کے باوجود حضرت عائشہ کے بارے میں یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے مسلمانوں کے خلاف نماز پڑھی ہو گی ۔ (زاد المعاد)

ہاں حضرت عثمان کے بارے میں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انہوں نے حج کے

بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے بتایا ہے اور خوارج کا بھی یہی مسلک ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ نے تصریح کی ہے لیکن پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ قصر کے لیے خوف شرط نہیں ہے۔ قرآن میں یہ شرط صرف پیش پا افتادہ احوال وظروف کے تحت آئی ہے کیونکہ زمانہ نزول میں حضور انور اور صحابہ کے سفر خوف کے اندیشوں سے بھرپور تھے۔ اس لیے شرط یہاں موثر نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا تعامل گواہ ہے کہ آپ حالت سفر میں بھی قصر فرماتے تھے اور نماز قصر کرتے تھے اور پھر یہ بات تاریخ و روایت میں صاف ہو چکی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ یعلی ابن امیہ کہتے ہیں کہ:

> میں نے حضرت عمر سے دریافت کیا کہ قرآن کی اس آیت میں قصر کے لیے خوف کی شرط ہے۔ اب تو امن وامان ہو چکا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھے بھی اس پر حیرت تھی اور اپنی اس حیرت کا اظہار بارگاہ نبوت میں کیا تھا، آپ نے فرمایا تھا کہ عمر! یہ اللہ کی جانب سے صدقہ ہے اللہ نے خیرات کی ہے، اللہ کی خیرات کو قبول کر لینا چاہیے۔

قرآن میں ایسی بہت مثالیں ہیں کہ شرط احوال ووقائع کے تحت آئی ہیں۔ احوال ووقائع کے بدلنے سے شرط بے جان ہو کر رہ گئی لیکن اصل حکم اپنی جگہ باقی رہا۔ ان خفتم کی شرط صرف آیت کے موقع نزول کے اعتبار سے اس علت کو ظاہر کر رہی ہے جس کی بنا پر قصر کی مشروعیت آئی ہے۔ اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ یہ خوف ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ عبداللہ ابن عمر نے امیہ ابن خالد کو جو جواب دیا تھا وہ اس باب میں قول فیصل ہے:

> امیہ ابن خالد نے عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا کہ قرآن میں حضر کی نماز بھی ہے نماز خوف بھی ہے لیکن سفر کی نماز قرآن میں نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا بھائی اللہ نے حضور انور کو مبعوث فرمایا اور ہم علم سے بے بہرہ تھے ہم تو وہی کچھ کرتے ہیں جو ہم نے حضور کو کرتے دیکھا ہے۔

نماز میں قصر کی تاریخ کا مسئلہ

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ

اللہ سبحانہ نے نماز دو دو رکعت فرض کی تھیں۔ پھر جب حضور نے مدینہ ہجرت فرمائی تو

موقعہ پر منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائیں ہیں۔ یہ حضرت عثمان کا منفرد عمل ہے۔ ابن القیم نے زاد المعاد میں حضرت عثمان کے اس عمل کی چھ تاویلیں پیش کی ہیں۔ ان میں سب سے اچھی توجیہہ ان کے خیال کے مطابق اور خود حنفیہ اور مالکیہ کی رائے کے مطابق یہ ہے کہ جب صحابہ نے اعتراض کیا تو حضرت عثمان نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ مکہ میں شادی کر لی ہے اور چونکہ میں نے حضور سے سنا ہے جو شخص کسی شہر میں متاہل ہوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے اسے نماز پوری کرنی چاہیے اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔

مسئلہ فقہی بھی ہے اور تاریخی بھی، تفصیلات تو فقہ و روایت کی کتابوں میں ہیں مگر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سال پہلی بار حضرت عثمان نے بجائے قصر کے پوری نماز پڑھانے کا ارادہ کیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس سال دُور دُور کے دیہاتی مسلمانوں کا مجمع غیر معمولی طور پر اکٹھا ہو گیا تھا حضرت عثمان کو بعض ذرائع سے غالباً یہ چیزیں پہنچائی گئیں کہ عرفات و مزدلفہ کی قصر کی نمازوں کو کچھ دیہاتیوں نے اپنے علاقوں میں یہ پھیلا دیا ہے کہ نمازیں دو دو رکعت ہی ہیں، دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہم نے خود خلیفہ کے پیچھے ظہر کی دو عصر کی دو اور عشاء کی بھی دو رکعت پڑھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ناواقف دیہاتیوں کو اس سے مغالطہ ہوا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مقصود اسی غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ بہر حال وجہ کچھ ہو حضرت عثمان کے عمل کے سوا سفر میں نماز پوری کرنے کا کوئی عمل نہیں ہے۔

بعض ائمہ نے فلیس علیکم جناح کوئی مضائقہ نہیں کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ ایسی ہی تعبیر آپ البقرہ میں مناسک حج کے موضوع پر پڑھ چکے ہیں۔ سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں آیا ہے فلاجناح علیہ ان یطوف بھما صفا و مروہ کی سعی میں کوئی مضائقہ نہیں حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ لوگوں کے اس اندیشہ کو دُور کرنا مقصود ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو نہ ہوگا۔

آیت میں خوف کی قید کی توضیح

اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ نماز کے قصر میں سفر بالذات مؤثر ہے۔ اس کے لیے کسی شرط کی ضرورت نہیں، صرف حضرت عائشہ کی رائے ہے کہ سفر میں قصر کی شرط خوف ہے۔ جیسا کہ

اقامت کی نماز میں اضافہ ہوا اور نمازِ سفر پہلی ہی رکھی گئی ۔
اور صحیح بخاری میں ہے :
نماز دو رکعت فرض ہوئی تھی پھر ہجرت کے بعد چار رکعت فرض ہوئی۔

علامہ دولابی نے حضرت کے اس بیان کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ نماز کی چار رکعتیں منگل کے دن ۱۲ ربیع الثانی ۲ھ کو فرض ہوئیں ۔ تاریخ خمیس اور سیرۃ مغلطائی میں بھی ایسا ہی ہے الروض الانف میں علامہ ابوالقاسم السہیلی نے بھی یہی لکھا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ معراج کی رات میں سوائے مغرب کے ساری نمازیں دو رکعت فرض ہوئیں، پھر ہجرت کے بعد ظہر، عشا اور عصر میں اضافہ ہوا۔ مغرب اور فجر اپنے حال پر رہیں۔ حافظ عسقلانی رقمطراز ہیں کہ ابن الاثیر کا دعویٰ ہے کہ سفر میں نماز کا قصر ۴ھ میں ہوا۔ دولابی ۲ھ بتاتے ہیں۔ لیکن سابقہ حدیث عائشہ پر یہاں شاید ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ یہ حدیث عائشہ کہتی ہے کہ سفر کی نماز دو ہی فرض ہوئی ہے جبکہ قرآن یہاں کہہ رہا ہے کہ نماز قصر کرو۔ اس کے جواب میں پسندیدہ بات وہی ہے جو حافظ عسقلانی نے لکھی ہے کہ نمازیں تو دو رکعت کی صورت میں معراج ہی میں فرض ہوئی تھیں۔ پھر فجر و مغرب کے علاوہ ہجرت کے بعد اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ۴ھ میں نماز میں قصر کا حکم آیا۔ دوسری احادیث بھی اس کی مؤید ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس کا یہ بیان کہ اللہ سبحانہٗ نے تمہارے نبی کی زبان پر سفر میں دو رکعتیں فرض کی ہیں جیسا کہ حضر میں چار رکعتیں فرض کیں اور نسائی میں بسندِ صحیح حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کا بیان ہے، نمازِ سفر تمہارے نبی کی زبان پر دو رکعت ہیں پوری کی پوری — ان بیانات کا منشا یہ واضح کرتا ہے کہ سفر میں نماز کا قصر رخصت نہیں بلکہ اصل فرض ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل نے قرآن کے چہرۂ اجمال سے نقاب اٹھائی ہے ۔

جنگ میں نمازِ خوف کی ترکیب

۱۵۸- اور اے پیغمبر جب تم مسلمانوں میں موجود ہو اور تم ان کے لیے نماز قائم کرو تو چاہیے کہ فوج کا ایک حصہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار لیے رہے پھر جب وہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ جائے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہ تھا وہ تمہارے ساتھ نماز میں شریک رہے اور پوری طرح چوکنا رہے اور اپنے ہتھیار لیے رہے، جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامانِ جنگ سے ذرا بھی غفلت کرو تو ایک بارگی

تم پر ٹوٹ پڑیں۔ پہلے نمازِ سفر کا بیان تھا یہ نمازِ خوف کا بیان ہے یعنی کافروں کی فوج مقابلہ میں ہو تو مسلمانوں کی فوج دو حصے ہو جائے ایک حصہ امام کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر دشمن کے مقابلے میں جا کر کھڑا ہو جائے، دوسرا حصہ آ کر امام کے ساتھ نصف باقی پڑھ لے۔ امام کے سلام کے بعد دونوں جماعتیں اپنی باقی نماز جُدا جُدا پڑھ لیں۔ اگر مغرب کی نماز ہو تو اوّل جماعت دو رکعت اور دوسری جماعت ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور اس حالت میں نماز کے اندر آمد و رفت معاف ہے اور تلوار زرہ سپر کے اپنے ساتھ رکھنے کی بھی ہدایت فرمائی تاکہ کفار موقع پاکر یک بارگی حملہ نہ کر دیں۔ [1]

صلوٰۃ خوف چونکہ دراز دامن موضوع ہے اس لیے ہم ناظرینِ معالم القرآن کی سہولت کے لیے سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں ان سوالات کا جواب دینا ہے۔

۱۔ نمازِ خوف کی ابتداء روایتی اور تاریخی حیثیت سے کب ہوئی اور اس کا حکم۔
۲۔ نمازِ خوف کی مشروعیت وقتی تھی یا دائمی ہے۔
۳۔ نمازِ خوف کے لیے سفر شرط ہے یا عام حالات میں بھی جائز ہے۔
۴۔ کیا نمازِ خوف میں خوف رکعات کی تعداد پر اثر انداز ہوتا ہے۔
۵۔ نمازِ خوف کی کہانی تاریخ کی زبانی اور اس کی صورتیں۔
۶۔ نمازِ خوف کی ادائیگی کے لیے شرائط کیا ہیں۔

نمازِ خوف کی تاریخ اور اس کا حکم

جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ نمازِ خوف سب سے پہلے غزوۂ ذات الرقاع میں پڑھی گئی۔ یہ غزوہ کب ہوا اس میں اربابِ سیرۃ کا اختلاف ہے۔ ابن اسحاق اور دوسرے اصحابِ سیر و مغازی اس غزوہ کو غزوۂ خندق سے پہلے کہتے ہیں مگر حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ امام احمد اور اربابِ سنن ابو عباس الزرقی سے اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ صلوٰۃ خوف پہلے پہلے غزوۂ عسفان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔ ان دونوں روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے تھے اور کفار کے لشکر کی قیادت خالد بن الولید کر رہے تھے۔ مسلمان ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تو کفار نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

افسوس کیا کہ ہم نے ایک موقع کھو دیا۔ پھر خالد نے کفار سے مشورہ کیا کہ عصر کی نماز مسلمانوں کو اپنے مال و اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جب یہ لوگ عصر کی نماز شروع کریں تو متفقہ حملہ کر دیا جائے حضرت جبرئیل نے حضور کو اس مشورے کی خبر دی اور صحابہ کو جمع کر کے صلاۃ خوف پڑھنے کا حکم دیا اور پھر صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ وہ غزوۂ ذات الرقاع میں شریک تھے اور مسند امام احمد اور سنن میں روایت ہے کہ مروان بن الحکم کے سامنے حضرت ابوہریرہ نے بیان کیا کہ ہم نے صلاۃ خوف غزوہ نجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی ہے اور حضرت ابوہریرہ غزوۂ خیبر کے قریب مسلمان ہوئے تھے اور ابوموسیٰ اشعری غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ آئے تو اگر ذات الرقاع خندق سے بھی پہلے تھا تو یہ لوگ کیوں کر شریک ہوئے اس لیے غزوہ ذات الرقاع بلاریب غزوۂ عسفان اور غزوۂ خیبر کے بعد ہوا۔ امام بخاری کا صحیح میں میلان اسی طرف ہے اور حافظ عسقلانی کی رائے بھی یہی ہے اور یہ مسئلہ بھی اتفاقی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق میں نمازِ خوف نہیں پڑھی۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں یہ بات جزم و یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع بنو قریظہ سے جنگ کے بعد ہوا کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ غزوہ خندق میں نمازِ خوف کی مشروعیت نہ ہوئی تھی۔ صاحبِ ہدایہ نے غزوۂ خندق کے واقعہ سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا تھا کہ دورانِ نماز میں قتال ناجائز ہے اس پر حافظ زیلعی نے ان کا تعاقب کیا اور کہا کہ صاحبِ ہدایہ کا یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ نمازِ خوف تو مشروع ہی غزوۂ خندق کے بعد ہوئی ہے۔ قاضی عیاض شفا میں رقمطراز ہیں۔ صحیح اور پائدار بات یہی ہے کہ خندق کا واقعہ نمازِ خوف مشروع ہونے سے پہلے ہوا ہے شیخ ابن الہمام نے بھی تصریح کی ہے کہ صحیح یہی ہے کہ نمازِ خوف غزوۂ خندق کے بعد مشروع ہوئی ہے۔

نمازِ خوف کا حکم اس صورت کے لیے ہے جبکہ دشمن کے حملہ کا خطرہ تو ہو مگر عملاً معرکہ قتال گرم نہ ہو جنگ ہونے کی حالت میں حنفیہ کے نزدیک نماز مؤخر کی جائے گی۔ امام مالک اور امام ثوری کے نزدیک اگر رکوع و سجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے گی۔ امام شافعی کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی مار دھاڑ بھی کی جا سکتی ہے اور کھایا پیا بھی جا سکتا ہے۔

نمازِ خوف کی مشروعیت وقتی تھی یا دائمی ہے

جمہور ائمہ کا خیال یہی ہے کہ نمازِ خوف کی مشروعیت دائمی ہے کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کے تعامل سے نمازِ خوف کا مختلف جنگوں میں پڑھنا ثابت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے نمازِ خوف پڑھی ہے۔ ابوموسیٰ اشعری نے اصفہان میں نمازِ خوف پڑھی۔ سعید بن العاص طبرستان میں مجوسیوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمرکابی میں جماعتِ صحابہ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت حذیفہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن الزبیر موجود ہیں۔ سعید نے دریافت کیا کہ آپ میں کون ہے جس نے حضور کے ساتھ نمازِ خوف پڑھی ہے؟ حضرت حذیفہ نے اپنے کو پیش کیا، حضرت حذیفہ ہی نے نماز پڑھائی۔ کاشانی رقمطراز ہیں کہ اس طرح حضور کے بعد نمازِ خوف کے جواز پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے لیکن امام ابو یوسف، حسن بن زیاد اور شافعیہ میں امام مزنی اور ابراہیم بن علیہ کا خیال ہے کہ نمازِ خوف صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لیے مخصوص تھی۔ ان بزرگوں کے اس خیال کی بنیاد قرآن میں اذا کنت فیھم فاقمت کے خطاب پر ہے۔ یعنی چونکہ قرآن نے نمازِ خوف کے جواز کے لیے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے کی شرط لگائی ہے اس لیے آپ کے بعد شرط معدوم ہونے کی وجہ سے نمازِ خوف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن قرآن میں بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے لیے ہے اس لیے نمازِ خوف کو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ ابن العربی کہتے ہیں آپ کے ہونے کی شرط یہاں حکم کے لیے ہے نہ کہ وجودِ صلاۃ کے لیے۔ بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے اور نصب الرایہ میں حافظ زیلعی نے اس پر پسندیدہ اور دلچسپ بحث کی ہے۔ بہرحال نمازِ خوف کی مشروعیت اُمت کے لیے آپ کے بعد بھی موجود ہے اور جب تک تصریح نہ ہو محض احتمالات سے خصوصیات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے اور معلوم ہے کہ یہاں کوئی ایسی تصریح نہیں ہے۔

کیا نمازِ خوف کے لیے سفر شرط ہے؟

جمہور کے نزدیک نمازِ خوف کے لیے سفر شرط نہیں۔ حالتِ اقامت میں شہر میں بھی خوف کے حالات پیدا ہو جائیں تو نمازِ خوف پڑھی جا سکتی ہے۔ صرف ابن الماجشون نے اس پر قدغن قائم کی ہے۔ الزرقانی نے ان کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اذا ضربتم فی الارض کے مفہوم کے سہارے ایسا کہتے ہیں، ورنہ امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کی متفقہ رائے یہی ہے کہ نمازِ خوف کے لیے سفر کی شرط نہیں ہے۔ امام مالک کے بارے میں

اگرچہ عام شہرت یہی ہے کہ وہ نمازِ خوف کے جواز کے لیے سفر کو شرط قرار دیتے ہیں لیکن امام مالک کی طرف یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔ امام نووی نے خبر نہیں یہ بات کہاں سے نکالی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شاید سمجھنے والوں نے المدونہ سے ایسا سمجھ لیا ہے۔ المدونہ میں ہے:

امام مالک فرماتے ہیں نمازِ خوف دو رکعت نہ پڑھے مگر وہ شخص جو سفر میں ہو حضر میں نہ پڑھے۔

اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ نمازِ خوف حضر میں نہ پڑھی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ نمازِ خوف حضر میں دو رکعت نہ پڑھی جائے۔ پابندی حضر میں قصرِ صلاۃ پر لگائی جارہی ہے نہ کہ نمازِ خوف پر۔ المدونہ ہی میں اس کے بعد ان کا یہ ارشاد،

اگر حضر میں خوف کی حالت ہو تو چار رکعت نمازِ خوف کے مطابق پڑھیں قصر نہ کریں۔

صراحۃً کہہ رہا ہے کہ ان کا مقصد حضر میں نمازِ خوف پر قدغن لگانا نہیں ہے۔ ابن العربی نے احکام القرآن میں، قرطبی نے تفسیر میں، دردیر نے شرح کبیر اور دسوقی نے امام مالک کے اس موقف کی تشریح کی ہے۔

نمازِ خوف میں خوف کا تعدادِ رکعات پر اثر

قاضی ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں کہ نمازِ خوف میں خوف رکعتوں کی تعداد پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عمر، ائمہ لیث ابراہیم نخعی، ثوری، مالک، شافعی، ابوحنیفہ اور تمام اہل علم کی رائے یہی ہے۔ حنابلہ کے مسلک کی ترجمان الانوار الساطعہ میں ہے:

رکعات کی تعداد میں خوف قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ خوف صرف وصف و شرط پر اثر کرتا ہے۔

حنفی مسلک کی ترجمانی صاحب بدائع نے اس طرح کی ہے،

ہمارے نزدیک خوف کی وجہ سے رکعات کی تعداد کم نہ ہوگی۔ یہی عام صحابہ کرام کی رائے ہے۔

الشعرانی نے المیزان الکبریٰ میں لکھا ہے:

اس پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ نمازِ خوف حضر میں چار رکعت اور سفر میں

دو رکعت ہے ۔

صحابہ میں عبداللہ بن عباس کی رائے ہے کہ نمازِ خوف ایک رکعت ہے اور ان کی ہمنوائی الحسن البصری، طاؤس یمانی، عطا بن ابی رباح اور مجاہد نے کی ہے ۔ ابن قدامہ نے صحابہ میں سے زید بن ثابت، ابوہریرہؓ اور جابر بن عبداللہ کا بھی نام لیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ نمازِ خوف میں ایک رکعت کہتے ہیں وہ صرف قتال کی حالت میں ایک رکعت مانتے ہیں علی الاطلاق نہیں ۔ اور بعد والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک سجدہ ایک تکبیر ہی کو کافی بتاتے ہیں چنانچہ ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر وغیرہ کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ ،

جب میدانِ جنگ میں گھمسان کا رن پڑ جائے اور باہم مڈبھیڑ ہو جائے اور نماز کا وقت آجائے تو صرف سبحان اللہ ، الحمد للہ ، لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر ہی کہہ لینا کافی ہے ۔

اور حافظ عسقلانی نے بتایا ہے کہ بس یہی ان کی نماز ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے ۔ ابن عباس نے غالباً قرآن کی بیان کردہ قیام جماعت کی تدبیر سے سمجھی ہے ۔ قرآن نے یہاں یہ تدبیر بتائی ہے کہ ایک گروہ اسلحہ کے ساتھ امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو، دوسرا گروہ حفاظت کا فرض انجام دے ۔ جب پہلا گروہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ کر وہ حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے ، اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی ہے امام کے پیچھے اسی مسلح حالت میں نماز کے لیے کھڑا ہو ۔ اس صورت میں مقتدیوں اور امام کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہو گی ؟ ظاہر ہے کہ امام اگر مسافر ہے تو دو رکعت ہوئیں اور مقتدیوں کی ایک ایک رکعت ہوئی ۔ ابن عباس نے مقتدی کی ایک رکعت کو پوری نماز سمجھ لیا ہے ۔

نمازِ خوف کی کہانی تاریخ کی زبانی

ابن العربی نے لکھا ہے کہ حضور نے نمازِ خوف ۲۴ بار پڑھی ہے اور قاضی عیاض نے ان مقامات کی تفصیل بیان کی ہے ۔ ابن القصار مالکی کہتے ہیں کہ حضور انور نے دس جگہ نمازِ خوف پڑھی ہے حافظ زیلعی فرماتے ہیں کہ کچھ فقہا نے بتایا ہے کہ حضور انور نے دس جگہ نمازِ خوف پڑھی ہے لیکن سیر و مغازی کے فنکاروں کے نزدیک ثابت صرف چار جگہ ہے ، ذات الرقاع ، بطن نخل ، عسفان اور ذی قرد ذات الرقاع میں نمازِ خوف پڑھنے کا ذکر صحیح بخاری میں بحوالہ سہل بن ابی حثمہ میں ہے بطن نخلہ کی حدیث سنن نسائی میں بحوالہ جابر بن عبداللہ ہے ۔ عسفان میں نمازِ خوف پڑھنے

کی حدیث ابوداؤد اور نسائی میں بحوالہ ابی عیاش الزرقی آئی ہے اور ذی قرد میں نماز پڑھنے کی حدیث بحوالہ عبداللہ بن عباس نسائی میں موجود ہے۔ ان ہی مقامات کی پڑھی گئی نماز خوف کی مختلف صورتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ اگرچہ نماز خوف کی صورتیں لوگوں نے ۱۰، ۱۴، ۱۶، ۲۴ تک بتائی ہیں لیکن اصول ۶ ہیں۔ باقی سب راویوں کا اختلاف ہے۔

نماز خوف کی کیفیت اور ترکیب کا دارومدار بہت حد تک ان حالات پر ہے جن کے تحت یہ نماز پڑھی گئی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں متعدد طریقوں سے نماز پڑھائی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں صرف ابوداؤد کی سنن ایک ایسی کتاب ہے جس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ابوداؤد نے گیارہ صورتیں نماز خوف کی لکھی ہیں۔ جواز کی حد تک سب فقہا کے یہاں مقبول ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ صرف اولایت میں ہے جواز میں نہیں ہے اس لیے امام وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقہ کی جنگی صورت حال اجازت دے اسے اختیار کرلے۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے انما ھی صلاۃ ضرورۃ فتفعل بحال الضرورۃ وحسب الامکان۔ یہ ضرورت کی نماز ہے اس کو ضرورت کے مطابق جیسے ممکن ہوگا کیا جائے گا۔ یہاں نماز خوف کی سب صورتیں تو نہیں ہم صرف چار صورتیں پیش کرتے ہیں۔ اول یہ کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابلہ پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہو جائے تو پہلا حصہ چلا جائے اور دوسرا حصہ آکر دوسری رکعت امام کے ساتھ پڑھے اس کے بعد امام سلام پھیر دے اس طرح امام کی دو رکعتیں ہوئی ہیں اور فوج کی ایک ایک رکعت۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے پھر دوسرا حصہ فوج کا آکر امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے پھر دونوں حصے باری باری سے آکر اپنی چھوڑی ہوئی نماز کی ایک ایک رکعت بطور خود ادا کرلیں۔ اس طرح دونوں حصوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ہوگی اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے اور تشہد کے بعد سلام پھیر دے پھر دوسرا حصہ تیسری رکعت میں آکر شامل ہو اور امام کے ساتھ دو رکعت پڑھے اور امام کے ساتھ سلام پھیرے اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو ہوں گی۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطور خود ایک رکعت مع تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں، پھر دوسرا حصہ آکر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ وہی امام دوسری رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا

کرنے کے بعد ایک رکعت خود اٹھ کر پڑھ لیں۔
پہلی صورت کو ابن عباس اور جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے۔ دوسرے طریقہ کو عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور احناف اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقے کو حسن بصری نے ابو بکرہ سے روایت کیا ہے اور چوتھے طریقے کو امام مالک اور امام شافعی نے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اس کا ماخذ سہل بن حثمہ کی روایت ہے۔

نمازِ خوف کی ادائیگی کی شرطیں

نمازِ خوف کی ادائیگی کے لیے کچھ اہم اور بنیادی شرطیں ہیں۔ ان کے بغیر نمازِ خوف ادا کرنا جائز نہیں ہے مثلاً
اوّل یہ کہ جنگ جو کی جارہی ہے وہ فی حد ذاتہٖ جائز ہو، اگر کچھ مسلمانوں نے اسلامی مملکت کی بغاوت کر دی تو ان مسلمان باغیوں کے لیے نمازِ خوف جائز نہیں ہے۔ یہ ائمہ کے درمیان اتفاقی ہے برخلاف نمازِ قصر کے کہ وہ جائز ہے خواہ سفر کیسا ہو کیونکہ اس میں مبنیٰ مشقت ہے اور بس۔
دوسرے یہ کہ دشمن موجود ہو، اگر دُور سے غبار دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ دشمن آرہا ہے اور نماز پڑھ لی، بعد کو معلوم ہوا کہ دشمن نہیں آرہا ہے نماز نہیں ہوئی دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔
تیسرے یہ کہ نمازِ خوف کی یہ صورت اس وقت ہے جب پوری فوج ایک ہی امام کی امامت میں نماز ادا کرنی چاہے۔ ہر سپاہی کی یہ آرزو ہو کہ ایک امام کے پیچھے پڑھے جیسے زمانۂ نبوت ہر شخص کی یہ آرزو تھی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں پڑھے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی جس کا لحاظ ضروری تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتداء کی خواہش نہ تو اتنی شدید ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اہمیت ہی ہے اس لیے دفاع کے تقاضوں کے مطابق اگر اہل لشکر الگ الگ اماموں کی اقتداء میں نماز پڑھیں تو پھر نماز اپنے طریقے پر پڑھی جائے گی اور نمازِ خوف نہ پڑھی جائے گی حضور انور کے زمانے میں صحابہ کرام کی والہانہ عقیدت اور عقیدت کے ساتھ محبت کا جوش اس صورت کے اختیار کرنے کا باعث تھا۔ اس زمانے میں اوّل تو جنگ کی صورت ہی بالکل تبدیل ہو چکی ہے دوسرے یہاں حضور انور کی امامت نہیں اس لیے حالات کے تقاضے کے تحت قیام جماعت کی جو شکل اختیار کی جائے وہ اختیار کی جا سکتی ہے۔ افضل یہی ہے کہ ہر فوج کا حصہ مستقل امامت میں اگر مسافر ہے تو دو رکعت اور اگر مسافر نہیں تو پوری نماز پڑھے۔

دشمن کے مقابلے میں چوکنے رہنے کا حکم

۱۵۹۔ اور اگر تمہیں بارش کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو پھر تم پر گناہ نہیں ہے اگر ہتھیار اتار دو، لیکن اپنے بچاؤ کی طرف سے تمہیں غافل نہ ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اللہ نے کفر پیشہ لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یعنی اگر بارش، بیماری یا ضعف کی وجہ سے ہتھیار کا اٹھانا مشکل ہے تو ایسی حالت میں ہتھیار اتار کر رکھ دینے کی اجازت ہے لیکن اپنا بچاؤ کر لینا چاہیئے۔ مثلاً زرہ سپر خود ساتھ لے لو، اگر دشمنوں کے خوف سے اتنی بھی مہلت نہ ملے کہ نمازِ خوف بصورت مذکورہ ادا کر سکیں تو جماعت موقوف کر کے تنہا تنہا نماز پڑھ لیں۔ پیادہ ہو کر اور سواری سے اترنے کا بھی موقعہ نہ ملے تو سواری پر اشارے سے نماز پڑھ لیں اگر اس کی بھی مہلت نہ ملے تو پھر نماز کو قضا کر لیں[1]

پہلی آیت میں ہتھیار اور سامانِ حفاظت کو ہمراہ رکھنے کا حکم ہوا تھا یہاں فرمایا کہ دشواری کے وقت میں ہتھیار اتار دینے کی اجازت ہے لیکن بچاؤ سے کسی حال میں بے پروا نہ ہونا چاہیے۔

حذر کے اصل معنے کسی خطرے اور آفت سے بچنے کے ہیں لیکن اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں مثلاً زرہ بکتر، سپر خود وغیرہ، اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات ہی کے لیے ہے لیکن اپنے عام استعمال میں ان اسلحہ پر بھی بولا جاتا ہے جو حملے کے کام آتے ہیں مثلاً تیر تفنگ تلوار وغیرہ، یہاں پر بھی یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں معلوم ہوتا ہے لیکن یہ لفظ جب اسلحہ کے ساتھ استعمال ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے تو اس سے مراد صرف وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کو ایک سپاہی اپنے دشمن سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں احتیاط کے تقاضوں سے بے پروا ہونے کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بیماری اور بارش وغیرہ کی وجہ سے اگر اسلحہ اتارنے کے لیے مجبور ہی ہونا پڑے تو صرف اسلحہ اتار سکتا ہے۔ حذر یعنی حفاظتی نوعیت کی چیزوں سے پھر بھی بے پروا ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

دراصل قرآن کی اس آیت میں ہمیں دفاعی سیاست کا ایک عظیم گر بتایا ہے۔ غور کیجئے کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اسلحہ اور سامانِ جنگ کے اعتبار سے دشمنوں کے مقابلے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں کبھی عشر عشیر ہی تھے۔ دفاعی سیاست کا منشا یہ ہے کہ اسلامی نصب العین کو ہم نے اپنایا ہے اور اس کے مطابق ہم جو زندگی کا خاکہ قائم کرنا چاہتے ہیں اس کے مفاد کے لیے دشمن سے جنگ کریں یعنی دفاعی سیاست کے تحت جنگ کا مقصد اپنے ملی مفاد کو دشمن سے منوانا ہے۔ یہ دفاعی سیاست جنگ کے نتائج حاصل کرنے میں بہت زیادہ موثر ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تیاری ایسی ہو کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم لڑائی لڑے بغیر دشمن کی فوج کا حوصلہ پست ہو جائے۔

اس آیت میں بچاؤ کی تلقین کر کے قرآن نے مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ اگر تم یہ چاہو کہ سیاسی اقتدار اور فرمانروائی کی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑ کر گوشہ عافیت میں بیٹھ جاؤ۔ پھر بھی تمہارے اصول واقدار جن کو تم نے قبول کیا ہے دنیا میں خود بخود غالب رہیں تو یہ کم فہمی اور کوتاہ نظری ہے ہاں تمہارا مقصد اصلی اخلاق کی اصلاح ہونا چاہیئے نہ کہ سیاسی طاقت کا حصول لیکن بہر حال اس طاقت کا حاصل کرنا ضروری ہے آخر میں فرمایا ان اللہ اعد للکافرین عذاباً مہینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تدبیر اور احتیاط اور اہتمام کے ساتھ کام کرو اور اللہ کے فضل سے اُمید رکھو وہ کافروں کو تمہارے ہاتھ سے ذلیل و خوار کرا دے گا۔ کافروں سے خوف مت کرو[1]

اس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ان کفار کی سرکوبی کے لیے جہاں تک تمہارا تعلق ہے، تم پوری طرح مستعد رہو جیسے اللہ نے تو ان کو ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر ہی رکھا ہے[2]

یعنی یہ احتیاط جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے محض دنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے ورنہ دراصل فتح و شکست کا مدار تمہاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلے پر ہے[3]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] تفہیم القرآن

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ
فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ
إِنْ تَكُوْنُوْا تَأْلَمُوْنَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُوْنَ كَمَا تَأْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ
ع ۱۵ ۱۲ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝

پھر جب تم ایک رکعت نماز باجماعت ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے یاد کرتے رہو[۱۶۰]۔ پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قائم کرو[۱۶۱]۔ بلاشبہ نماز اہل ایمان پر بقیدِ وقت فرض کی گئی ہے[۱۶۲]، اور کمزوری و سستی نہ دکھاؤ اگر تم تکلیف سے دوچار ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے اُمیدوار ہو جس کے وہ اُمیدوار نہیں ہیں، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے[۱۶۳]۔

نماز اجتماعی زندگی کی اساس ہے

باطل کی شکست اور حق کی سربلندی کی خاطر لڑنا مسلمان کا فرض ہے اس فرض کو انجام دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اس کی ایک تیاری وہ ہے جو آیت خذوا حذرکم کی ہدایت کی صورت میں بتائی گئی ہے اور ایک تیاری وہ ہے جس کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تو تسبیح کہتا۔ نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی، ایک افسر کی اطاعت، تمام سپاہیوں کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پوری صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست نماز میں مسلمانوں کو صف بندی جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے۔ سردیوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو آنا، عصر کے وقت لہو و لعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا، صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے اندر پیدا کریں اور کام کے وقت احساس فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کے لیے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں۔ ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لیے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پروگراموں میں آرام کے وقت ممکن نہ تھا مگر اس کے لیے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرے میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں۔ نماز اسلام کی اجتماعی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے۔ زمانۂ نبوت اور خلافت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی یا اجتماعی مشکل پیدا ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلاۃ جامعۃ سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے یہ گویا مسلمانوں کے اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا ذریعہ تھا جس کے لیے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا جمع ہونا ضروری تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعائر اور اس کے اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی تھی۔ کسی

قوم کی زندگی اس کے نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر اور پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا صف بصف کھڑا ہونا ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے۔

۱۶۰۔ پھر جب تم نماز ایک رکعت باجماعت ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہو۔ یعنی خوف کے وقت بوجہ تنگی اور بے اطمینانی اگر نماز میں کسی طرح کی کوتاہی ہو گئی تو نمازِ خوف سے فراغت کے بعد ہر وقت ہر حالت میں کھڑے ہو یا بیٹھے یا لیٹے اللہ کو یاد کرو حتیٰ کہ عین ہجوم اور مقاتلہ کے وقت بھی کیونکہ وقت کی تعیین اور دیگر قیود کی پابندی تو بحالتِ نماز تھی جن کی وجہ سے تنگی اور بے اطمینانی پیش آنے کا موقع ہے اس کے سوا ہر حالت میں بلا قید اللہ کو یاد کر سکتے ہو، کسی حالت میں اس کی یاد سے غافل نہ رہو۔ عبداللہ ابن عباس نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ صرف وہ شخص جس کے عقل و حواس کسی وجہ سے مغلوب ہو جائیں البتہ معذور ہے ورنہ کوئی شخص اللہ کی یاد کرنے میں معذور نہیں۔[1]

عام شارحینِ قرآن نے آیت کی یہی تشریح کی ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں جب تم نمازِ خوف کو بیان کردہ طریقہ کے مطابق ادا کر کے فراغت حاصل کر لو تو اللہ کے ذکر پر مداومت کرو۔ قرطبی فرماتے ہیں جب تم نمازِ خوف سے فراغت پالو تو اللہ کو زبان سے، دل سے یاد کرو اور اس پر مداومت کرو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نمازِ خوف کے بعد زیادہ ذکر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ امام رازی نے بھی اوّلیت اسی کو دی ہے، فرماتے ہیں کہ جب نمازِ خوف ادا کر چکو تو سارے احوال میں اللہ کے ذکر پر مداومت کرو۔ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں جب نمازِ خوف سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں جب تم نمازِ خوف سے فارغ ہو جاؤ تو ان حالات میں اللہ کو یاد کرو۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ تم جب نمازِ خوف ادا کر چکو تو سارے حالات میں اللہ کے ذکر پر ہمیشگی کرو، اور نواب صدیق حسن خاں رقمطراز ہیں کہ جب تمہیں نمازِ خوف سے فراغت ہو جائے تو اللہ کو خوب یاد کرو۔ اردو کے شارحینِ قرآن میں سے بلا استثنا سب نے لفظ بلفظ یہی لکھی ہے۔ شارحین میں سے صرف زمخشری

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نے اس آیت قرآنی کی دوسرے انداز میں تشریح کی ہے۔ پہلی آیات میں نمازِ خوف کی جو ترکیب بتائی گئی ہے اسی پر فا کے ذریعے تفریع کی ہے کہ اس طرح جنگ کی حالت میں نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت اس طرح ادا کرو۔ اس طرح آیت کا ترجمہ یوں ہو گا کہ امام کے ساتھ ایک رکعت باجماعت ادا کرنے کے بعد باقی نماز کھڑے بیٹھے اور لیٹے پڑھ لو۔ اس صورت میں قضا کے معنے ادا کرنے اور ذکر کے معنے نماز کے ہیں۔ قیاماً یعنی کھڑے ہو کر تلوار چلاتے ہوئے، قعوداً بیٹھ کر یعنی گھٹنوں کے بل کمان تیر چلاتے وعلیٰ جنوبھم اپنے پہلوؤں پر یعنی زخموں سے چور ہو کر خون بہاتے ہوتے اس طرح اس آیت میں ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت میں ہوئی اس کو ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت البقرہ کی آیت کے مطابق ہو گئی جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر جنگ وغیرہ سے موقعہ نہ ملے تو پھر جس طرح ممکن ہو کھڑے ہی کھڑے ادا کر لو۔ رکوع اور سجدہ کا موقعہ نہ ہو تو اشارہ ہی سے ادا کر لو قبلہ کی جہت نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہی حال سوار کا ہے۔ میری مراد یہ آیت ہے

فان خفتم فرجالاً او رکباناً

پہلے مطلب کی صورت میں جو عام شارحین قرآن نے اختیار کیا ہے لفظ قضا فراغت کے معنے میں ہے اور ذکر اپنے معنے میں ہے۔

پرسکون حالات میں نماز کی اقامت

۱۶۱۔ پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قائم کرو۔ یعنی جب خوف مذکور جاتا رہے اور خاطر جمع ہو جائے پھر جو نماز پڑھو اطمینان اور تعدیل ارکان اور رعایت شروط اور محافظت آداب کے ساتھ پڑھو جیسا کہ امن کی حالت میں پڑھنی چاہیے اور جن حرکات زائدہ کی اجازت دی گئی ہے وہ حالت خوف کے ساتھ مخصوص ہے[1] یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ جنگ کی عارضی اور مخفف نماز کو اقامت صلوٰۃ نہیں کہا گیا۔ حالانکہ ذکر الٰہی تسبیح و تہلیل اور کچھ ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ جب اطمینان ہو جائے تو اقامت صلاۃ کرو۔ معلوم ہوا کہ جنگ کی حالت میں نماز پڑھی گئی ہے قائم نہیں کی گئی ہے۔ اقامت صلاۃ کے معنے مطلق ذکر الٰہی، تسبیح و تہلیل،

[1] افادات شیخ الاسلام

حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامت صلاۃ کے ضمن میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اور اب اس عارضی معنے کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ ارکان تھے جن کے بارے میں سورہ بقرہ میں کہا گیا فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم ما لم تکونوا تعلمون جب خوف جاتا رہا تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔ اقامتِ صلاۃ کے معنے صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے ارکان واجبات سنن اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں یہاں فاذا اطمانتم فاقیموا الصلوٰۃ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان اور شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے۔ نماز کے ارکان اگرچہ قیام، قرأت، رکوع، سجدہ اور قعود ہیں۔ یعنی یہ نماز کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسی طرح جیسے نماز کے ۲۴ واجبات ۴۴ سنتیں اور ۷ مستحبات ہیں ٹھیک اسی طرح نماز کے کچھ باطنی آداب ہیں۔ مثلاً قنوت، خشوع، تبتل، تضرع، اخلاص اور فہم و تدبر، نماز کے بارے میں ان سب کے بارے میں قرآن میں اشارات، اور سنت میں تصریحات ہیں۔ اگرچہ ان میں اسلام کے قانون دانوں نے فرق مراتب کو خوب قوت کے ساتھ واضح کیا ہے لیکن رسائل الارکان میں مولانا بحر العلوم نے اس موضوع پر جس انداز سے دادِ تحقیق دی ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ آئیے آپ بھی لطف اندوزی فرمالیجئے۔ مولانا کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ماہیت کے اجزاء اہمیت اور غیر اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے۔ ایک درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزا کہلاتے ہیں، مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے یہ تمام اجزاء ایک حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح ایک انسان میں ہاتھ پیر، دل و دماغ وغیرہ سب اس کے اجزاء شمار ہوتے ہیں مگر ان اجزاء میں اس عظیم فرق مراتب ہے کچھ کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے ۔ اور بعض کے کٹ جانے سے اس کے نمو میں کمی آتی ہے اور کچھ کے کٹ جانے سے درخت کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اگر ہاتھ پیر قطع کر دیے جائیں تو پھر بھی اسے انسان ہی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی گردن کاٹ دی جائے تو پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ اس کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس کو اب انسان کہنا صرف اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ پر انسان بولا جاتا تھا لہٰذا جس طرح خارج میں کسی ماہیت کے اجزاء میں حکم کا اتنا تفاوت ہوتا ہے اسی طرح فقہائے نے شرعی ماہیات کے اجزاء میں بھی فرق سمجھ لیا ہے۔

نماز کے بعض اجزاء وہ ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز کی آرائش میں فرق آتا ہے اور بعض سے اس کی حقیقت اثر پذیر ہوتی ہے اور کچھ سے اس پر نماز کا اطلاق ہی درست نہیں رہتا۔ پہلی قسم مستحبات دوسری واجبات، تیسری فرائض وارکان کہلاتی ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ان مراتب کا اندازہ کیسے معلوم کیا گیا؟ اس کا اندازہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور کردار سے ہوا۔ نماز کے بعض اجزاء کے چھوڑ دینے پر آپ نے نماز کو ناقص، قابلِ اعادہ بتایا اور بعض کے ترک سے ناقص تو فرمایا مگر اعادہ کا حکم نہیں دیا بعض کی وجہ سے نماز کا ہونا نہ ہونا برابر بتایا۔ آپ کے ارشادات کے اسی نشیب و فراز سے فقہاء نے معلوم کر لیا کہ نماز میں وہ کون سے اجزاء ہیں جن کی ادائیگی سے اقیموا الصلاۃ کا مطالبہ خداوندی پورا ادا ہوتا ہے اور وہ کون سے اجزاء ہیں جن کے چھوڑ دینے سے یہ مطالبہ نقصان کے ساتھ پورا ہوتا ہے اور وہ کون سے اجزاء ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز کی صرف زینت میں فرق آتا ہے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اقامتِ صلاۃ کے معنے یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے ساتھ بجا لایا جاتے۔ اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہیے جس کے بغیر نماز ناقص ہوتی ہے۔ نمازِ خوف میں چونکہ سکون کی دولت ختم ہو جاتی ہے۔ واجبات و سنن کی رعایت نہیں ہوئی اس لیے اسے نماز کہا گیا، اور اب جبکہ اضطراب کے بعد سکون کی حالت واپس آگئی تو نماز قائم کرنے کا حکم دیا۔

نماز بقیدِ وقت فرض ہے

۱۶۲۔ بلاشبہ نماز مسلمانوں پر بقیدِ وقت فرض ہوتی ہے یعنی بے شک نماز فرض ہے۔ وقت معین میں سفر حضر، اطمینان وخوف ہر حالت میں اسی وقت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہو پڑھ لو یا یہ مطلب ہے کہ نماز کے متعلق حق تعالیٰ نے پورا ضبط اور تعین فرما دیا ہے کہ حضر میں کیا ہونا چاہیے اور سفر میں کیا کرنا چاہیے اور خوف میں کیا ہو ہر حالت میں اس کی پابندی چاہیے۔[1]

الجصاص نے لکھا ہے کہ اس آیت میں نمازوں کی فرضیت اور ان کی توقیت بیان کی گئی

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ اگرچہ یہاں اوقات کا اجمالی تصور ہے لیکن آغاز و انجام کی تحدید کے بغیر دوسری آیات میں اوقات کا تذکرہ کیا ہے، قرآن میں ہے؛

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر

آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز قائم کر اور فجر کی قرأت کر۔

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے الجصاص لکھتا ہے تنتظم الآیۃ الصلوٰت الخمس اس جگہ سب سے اہم تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے۔ دلوک کے اصلی معنے جھکنے کے ہیں۔ عربی میں اس کا اطلاق ۳ اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ آفتاب کے اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین جھکاؤ ہوتے ہیں ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے۔ پہلا ظہر کا وقت ہے دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا یہ تین نمازوں کے اوقات ہوئے۔ چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل ہے، یہ عشا کی نماز ہے۔ اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر ہے۔ اس طرح یہ آیت گرامی اپنے اندر پانچوں نمازوں کے اوقات کو سمیٹے ہوتے ہے۔

نماز کے لیے اوقات کی ضرورت

ممکن ہے یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آئے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے انسانیت کو جس دین کامل کی دعوت دی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نظام عملی ہے محض نظری نہیں۔ اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے۔ انسان کی نفسیاتی خصوصیت یہ ہے کہ جو کام اس کو مداومت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے جب تک وہ ان کے اوقات مقرر نہ کرے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا۔ اس لیے ہر منظم باقاعدہ اور دوامی عمل کے لیے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان

کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر متقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے جاتے ہیں۔ اوقات نماز کے تقرر میں اصول وحدت بھی مدنظر ہے۔ مسلمان مختلف شہروں اور ملکوں اور اقلیموں میں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرۂ ہوا میں لگی ہوئی دُوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے۔ اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہو گا یہی منظر یگانگت کا آنکھوں کے سامنے ہو گا۔ مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس جگہ میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اُس وقت وہاں ادا ہوتا ہے یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ہستی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نمازی نظر نہیں آسکتے تھے۔

نماز کے لیے مناسب اوقات

اصل یہ ہے جیسا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے لکھا ہے حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا۔ اس لیے قرآن نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے۔ ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے صبح کو یہ بیدار ہوتا ہے دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے۔ پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں، دل بہلاتا ہے شام ہوتی ہے تو گھر آکر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام

اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں اور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حی علی الصلاۃ کا نغمہ جان فزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے صانع عالم کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرا نقش ہو۔ اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے۔ دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کرتا ہے۔ اس موقعہ پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ پھر دوپہر کے بعد جب آرام سے فارغ ہو کر کام کے لیے تازہ دم ہوتا ہے تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے۔ اس کے بعد شام ہوتی ہے جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو پھر سوتے وقت جب انسان اپنی احساس زندگی کے لیے کچھ دیر کے لیے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کہ اس دنیا سے بے خبر ہو کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہو گا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں اس لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی اسی لیے عشا سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے کہ یہ وقت صرف خواب راحت کے لیے موزوں ہے۔ ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں ان ہی کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے۔[1]

جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت اور فضیلت

۱۶۳۔ اور کمزوری و سستی نہ دکھاؤ اگر تم تکلیف سے دوچار ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں اللہ سب کچھ جاننا

[1] سیرت النبیؐ۔

ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ یعنی کفار کی جستجو اور ان کے تعاقب میں ہمت سے کام لو اور کوتاہی نہ کرو۔ اگر تم کو ان کی لڑائی سے زخم اور درد پہنچا ہے تو اس تکلیف میں وہ بھی شریک ہیں اور آئندہ تم کو حق تعالیٰ سے وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔ یعنی دنیا میں کفار پر غلبہ اور آخرت میں ثواب عظیم اور اللہ تعالیٰ تمہارے مصالح اور تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے اس کا جو حکم ہے اس میں تمہارے لیے بڑے منافع ہیں۔ دین اور دنیا دونوں کے لیے سو اس کے امتثال کو غنیمت اور بڑی نعمت سمجھو[1]

مطلب یہ ہے کہ کفر کی طاقتیں جو اس وقت دعوت اسلامی اور اسلامی نظام کے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی ہیں تمہیں اس رکاوٹ کے ہٹانے میں کمزوری اور سستی نہ دکھانی چاہیے۔ اصل ارشاد میں لا تھنوا آیا ہے یہ وہن سے بنا ہے۔ عمل ارادے، کردار، رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اندر عزیمت، بلند ہمتی پیدا کرو، جنگ اور اس کے لوازم میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو۔ گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد ان لوگوں پر بھرپور حملہ کر دو اور ان راہوں سے بچ کر رہو جو تم میں کسی وجہ سے کمزوری کا باعث ہو سکتی ہیں اور وہ کردار اختیار کرو جو تم میں اس کام کے لیے جوش پیدا کریں۔ اس راہ میں تکلیفوں سے دل برداشتہ ہو کر پست ہمت نہیں ہونا چاہیے۔ کفر بھی تکلیفوں سے دردمند ہے اور تم بھی، مگر دونوں میں فرق ہے تم حق کی خاطر تکلیف برداشت کر رہے ہو جب کہ کفر باطل کو فروغ دینے کے لیے تکلیفیں برداشت کر رہا ہے اور پھر کفر کے پیش نظر صرف دنیا کے ناپائدار فائدے ہیں جبکہ تمہارے پیش نظر رب السماوات والارض کی خوشنودی و تقرب اور اس کے ابدی انعامات ہیں۔ یہاں جہاد کے موضوع پر ترجون من اللہ مالا یرجون فرما کر جہاد کی فضیلت کی طرف اور لا تھنوا فرما کر جہاد کی اہمیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہمیت اور فضیلت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اتنی ہی افضل ہے۔ حضور انور نے جہاد کی اہمیت اور فضیلت کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس کا سرسری اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اسلامی احکام میں جہاد کو جو اہمیت ہے وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی فرض، کسی حکم، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔

قرآن و سنت میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ اسلامی زندگی اسی عمل کے بقا پر موقوف ہے جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا اس وقت تک نظامِ کفر ان پر غالب نہ آ سکے گا۔ جس روز یہ جذبہ مردہ ہو جائے گا اسی دن اسلامی زندگی کی موت شروع ہو جائے گی۔ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی نہ رہا۔ حکومت و عزت ان ہی کے لیے تھی جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آ گیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے تو ذلت و محکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ

چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی تھی اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہو گی اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔ کوئی خاص وقت اور عہد اس کے لیے مخصوص نہیں ہر حال ہر زمانے میں ایک اسلامی زندگی کے ایمان اور صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے یہی سنام دین ہے یہی اساس شریعت یہی ملاک اسلام ہے۔ یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے۔ یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصلی پہچان ہے۔ نماز اسی سے ہے روزہ اسی سے ہے، حج اسی سے ہے زکوٰۃ کا مصرف یہی ہے۔ سب اس کی خاطر ملتوی کیے جا سکتے ہیں اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے کی ڈھال ہے لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کرنے والی تلوار۔ پس اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے۔ ہزاروں نمازیں ہزاروں روزے بھی اس ایک قطرۂ خون کی فضیلت نہیں پا سکتے جو اس راہ میں بہایا گیا۔ اور عمر بھر کی خیرات صدقات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصلی پہچان ہے جس مسلمان کے دل میں اس کا ولولہ نہ ہو وہ ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہے۔ نفاق کی ظلمت اس پر چھا گئی۔ صحیح مسلم میں ہے:

جو مسلمان دنیا سے اس حالت میں گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی۔ اور نہ اس کے دل میں اس بات کی طلب رہی اس کی موت ایسی حالت میں ہوئی جو

نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

قرطبی نے اس کی شرح میں لکھا ہے فیہ دلیل علی وجوب العزم اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم و ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس کے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہو گیا تو وہ مومن نہیں ہے منافق ہے۔

ترمذی میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا کہ ای الاعمال احب الی اللہ ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے زیادہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے۔ اس پر سورۃ صف کی یہ آیت نازل ہوئی۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص
اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ان جہاد کرنے والوں کو پسند کرتا ہے جو اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں کہ گویا ایک دیوار ہے سیسہ پگھلائی ہوئی۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا ای العمل افضل؟ کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ فرمایا ایمان باللہ ورسولہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا اس کے بعد کون سا عمل؟ فرمایا الجہاد فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں جہاد۔

بخاری میں ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ حضور سے پوچھا گیا کہ سب سے افضل آدمی کون ہے؟ آپ نے فرمایا من یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ ومالہ وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے۔ اور فرمایا جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح و شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے جن پر سورج نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔

حد ہو گئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جان نثاریاں کی تھیں اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہوئی تو آپ نے یہ کہہ کر ان کو کچھ بھی کہنے سے انکار کر دیا "یہ وہ جان نثار ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے۔ عجب نہیں کہ اس عمل کی برکت سے ان کی ساری اگلی اور پچھلی خطائیں بخش دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ جو چاہے کرو۔

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ جب شام کے رومیوں کی تیاریوں کی خبر پہنچی تو مدینے میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی۔ کسی طرح کا ساز و سامان نہ تھا۔ حضرت عثمان نے یہ حال دیکھا تو اپنا تجارتی قافلہ پورا کا پورا جناب نبوت میں پیش کر دیا جو شام جانے کے

لیے تیار ہوا تھا۔ اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے اور دو سو اوقیہ سونا تھا جس کا وزن ہمارے حساب سے تقریباً پندرہ سو انیس تولہ چار ماشہ دو رتی ہوتا ہے۔ یعنی آج کے حساب سے نو لاکھ گیارہ ہزار چھ سو بارہ روپے بنتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے دن کے بعد سے عثمان خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ سبحان اللہ عمل جہاد کی برکت یہ ہے کہ جہاد کے لیے اپنا مال و متاع قربان کرنا خدا اور رسول کی نظروں میں ایسا محبوب و محترم کام ہے جس کے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو فرمایا کیا تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ نماز ہی پڑھتے رہو، روزہ ہی رکھتے رہو۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ تو میری طاقت سے باہر ہے فرمایا پھر بخدا اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے جب بھی ان لوگوں کی فضیلت کو نہیں پا سکتے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں کیا تم نہیں جانتے ہو کہ مجاہد کا گھوڑا لگام میں اچھلتا ہے تو اس کے لیے بھی اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں (رواہ احمد)

بخاری و مسلم میں ہے کہ تین بار آپ سے دریافت کیا گیا ما یعدل الجہاد جہاد کے برابر کون سا کام فضیلت رکھتا ہے تینوں مرتبہ جواب میں فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے ہو۔ یعنی کوئی عمل اس کے برابر نہیں پھر فرمایا مجاہد کی مثال تو اس روزہ دار کی ہے جو اللہ کی جناب میں کھڑا رہتا ہو اور کبھی بھی نماز روزے سے الگ نہ ہو۔ اور فرمایا جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کے لیے بھی گرد آلود ہوتے دوزخ کی آگ ان پر حرام ہے۔ بخاری میں بھی روایت تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔ حافظ عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں، اس حدیث سے جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے جب صرف غبار راہ سے قدموں کا آلودہ ہونا اتنا بڑا اجر رکھتا ہے کہ جہنم کی آگ اس پر حرام ہو جاتی ہے تو جو خوش نصیب جہاد میں کمال سعی و تدبیر کرے اور اپنی جان و مال کو اس کے لیے وقف کر دے اس کے اجر و ثواب کا کیا حال ہوگا اور کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہے واللہ یضاعف لمن یشآء۔

ارباب سنن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جاتا ہو مگر وہ شخص جو جہاد میں دشمن کے حملے کی انتظار میں مرا ہو اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔ یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد میں حصہ نہ لے سکیں مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں یا اور کسی طرح کی خدمت انجام دیں تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے لیکن ان کے لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں، طاعتوں سے بڑھ کر اجر ہے۔ ابن ماجہ میں ہے:

جو مسلمان ایسے وقت میں گھر سے نہ نکلا صرف اپنے روپے سے جہاد میں مدد دی تو اس کو ہر روپیہ کے بدلے سات سو روپیہ کا اجر ملے گا اور جس نے روپیہ بھی لگایا اور خود بھی شریک ہوا تو اس کے لیے سات لاکھ کا اجر ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی واللہ یضاعف لمن یشاء۔

اور امام بخاری نے باب باندھا ہے فضل من جھز غازیا اس میں زید بن خالد کی حدیث لائے ہیں کہ جس نے مجاہد اور غازی کے سامان کا انتظام کیا تو گویا اس نے خود جہاد کیا اور جس نے اس کے پیچھے اس کے کاموں کی دیکھ بھال کی تو اس کے لیے بھی ایسا ہی اجر ہے۔

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے وہ سب جانتے ہیں بالخصوص والدین اور اقربا کے حقوق کو ساری نیکیوں سے مقدم بتاتے ہیں لیکن جہاد ہی وہ عظیم عمل ہے جس میں یہ حقوق بھی رکاوٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت موقوف ہے۔ ان پر تفصیلی تبصرہ دسویں پارے میں آ رہا ہے۔ بہر حال میں نے یہاں جہاد کی اہمیت اور فضیلت کو اس لیے پیش کیا ہے تاکہ قرآن کی بات ترجون من اللہ ما لا یرجون واضح ہو کر کوزہ ذہن میں آ جائے کہ ایمان کا نقطۂ نظر کیا ہوتا ہے۔ مقاصد کی راہ میں تکلیفیں مومن کو بھی پیش آتی ہیں اور کافر کو بھی لیکن مومن کے لیے جھیلنا سہل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے سامنے ایسی امیدیں رکھتا ہے جو کافر کو میسر نہیں وہ یقین رکھتا ہے کہ میں جو تکلیف اٹھا رہا ہوں اللہ کی راہ میں ہے اور میرے لیے دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آخرت میں بھی۔ پھر افسوس اس مومن پر جو مقاصد حق کی راہ میں اتنا بھی نہ کر سکے جتنا ایک کافر باطل کی راہ میں کرتا ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ
ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ
غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ
ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا
يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ
وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ
فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن
يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

اے پیغمبر ہم نے تم پر سچائی کے ساتھ الکتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو جیسا کچھ خدا نے تم کو سمجھایا ہے اور خیانت کرنے والوں کی طرفداری میں نہ جھگڑو۔[۱۰۴] اور اللہ سے مغفرت مانگو بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[۱۰۵] اور جو لوگ

جو اپنے اندر خیانت رکھتے ہیں تم ان کی طرف سے نہ جھگڑو خدا ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خیانت اور گنہ گاری میں ڈوبے ہوئے ہوں، اسی طرح کے لوگ انسانوں سے شرماتے ہیں اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اپنی مجلس میں ایسی ایسی باتوں کا مشورہ کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے قابو میں ہے"[166] دیکھو تم ہی وہ لوگ ہو کہ جنہوں نے ان مجرموں کی جانب سے دُنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا ہے بتاؤ روزِ قیامت ان کی جانب سے اللہ کی عدالت میں کون جھگڑا کرے گا یا ان کا اس روز کون وکیل ہوگا۔"[167]

عدلیہ کے فرائض و واجبات

یہاں پر اصل موضوع کی طرف سلسلہ کلام لوٹ گیا ہے۔ اسلام کا معاشرتی، معاشی اور اخلاقی نظام بیان کرنے کے بعد اصل موضوع اسلام کا سیاسی نظام تھا۔ آغاز میں اسلام کا سیاسی نظام

بیان کرتے ہوئے عدلیہ اور انتظامیہ کی طرف اشارہ کرکے اسلام کے سیاسی نظام میں مصادر قانون بیان کیے گئے تھے اور بتایا تھا کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ یہی دونوں اسنادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سر تسلیم خم کریں گے۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں ان اصول استناد کو سند اور مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام سے ممتاز کرتا ہے جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔ ان دونوں اصول استناد کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے بعد بات کا رخ اس طرف ہو گیا کہ ان اصول استناد پر مبنی اسلامی نظام کو دنیا میں رائج اور قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ رکاوٹیں دو طرح کی ہیں داخلی اور خارجی، ان ہی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے جہاد کا حکم ہوا اور اسی کی خاطر ہجرت کی تلقین کی گئی۔ اسی سلسلے میں جہاد کی اہمیت اور فضیلت بتائی گئی۔ میدان جنگ میں نماز کی ادائیگی کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ اب ان آیات میں ایک واقعہ کی روشنی میں عدلیہ اور انتظامیہ کو خاص ہدایتیں دی گئی ہیں مثلاً۔

۱۔ عدالت کو چاہیے ہر حال میں حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے اس معاملہ میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز نہ ہونی چاہیے۔

۲۔ عدالت میں فیصلہ کرنے والا ہمیشہ اللہ سے مدد کا طالب رہے کیونکہ عدالت کی ذمہ داری نہایت نازک ہے ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کے میلان سے کوئی لغزش ہو جائے۔

۳۔ عدالت کو ایسی کوئی بات نہ کرنی چاہیے جس سے کسی فریق کی وکالت کی بو آئے۔

۴۔ مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی مجرم کی ہرگز حمایت نہ کرنی چاہیے۔

۵۔ تمام مسائل زندگی میں نبوت کے فیصلوں کی حیثیت اللہ کی اراءت کی ہے یعنی اصول استناد میں قرآن اگر ما انزل اللہ ہے تو نبی کا طریقہ، فیصلہ اور حکم ما اراہ اللہ ہے۔

۶۔ اسلام کے نظام کو جو چیز نظام کفر سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ نظام کفر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور نظام اسلام صرف اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اللہ نے دی ہے کفر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین سے کرتا ہے اس کے

برعکس اسلام اپنے ہر معاملہ میں اصولِ استناد ما انزل اللہ اور ما اراہ اللہ یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسُول کی سنت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر ان میں کوئی روشنی نہ ملے تو وہ آزادی عمل برتتا ہے۔ اس رکوع کی اصلی رُوح یہ بتاتا ہے کہ مصادرِ قانون میں الرسُول کی حیثیت کیا ہے اور بعد والے رکوع میں اسی کی اہمیت اور عظمت کو ظاہر کیا ہے۔

۱۶۴۔ اے پیغمبر ہم نے تم پر سچائی کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرد جیسا کچھ خدا نے تم کو سمجھا دیا ہے اور خیانت کرنے والوں کی طرف داری میں نہ جھگڑو۔ منافق اور ضعیف الایمان لوگوں میں جب کوئی کسی گناہ اور خرابی کا مرتکب ہوتا تو سزا اور بدنامی سے بچنے کے لیے حیلے گھڑتے اور آپ کی خدمت میں اس کا اظہار کرتے کہ آپ ان کو بری سمجھ جائیں بلکہ کسی بری الذمہ کے ذمہ تہمت لگا کر اس کے مجرم بنانے میں سعی کرتے اور باہم مشورہ کرتے چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک ایسے ہی مسلمان نے دوسرے مسلمان کے گھر میں نقب لگائی ایک تھیلا آٹے کا اور اس کے ساتھ کچھ ہتھیار چوری کر کے لے گیا۔ اس تھیلے میں اتفاقاً سوراخ تھا چور کے گھر تک راستہ میں آٹا گرتا گیا۔ چور نے یہ تدبیر کی کہ مال اپنے گھر میں نہ رکھا بلکہ رات ہی کو لے جا کر وہ مال ایک یہودی کے پاس بطورِ امانت رکھ آیا جو اس کا واقف تھا۔ صبح کو مالک نے اسی سوراخ پر چور کو جا پکڑا مگر تلاشی پر اس کے گھر سے کچھ نہ نکلا، اُدھر چور نے قسم کھالی کہ مجھے کچھ خبر نہیں۔ آٹے کا سراغ آگے چلتا نظر آیا تو مالک نے اسی سراغ پر یہودی کو جا پکڑا اس نے مال کا اقرار کر لیا کہ میرے گھر میں موجود ہے مگر میرے پاس تو رات کو فلاں شخص امانت رکھ گیا ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔ مالک نے یہ معاملہ حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چور کی قوم اور اس کی جماعت نے ایکا کر لیا کہ جس طرح ہو سکے چور پر چوری ثابت نہ ہونے پائے چور یہودی بنے۔ چنانچہ یہودی سے جھگڑے اور آپ کی خدمت میں چور کی برأت پر قسمیں کھائیں، گواہی دی، قریب تھا کہ یہودی کو چور سمجھ لیا جائے اور مجرم بنا دیا جائے کہ حق سبحانہ نے اس پر متعدد آیات نازل فرمائیں۔ اور حضرت رسُول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سب کو متنبہ فرمادیا کہ چور یہی مسلمان ہے یہودی اس میں سچا اور بے قصور ہے اور ہمیشہ کے لیے ایسے لوگوں کی قلعی کھول کر سب کو متنبہ کر دیا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے رسول ہم نے اپنی سچی کتاب تجھ پر اس لیے اتاری ہے کہ ہمارے سمجھانے اور بتلانے کے موافق تمام لوگوں میں نیک ہوں یا بد، مومن ہوں یا کافر حکم اور انصاف کریں اور چور دغاباز ہیں ان کی بات کا اعتبار اور ان کی طرفداری ہرگز مت کرو اور ان کی قسم اور

ان کی گواہی پر کسی بے قصور کو مجرم مت بناؤ یعنی ان دغابازوں کی طرف سے ہو کر یہودی سے مت جھگڑو۔[1]

یہ واقعہ جو شیخ الاسلام نے بیان کیا ہے علامہ قرطبی نے اسی طرح بلا سند پیش کیا ہے اور علامہ بغوی نے اسے کلبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ کلبی کا حال تاریخ و روایت میں کیا ہے۔ اس پر ہم پہلے تبصرہ کر چکے ہیں اور یہی واقعہ امام ترمذی نے اپنے جامع میں اور حاکم نے مستدرک میں ابن سعد نے طبقات میں اس سے مختلف پیش کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان جو منافق تھا اور جس کا نام طعمہ یا بشیر تھا نے ایک انصاری کی زرہ چرالی۔ اور چوری کر کے مال مسروقہ یہودی کے یہاں رکھ دیا۔ زرہ کے مالک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں استغاثہ کیا اور طعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا مگر طعمہ اور اس کے بھائی بندوں نے اتفاق کر کے الزام یہودی کے سر رکھ دیا۔ یہودی سے دریافت کیا گیا تو اس نے اپنی برأت کی لیکن طعمہ کے ساتھی طعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے رہے۔ قریب تھا کہ مقدمہ کی ظاہری رُوداد کی بنا پر یہودی کے خلاف فیصلہ ہو جاتا کہ وحی آئی اور معاملہ کی ساری حقیقت کھول دی۔ یہ ہم نے خلاصہ پیش کیا ہے ورنہ کتابوں میں قصہ بڑا طویل ہے۔ اگرچہ روایتی طور پر اس کی تاریخی حیثیت پائدار نہیں ہے مگر سیاق قرآنی بتا رہا ہے کہ اس قسم کا واقعہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ واقعہ کی تفصیلات اور اس کی جزئیات سے نظر ہٹا کر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ خود سیاق قرآنی کیا ہے اوروں نے جو کچھ سمجھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اور درست ہے لیکن میں نے جو کچھ سمجھا ہے چاہتا ہوں کہ وہ سمجھادوں۔ جیسا کہ پہلے تمہید میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اصل موضوع اسلامی نظام میں مصادرِ قانون ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے اصولِ استناد پیش کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کا ذکر کیا ہے فردوہ الی اللہ والرسول اللہ کی حد تک تو یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ اللہ کی اطاعت یا اللہ کی طرف لوٹنے کا مطلب ما انزل اللہ کی اطاعت ہے اور ما انزل اللہ کتاب اللہ اور قرآن ہے لیکن الرسول کی حد تک یہ بات وضاحت طلب ہے۔ رسول کے معنے پیغمبر اور قاصد کے ہیں یعنی قرآن کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچانا اس کا کام ہے پھر ما انزل اللہ سے الگ ہو کر رسول کی طاعت کا مفہوم کیا ہے۔ قرآن یہاں اسی بات کو سمجھانا اور اپنے مخاطبوں کے ذہنوں میں اتارنا چاہتا ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے

[1] افادات شیخ الاسلام

محفوظ ہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمامتر دُور نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے اس اختلافِ فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسُول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرا دی گو انسانی ذرائع حفظ و درایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس کی تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلاف کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلے کی یہ صورت رکھی گئی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہتے اور آپ ما انزل اللہ کے اصول و کلیات کے تحت اپنے نورِ بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہتے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی حیثیت حضور انور کی اپنی رائے کی نہیں بلکہ اللہ کی ارآت کی ہے۔ اس ما انزل اللہ کے نزول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ اے پیغمبر اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعے جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سمجھائے اور دکھائے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو بھی سمجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا دوسرا مصدر ہے۔

یہ بات بھی قرآن میں بتائی گئی ہے کہ رسُول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسُول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

اس موضوع پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو ملا کر دیکھئے سب سے پہلے کہا گیا ہے کہ مسائل زندگی میں اللہ و رسُول کی طرف رجوع کرو فردوہ الی اللہ والرسول، پھر کہا گیا کہ رسُول آتا ہی اس لیے ہے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے الا لیطاع باذن اللہ اور پھر ہر قسم کی پوری قوت اور زور سے یہ اعلان کیا گیا کہ کوئی شخص کبھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے تمام جھگڑوں قضیوں میں رسُول کو حاکم نہ بنائے۔ فلا وربك لا يؤمنون اور اب بتایا جا رہا ہے کہ آپ پر یہ کتاب اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم جیسا خدا تم کو سمجھائے اس کے ذریعے فیصلے کرو۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی

ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لیے نہیں، یہ نبوت کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرح صدر تبیین، تفقہ اور ارائت کے ذریعے فرماتا تھا۔ لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً ما انزل اللہ کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھاتا تھا۔ آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضا مندانہ طاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے بلکہ ایمان کی نشانی ہے۔ آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات میں ہم وہی فیصلہ جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کیے کیونکہ آپ کے فیصلے بحکم خداوندی غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

ایک غلط استدلال

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارائت الٰہی ہوتی تھی۔ یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سمجھائی جاتی تھی اور یہ ارائتِ الٰہی علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں انسانی دماغ سے نہیں بلکہ قلب نبوت کے سرچشمہ سے بہتی ہیں۔ انسانی خیال اور تجربہ سے نہیں بلکہ الہامِ الٰہی اور القائے ربانی، حکمتِ یزدانی، فہم رسالت بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار قرآن وسنت فاروق اعظم برسرِ منبر فرماتے ہیں:

> لوگو! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا اور ہماری رائے تو صرف ہمارا گمان اور سراسر تکلف ہے۔
>
> (ابوداؤد)

اور ظاہر ہے کہ ارائتِ الٰہی جو بمنزلہ وحی ہے غلط نہیں ہو سکتی لیکن ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

> میں ایک آدمی ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو اگر میں کسی کو حق دلا دوں جو اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کاٹ کر دے رہا ہوں۔

اس سے ایک غلط رو شخص یہ استدلال کر سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ہمیشہ ارادت الٰہی کے تحت نہ ہوتے تھے اس لیے امت اسلام کے سیاسی نظام میں آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں لیکن ایسا سوچنا سراسر غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک واقعہ کی اصلی روداد دوسری اس روداد پر صحیح اور عادلانہ فیصلہ۔ یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور مدعی، مدعا علیہ میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے۔ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے لیے فریقین کے بیانات شہادتیں اور دلائل ہی کارآمد اور مفید ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہنا کہ دوسری چیز یعنی جس روداد کو اپنے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ عادلانہ نہ ہوتا تھا۔ نبوت کی شان کی توہین اور تحقیر ہے اور اس ارادت کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلے میں قرآن کی اس آیت نے آپ کو بخشا ہے۔ اسی لیے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی شہادت و دلیل کو سن کر اس کے مطابق واقعہ یا خلاف واقعہ ہونے تک محدود تھی لیکن جس کو آپ نے صحیح باور کر لیا اس کے مطابق مناسب اور صحیح حکم و فیصلہ میں آپ سے کبھی غلطی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی تھی۔ اور امت آپ کی پیروی آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں خوب سمجھ لیجئے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا ارشاد ہے:

وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امراً ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالاً مبيناً۔

اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس کو اپنے کام کا کوئی اختیار رہے اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہ ہے۔

قانون سازی کا طریق کار

آپ کے بعد بھی اُمت کو قرآن میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے لیکن آپ میں اور اُمت میں جوہری فرق ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ قرآن سے اللہ کی ارائت ہوتا تھا جبکہ آپ کے بعد ہر شخص کا قرآن سے فیصلہ رائے ہے اور دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ایک شخص نے فاروق اعظم سے کہا فاحکم بما اراک اللہ آپ اللہ کی ارائت کے مطابق فیصلہ کیجئے۔ تو حضرت عمر نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ ارائت نہیں بلکہ رائے ہے اسی لیے خلفائے راشدین نے اپنے اپنے زمانہ میں ان نو بنو تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے ماانزل اللہ کو اور اس کے بعد ما اراہ اللہ کو یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت نور بصیرت اور ارائت الٰہی کے ذریعے فیصل ہوتے تھے۔ قانون سازی کے لیے مصدر قرار دیا اور ان دونوں یعنی ما انزل اللہ اور ما اراہ اللہ کو ہمیشہ کے لیے اسلامی زندگی میں قانون سازی کے لیے اصول استناد کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اسی طریق کار کو بعد کے فقہائے نے اختیار کیا۔ اور ہر نئے واقعہ کو کتاب اللہ اور فیصلہ نبوی کے معصوم اور مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا بلکہ حافظ ابن القیم تو یہاں تک فرما گئے ہیں کہ اسلام میں عادلانہ سیاست پر مبنی قانون سازی بھی اسلام ہی کا ایک باب ہے۔

کیونکہ انبیاء کی بعثت اور کتابیں نازل کرنے سے اللہ سبحانہ کا منشا یہ تھا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ یہی وہ عدل ہے جس کے سہارے آسمان و زمین قائم ہیں۔ لہٰذا جب حق کی علامات نمایاں ہو جائیں، عقلی دلائل سامنے آجائیں اور کسی طریقہ سے بھی حق واضح ہو جائے تو وہی شریعت الٰہی اور دین الٰہی ہے، وہی اللہ کا فرمان ہے اور اسی میں اللہ کی رضا مضمر ہے۔ عدل تک پہنچنے کے طریقوں یا اس کے دلائل اور علامات کو اللہ نے کسی ایک قسم کے احکام میں محصور کر کے دوسرے قوی تر، زیادہ واضح اور مدلل طریقوں کو باطل نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس نے جو طریقے بھی شروع فرمائے ہیں ان کے ذریعے یہ واضح کر دیا ہے کہ اصل مقصد حق اور عدل کا قیام اور انسانی

زندگی کی متوازن اور منصفانہ تنظیم ہے۔ بس حق تک جس طریقہ سے بھی پہنچا جا سکے اور عدل کو جس طرح بھی پہچانا جا سکے اس کے مطابق قانون سازی ضروری ہے۔ اسباب و وسائل اور طریقے مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ اصل مقصود وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر انہیں وضع کیا گیا ہو، البتہ مشروع طریقوں کو سامنے لا کر اللہ تعالیٰ نے مناسب مثالوں اور معقول اسباب کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ حق کے ثابت شدہ طریقوں میں سے ہر طریقہ آپ کو انہی مقاصد کی طرف لے جانے والا ملے گا۔ شریعتِ کاملہ سے اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی، ہمارے نزدیک سیاستِ عادلہ شریعتِ کاملہ کی مخالف نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک حصہ اور اس کے مختلف ابواب میں سے ایک باب ہے اس کو سیاست کہنا محض ایک اصطلاحی امر ہے ورنہ اگر وہ عدل پر مبنی ہو تو شریعت میں داخل ہے (اعلام الموقعین ج ۲)

جدید اسلامی قانون سازی کی اصولی حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس نکتہ کو سمجھنا بے حد ضروری ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی شرائط کی پابندی کرتے ہوئے جو قوانین مرتب کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ البتہ ان اجتہادی قوانین کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو گی جو قرآن و سنت کے منصوص احکام کو حاصل ہے۔ اجتہادی قوانین اختلافی ہوتے ہیں۔ تفصیلی امور میں اسلامی مفکرین کی ان رایوں کو حرفِ آخر نہ سمجھنا چاہیے جو کسی نص صریح پر مبنی نہ ہوں۔

بہرحال آیتِ قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت میں صرف قرآن کو لوگوں تک پہنچانا ہی آپ کا کام نہیں ہے بلکہ جیسے اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح آپ کے فرائض میں داخل ہے ایسے ہی اللہ کی ارأت کے مطابق اس کتاب کے ذریعے لوگوں کے تمدنی، معاشی، ثقافتی، معاشرتی، دیوانی اور سیاسی معاملات و مسائل میں فیصلہ کرنا بھی آپ کا کام ہے۔ اب یہی حق و باطل کی کسوٹی ہے۔ آپ اسی کسوٹی پر رکھ کر لوگوں سے معاملہ کریں جو اس پر یعنی قرآن پر اور قرآن سے اللہ کی ارأت کے مطابق آپ کے فیصلے پر پورا اترتا ہے وہ مومن اور مخلص ہے اور جو اس میں کھوٹا ہے وہ غدار اور بے وفا ہے۔ آپ اس کی طرفداری نہ کریں۔ خواہ کوئی ہو۔

عدالت میں قضا کی نزاکت

۱۶۵- اور اللہ سے مغفرت مانگو بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی قبل تحقیق صرف حال کو دیکھ کر چور کو بری اور یہودی مذکور کو چور خیال کر لینا تمہاری عصمت اور عظمت شان کے مناسب نہیں اس سے استغفار چاہیے۔ اس میں ان مخلصین صحابہ کو کامل تنبیہ ہو گئی جو بوجہ اسلامی تعلق یا قومی وغیرہ، چور پر حسن ظن کر کے یہودی کے چور اپنانے میں کوشاں تھے۔[1] علماء اور شارحین قرآن نے یہ مطلب بھی بتایا ہے کہ جن لوگوں نے چور ہونے کے باوجود طعمہ کی حمایت کی اور یہودی کو چور بتایا ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیے۔ مطلب خواہ کچھ ہو اور استغفار کا تعلق خواہ کسی سے ہو آیت بتا رہی ہے کہ قضا کا معاملہ جج کے لیے بڑی نزاکت کا معاملہ ہے۔ طبیعت کے میلان سے ہر وقت خرابی کا اندیشہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں ایک فریق دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی تو در اصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپ کے مقام عصمت کے منافی نہ تھا لیکن اس وقت جب کہ کفر و اسلام کے درمیان زبردست کشمکش برپا تھی اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رودادِ مقدمہ کے مطابق فیصلہ کر دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپ کے خلاف اور اسلام کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا۔ اس لیے قرآن نے خاص طور پر آپ کو مخاطب کیا ہے کہ آپ کو طبیعت کے ایسے میلان سے جو کسی فریق کی چرب زبانی یا مسلمان کی حمایت کے جوش میں پیدا ہو سکتا ہے اللہ کی جناب میں استغفار کرنی چاہیے عمداً عدل و انصاف کو بالفعل ہاتھ سے نہ دیا ہو اور کسی فریق کی طرف میلان بھی نہ ہوا ہو۔ کیونکہ آپ طہارت قلب کے جس مقام رفیع پر ہیں اس کا تقاضا یہی ہے۔ ولا تکن للخائنین خصیما مت ہو تو خیانت کرنے والوں کے بیلے جھگڑا کرنے والا، اسے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آپ نے کوئی فی الواقع طرفداری کی ہو گی۔ قرآن میں جو حکم آپ کو دیا جاتا ہے اس کا لازماً یہ منشا ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ ایسا کر چکے ہیں اس لیے ممانعت آئی ہے بلکہ اس اندازِ بیان سے اُمت کی تعلیم مقصود ہوتی ہے اور آپ کو مخاطب کر کے اس کی سنگینی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اقم الصلاۃ کا حکم بار بار اس لیے نہیں آیا کہ آپ نے نماز چھوڑ دی تھی، آپ نے طعمہ کے واقعہ میں اس کی جانب سے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا۔ اس اندازِ بیان سے دوسرے مخاطبوں کی جھوٹی امیدوں کو ختم کرنا تھا۔ ورنہ فیصلہ کے معاملہ میں حضور انور کی امانت و دیانت تو قبل از نبوت بھی مسلم تھی۔ اگر آپ میں اس قسم کی طرفداری کا ذرہ بھی ہوتا تو عرب جیسی اکھڑ قوم آپ کو الامین کا لقب کیوں کر دیتی۔ لہٰذا اگر قبل از نبوت آپ کی دیانت و امانت پر کبھی حرف گیری نہیں ہوئی ہے تو بعد از نبوت اس کا امکان بھی سوچنا حقائق و واقعات کا مُنہ چڑانا ہے۔ ہاں آپ کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور پیش آئے ہیں کہ ان کے اندر اچھوں اچھوں کے پائے استقامت میں لغزش آجاتی لیکن آپ وہاں بھی فوق العادت، امانت و دیانت کے پیکر رہے۔ ایسے مواقع پر اللہ کی وحی نے آپ کی دستگیری فرمائی چنانچہ اس واقعہ میں بھی فیصلہ کرنے سے اللہ سبحانہٗ نے آپ کی دستگیری فرمائی۔ ایک طرف یہودیوں سے سیاسی تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں دوسری طرف حالاتِ مقدمہ یہ ہیں کہ گواہی دینے والے گواہی دے رہے ہیں کہ طعمہ بے قصور ہے۔ ان حالات میں حضور انور کو نہ یہودیوں کے سیاسی تعلقات کی پرواہ ہے اور نہ آپ کو اس کی پرواہ ہے کہ کچھ مسلمان اس کے ساتھ ہیں۔ آپ حق و انصاف کا بول بالا کرتے ہیں اور یہودی کو دشمن ہونے کے باوجود بری اور طعمہ کو مسلمان ہونے کے باوجود مجرم گردان رہے ہیں۔ ایسے عدل و انصاف کی دُنیا میں نظیر نہیں مل سکتی ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں خلش ہو کہ صورتِ حال اگر یہ ہے تو پھر قرآن آپ کو استغفار کی کیوں تلقین کر رہا ہے۔ استغفار کے معنیٰ لغت میں حفاظت چاہنے کے ہیں جیسا کہ ابن القیم نے مدارج السالکین میں لکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشکلات میں حالات پر قابو پانے کے لیے اللہ کی حفاظت چاہو۔ منشا یہ ہے کہ قضا کا معاملہ ضروری ہونے کے ساتھ اپنے اندر اس قدر نزاکتیں رکھتا ہے کہ کوئی جج ایک آن کے لیے بھی اپنے آپ کو خدا کی حفاظت سے بے پرواہ نہ سمجھے۔ آپ کو مخاطب کر کے اسلام کی عدلیہ کو سمجھایا جا رہا ہے اور قرآن تعلیم دے رہا ہے کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی شخص، پارٹی، برادری، قرابت کی نہیں بلکہ عدل و انصاف کی حمایت کرنی چاہیے۔ گویا کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ عدالت کے فرائض میں یہ بات

داخل ہے کہ عدالت میں بیٹھ کر جج اپنا ذاتی طبعی اور اعتقادی رجحان کا کسی درجہ میں مظاہرہ نہ کرے، اور جس کے بارے میں عدالت کو ذاتی طور پر برحق ہونا معلوم ہو اس کی کوئی مدد نہ کرے بلکہ عدالت کا کام یہ ہے کہ فریقین میں ہر طرح برابری کا مظاہرہ کرے اگر عدالت ایسا کرے گی تو وہ خصیم ہو جائے گی۔

خیانت کار لوگوں کی سفارش

۱۶۶- اور جو لوگ اپنے اندر خیانت رکھتے ہیں تم ان کی طرف سے نہ جھگڑو خدا ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہے جو خیانت اور گنہ گاری میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ اس طرح کے لوگ انسانوں سے شرماتے ہیں اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اپنی مجلس میں ایسی باتوں کا مشورہ کرتے ہیں جو خدا کو ناپسند ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے قابو میں ہے۔ پہلی آیت میں جب ان لوگوں کی دغا اور برائی صاف بتلادی گئی تو شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ غلبہ شفقت جو آپ کو تمام انسانیت سے خصوصاً اپنی امت پر تھا حق تعالیٰ سے ان خطا واروں کی معافی چاہی اس پر ارشاد ہوا کہ ان دغا بازوں کی طرف ہو کر اللہ سے کیوں جھگڑتے ہو ایسے لوگ اللہ کو نہیں بھاتے یہ تو لوگوں سے چھپ چھپ کر راتوں کو ناجائز مشورہ کرتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے اور ان کے تمام امور پر حاوی ہے اور اگر آپ نے ان کی معافی نہ بھی مانگی ہو تو آپ کی معافی مانگنے کا احتمال تو بالیقین موجود تھا دیکھئے دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت یجادلنا فی قوم لوط ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب ارشاد صریح موجود ہے اس کی پیش بندی کے لیے حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر ان لوگوں کی سفارش سے آپ کو روک دیا۔[1]

لا تجادل میں خطاب عام ہے جیسا کہ اگلی آیت بتا رہی ہے اور انداز کلام حضور انور کے لیے خطابی انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ عدلیہ کے حاکموں پر اس جرم کی قباحت اور شناعت زیادہ واضح ہو جائے۔ مسلمان حکمرانوں کو سبق دیا جا رہا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں کہ خیانت کار لوگوں کی حمایت کی جائے۔ خیانت کار لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں الذین یختانون انفسھم سے وہی لوگ مراد ہیں جن کا ذکر پہلے خائنین میں ہو چکا ہے۔ خیانت یہاں بے وفائی اور غداری کے معنے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اطاعت و

[1] افادات شیخ الاسلام

و فاداری کا عہد تو انہوں نے ایمان کے ذریعے اللہ سے کیا ہے لیکن یہاں دوسروں کے لیے اظہار ہمدردی کر رہے ہیں۔ ان کی اس خیانت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ خود اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اور جو شخص دوسرے سے خیانت کرتا ہے وہ درحقیقت سب سے پہلے اپنے آپ سے خیانت کرتا ہے کیونکہ دل اور دماغ کی جو قوتیں اس کے پاس بطورِ امانت ہیں ان میں بے جا تصرف کر کے وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا ساتھ دیں اور اپنے ضمیر کو جسے اللہ نے اس کے اخلاق کا محافظ بنایا تھا اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں سدِراہ بننے کے قابل نہیں رہتا جب انسان اپنے اندر اس ظالمانہ دست برد کو پایہ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہوتے ہیں لہ مطلب یہ ہے کہ اس خیانت سے اسلامی نظام کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ خود ان کا ہی خانہ خراب ہوتا ہے۔ خدا ایسے بدعہدوں اور ضمیر فروشوں کو پسند نہیں کرتا۔

فرمایا یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ یہ لوگ انسانوں سے تو چھپتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپتے، یعنی ان کو لوگوں سے تو شرم آتی ہے مگر اللہ سے شرم نہیں آتی ہے۔ ان کو خیانت کا ارتکاب کرکے لوگوں کا ڈر تو مارا جا رہا ہے لیکن ایمان کے تقاضے کے خلاف اقدام کر کے اللہ سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فسادِ نیت موجود ہے اور دیانت و خیانت کی تمام تر بنیاد ارادہ و نیت پر ہے۔ اس فقرے کے یہ معنے بھی کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ اپنی حرکات کو انسانوں سے تو چھپا سکتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے ہیں کیونکہ اللہ تو ان کے ساتھ اس وقت بھی ہوتا ہے جب یہ راتوں کی تنہائیوں میں باہم اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیانت امانت اور اس جیسے دوسرے اخلاق کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے۔ ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں کوئی ہے جو دل کی تہ کو ہزاروں پردوں میں دیکھ رہا ہے۔ دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے اور ہمہ آن ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ایمان صحیح ہے جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے۔ آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے وقعت ہیں اور یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے جب تک کسی واقف اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش

لہ تفہیم القرآن

اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، بازپرس اور جوابدہی کا یقین نہ ہو گا دل میں اخلاص اور نفس میں دُنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غلط کار کی حمایت مسلمان نہیں کرتا

۱۶۷۔ دیکھو تم ہی وہ لوگ ہو کہ جنہوں نے ان مجرموں کی جانب سے دُنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا ہے۔ بتلاؤ! روزِ قیامت ان کی جانب سے اللہ کی عدالت میں کون جھگڑا کرے گا یا اس روز ان کا کون کارساز ہو گا۔ اس میں خطاب ہے چور کی قوم اور ان لوگوں کو جو چور کے طرفدار ہوئے تھے۔ یعنی اللہ کو سب کچھ معلوم ہے اس بے جا حمایت سے چور کو قیامت میں کوئی نفع نہیں ہو سکتا۔ لہ

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ یہودی کے مقابلہ میں چور کی مدد کرنے والی مسلمانوں کی ایک جماعت تھی اور اصل مخاطب یہی لوگ ہیں۔ اور حضور انور کو اوپر کی آیات میں مخاطب کر کے ان کو بھی تنبیہہ کی گئی ہے۔ یعنی اوپر کی آیات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی شخصاً مخاطب نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ مخاطب ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر منافقین کی حمایت کرتے تھے اور ان کی صریح غلطیوں کے باوجود ان کی بریت کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرتے چنانچہ یہاں روئے سخن ان کی طرف کر کے فرمایا کہ کان کھول کر سن لو! خبردار ہو جاؤ کہ آج تو تم ان کی حمایت میں مجادلہ کر رہے ہو لیکن کل جب خدا کی عدالت میں یہ پیش ہوں گے تو اللہ سبحانہٗ سے ان کی جانب سے مدافعت کون کرے گا یا ان کی جانب سے وکالت کا فرض کون انجام دے گا۔ اس طرح مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ مسلمانوں کو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے یا اپنے خاندان اور قبیلہ کا فرد ہونے کی وجہ سے کسی مجرم کی ہرگز حمایت نہ کرنی چاہیے اور سازش کر کے جتھہ بندی نہ کرنی چاہیے۔

یہ آیات قرآنی بتا رہی ہیں کہ قرآن نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق معاشرت اور سیاست کے ہر گوشہ کو محیط ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر قرآن کی یہ تعلیم حاوی نہ ہو۔ یہ صرف قانون ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اخلاق کا بھی یہی مطالبہ ہے۔ یہاں

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

قانون و اخلاق میں ہم آہنگی ہے۔ یعنی ان آیات کی رُو سے اخلاقی طور پر اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے لیکن حاکم وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اسی لیے احادیث میں عادل حاکم کی بڑی فضیلت آئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز جب خدا کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو اللہ سبحانہ اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا

رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ

اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ

ع ۱۶ ۱۳ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

اور جو شخص کوئی برائی کی بات کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے اور پھر اس کی اللہ سے معافی مانگ لیتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا[۱۶۸]، اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ارتکاب وہ اپنے ہی خلاف کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے[۱۶۹]، اور جو کوئی کسی قصور کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس کو کسی بے گناہ کے سر ڈال دیتا ہے تو بلاشبہ اس نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے[۱۷۰]۔

قانون جرم پر لاگو ہے نہ الزام پر

شہریوں کا اولین حق اسلام میں یہ ہے کہ ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے اور قانونی وجوہ کے بغیر ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے جو خلاف قانون کرتا ہے خواہ کوئی ہو قانون اس کی گرفت کرے گا۔ اس کے جرم کی پاداش میں دوسرے کو نہ پکڑا جائے گا، ہم جماعت ہونا، ہم قرابت ہونا قانون کے سامنے بے حقیقت ہے۔ برائی کرنے والا ہی برائی کا ذمہ دار ہے۔ قرآن کے نزدیک اجتماع ایک بامقصد ہیئت ہے، اس کے مقاصد اور مزاج کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ فرد و اجتماع کے مابین کسی تکرار کی گنجائش نہیں۔ قرآنی اجتماعیت افراد ہی کے مقاصد تکمیل کا ذریعہ ہے۔ یہ اجتماعیت انسان کے فطری رجحانات اور دواعی کے تحت ابھرتی ہے۔ اجتماع میں قانون افراد کے جذبہ طاعت اور فرمانبرداری کا عملی مظہر ہے۔ افراد اس کے ذریعے سے اپنے مشترکہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قانون فرد کے لیے ایک رحمت ہے کہ یہ ہر فرد کے تمام مادی اور روحانی مفادات کا نگران و محافظ اور ان کی ترقی و تزکیہ کا ذریعہ ہے۔ قانون ہی کے ذریعے حکومت اور دوسرے اجتماعی ادارے جنم لیتے ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تعمیر و تزکیہ کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح افراد ہی قانون کا اصل سرمایہ ہیں۔ ان ہی کے سدھار پر قانون کی کامیابی کا انحصار ہے۔ انہی کی ترقی قانون کی ترقی ہے اور ان ہی کی کامیابی قانون کا مقصود ہے۔ قانون کا کام یہ ہے کہ وہ ہر فرد کی نگرانی کرے اور ان کو برائیوں سے روکے۔ ان کے باہمی تعلقات کو منظم کرے اور ان کو اسلامی طرز زندگی پر کاربند رہنے اور ہر طرح کی کج روی سے دور رہنے میں مدد دے۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ جو برائی کرتا ہے اس کی برائی اس پر ہے یہ خیال نہ کرو کہ یہ شخص ہمارا ہم مذہب یا رشتہ دار ہے، اس کا جرم ثابت ہونے سے کسی دوسرے پر دھبہ آئے گا۔ اور بتایا کہ خود برائی کرنا اور اسے دوسرے کے سر تھوپ دینا ایک قانون شکنی دوسری قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہے۔ اس طرح دنیا کی عدالت کو دھوکا دینا ممکن ہے لیکن خدا کی عدالت کو ہرگز دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ عمل سوء، ظلم نفس، کسب اثم، کسب خطیۃ اور الزام گناہ میں نوع انسانی کے تمام افراد کی حیثیت یکساں ہے۔ کسی کا حسب نسب یا سیاسی حیثیت یا اس کی مالی حالت اس کی بنیادی قانونی حیثیت کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتی۔

۱۶۸- اور جو شخص کوئی برائی کی بات کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے اور پھر اس کی اللہ سے معافی مانگتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ سوء اور ظلم سے مراد بڑے اور چھوٹے گناہ ہیں یا سوء سے وہ گناہ مراد ہے جس سے دوسرے کو تکلیف ہو جیسے کسی پر تہمت لگانی اور ظلم وہ ہے کہ اس کی خرابی اپنے ہی نفس تک رہے یعنی گناہ کیسا ہی ہو۔ اس کا علاج توبہ و استغفار ہے۔ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ البتہ معاف کر دیتا ہے۔ اگر آدمیوں نے جان بوجھ کر فریب سے کسی مجرم کی برأت ثابت کر دی یا غلطی سے مجرم کو بے قصور سمجھ گئے تو اس سے اس کے جرم میں تخفیف نہیں ہو سکتی البتہ توبہ سے بالکل معاف ہو سکتا ہے۔ اس میں اس چور کو اس کے سب طرفداروں کو جو دیدہ دانستہ طرفدار بنے ہوں یا غلطی سے سب ہی کو توبہ اور استغفار کا اشارہ ہو گیا اور اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اب بھی اگر کوئی اپنی بات پر ڈٹا رہے گا اور توبہ نہ کرے گا تو اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت سے محروم ہو گا۔[1]

اس میں ایک طرف تو حق و انصاف سے دشمنی رکھنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ جرم اتنا سنگین ہے کہ جب تک اللہ کی جناب میں معافی کی درخواست نہ کرے صرف قانونی سزا سے اس جرم کی سنگینی کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری طرف مجرمین کو تسلی دی ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ اب خدا کی گرفت سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی برائی ہو گئی یا اگر کسی نے اپنی جان پر ظلم کر لیا تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مغفرت مانگے۔ جو شخص خلوص کے ساتھ استغفار کرے گا اللہ اس کے لیے غفور رحیم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو یا حقوق اللہ سے ہر قسم کا گناہ توبہ اور استغفار سے معاف ہو سکتا ہے۔ ہاں توبہ کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے محض زبان سے استغفر اللہ کہنے کا نام توبہ نہیں ہے۔[2]

انسان کے تمام کاروبار میں اصل چیز دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے وہ ناپاک ہوتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں کی اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے خدا سے نکوکاری کا مستحکم وعدہ کرے تو اس کا نام توبہ ہے یہ توبہ و

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ش

استغفار گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی خدا کی آغوش محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ سبحانہ، کی آغوشِ رحمت کس طرح گنہ گار کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ رہتی ہے۔ رحمتِ الٰہی کے اس پرجوش نظارہ کی جو کیفیت یہاں قرآن نے یجد الله غفوراً رحیماً میں پیش کی ہے اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس پیام زبانی میں اس کی کیفیت اور اصول و شرائط کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ ہے۔ اس آیت کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ چور اور ڈاکو بھی اگر توبہ کریں تو اس میں ان کے لیے بھی بشارت ہے۔ یہ آیت چوتھے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ توبہ کے بعد بندے کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا بھی احساس موجود ہو۔ توبہ کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے ایک گزشتہ گناہوں پر ندامت دوسرے جس گناہ میں مبتلا ہے اسے چھوڑ دینا تیسرے آئندہ کے لیے نہ کرنے کا عہد کرنا اور اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو صاحبِ حق سے معاف کرانا بھی توبہ کی شرط ہے۔

گناہ کی تمامتر ذمہ داری گنہ گار پر ہے

١٦٩- اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ارتکاب وہ خود اپنے ہی خلاف کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی جو اپنے قصد سے گناہ کرے گا اس کا وبال تو اسی پر پڑے گا اور اس کی سزا خاص اسی کو دی جائے گی۔ کسی دوسرے کو سزا نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا تو وہ کر سکتا ہے جس کو واقعی بات کی خبر نہ ہو یا حکمت سے بے بہرہ ہو مگر حق سبحانہ، تو بلا مبالغہ بصیغہ مبالغہ علیم و حکیم ہے وہاں اس کی گنجائش کہاں تو اب خود چوری کر کے یہودی کے سر لگانے سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔[1]

اس آیت میں قانونِ سزا بتایا گیا ہے کہ ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قصور کوئی کرے اور پکڑا کوئی جائے۔ چوری کرے ایک

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مسلمان اور پکڑا جاتے یہودی۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو ضرر اور نقصان جو کچھ بھی پہنچے گا۔ اس کو اپنے کسب ہی سے پہنچے گا وہ جو کچھ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا۔ نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی برائیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا ہے۔ ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس کے کسب سے بندھی ہوئی ہے یہی بات البقرہ لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت کے عنوان سے سمجھائی ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص ارادے کی پوری قوت سے گناہ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اس کی کارگزاری ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی یہ کارگزاری خود اس کی ذات کے لیے وبال ہے اور اس کے نتائج بد سے اس کو ہی دوچار ہونا ہے۔ دنیا میں اس کا انجام لوگوں میں رسوائی اور عدالت میں رسوائی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے گا ہر شخص کو اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے اور حافظ ابن جریر فرماتے ہیں :

> جو شخص جان کر گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی پاداش، نقصان، رسوائی۔ بدنامی سب اسی کے لیے ہے نہ کسی اور کے لیے اس لیے تم اس اندیشہ سے کہ مجرم ہماری برادری، ہماری پارٹی کا آدمی ہے اس سے ہماری بدنامی ہے اس مجرم کی حمایت نہ کرو۔

بے گناہ کو گنہ گار اور گنہ گار کو بے گناہ بنانا

۱۱۲۔ اور جو شخص کسی قصور کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کو کسی بے گناہ کے سر تھوپ دیتا ہے تو بلاشبہ اس نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ یعنی جس نے چھوٹا یا بڑا گناہ کر کے کسی بے گناہ کے ذمہ لگایا تو اس پر دو گناہ لازم ہو گئے۔ ایک جھوٹی تہمت اور دوسرا وہ اصلی گناہ۔ تو ظاہر ہو گیا کہ خود چوری کر کے یہودی پر تہمت دھرنے سے اور وبال بڑھ گیا۔ نفع خاک بھی نہ ہوا اور معلوم ہو گیا کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا تو بہ خالص کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔[1] بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یا برائی منسوب کی جاتی یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے بلکہ اسی رکوع میں قرآن نے اس کو خیانت بھی کہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ گنہ گار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہ گار ٹھہرانے کی مذمت ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اعتراف جرم کی جگہ جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ گناہ سے بریت کا یہ راستہ غلط ہے۔ اس بہتان اور جھوٹ سے دُنیا کی عدالت کو دھوکا دیا جا سکتا ہے اللہ سبحانہٗ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ کی بارگاہ میں ایسے مجرم نہ صرف اپنے گناہ کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ اپنے اصل جُرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کریں گے۔

قرآن چونکہ محض کتاب آئین نہیں بلکہ کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفۂ وعظ وارشاد بھی ہے۔ اس لیے قانون و اخلاق دونوں میں ہم آہنگی رکھتا ہے۔ دُنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے دو چیزیں ہیں قانون اور اخلاق۔ اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہے مگر منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتہً نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں یہ دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ سنت میں بھی یہ دونوں ملی ہوئی ہیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں معاشرہ اسی قانون و اخلاق کا ملا جلا نمونہ ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ بعد کو دونوں میں ہم آہنگی نہ رہ سکی، فقہ کے نام پر قانون اور تصوف کے نام پر اخلاق الگ الگ ہو گئے۔ فقہ پر کام کرنے والے فقہا اور تصوف پر کام کرنے والے صوفیا کہلانے لگے۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی زندگی کن المناک نتائج کا شکار ہوئی یہ داستان طویل ہے تفصیل کا محل نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ
اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ
بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّشَاقِقِ
الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
ع نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝

اور اے پیغمبر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں ایک جماعت نے تمہیں صراطِ مستقیم سے بہکانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا فی الواقع یہ اپنے آپ ہی کو بہکا رہے ہیں، اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اللہ نے تم پر کتاب

اور حکمت اتاری ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھلا دی ہیں جو تمہیں معلوم نہ تھیں اور تم پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے[۱۱۲]۔ ان لوگوں کی خُفیہ سرگوشیوں میں اکثر مشورے بھلائی کے لیے نہیں ہوتے ہیں ہاں جو کوئی خیرات کے لیے یا کسی نیک کام کے لیے حکم کرے یا لوگوں میں صلح وصفائی کرا دے تو یہ بے شک بھلائی کی بات ہے اور جو کوئی یہ کام اللہ کی رضا کا متلاشی ہو کر کرتا ہے تو ہم اسے اجرِ عظیم دیں گے[۱۱۳]۔ اور جو بھی اللہ کے رسُول کی مخالفت پر راہِ ہدایت واضح ہو جانے کے باوجود کمربستہ ہو جاتا ہے اور اہلِ ایمان کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہم اسے اسی طرف کو لے جائیں گے جس طرف وہ خود پھر گیا اور ہم اسے دوزخ میں داخل کریں گے دوزخ بدترین جگہ ہے[۱۱۴]۔

برہانِ فضل اور برہانِ رحمت

قرآن نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کو رحمت اور فضل سے تعبیر کیا ہے جس

چیز کو پہلی آیات میں ما انزل اللہ اور ما اراہ اللہ کہا ہے اسی کا چہرہ ان آیات میں فضل و رحمت کے عنوان سے پیش کیا ہے فضل کہتے ہیں ان خوبیوں کو جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کریں جس سے دوسرے متاثر ہوں اور رحمت نام ہے اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت حاصل ہو جائے نبوت کا علم سرتاسر رحمت ہے کیونکہ وہی ہے جو ما انزل اللہ ہے اور نبوت کا عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت اور مشقت کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ قرآن میں ہے:

الا رحمة من ربك ان فضله كان عليك كبيراً

مگر مہربانی تیرے رب کی جانب سے آ اور اس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ علم وحی اور کتاب کا آنا اگر اللہ سبحانہ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے ذریعے آپ کے دامن میں عمل کا ظہور صرف اللہ کا فضل نہیں فضل کبیر ہے آپ کے علم میں اگر شان اعجاز ہے تو آپ کے عمل میں شان تعبد ہے۔ علم اگر پڑھنے کی چیز قرآن ہے تو عمل برتنے کی چیز سنت ہے۔ گویا اسلام نے دنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ یہ امر واقعہ ہے کہ نبوت نام ہے اللہ کی نمائندگی کا، اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کی نمائندگی کر رہا ہے وہ بھی مجمع الکمالات ہو۔ کمال علمی کی حد تک اگر قرآن ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو مجمع ہونا چاہیے تاکہ نمونہ کو کامل نمونہ اور عمل کو نقش قرآن کہا جا سکے۔ حضرت نوح کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے، حضرت موسیٰ کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد شان نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی لائف صرف خاکساری، تواضع، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے، حضرت سلیمان کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت ایوب کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے، حضرت یونس کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے۔ حضرت یوسف کی زندگی قید و بند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد کی سیرت گریہ و بکا، حمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب کی زندگی امید، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مقدسہ نوح و ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ، سلیمان و داؤد، ایوب و یونس اور یوسف و یعقوب سب کی زندگیاں اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے یہی معنے ہیں ان فضله كان كبيرا، اور وكان فضل الله عليك عظيماً کے۔

اس رکوع میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال علم اور کمال عمل کو پیش کرکے آپ کے پیش کیے ہوئے اسلامی نظام کا دوسرے نظاموں سے مقابلہ کیا ہے۔ یہ پہلے سن آئے ہو کہ منافقین اہل کتاب میں سے تھے جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور پچھلی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن اپنے تمدنی و مالیاتی مسائل میں اسلام کے سیاسی نظام کو جس کی اساس اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول ہے نہیں مانتے تھے یہاں ان کو یہی سمجھایا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ جو نظام اسلامی نبوت کے علم و عمل کی صورت میں لے کر آئے تمام نظاموں میں افضل، اولیٰ اور فائق ہے اور اس میں ہر قسم کی رفعت سے حفاظت کی ضمانت ہے۔

۱۱۳- اور اے پیغمبر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک جماعت نے تمہیں صراط مستقیم سے بھٹکانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا فی الواقع یہ اپنے آپ ہی کو بھٹکا رہے ہیں اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اگرچہ عام شارحین قرآن نے ان آیات کو اسی پس منظر سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ مستقل بات ہے اور اس میں یہ اہم اعلان کیا گیا کہ :

الف: آپ اسلامی نظام جو نبوت کے علم و عمل کی صورت میں لے کر آتے ہیں یہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہے۔

ب: اگر فضل و رحمت یعنی علم و عمل کا یہ نظام نہ ہوتا تو یہ لوگ آپ کو اپنے نظاموں پر چلا لیتے اور اس طرح آپ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے۔

ج: اس کی مخالفت نفاق کی صورت میں جو بھی کر رہا ہے اس سے آپ کا نقصان نہیں بلکہ مخالفت کرنے والوں کا اپنا نقصان ہے۔

د: اس نظام کو مان کر اس سے منحرف ہونے والے لوگ خود اپنے کو گمراہ کرتے ہیں۔ آپ کو راہ حق سے ہٹانے میں وہ کامیاب نہ ہوں گے

یہ چاروں باتیں پہلے الم نشرح ہو چکی ہیں۔

نبوت کا علم و عمل اللہ کی رحمت اور فضل ہے

پہلے اس بات پر غور کرو کہ نبوت اور اس کے مخالفوں میں یہاں بنائے نزاع کیا ہے اور پھر یہ سوچو کہ یہاں مخالف کون ہے۔ یہود و نصاریٰ تھے جن کے پاس کتاب تھی جو نبوت کو مانتے

اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے۔

بنائے نزاع کیا بات تھی کیا یہ تھی کہ وہ خدا کو مانتے نہیں تھے اور خدا کی مقدس کتابوں کا انکار کرتے تھے؟ کیا یہ تھی کہ انہوں نے حضور انور کو نہیں مانا تھا، کیا یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کے خدا کی کتاب ہونے کا انکار کر دیا تھا۔ قرآن گواہ ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہ تھی۔ خدا اور آخرت پر ایمان کے وہ مدعی تھے امنا باللہ وبالیوم الآخر۔ مقدس کتابوں اور قرآن کو خدا کی کتاب مانتے تھے یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

اصل یہ ہے کہ ان کی مخالفت صرف اس لیے تھی کہ وہ قرآن کو مانتے ہوئے صرف انفرادی زندگی تک محدود رکھنا چاہتے تھے وہ اسے ایسا نظام نہیں سمجھتے تھے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہو۔ وہ نمازیں پڑھتے ہوتے مقدمات و معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرا لیتے۔ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت۔ وہ اسلام کے تحفظ کے لیے کوئی قربانی کرنا گوارا نہ کرتے تھے لما کتب علیھم القتال۔ اور کبھی میدان مقابلہ میں جاتے ہیں اور اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے کہیں ناکامی ہوتی ہے تو ذات نبوت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ یقولون ھذا من عندک اہل ایمان میں بددلی پیدا کرنے کے لیے قسم قسم کی افواہیں اڑاتے اذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ۔ اسلام کی خاطر ان کو اپنے مفادات کو چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ اور ہجرت کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ لوگ یہودیوں میں سے تھے۔ اور انہوں نے مسلمانی کا لبادہ پہن لیا تھا۔

ان کو پیش نظر رکھ کر قرآن کہتا ہے کہ اگر آپ اسلام کے اس نظام کے علمبردار نہ ہوتے جو آپ کے کمال علم اور کمال عمل کی صورت میں آپ کے پاس موجود ہے تو آپ ان منافقین کے شر سے محفوظ نہ رہتے لیکن چونکہ اللہ نے آپ کو اپنے فضل و رحمت کا نظام دے کر روانہ کیا ہے اس لیے اس کے مقابلے میں وہ نظام نہیں ٹھہر سکتے جن کے وہ علمبردار ہیں اس لیے ان کی ہمتیں پست ہیں اختلاف تعبیر سے حقیقت مختلف نہیں ہوتی۔ قرآن کبھی نبوت کے علم و عمل کو فضل و رحمت کہتا ہے کبھی حبل اللہ، کبھی کتاب و حکمت کہتا ہے مصداق سب کا ایک ہے۔ فقہاء کی زبان میں اسی کا نام شریعت ہے اور اسی کو قرآن نے انعام خداوندی قرار دیا ہے اور نبوت کے اسی کمال علم اور کمال عمل کا نام صراط مستقیم ہے۔ یہاں فضل اور رحمت کے الفاظ کمال علم اور کمال عمل کے لیے لا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور عصمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور

بتایا ہے کہ اس عالم امکان میں کمالات علمی ہوں۔ یا کمالات عمل دونوں میں آپ کی ذات گرامی اصل اور مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیاء سابقین کے لیے اور قیامت تک ہونے والی امت کے لیے بھی۔ شاید آپ حیران ہوں کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ پہلی بات کہ آپ انبیاء سابقین کے لیے علم و عمل میں اصل ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اور دوسری بات کہ آپ امت کے لیے علم و عمل میں مصدر ہیں، شاہ عبدالعزیز نے پیش فرمائی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے، کچھ ارشادات پیش خدمت ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

کمال علم کے لیے لازم ہے کہ اعلیٰ درجہ کی معلومات تک ذہن پہنچے لہٰذا جو شخص کمال علم میں تمام انسانوں میں ممتاز ہوگا بلاشبہ عمدہ سے عمدہ معلومات تک اس کی رسائی ہوگی اور کمال عمل کے لیے ضروری ہے کہ علم سے متاثر ہو اور اعمال علمی ہدایات کے مطابق صادر ہوں۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل ہدایت عقل کا تقاضا ہے کہ علم کے لیے عمل لازم ہے بشرطیکہ طبیعت عمل میں صحت ہو۔ اگر طبیعت میں کوئی کمی ہوگی تو ظہور عمل نہ ہوگا۔ علم ہو اور عمل نہ ہو۔ اس کا تعلق قابل سے ہے فاعل سے ہرگز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصدر کے حق میں وصف صادر خانہ زاد ہوتا ہے لہٰذا جو شخص کمال علمی کے لیے مصدر ہوا اور پھر چونکہ کمال علمی کمال عمل کے لیے اصل اور منشا ہے اس لیے لازماً وہ کمال عمل کے لیے بھی مصدر ہوگا تو چونکہ اصل اور مصدر وصف اپنے وصف میں اکمل اور افضل ہوتا ہے اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال علم اور کمال عمل میں کامل ہونا بلکہ اکمل اور افضل ہونا اور اعلیٰ و اشرف ہونا ضروری ہے۔ الحاصل حضور انور میں دونوں کمال بدرجہ کمال موجود ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ آپ کی ذات گرامی دونوں کمالوں کے لیے مصدر ہے اس لیے کمال علمی کے تقاضے کے تحت ضروری ہے کہ آپ کو خدا کے جلال و جمال سے بدرجہ کمال واقفیت ہو، اتنی واقفیت کہ آپ کے مقابلہ میں کوئی ہم سنگ تو کیا پاسنگ بھی نہ ہو سکے۔ اور پھر بمقتضائے کمال عملی علم جلال و جمال سے بدرجہ کمال متاثر ہو۔ اس کے بعد بمقتضائے کمال علمی اسرار احکام خداوندی سے آگاہ ہو اور پھر بمقتضائے کمال عمل اس کے موافق بجالائے۔ کمال علمی پر تو اعجاز قرآنی کافی ہے۔ کمال علمی کے لیے یہ ضروری ہے کہ معلومات کاملہ تک بوجہ احسن

پہنچے قرآن اس موضوع پر اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر کوئی نہ ملنے تو اس سے بہتر یا اس جیسی کتاب لے کر آتے۔ قرآن علم حقائق، علم وقائع میں اپنی مثال آپ ہے۔

نبوت کے علم و عمل کی درسگاہ

شاہ عبدالعزیز نے اپنی تفسیر میں نبوت کے کمال علم و عمل کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ بات شاہ صاحب کی ہے اور الفاظ میرے نہیں سید سلیمان کے ہیں۔ شاہ صاحب نے نبوت کے کمال علم و عمل کو ۱۲ ایشمنوں کی تمثیل سے سمجھایا ہے اور سید صاحب موصوف نے اسی کی اس طرح توضیح کی ہے "آؤ ذرا اس عرب کے معلم کی درسگاہ کا مطالعہ کریں اور لولا فضل اللہ علیک و رحمتہ کی تفسیر آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ طالب علم کون ہیں؟ ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ و زبیر مکہ کے قریشی طلبہ ہیں۔ یہ کون ہیں ابوذر، انس ہیں یہ مکہ سے باہر تہامہ کے قبیلہ غفاری کے فرزند ہیں۔ یہ ابوہریرہ اور طفیل بن عمرو ہیں، یمن سے آئے ہیں اور قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ابو موسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل ہیں، یہ بھی یمن سے آئے ہیں اور دوسرے قبیلوں کے ہیں۔ یہ کون ہیں یہ ضماد بن ثعلبہ ہیں قبیلہ ازد کے ہیں یہ کون ہیں خباب بن الارت قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ منقذ بن حبان اور منذر بن عائذ ہیں، عبدالقیس کے قبیلہ کے ہیں اور بحرین سے آئے ہیں۔ یہ عبید و جعفر عمان کے رئیس ہیں۔ یہ فروہ معان کے رہنے والے ہیں۔ یہ بلال حبش سے آئے ہیں، یہ صہیب رومی کہلاتے ہیں۔ یہ ایران کے سلمان فارسی ہیں۔ یہ درسگاہ نبوت کے طالب علم ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں داخلہ کے لیے رنگ و روپ، وطن، قوم، ملک اور زبان و لہجہ کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ داخلہ دنیا کے تمام خاندانوں، تمام قوموں، تمام ملکوں اور تمام زبانوں کے لیے عام ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

نبوت کے علم و عمل کے کمال کا پورا پورا اندازہ کرنا چاہئے ہو تو درسگاہ نبوت کی حیثیت بھی معلوم کر لو۔ کیا یہ وہ کالج ہے جہاں صرف ایک فن کی تعلیم ہوتی ہے یا اس کی حیثیت ایک جامعہ کی ہے جہاں ذوق مناسبت طبع و استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو اور ہر قوم کے افراد کو الگ تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک طرف عقلائے روزگار، اسرار فطرت کے محرم، دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرمانروا اس درسگاہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں۔ صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ اور معاویہ ابن ابی سفیان اسی درسگاہ کے فضلاء ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک، افریقہ سے

پاکستان تک فرماں روائی کی ہے جو دُنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور حکمران کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ان کے عدل و انصاف کے فیصلے ایرانی دستور اور رومی قانون کو بے اثر بنا دیتے ہیں اور دُنیا کی سیاسی و انتظامی تاریخ میں وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی ہے۔

دوسری طرف خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ ابن الجراح، عمرو بن العاص ہیں جو دُنیا کے وہ فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دُنیا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ سعد بن ابی وقاص نے ایران کا تاج شاہی اتار کر اسلام کے قدموں پر ڈال دیا۔ ابوعبیدہ نے رومیوں کو شام سے نکال کر ابراہیم کی موعودہ زمین کی امانت مسلمانوں کے سپرد کر دی۔ عمرو بن العاص نے فرعون کی سرزمین وادیٔ نیل رومن شہنشاہی کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لی۔ عبداللہ بن زبیر اور ابن ابی سرح نے افریقہ کا میدان دشمنوں سے جیت لیا۔ یہ وہ مشہور فاتح اور سپہ سالار ہیں جن کی قابلیتوں کو زمانے نے تسلیم کیا ہے اور تاریخ نے ان کی بزرگی کی شہادت دی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان یمن، خالد بن سعید صنعاء، مہاجر بن امیہ کندہ، زیاد بن لبید حضر موت، عمرو بن حزم نجران، یزید بن ابی سفیان تیما، علاء بن حضرمی بحرین، وغیرہ بیسیوں وہ صحابہ ہیں جو صوبوں میں گورنر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

چوتھی طرف فقہاء و مجتہدین کی صف ہے ان میں عمر بن الخطاب، علی ابن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو ابن العاص، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت ابن زبیر وغیرہ ہیں۔ جنہوں نے اسلام کے فقہ و قانون کی بنیاد ڈالی۔

پانچویں طرف قراء اور ارباب تجوید کی صف ہے مثلاً ابی بن کعب، عثمان بن عفان، عبداللہ بن مسعود، علی ابن ابی طالب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، ابوالدرداء، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، سالم مولیٰ حذیفہ، عقبہ بن عامر، عبداللہ بن عمر، ابوزید، معاذ بن جبل، عبداللہ بن السائب، چھٹی طرف عام روایت و تاریخ کی جماعت ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت انس بن مالک، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبادہ ابن الصامت، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت براء بن عازب وغیرہ سینکڑوں صحابہ ہیں جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔
ساتویں طرف ان اصحاب صفہ کی جماعت ہے جن کے پاس سر رکھنے کے لیے مسجد نبوی کے

چبوترے کے سوا کوئی جگہ نہ تھی۔ بدن پر کپڑوں کے سوا دنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی۔ یہ رات کو عبادت کرتے اور دن میں اسلام کی رضاکارانہ خدمات انجام دیتے۔

آٹھویں طرف ان پاکباز زاہدوں کی جماعت ہے جن کے مانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق گو پیدا نہیں ہوا۔ ان کے نزدیک آج کا کھانا کل کے لیے اٹھا کر رکھنا بھی شانِ توکل کے خلاف تھا۔ ان کو دربارِ رسالت سے مسیح الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ عثمان بن مظعون ہیں جو اسلام کے پہلے صوفی کہلاتے ہیں۔ ابوالدرداء ہیں جن کی راتیں نمازوں میں اور دن روزوں میں گزرتے تھے۔

نویں طرف مدبرین کی جماعت ہے اس میں طلحہ ہیں زبیر ہیں، مغیرہ ہیں مقداد ہیں، سعد بن معاذ ہیں، سعد بن عبادہ ہیں، اسید بن حضیر اور اسعد بن زرارہ ہیں۔

گیارہویں طرف معاشیات کے ماہرین کی جماعت ہے ان میں عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن زبیر ہیں۔

بارہویں طرف حق کے شہیدوں کی وہ جماعت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں جان قربان کی ہے مگر حق کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔

سوچنے کی بات ہے یہ وہی وحشی عرب وہی بت پرست عرب بداخلاق عرب ہیں۔ یہ انقلاب کیوں کر آیا؟ ایک اُمی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل روشن دماغ اور متقن کیوں کر بنا گئی۔ اس سوال کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کا کارنامہ ہے۔ آپ کی ذات ان دو کمالوں کا مجموعہ تھی اور یہ سب اسی کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں ہیں جو کبھی صدیق و فاروق ہو کر چمکتی تھیں۔ کبھی ذی النورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھیں، کبھی خالد اور ابو عبیدہ اور کبھی سعد و جعفر طیار ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور ابوذر اور سلمان اور ابوالدرداء ہو کر مسجد و محراب میں نظر آتی تھیں۔ اور کبھی ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درس گاہ اور عقل و حکمت کا دبستان بن جاتی تھیں اور کبھی بلال و صہیب اور عمار و خبیب کی امتحان گاہوں میں تسلی کی روح اور تسکین کا پیام بن جاتی تھیں۔ گویا یہ نبوت کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کا آفتاب عالمتاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق تابش اور نور حاصل کر رہے تھے یا فضل و رحمت کا ابر باراں تھا جو پہاڑ،

جنگل، میدان، کھیت و باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔

اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی سازش

ارشاد ہوا ہے کہ اگر اے پیغمبر تمہارے ساتھ نبوت کا علم و عمل خدا کے فضل و رحمت کی صورت میں نہ ہوتا تو ان میں ایک جماعت نے تمہیں صراطِ مستقیم سے بہکانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ بات قرآن نے یہودیوں کے بارے میں ایک بار نہیں متعدد بار کہی ہے۔ یہ بات یہاں ذہن میں رکھیے کہ منافقین کا تعلق یہودیوں سے تھا۔ پہلے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں:

ودّ کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً

اہل کتاب میں سے اکثر کی خواہش یہ ہے کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کافروں میں واپس لوٹا دیں۔

تیسرے پارے میں ہے:

ودت طائفۃ من اھل الکتاب لو یضلونکم

اہل کتاب میں سے ایک جماعت کی خواہش ہے کہ تم کو گمراہ کر دیں۔

اور چوتھے پارے میں ہے:

یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین۔

اے اہل ایمان اگر تم اہل کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی اطاعت کرو تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔

ان سب آیتوں میں وہی بات کہی گئی ہے جو زیرِ تشریح آیت میں بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ ان کی سازش یہ ہے کہ اے پیغمبر تمہیں جادۂ حق سے ہٹا دیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اللہ کے فضل و رحمت سے ہمدوش نہ ہوتے تو یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے لیکن چونکہ آپ اللہ کی جانب سے کمالِ علم اور کمالِ عمل لے کر آئے ہیں اس لیے آپ ان کے مقابلے میں کامیاب ہیں اور ان کا کوئی چال گمراہی کا آپ کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوگا۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے کہ اللہ کی رحمت اور فضل کی موجودگی ان گمراہ کرنے والے لوگوں کے راستہ میں

اُڑ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ان کی سازشیں کامیاب ہو جاتیں۔ یہی بات اہل ایمان کو مخاطب کر کے چوتھے پارے کے آغاز میں دوسرے انداز میں کہی ہے پہلے یہ بتایا کہ اگر تم اہل کتاب کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد راہ کفر کی طرف لے جائیں گے اور پھر فرمایا کہ:

وکیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیات اللّٰہ وفیکم رسولہ

تمہارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

یہاں اسی چیز کو آیات اللہ اور رسول اللہ سے تعبیر کیا ہے جیسے زیر تشریح آیت میں فضل اللہ اور رحمت اللہ کہا ہے اور بتایا ہے کہ نبوت کے کمال علم اور کمال عمل پر مشتمل نظام اسلامی کے ہوتے ہوئے تم راہ کفر کیوں کر اختیار کر سکتے ہو۔ اس آیت میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کہا گیا ہے کہ نبوت کے کمال علم رحمت الٰہی اور کمال عمل فضل الٰہی پر مبنی اسلامی نظام کی موجودگی میں آپ کو راہ سے ہٹانا ممکن نہیں۔ ان کی سازشوں کا آپ پر کوئی اثر نہ ہو گا بلکہ یہ خود ہی ان سازشوں کے جال میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ وما یضلون الا انفسہم کا یہی مطلب ہے۔ اور اگر آیت قرآنی کے پس منظر میں رکھ کر آپ مطلب سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ غلط روداد پیش کر کے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انہی کا تھا آپ کا کچھ بھی نہ بگڑتا کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔ جو شخص حاکم کو دھوکہ دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہو گیا حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور حاکم کے غلط فیصلہ سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[1]

نبوت کے علم کی وسعت اور عمل کی عظمت

۱۷۲۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھلا دیا جو تمہیں معلوم نہ تھیں اور تم پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے۔ اس میں خطاب ہے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی

[1] تفہیم القرآن۔

طرف اور اظہار ہے ان خائنوں کے قریب کا اور بیان ہے آپ کی عظمت شان عصمت کا اور اس کا کہ آپ کمال علمی میں جو تمام کمالات سے افضل اور اوّل ہے سب سے فائق ہیں اور اللہ کا فضل آپ پر بے نہایت ہے جو ہمارے یہاں اور ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ [1]

پوری آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور آپ کو بہکا نہ سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا آپ پر فضل اور رحمت ہے اور وہ رحمت و فضل یہ ہے کہ اس نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری اور آپ کو وہ علم عطا کیا جو پہلے نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کمالِ علم اور کمالِ عمل ملنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔

یہاں کتاب سے مراد علمِ نبوّت یعنی قرآن اور حکمت سے مراد عمل یعنی سنت ہے۔ اصل حکمت وہ نورِ نبوّت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب وسینہ میں ودیعت کیا تھا اور چونکہ آپ کے سنن واقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لیے ان پر بھی حکمت کا اطلاق ہوا ہے۔

علم کے لغوی معنے جاننے کے ہیں اور تعلیم اسی سے متعدی ہے سکھانے کو کہتے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہو گی۔ نبوّ ۔ کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید ذات وصفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گے۔ حضرت ابراہیم توحید پر استدلال کرتے ہوئے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

یا ابت انی قد جاءنی من العلم مالم یاتک

اے میرے باپ میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضر کے بارے میں ہے:

وعلمناہ من لدنا علما

ہم نے اپنے پاس سے اسے علم سکھایا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے۔ ہر وہ شی جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے تو وہ من جانب اللہ کہی جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنے اس علم کے ملنے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو یہی علم خداداد ہے۔ حضرت داؤد وسلیمان کے بارے میں ہے ولقد اتینا داؤد وسلیمان علماً اور حضرت یوسف کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے،

وكذالك يجتبيك ربك ويعلمك من تاويل الاحاديث

اور ایسے ہی تیرا پروردگار تجھے نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت سکھائے گا

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشا وحی موقت ہے کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں۔ ایسے ہی وعلمك مالم تكن تعلم میں جس حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وحی موقت کے علاوہ خود آپ کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لیے ودیعت کر دی گئی تھی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں وعلمك مالم تكن تعلم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم میں کوئی آپ کا ہم پایہ نہیں ہے۔ اول تو مالم تكن تعلم اس طرف اشارہ ہے کہ جو علوم حضور انور کو عطا ہوئے وہ کوشش ومحنت کی سرحد سے پرے تھے اور یہ بھی یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کتاب وحکمت کے علاوہ علم خداوندی سے بے واسطہ مستفید ہوتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ علم پر صفات حاکمہ ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ ارادہ قدرت کا وجود علم کا محتاج ہے لیکن علم اپنے وجود کے لیے کسی صفت کا محتاج نہیں ہے لہٰذا جو شخص بذات خود اللہ سبحانہ کی صفت علمی سے مستفید ہو رہا ہے اس کے سامنے سب کی حیثیت ایسی ہو گی جیسے آفتاب کے سامنے ذرات کی۔ جیسے ذرات نور کا آفتاب سے استفادہ کرتے ہیں ایسے ہی اور سب علم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کرتے ہیں۔

شاید ذہن میں آپ یہ خلش محسوس کریں کہ اگر نبوت ایسا ہی کمال علم لے کر آئی ہے تو علم معقولات جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہے ان میں انبیاء کو تاریخ وروایت کی حد تک کوئی تعلق اور دخل ثابت نہیں ہے۔ مولانا محمد قاسم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ گفتگو نبوت کے علم میں ہے معلومات میں نہیں، دخل کا ہونا نہ ہونا معلومات کا ہونا نہ ہونا ہے علم کا ہونا نہ ہونا ہے۔ اگر کوئی تیز نگاہ رکھتا ہو اور گھر میں بیٹھا رہتا ہو اور دوسرا کمزور بصارت والا ہو اور سیاحت کرتا ہو اور سیاحت میں ایسے عجائب وغرائب

دیکھنے کا زیادہ اتفاق ہوتا ہو تو گویا اس معلومات کی زیادتی سے اس کی بصارت قوی ہو جائے گی۔ اور کمال بصارت میں اس شخص سے بڑھ جائے گا جو قوی البصر ہے۔ اس لیے اگر کسی کی بوجہ محنت و طلب کسی فن میں معلومات وسیع ہوں تو معلومات کی زیادتی سے علم و فہم میں اضافہ نہ ہو گا۔ سوئی دیکھو یا پھالی دونوں صورتوں میں ایک ہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ سوئی باریک ہے اور پھالی موٹی، ایسے ہی ذات و صفات خداوندی اور اسرار احکام خداوندی کا علم ہو یا اس کے مقابلے میں زمین آسمان، دواؤں، خواص اجسام، قضایا اور نظریات کا علم ہو۔ علم کی حد تک قوت علمیہ ایک ہے لیکن دونوں میں فرق ہے کہ اول میں معلومات دقیقہ ہیں اور دوسرے میں معلومات واضح ہیں اس لیے جیسے سوئی اور انتیسویں کے چاند دیکھنے کے مقابلہ میں پھالی اور موٹی چیزوں کا دیکھنا کوئی کمال نہیں ایسے ہی بمقابلہ علم ذات و صفات اور اسرار احکام خداوندی زمین و آسمان، ادویہ خواص اجسام کا علم کوئی کمال نہیں ہے۔ اسی بنا پر علم اور خشیت خداوندی کو ایک حدیث میں حضور انور نے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کوئی ایسا عمل کیا جس میں رخصت کا پہلو اختیار کیا۔ بعض لوگوں نے اس عمل کے اختیار کرنے سے پرہیز کیا۔ یہ بات آپ تک پہنچ گئی اسی وقت آپ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا، لوگوں کو کیا ہو گیا اس عمل سے احتراز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں، خدا کی قسم میں ان سب میں زیادہ خدا کا علم رکھنے والا اور سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ (صحیح بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی وقت کے سب سے زیادہ عالم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا سب سے زیادہ علم اس کو ہوتا ہے اور اس لیے سب میں زیادہ خدا سے ڈرنے والا بھی وہی ہوتا ہے جس مقصد کے لیے نبی کو بھیجا جاتا ہے وہ مخلوق کی ہدایت ہے اسی لیے تمام علوم ہدایت اس کو مرحمت ہوتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ سب سے زیادہ کامل ہے اس لیے آپ کو علوم بھی کاملترین ملے ہیں۔ وعلمك مالم تكن تعلم فرمانے کے بعد آخر میں وكان فضل الله عليك عظيما ارشاد ہوا ہے اس میں اشارہ ہے کہ جیسے آپ کے علم میں وسعت ہے۔ آپ کے عمل میں بہت بڑی عظمت ہے اس عظمت کا ایک اجمالی نقشہ پہلے پیش ہو چکا ہے۔

بڑے مقاصد کی خاطر سرگوشی

۱۷۳۔ ان لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر مشورے بھلائی کے لیے نہیں ہوتے ہیں ہاں جو

کوئی خیرات کے لیے یا کسی نیک کام کے لیے حکم کرے یا لوگوں میں صلح و صفائی کرا دے تو یہ بے شک بھلائی کی بات ہے اور جو کوئی یہ کام اللہ کی رضا کا متلاشی ہو کر کرتا ہے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔ منافق اور حیلہ گر آپ سے کان میں بات کرتے تاکہ لوگوں میں اپنا اعتبار بڑھائیں اور مجلس میں آکر بیٹھ کر آپس میں بیہودہ سرگوشیاں کرتے، کسی کی عیب جوئی، کسی کی غیبت، کسی کی شکایت کرتے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جو لوگ باہم کانوں میں مشورہ کرتے ہیں۔ اکثر مشورے خیر سے خالی ہوتے ہیں۔ صاف اور سچی بات کو چھپانے کی حاجت نہیں۔ اس میں کوئی فریب ہوتا ہے۔ البتہ چھپاوے تو صدقہ اور خیرات کی بات کو چھپاوے تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو یا کسی ناواقف کو غلطی سے بچاتے اور اس کو اچھی بات اور صحیح مسئلہ بتاتے تاکہ اس کو ندامت نہ ہو یا دو میں لڑائی ہو اور غصہ والا جوش میں صلح نہیں کرتا تو اول کوئی تدبیر بنا کر اس کو سمجھاتے حتیٰ کہ توریہ کی بھی اجازت ہے۔ آخر میں فرمایا کہ جو کوئی امورِ مذکورہ کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کرے گا اس کو بڑا عظیم الشان ثواب عنایت ہوگا۔ یعنی ریاکاری یا کسی اور غرض دنیاوی کے لیے نہ ہونا چاہیے[1]

نجویٰ کے معنے سرگوشی اور رازداری کے انداز میں کسی سے بات کرنے کے ہیں۔ اس میں بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے اس لیے ایسے مواقع بہت ہو سکتے ہیں جہاں رازداری اور سرگوشی کا طریقہ ہی قرینِ مصلحت ہو۔ ہر جگہ ہر موقع پر اعلان ہی ضروری نہیں ہے۔ اس میں برائی یا بھلائی بات کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بات نیکی اور تقویٰ کی ہے تو وہ نجوائے خیر ہے اور اگر بات شرارت اور فتنے کی ہے تو وہ نجوائے شیطانی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت سورۂ مجادلہ میں فرما دی ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا بالاثم والعدوان ومعصیۃ الرسول وتناجوا بالبر والتقویٰ۔

اے ایمان والو! جب تم آپس میں رازداری کے ساتھ بات کرو تو گناہ اور ظلم کے مشورے نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی بات کرو۔

مگر یہاں قرآن نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ بہت سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں زیادہ تر ان ہی باتوں کو راز بنایا جاتا ہے جن کو آدمی طبعاً لوگوں کے سامنے کرنا

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نہیں چاہتا اور اس میں برائی کا پہلو ہوتا ہے ورنہ اچھی باتوں اور اچھے کاموں کے لیے عام دستور یہ ہے کہ اسے ظاہر کیا جاتا ہے ۔ یہ منافقین اپنی خفیہ مجالس میں نبوت اور اسلام کے خلاف سازشوں کے مشورے کرتے تھے اور لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ، منکرات کو رواج دیتے اور مسلمانوں کو باہم لڑانے کے لیے اسکیمیں تیار کرتے تھے ۔ قرآن ان کی ان ہی سازشوں کو یہ کہہ کر بے نقاب کر رہا ہے کہ لاخیر فی کثیر من نجواھم یعنی ان کے زیادہ تر مشورے ان ہی موضوعات پر ہوتے ہیں اس لیے ان میں کوئی خیر نہیں ہے ۔ ہاں اگر ان کے یہی مشورے اللہ کی راہ میں خیرات کرنے ، معروف کو رواج دینے اور مسلمانوں میں باہم صلح وصفائی کے لیے ہوتے تو ان میں ضرور خیر ہوتی بلکہ یہ تو وہ کام ہیں کہ ان کاموں کو جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرے گا اللہ اس کو اجر عظیم دے گا ۔

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن نہایت بلیغ انداز میں ان منافقین کے مقاصد بے نقاب کر رہا ہے جو اہل ایمان میں لڑائی کرانے ، ان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے باز رکھنے اور معاشرے میں برائیاں عام کرنے میں پیش پیش ہیں اور اس کے لیے سرگوشیاں ، خفیہ مجالس منعقد کرتے ہیں اور عام لوگوں میں اپنی ان مفسد کارگزاریوں پر مصلحانہ مساعی کا چہرہ چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور منکرات کو معروف کہہ کر پکارتے ہیں ۔

نبوت کی اپوزیشن اور اس کا انجام

۱۱۴ ۔ اور جو بھی اللہ کے رسول کی مخالفت پر راہ ہدایت واضح ہو جانے کے باوجود کمربستہ ہو جاتا ہے اور اہل ایمان کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے ، جس طرف وہ خود پھر گیا اور ہم اسے دوزخ میں داخل کریں گے دوزخ بدترین جگہ ہے ۔ یعنی جب کسی کو حق بات واضح ہو چکنے پھر اس کے بعد بھی رسول کے حکم کی مخالفت کرے اور سب مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنی جدا راہ اختیار کرے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے جیسا کہ اس چور نے کیا جس کا ذکر ہو چکا ہے ، بجائے اس کے کہ قصور کا اعتراف کر کے ، توبہ کرتا یہ کیا کہ ہاتھ کٹنے کے خوف سے مکہ بھاگ گیا اور مشرکین میں مل گیا ۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ مندرجہ صدر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو بری کر دیا اور طعمہ کے خلاف فیصلہ فرمایا تو وہ مسلمانوں سے الگ ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملا۔

(ترمذی، حاکم، ابن سعد)

جس شخص پر "الہدیٰ" یعنی دین حقیقی کی راہ واضح ہو جائے اور پھر وہ دیدہ دانستہ اس سے پھر جائے تو اس نے خود اپنی پسند سے سعادت کی راہ چھوڑ کر شقاوت کی راہ پسند کر لی اور جیسی کچھ راہ اس نے پسند کی ضروری ہے کہ ویسا ہی نتیجہ اسے پیش آئے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ اچھی طرح سمجھ چکنے کے بعد کہ رسول جس طریق ہدایت کے داعی ہیں یہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت ہے۔ رسول کی مخالفت کرتے ہیں اور اہل ایمان کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور یہ اس راہ سے سیدھے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔[2]

گویا جب مذکورہ بالا مقدمہ میں وحی الٰہی کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خائن مسلمان کے خلاف اور اس بے گناہ یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمادیا تو اس منافق پر جاہلیت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔[3]

یہ آیت مہمات معارف میں سے ہے۔ اگرچہ شارحین قرآن نے آیت کے مطالب کو پس منظر سے وابستہ کیا ہے لیکن جیسا کہ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ العبرۃ بعموم اللفظ قرآن کی جلالت شان کا تقاضا ہے کہ اسے عام ہی رکھا جائے۔ شارحین قرآن نے اس پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے، مشہور مفسر قرآن امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ

جو بھی بربنائے عداوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اور آپ سے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ آپ اللہ کے رسول ہیں علیحدگی اختیار کرے گا اور راہ حق چھوڑ کر اہل ایمان کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ پر چلے گا یعنی راہ کفر پر چلے گا ہم اس کا مددگار اسی چیز کو بنا دیں گے جس سے اس نے مدد لی ہے۔

اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

[1] ترجمان القرآن [2] تدبر قرآن، [3] تفہیم القرآن

جو شخص محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے نظام کو چھوڑ کر کسی اور نظام کو اپنا کر حضور کے نظام کا مدمقابل ہو جائے گا اور وہ ایسا حق ظاہر ہو جانے کے بعد جان کر کرے گا اور اہل ایمان کی راہ کے علاوہ راہ چلے گا ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے جس کی طرف وہ جاتے گا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں :

جو شخص اللہ کے رسول کی دلیل قطعی کے ذریعہ ہدایت ثابت ہو جانے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اللہ کے رسول کا حکم یہ ہے مخالفت کرے گا اور اہل ایمان کی متفقہ راہ چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلے گا ہم دُنیا میں اسے اس چیز پر اقتدار دے دیں گے جس کو وہ اختیار کر رہا ہے اور ہم اس کے اور اس کی اختیار کردہ راہ میں رکاوٹ نہ بنیں گے۔

یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیت میں رُوئے سخن کس کی طرف ہے اہل ایمان کی طرف یا اُن لوگوں کی طرف جو نبوت کے منکر ہیں۔ عام شارحین قرآن روئے سخن اہل کفر کی طرف بتاتے ہیں اور مطلب یہ قرار دیتے ہیں کہ جن کافروں پر حضور انور کی نبوت کی صداقت ظاہر ہو چکی ہے اگر وہ اس کے بعد بھی حضور کو نبی نہیں مانتے بلکہ آپ کے مخالف ہی رہیں گے اور ماننے والوں کی راہ پر نہ چلیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو دو قسم کی سزا دیں گے ایک تو نُولّه ما تولّی اس کے معنے یہ بتائے ہیں کہ دُنیا میں جو طریقہ اس نے اختیار کیا ہے اسی پر اس کو چھوڑ دیں۔ امام مجاہد کہتے ہیں کہ ہم اسے بتوں کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن ہماری رائے میں آیت میں روئے سخن کافروں کی طرف نہیں بلکہ اہل ایمان کی طرف ہے اور آیت کا منشا یہ بتانا نہیں کہ جو حضور کی نبوت کو نہیں مانے گا بلکہ یہ بتانا ہے کہ جو حضور کو نبی ماننے کے بعد آپ کے احکام کو نہیں مانے گا حضور کے احکام پر چلنا ہی اہل ایمان کی راہ ہے۔ اسی لیے آیت میں لفظ اتباع ہے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف آیت قرآنی سے اجماع ثابت کیا جاتا ہے اور دوسری طرف آیت کا روئے سخن اہل ایمان سے ہٹا کر اہل کفر کو قرار دیا جاتا ہے۔ آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی مسلمانی کا دعویٰ کر کے نبوت کی اپوزیشن بن کر کھڑا ہو گا اور یہ کام بے خبری میں نہیں بلکہ پورے علم و شعور اور دل کی پوری رضامندی سے کرے گا وہ یقیناً ان سزاؤں کا مستحق ہو گا جن کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے۔ اس کی راہ اہل ایمان کی راہ نہیں۔ اہل ایمان کی راہ تو نبوت

کی اتباع ہے۔ جو بھی اتباع نبوت سے جان بوجھ کر گریزاں ہے وہ اہلِ ایمان کی راہ نہیں چل رہا ہے۔
اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ کسی انسان کا وضع کردہ کوئی قانون اگر نبوت سے متصادم ہو جائے تو اسے ٹھکرا کر نبوت کے قانون پر عمل پیرا ہونا فرض ہے کیونکہ ـــــ نبوت جو کچھ لے کر آئی ہے وہ الہدیٰ ہے اور انسانوں کا وضع کردہ قانون الھویٰ ہے۔ اہلِ ایمان کی راہ اتباع ہدیٰ ہے اتباعِ ہویٰ نہیں ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے متصادم ہونے والی چیز باطل ہے اور اس پر عمل کرنا ممنوع ہے۔ قرآن مسلمان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ نبوت کے علم و عمل کے سوا کسی دوسرے قانون کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جس میں نبوت کے علم و عمل اس کی مبادیات اور قانون سازی کے مقررہ طریق کار کے ساتھ ذرہ برابر بھی تصادم پایا جاتے۔ قرآن نے اس صورتِ حال کی صرف دو صورتیں بتائی ہیں۔ الہدیٰ کی طاعت یا الھویٰ خواہش کی پیروی الہدیٰ نام ہے نبوت کے علم اور اس علم کے مطابق پیمانۂ عمل کا: اور الھویٰ نام ہے نبوت کے پیمانۂ عمل کے خلاف ہر کام کے خواہشِ نفس کی پیروی کرنے کا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون اھواءھم و
من اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدیً من اللہ

اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔

فقہا اس پر متفق ہیں کہ اگر کوئی مسلمان قرآن اور سنت سے ہٹ کر کچھ اپنے قوانین گھڑ لیتا ہے اور اللہ کی نازل کردہ بعض یا پورے کے پورے احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی حالت کے مطابق ان فیصلوں میں سے ایک فیصلہ اس پر منطبق ہوتا ہے۔ ایک شخص اگر چوری، تہمت، بدکاری یا زنا کے بارے میں قرآنی حکم کو نہیں مانتا تو وہ کافر ہے اور اگر وہ ان احکام کو ماننے سے انکار تو نہیں کرتا لیکن کسی دوسری وجہ سے ان کے مطابق فیصلہ بھی نہیں کرتا تو وہ ظالم ہے اور اگر وہ فیصلہ دیتے ہوئے انصاف اور تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا تو وہ فاسق ہے۔
اس آیت قرآنی سے کچھ علماء نے اصول اجتہاد میں سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے چنانچہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں ـــــ اکابر علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اجماعِ اُمت کا مخالف اور منکر بھی جہنمی ہے یعنی اجماعِ اُمت کو ماننا فرض ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کا

ہاتھ مسلمانوں کی جماعت پر ہے جس نے جدی راہ اختیار کی وہ دوزخ میں جائے گا۔[1] لیکن کچھ علما کو اجماع کے حجت ہونے میں تو نہیں مگر اس آیت سے اجماع کی حجیت پر استدلال میں اختلاف ہے۔ یہ ایک طویل الذیل بحث ہے۔ تفصیل آلوسی نے روح المعانی میں لکھ دی ہے۔ حافظ ابن کثیر یہاں اس آیت کی تفسیر میں بڑی عجیب بات فرما گئے کہ :

> اس امت کے لیے ایک طرف اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ کسی غلط بات پر جمع ہونے سے محفوظ کر دی گئی اور دوسری طرف اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی ضمانت دی گئی ہے۔

اس موضوع پر بہت سی صحیح حدیثیں آئی ہیں۔

جلیل القدر محدثین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگرچہ مشہور روایت لا تجتمع امتی علی ضلالۃ لفظاً و سنداً ثابت نہیں ہے لیکن وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہے۔ مشہور اندلسی محدث و ناقد علامہ ابو محمد علی بن حزم اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں :

> محدثین کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی غیر حق پر متفق نہیں ہو سکتی اس لیے کہ آپ نے اس کی خبر دی ہے کہ ہر دور میں حق کے علمبردار رہیں گے بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تجتمع امتی علی ضلالۃ۔ اگرچہ اس کے الفاظ و سند درجۂ صحت کو نہیں پہنچے لیکن اس کا مفہوم اور نتیجہ ان احادیث کی بنا پر جن میں ہر دور میں حق پر قائم رہنے والوں کی خبر دی گئی ہے صحیح اور ثابت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ط
وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾ إِن يَدْعُونَ
مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ج وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ
اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ
وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ط وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ
خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ﴿١١٩﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ط وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ
إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾

اللہ یہ بات نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اس کے سوا جتنے گناہ ہیں وہ جسے چاہے بخش دے[۱۱۵] اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ سیدھی راہ سے دُور جا پڑتا ہے[۱۱۶]۔ یہ لوگ اللہ سے ورے صرف دیویوں ہی کو پکارتے ہیں اور یہ لوگ

نہیں پکارتے ہیں مگر شیطان مردود کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے[۱۱۸]۔

اور اسی کا دعویٰ ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ

ضرور لے کر رہوں گا[۱۱۸] میں ان کو ضرور بہکاؤں گا، میں ان کو ضرور

آرزؤں میں لگائے رکھوں گا، میں ان کو ضرور حکم دوں گا، وہ

ضرور میرے حکم کی پابجائی میں جانوروں کے کان چیریں گے

اور میں ان کو ضرور حکم دوں گا وہ میری اطاعت میں ضرور خدا کی

بناوٹ میں تبدیلی کریں گے[۱۱۹]۔ اور دیکھو! جو شخص بھی اس شیطان

کو اللہ سے ورے اپنا رفیق و مددگار بنائے گا وہ سرتا سر نقصان

اور خسارے میں رہے گا اور خسارہ بھی کھلا خسارہ[۱۲۰]۔ یہ شیطان ان

سے وعدے کرتا ہے اور ان کو آرزؤں میں الجھائے رکھتا ہے

لیکن شیطان کا ہر وعدہ سرتاسر دھوکا اور فریب ہوتا ہے،

یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے جس سے ان کو خلاصی کی

کوئی صورت نہ ملے گی[۱۲۱]۔

اسلامی نظام کا غیر اسلامی نظام سے مقابلہ

نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی سب سے اہم رکن توحید کی دعوت ہے ، اللہ تعالیٰ کے بارے میں عقیدہ اور عبد و معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت ، ہر زمانہ اور ہر ماحول میں انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی پہلی دعوت اور ان کا سب سے بڑا اور اہم مقصد رہا ہے۔ ہمیشہ ان کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے اور صرف وہی عبادت ، دعا ، توجہ اور قربانی کا مستحق ہے۔ اور صرف وہی تمام مسائل زندگی میں طاعت کا حقدار ہے۔ ان کے بھرپور حملہ کا رُخ اپنے زمانے میں جاری و ساری " ذہنیت " کی طرف متوجہ رہا ہے جو موتیوں اور مقدس و صالح زندہ و مردہ شخصیتوں کی پرستش کی صورت میں جلوہ گر تھی۔ ان ہستیوں کے بارے میں اہل جاہلیت کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت و عظمت اور معبودیت کی خلوت سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان کو خاص اُمور میں تصرف کا اختیار بھی دے رکھا ہے اور انسانوں کے بارے میں ان کی سفارشوں کو علی الاطلاق قبول کرتا ہے جیسے شہنشاہ اعظم ہر علاقہ کے لیے ایک حاکم بھیج دیتا ہے اور بعض اہم امور کے علاوہ علاقہ کے انتظام کی ساری ذمہ داری انہی کے سر ڈال دیتا ہے۔ جس شخص کو نبوت کے علم و عمل سے کچھ بھی تعلق ہے اس کو یقینی اور بدیہی طور پر یہ معلوم ہو گا کہ اس نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط عبادت اور طاعت کی جانے اور انسان احکام الٰہی کے سامنے اپنے اختیارات سے کلیتہً دستبردار ہو جائے۔ اپنی عقل ، اپنی رائے ، اپنے افکار اور اپنے اعمال ، اپنے احساسات اور اپنے جذبات ، اپنے رجحان طبع اور اپنے ذوق سب کی گردنوں میں اللہ کی بے قید غلامی کا قلاوہ ڈال دے کیونکہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے تحت وہ اللہ کا عبد ہے اور اسے صرف اس کی مرضیات پوری کرنے کا فرض انجام دینا ہے۔ یہاں شرک کا ذکر ان منافقین کے تعلق سے ہوا ہے جو احکام الٰہی کے مقابلے میں اپنے ہوا جس ، اپنے میلان طبع کی پیروی کر رہے تھے اور اتباع ہُدیٰ کی جگہ اتباع ہویٰ کی راہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ نبوت کا علم و عمل ہوتے ہوئے کسی اور کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعت جو حق خداوندی ہے اس میں دوسرے کو شریک کر دیا گیا۔ یہ پرستش میں شرک نہیں بلکہ اللہ کی بندگی میں شرک ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہو اور جدی راہ چلے ۔ یہ آیت

نازل فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو "شرک" فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور مولانا شیخ الاسلام عثمانی فرماتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ شرک یہی نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرے بلکہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی کے حکم کو پسند کرنا بھی شرک ہے۔

گویا بتا دیا ہے کہ اسلامی نظام کی موجودگی میں کسی دوسرے نظام کو برضا و رغبت شرف پذیرائی دینا ایک مسلمان کے لیے مشرکانہ عمل ہے اور انسانیت کی خیر و برکت اور تمدن کی ساری ترقیاں اسلامی نظام سے وابستہ رکھنی چاہییں۔

۱۷۵- اللہ یہ بات نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔ اس کے سوا جتنے گناہ ہیں وہ جسے چاہے بخش دے گا۔ یعنی شرک سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے بخش دے گا مگر شرک کو ہرگز نہ بخشے گا۔ مشرک کے لیے عذاب ہی مقرر ہو چکا تو چوری کرنا اور تہمت جھوٹی لگانا اگرچہ کبیرہ گناہ تھے مگر یہ بھی احتمال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس چور کو بخش دیتا مگر جب وہ چور رسول کے حکم سے بھاگا اور مشرکوں میں جا ملا تو اس کی مغفرت کا احتمال بھی باقی نہ رہا۔[1]

جیسا کہ تمہید میں اشارہ ہو چکا ہے اور شاہ عبدالقادر کے حوالہ سے بتایا جا چکا ہے کہ اس آیت میں پرستش میں شرک کا نہیں بلکہ بندگی میں شرک کا ذکر ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ شرک فی الالوہیت کا نہیں بلکہ شرک فی الربوبیت کا ذکر ہے۔ اس آیت میں شرک فی الذات، شرک فی الخلق کا ذکر نہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

ان میں مشرکین عرب کا اور یہود و نصاریٰ کا نبوت سے کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کی مانی ہوئی باتوں میں سے ہے۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا نبوت سے اختلاف صرف توحید عبادت میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس مطلوبہ عبادت کو انسان کا مقصدِ وجود قرار دیا ہے اور جس کی تلقین و ہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں وہ کوئی ادھوری یا آدھی تہائی قسم کی عبادت نہیں، نہ وہ صرف پرستش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تک محدود ہے اور نہ صرف اطاعت و بندگی تک یہی عقل کا صریح تقاضا ہے اور یہی قرآن کا واضح فیصلہ۔
عقل کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ جو خدا انسان کا خالق اور مالک، رازق اور محسن، حاکم اور معبود سبھی کچھ ہے اسے سبھی طرح کی عبادتوں کا حقدار بھی ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس کی آیتیں اپنے پیروؤں سے اللہ جل مجدہ کی پرستش اور اس کی اطاعت و بندگی دونوں ہی چیزوں کا یکساں طور پر مطالبہ کرتی دیکھی جا رہی ہیں۔ وہ جہاں یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو اسی کے نام کی پاکی بیان کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور اعترافِ نعمت کرو، وہیں یہ بھی کہتی ہیں اور بار بار کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو بے قید و شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرماں روا مانو۔ اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو، اسی کے احکام کی اطاعت کرو، اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو، اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ۔ اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو، اسی لیے اس عبادت کا مفہوم جسے انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا فرمایا گیا ہے۔ جو ہر نبی کی دعوت کا سرعنوان تھی اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے۔ لازماً وہ ہی جامع اور کامل مفہوم ہوگا جس میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہوں۔

اس آیت میں جس چیز کو شرک قرار دیا گیا ہے وہ شرک فی الطاعت ہے اور سابقہ آیت من یشاقق الرسول کے بھی مناسب ہے۔ شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی بنایا جائے گویا شرک کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہو دوسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہو۔ تیسرے وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت مانا جائے مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی اطاعت صرف اللہ کا حق ہے۔ اسی طرح ان صفات کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے اگر کسی اور کو بغیر حکم الٰہی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔ اسی کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے وان اطعتموھم انکم لمشرکون اس آیت کی تشریح میں شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو خدا کے سوا پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے

کردار کا مطیع ہوجائے۔

اطاعت میں نبی کا مقام

اطاعت کے موضوع پر خود قرآن نے نبی کی اطاعت کو شرطِ ایمان قرار دیا ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے۔ اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ بہرصورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہی ہے۔ نبی کی یہ حیثیت خود قرآن میں اللہ سبحانہ کی مقرر کی ہوئی ہے جیسا کہ پڑھ آئے ہو وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہو بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے جیسا کہ ہم آیت قرآنی فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک کی تشریح میں بتا آئے ہیں۔ اور ایسا ہونا بہرحال ضروری بھی تھا۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور ہی نہیں کرسکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور اس کے احکام جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہی ہے تو نبی کی کامل اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہی لوگوں سے مطالبہ کرتا ہے۔ فاتقوا اللہ واطیعون خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ یہ دراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تقویٰ اور بندگی کی راہ تمہیں صرف نبی کی اطاعت کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ نبی ہی بتا سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ کے احکام کیا ہیں اور ان پر عمل کس طرح کیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی ہی اطاعت کا حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسول کا حکم بھی دیا ہے بلکہ جیسا کہ اسی پارے میں پڑھ آئے ہو نبی کی اطاعت کو خدا کی اطاعت فرمایا من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اس لحاظ سے رسول کی طاعت ذات اور شخص کی نہیں بلکہ رسالت کی ہے۔ یعنی یہ اطاعت رب العزت کے حکم کے تحت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر رسول سے مشاقہ قرآن میں سنگین جرم بتایا گیا ہے۔ یہاں اسی اطاعت کے مقابلے میں کبرا، سادہ، مسرفین کی طاعت کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں قوم ثمود کے ذکر میں جہاں حضرت صالح یہ فرماتے ہیں۔ فاتقوا اللہ واطیعون وہاں یہ بھی فرماتے ہیں:

ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون

اوران بے لگام لوگوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو ملک میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح کا کوئی کام نہیں کرتے۔

سورۃ احزاب میں صاف تصریح ہے:

یوم تقلب وجوههم فی النار یقولون یالیتنا اطعنا الله واطعنا الرسولا و قالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا۔

جس روز ان کے چہرے آگ پر اُلٹ دیے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور رسُول کی طاعت کی ہوتی اور کہیں گے اے رب ہمارے ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا۔

یہ منافقین جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے خدا کی کتاب اور اس کے قانون کے ہوتے ہوئے مسرفین کے قانون کی پیروی کر رہے تھے اور اپنے معاملاتِ زندگی، تمدنی مسائل میں بجائے اس کے کہ اسلام کے سیاسی نظام کو مان کر اللہ کے رسُول کی اطاعت کرتے وہ تحاکم الی الطاغوت کو اپنا رہے تھے۔ قرآن ان کے اسی طرزِ عمل کو یہاں شرک بتا رہا ہے۔

غیر اسلامی نظام سرتاسر ضلالت ہے

۱۱۶۔ اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ سیدھی راہ سے دُور جا پڑتا ہے، اس لیے کہ وہ شخص اللہ ہی سے صریح منحرف ہو گیا اور اللہ کے مقابلے میں دوسرا معبود بنا کر شیطان کا پورا مطیع ہو گیا۔ اللہ کی اطاعت اور اس کی رحمت سب سے مستغنی ہو بیٹھا اور جو اتنی دُور جا بیٹھا تو اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے بلکہ ایسے شخص کی مغفرت تو خلافِ حکمت ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مغفرت سے صاف مایوس فرما دیا گیا۔ اور مسلمان کتنا ہی گنہ گار ہو چونکہ اس کی خرابی صرف اعمال تک ہے۔ اس کا عقیدہ اور تعلق اور توقع سب جوں کا توں موجود ہیں اس کی مغفرت ضرور ہو گی جلدی یا بدیر اللہ جب چاہے گا بخش دے گا۔ جس طرح توحید اصل اصول ہے تمام ممکن بھلائیوں اور نیکیوں کی، اسی طرح شرک اصلی بنیاد ہے ساری برائیوں کی۔ اس لیے اور کسی گناہ پر شرک کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مشرک قبول رحمت کی ساری استعدادوں کو

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

محو کر دیتا ہے۔ اس آیت میں لفظ ضلالت سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ان مشرکوں کا ذکر ہو رہا ہے جو شرک فی الطاعت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر احکام و قوانین کی جگہ نیاز مندانہ اعمال کا شرک مراد ہوتا تو ضلالت نہ آتا بلکہ افترا آتا اور پھر یہاں سابقہ آیت میں الھدیٰ آیا ہے اسی کے ضلالت ہی مناسب ہے۔

اس آیت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اسلامی نظام کے مقابلے میں ہر نظام سرتاسر ضلالت اور گمراہی ہے جبکہ اسلامی نظام سرتاسر ہدایت ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو دوسرے موقعہ پر آئے گی مگر یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ غیر اسلامی نظام کے نظام ہونے کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اس کو پارلیمنٹ کی یا بادشاہ کی منظوری حاصل ہے یا کسی عدالت نے اس پر عمل کیا ہے یا کسی حکومت نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو تو پھر اس نظام کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اس کے برعکس اسلامی نظام کی قانونی حیثیت ان چیزوں میں سے کسی چیز کی محتاج نہیں ہے۔ وہ بہرحال قانون ہے کوئی عدالت اس کو مانے یا نہ مانے اور کوئی حکومت اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے وہ اس کائنات کے حقیقی مالک اور حکمران کا قانون ہے۔ اگر کوئی عدالت یا حکومت اس کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے تسلیم نہ کرنے سے اس کی قانونی حیثیت متاثر نہیں ہوتی بلکہ خود وہ عدالت یا حکومت نافرمانی اور بغاوت کی مجرم ٹھہرتی ہے۔ قرآن کا اعلان ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون۔

اس حقیقت کا اظہار ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو اسلام نے اپنے نظام کے لیے اختیار کیے ہیں۔ اسلامی قانون میں جو الفاظ استعمال ہوتے ان میں ما انزل اللہ ہے جس کے معنے ہیں اللہ کا اپنے رسول پر اتارا ہوا نظام، اسی کو قرآن، کتاب، ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا لفظ ما اراہ اللہ جس کے معنے ہیں اللہ کی اپنے رسول کو سمجھائی ہوئی بات، اسی کو سنّت اور حدیث کہتے ہیں۔ اور دونوں کو قرآن و سنّت یا نبوّت کا علم و عمل کہتے ہیں۔ اس کے خدا کی طرف سے آنے اور خدا کی اراءت ہونے میں اسلامی نظام کے لیے ہدایت ہونے کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔ اور اسی بنا پر اس کو نہایت مقدس و محترم مانا جاتا ہے۔ وہ ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہوتا ہے جس کو مانے بغیر اس کا ایمان ہی درست نہیں ہوتا۔ اس کے دینے والے کے متعلق ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ دلوں کے بھیدوں اور خلوت خانوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔

اس کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تو درکنار اگر دل کے کسی گوشہ میں اس سے انحراف کا وسوسہ بھی موجود ہو تو وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے متعلق ہر مسلمان کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ خدا کی رضا اس کے ماننے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر دنیا کی صلاح بھی ہے اور آخرت کی فلاح بھی۔ اس بنا پر قانون اسلامی سرتاسر ہدایت ہے اور غیر اسلامی قانون سرتاسر ضلالت ہے۔

اسلامی نظام سے انحراف کا سبب

۱۱۷۔ یہ لوگ اللہ سے ورے صرف دیویوں ہی کو پکارتے ہیں اور یہ لوگ نہیں پکارتے ہیں مگر اس شیطان مردود کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اسی کا دعویٰ ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ ضرور لوں گا، یعنی انہوں نے اللہ کے سوا جو اپنا معبود بنایا ہے تو ان بتوں کو جن کو عورتوں کے نام سے نامزد کر رکھا ہے جیسے عزیٰ، منات، اور نائلہ وغیرہ اور حقیقۃ الامر دیکھئے تو یہ مشرکین شیطان سرکش ملعون الٰہی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی نے بہکایا ایسا کرایا اور بت پرستی کرنے میں اس کی اطاعت اور اس کی عین خوشی ہے۔ اس سے مشرکین کی پرلے سرے کی ضلالت اور جہالت ظاہر فرمانی مقصود ہے۔ دیکھئے اول تو اللہ کے سوا کسی کو معبود بنانا اس سے بڑھ کر ضلالت کیا ہو سکتی ہے۔ پھر بنایا تو کس کو پتھروں کو جن میں کسی قسم کی حس و حرکت بھی نہیں اور عورتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اور کس کے بتلانے سے شیطان مردود و ملعون خداوندی کے بہکانے سے کیا اس ضلالت اور جہالت کی نظیر مل سکتی ہے اور کوئی احمق سے احمق بھی اس کو قبول کر سکتا ہے۔[1]

دراصل یہ استیناف بیانی ہے۔ اس میں جواب دیا گیا ہے کہ بندگی کی حدود میں مشرکانہ طرز عمل کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ اوروں کی نظر نے تو یہ نہیں تاڑا لیکن علامہ آلوسی نے یہ بات سمجھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں والجملۃ مبینۃ لوجہ ما قبلھا یعنی من یشرک باللہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اس کی وجہ بیان کی جا رہی ہے جیسے قرآن کی عادت ہے کہ توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کرتا ہے ایسے یہاں شرک فی العبادت کو شرک فی الطاعت کی وجہ قرار دیا ہے یعنی چونکہ ان میں شرک فی العبادت سے بستگی تھی اس لیے

[1] افادات شیخ الاسلام

ان میں شرک فی الطاعت پروان چڑھا۔

اناث انثی کی جمع ہے۔ لغت میں نرم و نازک کمزور کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت میں معبودان باطل کو اناث یا تو باعتبار لفظ کہا ہے کیونکہ اپنے بتوں کو انواع و اقسام کے زیورات سے آراستہ کرتے اور عورتوں کے نام سے پکارتے جیسے لات، منات، عزیٰ، نائلہ کہ یہ سب مونث نام ہیں۔ سعید بن منصور، ابن جریرا و ابن المنذر نے حضرت حسن بصری کی تصریح نقل کی ہے۔ کہ عرب کے قبیلہ قبیلہ کا بُت تھا جو اسی قبیلہ کی نسبت انثی بنی فلاں کہلاتا تھا۔ یا معنے کے اعتبار سے اناث کہا گیا چنانچہ مغربی نے اناث کے معنے کمزور اور عاجز کے بتائے ہیں جن کو کام کرنے کی قدرت نہ ہو۔ اسی مناسبت سے عربی میں کھٹل تلوار کو سیف انیث کہتے ہیں اَنِثَ فی امرہ کے معنے ڈھیلا پڑجانے کے ہیں۔ مخنث اور کمزور آدمی کو انیث کہا جاتا ہے۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں کہ موجودات کی ایک دوسرے کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں ۱۔ فاعل غیر منفعل یہ صفت صرف ذات باری کی ہے اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ۲۔ منفعل غیر فاعل یہ صفت جمادات کی ہے۔ ۳۔ ایک اعتبار سے فاعل دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن وانس اور ملائکہ کہ یہ اللہ سبحانہٗ کے اعتبار سے منفعل ہیں اور اپنی مصنوعات کے اعتبار سے فاعل ہیں۔ چونکہ عرب کے معبود من جملہ جمادات تھے جو سرتاسر منفعل اور غیر فاعل ہیں یعنی ان میں محض اثر پذیرائی کی صلاحیت ہے مگر موثر ہونے کی قوت بالکل نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے اناث کہہ کر مشرکین کو تنبیہہ کی ہے کہ تم نے جن کو معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے اور صرف یہی نہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی تو کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتے۔ اسی لیے حضرت ابن عباس، حسن بصری اور قتادہ نے اناثا کے معنے مُردے اور بے جان کے بتائے ہیں۔ ابن جریرا و ابن ابی حاتم حضرت حسن بصری سے ناقل ہیں کہ ہر بے جان چیز جس میں رُوح نہ پائی جاتے اناث میں داخل ہے۔ خشک لکڑی ہو یا خشک پتھر، مشہور مفسر ضحاک تابعی کا بیان ہے کہ مشرکین فرشتوں کو معاذ اللہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور مدعی تھے کہ ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ بارگاہ ایزدی میں ہمارے تقرب کا ذریعہ ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے اسی خیال کے اعتبار سے اناث کہا ہے۔ ضحاک کی یہ تفسیر خود قرآنی آیات کے بھی مناسب ہے۔ سورۃ زخرف میں تصریح ہے۔

وجعلوا الملائکۃ الذین ھم عباد الرحمان اناثا۔

بہرحال اناث کا لفظ فرشتوں کے لیے ہو یا بتوں کے لیے، فرشتوں کے بھی انہوں نے بت رکھے تھے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ناموں کی یہ تانیث تماثیل اور صور کے اعتبار سے ہے ورنہ ذات کے لحاظ سے نہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے بت پرستی کا جو پس منظر بتایا ہے اس کی تائید ہوتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :

مشرکین کا خیال یہ ہے کہ کچھ نیک بندگان خدا پہلے گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کی عبادت اور تقرب الٰہی میں خوب نام پیدا کیا۔ اللہ نے ان کو الوہیت کی پوشاک سے نوازا، اس کے نتیجہ میں وہ تمام مخلوقات میں استحقاق عبادت کے شرف سے مالا مال ہو گئے۔ جیسے شہنشاہ اعظم ہر علاقہ کے لیے حاکم روانہ کر دیتا ہے۔ اور علاقہ کے انتظام کی ساری ذمہ داری اس کے سر ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے ان کو عزت و عظمت اور معبودیت کی خلعت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اب یہی لوگوں کی درخواستیں سنتے اور لوگوں کی عبادت کے بھی مستحق ہیں بلکہ اللہ کی کوئی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول ہی نہیں ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات بالاتر ہے، اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کی عبادت ناگزیر ہے۔ یہی سنتے ہیں، یہی دیکھتے ہیں، یہی سفارش کرتے ہیں، یہی کام بناتے ہیں اور لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ لوگوں نے اسی تصور کے تحت ان کے ناموں کی تصویریں بنائی ہیں اور ان کو اولاً قبلہ توجہ بنایا۔ بعد ازیں امتداد وقت کے ساتھ شخص اور شخصیت کا فرق نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور لوگوں نے اشخاص یعنی بتوں کو معبود بنا لیا۔ اسی بنا پر اللہ سبحانہ، تردید کے لیے دو قسم کے انداز اختیار کیے کبھی شخصیتوں کا یہ کہہ کر رد کیا کہ حکم ملک صرف اللہ کا ہے اور کبھی اشخاص کا رد کیا، یہ کہہ کر کہ یہ جمادات ہیں۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مذہب کی ابتدائی تاریخ کا مظہر یعنی اعاظم پرستی عرب میں موجود تھی۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ عرب کے مشہور بت لات، ود، یغوث وغیرہ پہلے زمانہ کے بزرگوں کے نام ہیں۔ اہل عرب ان کی مورتیں بنا کر پوجتے تھے۔

ان تصریحات کی روشنی میں اناث کی تفسیر میں جو تین باتیں کہی گئی ہیں اوّل اصنام دوم اموات۔ سوم ملائکہ سب صحیح ہیں۔ اصنام اشخاص ہیں ان کی شخصیتیں خواہ فرشتے ہوں یا اموات ہوں، خود کوئی قرآن کہتا ہے ان سے دعاؤں، فریادوں، استغاثوں، استعانتوں اور دہائیوں میں تعلقات

قائم رکھنا ہی ان سے عابدانہ معاملہ کرنا ہے اور یہی پرستش بندگی کا باعث ہے۔

شرک کی قیادت شیطان کرتا ہے

اس آیت میں دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ یہ لوگ نہیں پکارتے مگر شیطان مردود کو، اصل ارشاد وان یدعون الا شیطاناً مریداً ۔شیطان سرکش شریر کو کہتے ہیں۔ امام محمد بن جریر فرماتے ہیں کہ ہر چیز کو جو سرکش ہو شیطان سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ اس کے اخلاق وافعال اپنے تمام ہم جنسوں کے اخلاق وافعال سے جُدا ہوتے ہیں اور وہ خیر سے جُدا ہوتا ہے اس معنی کے اعتبار سے شیطان شیطن سے بروزن فیعال ہے اور سیبویہ نے کبھی اس کے نون کو زائد لکھا ہے اور کبھی اصلی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بصریوں کے نزدیک اس کا وزن فیعال ہے لہٰذا اس کا نون اصلی ہے اور شطن سے مشتق ہے جس کے معنے دُور ہونے کے ہیں اور اسم فاعل شاطن ہے اور کوفیوں کے نزدیک اس کا وزن فعلان ہے اور نون زائد ہے اور شاط یشیط سے مشتق ہے جس کے معنے ہلاک ہونے کے ہیں اس کا مونث شیطانۃ ہے اور شیطان کی جمع شیاطین ہے۔

مرید مرد سے ہے شجر امرد اس درخت کو کہتے ہیں جس پر پتے نہ ہوں اور امرد مردوں میں بے ریش لڑکے کو کہتے ہیں۔ اس لیے مرید وہ ہے جو ہر قسم کی بھلائی سے خالی ہو۔ یہاں شیطان کے پکارنے کا ذکر اس کی شرک میں قیادت ظاہر کرنے کے لیے ہے کیونکہ تمام برائیوں کا شجرہ نسب اسی سے ملتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو وہ معبود بنا کر اپنی دعاؤں، فریادوں، استغاثوں اور استعانتوں میں پکارتے ہیں ان کو تو اس کا کوئی پتہ بھی نہیں نہ انھوں نے ان پکارنے والوں کو اس کی تلقین کی ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس معاملہ میں شیطان کی طاعت کر رہے ہیں اور اس کے بہکانے سے ایسا کر رہے ہیں ورنہ شیطان کو اس معنے میں تو کوئی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے مراسم عبادت ادا کرتا ہو اور اس کو الوہیت کا درجہ دیتا ہو۔ اسے معبود بنانے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دیتا ہے اور جدھر وہ چلاتا ہے اُدھر چلتا ہے گویا کہ یہ اس کا بندہ ہے اور وہ اس کا خدا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی عبادت ہے اور جو شخص اس طرح کی طاعت کرتا ہے وہ دراصل اس کی عبادت بجالاتا ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن

پھر ایک جملہ خبریہ کے ذریعہ شیطان کی صفت لعنہ اللہ یہ بتانے کے لیے لاتے ہیں کہ ان کی طاعتوں کا مرکز دائمی لعنت کا موصوف ہے۔ یہ گویا ان کی جہالت اور حماقت پر ایک اور ضرب کاری لگائی ہے اور آلوسی نے تصریح کی ہے کہ ابوالبقاءؒ نے اسے جملہ معترضہ بھی بتایا ہے۔

انسانی زندگی میں شیطان کا حصہ

۱۱۸۔ اور اس کا دعویٰ ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ضرور ایک مقررہ حصہ لے کر رہوں گا۔ یعنی جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون ہوا تو اس نے اسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولادِ آدم میں سے اپنے لیے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا جیسا کہ سورہ حجر اور بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے مطلب یہ ہے کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اول روز سے سخت دشمن ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر ہو چکا ہے تو اب یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث و گمراہ ہے مگر شاید کسی کو غیر خواہانہ کوئی نفع کی بات بتلادے بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا۔ پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنی کس قدر حماقت اور جہالت ہے حصہ مقررہ لینے کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ تیرے بندے اپنے مال میں سے میرا حصہ ٹھہرائیں گے جیسا کہ لوگ بُت یا جن وغیرہ غیر اللہ کی نذر و نیاز ادا کرتے ہیں [۱]

جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ اس آیتِ قرآنی کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے ایک یہ کہ اے پروردگار تیرے کچھ بندے تجھے چھوڑ کر میرے ہوں گے تو اس طرح تیرے بندوں میں میرا حصہ ضرور ہو گا۔ اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ شیطان کہہ رہا ہے کہ تیرے بندوں میں ایک مقررہ حصہ میرا ہو گا۔ اگرچہ لفظ نصیب قلت اور کثرت کو نہیں بتاتا لیکن یہاں متبادر اس سے قلت ہی ہوتی ہے اور نصیب من عبادک سے بلاغت کی رو سے سمجھا بدیہی جاتا ہے کہ سب میں کچھ میرے ہمنوا ہوں، لیکن قرآن میں اسی بات کو دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے لا تجد اکثرھم شاکرین اور سورہ نحل میں ہے لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین اور سورہ بنی اسرائیل میں لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا۔

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

ان سب آیات کا منطوق یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت شیطان کی ہمنوا ہوگی اس طرح جیسا کہ ابوحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ یہ آیت قرآنی قرآن کی آیات سے متعارض ہوگی اس لیے ہماری رائے میں آیت کا مطلب دوسرا ہے یعنی یہ کہ میں تیرے بندوں سے ان کے مال میں ایک مقررہ حصہ لوں گا۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ میں تیرے بندوں کو ایسا گمراہ کروں گا کہ وہ شرک کرنے لگیں گے اور اپنے مالوں سے مقررہ حصے غیراللہ کی نیازوں کے نکالیں گے۔ اب یہ آیت اس تشریح کی روشنی میں قرآن کی دوسری آیت شارکھم فی الاموال والاولاد کے مطابق ہے۔

اب سادہ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اوقات میں ان کی محنتوں اور کوششوں میں ان کی قوتوں اور قابلیتوں میں ان کے مال اور اولاد میں اپنا حصہ لگاؤں گا اور ان کو ایسا فریب دے کر پر چاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک معتدبہ حصہ میری راہ میں صرف کریں گے۔

انسانی زندگی پر شیطان کے چھاپے

۱۷۹۔ میں ان کو ضرور بہکاؤں گا میں ان کو ضرور آرزوؤں میں لگائے رکھوں گا، میں ان کو ضرور حکم دوں گا۔ وہ ضرور میرے حکم کی پابجائی میں جانوروں کے کان چیریں گے اور میں ان کو ضرور حکم دوں گا کہ وہ میری طاعت میں ضرور خدا کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے۔ یعنی جو لوگ میرے حصہ میں آئیں گے ان کو طریق حق سے گمراہ کروں گا اور ان کو حیات دنیوی اور خواہشات دنیوی کے حصول کی اور قیامت اور حساب وکتاب اخروی کے نہ ہونے کی آرزو دلاؤں گا اور اس بات کی تعلیم دوں گا کہ جانوروں کے کان چیر کر بتوں کے نام پر ان کو چھوڑ دیں گے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو اور اس کی مقرر کی ہوئی باتوں کو بدل ڈالیں گے۔ کافروں کا دستور تھا کہ گائے بکری اونٹ کا بچہ بُت کے نام کر دیتے اور اس کا کان چیر کر یا اس کے کان میں نشانی ڈال کر چھوڑ دیتے اور صورت بدلنا جیسے خوجہ کرنا یا بدن کو سوئی سے کھود کر تل بنانا یا نیلا داغ دینا یا بچوں کے سر پر چوٹیاں رکھنی کسی کے نام کی۔ مسلمانوں کو ان کاموں سے بچنا ضروری ہے، داڑھی منڈانا بھی اسی تغیر میں داخل ہے اور اللہ کے جتنے احکام ہیں کسی میں تغیر کرنا بہت سخت بات ہے جو چیز اس نے حلال کر دی اس کو حرام کرنا یا حرام کو حلال کرنا اسلام سے نکال دیتا ہے تو جو کوئی ان باتوں میں مبتلا ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں شیطان کے مقررہ حصے میں داخل ہوں جس کا ذکر گزرا۔ [1]

---

[1] افادات شیخ اسلام

شیطان کے اس چیلنج سے اس کے جوش و خروش کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے جو وہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کی تمام مساعی ضلالت کا خاص ہدف توحید کا عقیدہ ہے چنانچہ یہاں اس نے کہا لاضلنھم میں ان کو ضرور گمراہ کروں گا اور سورہ نمل میں اس کی بجائے لاغوینھم آیا ہے۔ ضلالت اور غوایت دونوں کا چیلنج دیا ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔

ضلالت نام ہے علمی اور فکری گمراہی کا اور غوایت نام ہے کردار و عمل میں غلط روی کا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن میں دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ ارشاد ہے ماضل صاحبکم وما غوی۔ اس آیت میں شیطان نے کہا ہے کہ ہر قسم کی فکری، نظری، اور عقلی گمراہیوں میں ڈالوں گا۔ یعنی ان کے عقائد اور نظریات کو راہ حق سے ہٹاؤں گا۔ علامہ بغوی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ اضلال سے مقصود تزیین ہے یعنی شیطان کا کام یہ ہے کہ ہر کام کو لوگوں کے سامنے مزین کر کے اور سجا کر پیش کرتا ہے چنانچہ قرآن ہی میں ہے لازینن لھم یعنی تیری نافرمانی کو اچھی کر کے دکھاؤں گا۔ باطل پر حق کی، شرک پر توحید کی اور بدعت پر سنت کی اور اعمال سیئہ پر حسنہ کی ملمع کاری کروں گا۔

رازوں اور ولولوں کا جال

اس آیت میں دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ میں ان کو ضرور آرزوؤں میں لگائے رکھوں گا۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں ہے وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے اور جو چیز خلود بخشی کی خاصیت سے محروم ہے اس کے بارے میں خلود بخش ہونے کا سبز باغ دکھاتا ہے۔ جن اعمال و افعال کا کوئی نتیجہ نہیں ہے باور کراتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے۔ الغرض شیطان کی امانی اور آرزوؤں کا جال اتنا وسیع اور اتنا مستحکم ہوتا ہے کہ موجود اس کے بعد معدوم نظر آتا ہے اور معدوم موجود ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے۔ خود قرآن نے انہی آرزوؤں کے جال کی ایک عملی مثال بھی پیش کی ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو بہکاتے ہوئے کہا کہ ھل ادلک علی شجرۃ الخلد کیا میں تجھے دوام اور ہمیشگی کا درخت بتادوں؟ اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان کی زبان سے

آرزوؤں کا یہ سبز باغ دکھایا گیا ہے کہ اس نے حضرت آدم اور حوا کو یہ سمجھایا تھا کہ اس درخت کے استعمال کے بعد تم دونوں کو یہاں بقائے دوام حاصل ہو جائے گا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان کا معاصی اور فواحش کی طرف میلان ہوتا ہے اور اس کی نظر سے اس کی مضرتیں غائب ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے وہ عقائد و نظریات جن کا قرآن و سنت میں کوئی نام و نشان نہیں اسی شیطانی تمنی کا شاہکار ہیں مثلاً یہ عقیدہ کہ وہ جن کے ناموں کی نذریں اور نیازیں دیتے ہیں وہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ انہی کی سفارش سے ان کو دنیا کی نعمتیں مل رہی ہیں اور آخرت میں بھی ایمان و عمل سے تہی دامن ہونے کے باوجود ان کی سفارش سے ان کو جنت ملے گی اسی سے یہود اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد ہیں۔ اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹوں اور محبوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنت کے پشتینی حقدار ہیں۔ ان کے اعمال کچھ ہوں دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی نہیں اور اگر چھوئے گی تو محض عارضی طور پر، ایسے ہی نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے اب وہ عمل و اطاعت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔

مشرکانہ نذریں

تیسری بات شیطان کی طرف منسوب کر کے یہ بتائی ہے کہ شیطان نے کہا کہ میں ان کو ضرور کان چیرنے کا حکم دوں گا پس وہ چوپایوں کے کان چیریں گے۔ اصل الفاظ میں فلیبتکن آذان الانعام آیا ہے۔ بتک کے معنے کاٹنے اور چیرنے کے ہیں۔ اہل عرب کے توہمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اونٹ کے نطفہ سے دس بچے ہو جاتے اسے بھی دیوتا کے نام پر پن کر دیا جاتا تھا اور کان چیرنا اس بات کی دلیل تھا کہ یہ پن کیا ہوا جانور ہے[1] حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ کان چیرنے کی یہ رسم بحائر اور سوائب کے لیے تھی۔ بحائر جمع بحیرہ کی ہے اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا کان چیر کر بتوں کی نذر کرتے تھے اور سائبہ اس جانور کو کہتے ہیں جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا۔ حضرت

---

[1] تفہیم القرآن۔

شاہ عبد القادر فرماتے ہیں جانوروں کے کان چیرنا یہ کافروں کا دستور تھا کہ گائے کا یا بکری کا بچہ بت کے نام کر دیتے اور اس کے کان میں نشان ڈال دیتے۔ مسلمانوں کو ان کاموں سے بچنا ضروری ہے اپنے بزرگوں سے یہ معاملہ نہ کریں کافر بھی جن سے کرتے تھے بزرگ ہی جان کر کرتے تھے۔ کان چیرنے کا پس منظر یہ تھا کہ دوسرے ان کو نذر کا جانور سمجھ کر ان سے تعرض نہ کریں اور ان کا احترام کریں۔

تغییرِ خلق اللہ کا مطلب

آخری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ میں ان کو ضرور حکم دوں گا وہ ضرور خدا کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے۔ اصل ارشاد یہ ہے فلیغیرن خلق اللہ وہ ضرور اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالیں گے۔ اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالنے کے دو مطلب ہیں اور آیتِ قرآنی میں دونوں کی گنجائش ہے۔ ایک یہ کہ خلق اللہ کو بدلنے سے اس فطرت کو بدلنا مراد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے جیسے توحید دینِ فطرت ہے اسے شرک سے تبدیل کر دیا، جیسا کہ اس آیت کا یہی مطلب مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، الحسن، قتادہ، اور عطا خراسانی نے بتایا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق خالقِ عالم اور صانعِ ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ جماعت انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس توحید کے تصور سے خالی نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خدا کا اعتراف انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے۔ قرآن نے اسی کو فطرۃ اللہ کہا ہے:

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا
اپنا چہرہ سب طرف سے پھیر کر خدا کے دین کی طرف کر لو یہی خدا کی درست ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

کل مولود یولد علی الفطرۃ
ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

انسان کے اسی جذبۂ فطرت یعنی توحید کو شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے تبدیل کر ڈالا ہے

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے تغییر دین اللہ کی خود یہ تفسیر بھی فرمائی ہے کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دینا اللہ کے دین کو بدلنا ہے۔

دوسرے علماء صحابہ جیسے عبداللہ ابن عمر، انس بن مالک، سعید بن المسیب، عکرمہ اور سفیان ثوری نے اس آیت کی یہ تفسیر پیش کی ہے کہ آیت میں خلق تکوینی میں تبدیلی مقصود ہے۔ انہوں نے اس کی مثال میں جسم گدانے، داڑھی منڈانے کو پیش کیا ہے لیکن صرف اتنا نہیں بلکہ اس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ خدائی ساخت میں ردّ و بدل کرنے کا مطلب اشیاء کی پیدائشی بناوٹ میں ردّ و بدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے تب تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغوا کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لیے تہذیب تو نام ہی ان تصرفات کا ہے جو انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کرتا ہے دراصل اس جگہ جس ردّ و بدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا نہیں کیا اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے اس آیت کی رُو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں مثلاً عمل قوم لوط، ضبط ولادت، رہبانیت، برہمچریہ، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان کی ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے ان شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں۔ دراصل یہ معنے رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالق کائنات کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں۔

آیت میں تغییر خلق اللہ کی دونوں تشریحیں آپ کے سامنے ہیں اور دونوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک خلق تکوینی میں تغییر اور دوسرا خلق تشریعی میں تغییر ہے۔ خلق تشریعی میں تغییر کے معنے دین اور احکام دین میں تحریف کر دینے کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب پرستی، آتش پرستی شجر پرستی، حیوان پرستی وغیرہ سب اس تغییر خلق کی صورتیں ہیں کہ مشرک ان سے وہ کام لے رہا ہے جس کے لیے ان کی خلقت ہوئی ہی نہ تھی۔

اس پوری آیت پر حضرت مولانا اسماعیل شہید نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی قابل دید ہے۔ اس میں مولانا نے حال کے چہرہ کی جس انداز سے عکاسی کی ہے خوب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں وہ اپنے خیال میں عورتوں کے پجاری ہیں کوئی تو حضرت بی بی کو، کوئی بی بی آسیہ کو، کوئی بی بی اتا ولی کو، کوئی لال پری کو، کوئی سیاہ پری کو، کوئی سیتلا کو، کوئی مسانی کو، اور کوئی کالی کو پوجتا ہے۔ یہ محض خیالات ہیں ورنہ ان کی حقیقت بھی کچھ نہیں نہ کوئی عورت ہے نہ کوئی مرد محض خام خیالی اور شیطانی وسوسہ ہے جس کو معبود بنالیا ہے اور یہ جو بولتا ہے اور کبھی کوئی تماشا بھی دکھا دیتا ہے شیطان ہے۔ ان مشرکوں کی تمام عبادتیں شیطان کے لیے ہو رہی ہیں۔ یہ اپنے خیال میں نذر و نیاز عورتوں کو دیتے ہیں مگر درحقیقت شیطان لے لیتا ہے انہیں ان باتوں سے نہ دینی فائدہ ہے نہ دنیوی، کیونکہ شیطان راندۂ درگاہ ہے۔ اس سے دینی فائدہ تو ہونے سے رہا کیونکہ یہ انسان کا دشمن ہے، بھلا کیسے اس کا بھلا چاہے گا یہ تو خدا کے سامنے کہہ چکا ہے کہ میں تیرے بہت سے بندوں کو اپنا بندہ بنالوں گا۔ ان کی عقلیں ایسی مار دوں گا کہ اپنے خیالات ہی کو ماننے لگیں گے۔ میرے نام کے جانور مقرر کریں گے جن پر میری نیاز کا نشان ہوگا۔ مثلاً اس کا کان چیر ڈالیں گے یا کاٹ ڈالیں گے یا اس کے گلے میں کمر بند ڈالیں گے، ماتھے پر مہندی لگادیں گے، منہ پر سہرا باندھ دیں گے، منہ کے اندر پیسہ رکھ دیں گے۔ بہرحال ہر وہ علامت جو یہ بتائے کہ یہ جانور فلاں کی نیاز کا ہے اسی میں داخل ہے۔ شیطان یہ بھی کہہ آیا ہے کہ میرے اثر سے لوگ اللہ کی پیدائش کو بگاڑیں گے، کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھے گا کوئی کسی کے نام پر ناک یا کان چھدوائے گا۔ کوئی داڑھی منڈوائے گا کوئی چار ابرو صاف کرکے فقیری کا اظہار کرے گا۔ یہ سب شیطانی باتیں ہیں اور اسلام کے خلاف ہیں۔ پھر جس نے اللہ جیسے کریم کو چھوڑ کر شیطان جیسے دشمن کی راہ اختیار کی اس نے صریح دھوکہ کھایا کیونکہ اوّل تو شیطان دشمن ہے، دوسرے اس میں بجز وسوسہ ڈالنے کے اور کوئی قدرت نہیں ہے۔ جھوٹے سچے وعدوں سے انسان کا وقتی طور پر دل بہلاتا ہے کہ فلاں کو مانو گے تو یہ ہوگا اور لمبی لمبی آرزوئیں دلاتا ہے کہ اگر اتنے پیسے ہوں تو ایسا ایسا باغ تیار ہو جائے گا اور خوبصورت محل بن جائے گا۔ چونکہ یہ اُمیدیں پوری نہیں ہوتی ہیں اس لیے انسان گھبرا کر خدا کو بھول کر غیروں کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو مقدر ہوتا ہے کسی کے ماننے نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو محض ایک شیطانی وسوسہ ہے اور اس کا مکر و فریب ہے۔ ان باتوں کا انجام یہ ہوتا ہے[1] کہ انسان شرک میں مبتلا ہو کر جہنمی ہو جاتا ہے اور شیطان کے جال میں بُری طرح پھنس جاتا ہے کہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر رہائی نصیب نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] تقویۃ الایمان

عالمگیر اور اصولی حریف

۱۸۰۔ اور جو شخص بھی اس شیطان کو اللہ سے ورے اپنا رفیق و مددگار بناتا ہے وہ سرتاسر نقصان اور گھاٹے میں رہے گا اور خسارہ بھی کھلا خسارہ۔ یعنی شیطان کا تمرد اور اللہ کی رحمت سے دُوری میں یہ حال اور اس کے اغوا اور افکار و اعمال میں آرائش کی یہ داستان سننے کے باوجود جو شخص اس سے لگاؤ اور تعلقات رکھے گا اور اس کی وسوسہ اندازیوں میں اس کی پیروی کرے گا وہ اپنی معاش اور معاد میں سرتاسر نقصان اور گھاٹے میں رہے گا اور ہمیشہ اوہام کا شکار رہے گا، فکری اور عملی زندگی میں بغیر ہدایت کے ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی ان نعمتوں سے محروم رہے گا جو اس نے انسان کو دی ہیں مثلاً عقل کی ہدایت، وحی کی ہدایت وغیرہ وغیرہ شیطان کا دوست بنانا یہی ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو چھوڑ کر خود ساختہ طریقوں کو اپنی انفرادی زندگی میں اور شیطان کے زور آور اور طاقتور ایجنٹوں کے بنائے ہوئے قانون کو اپنی اجتماعی زندگی میں اختیار کیا جائے۔ اس آیت نے یہ بنیادی اور اہم نکتہ واضح کیا ہے کہ یہاں دو ولایتیں ہیں ایک ہواتے نفس اور انسان کی مکمل آزادی کی دعوت یہی شیطان کی ولایت ہے دوسرے انسان کی عبدیت اس کے خدا کے سامنے ذمہ داری، جواب دہی کی دعوت یہ نبوت اور تعلیمات وحی کی دعوت ہے۔ پہلی دعوت کا نام جاہلیت ہے اور دوسری دعوت کو اسلام کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص اپنی زندگی میں نبوت کی ولایت کو چھوڑ کر شیطان کی ولایت کو اپنائے گا وہ کھلے ہوئے نقصان میں رہے گا۔

شیطان کا کاروبار

۱۸۱۔ یہ شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اور ان کو آرزوؤں میں الجھائے رکھتا ہے۔ لیکن شیطان کا ہر وعدہ سرتاسر دھوکا اور فریب ہوتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے جس سے ان کو خلاصی کی کوئی صورت نہ ملے گی۔ یعنی جب شیطان کی خیانت و شرارت اور اس کی عداوت کی کیفیت خوب معلوم ہو چکی تو اب اس میں کچھ شک نہیں رہا کہ اپنے سچے معبود سے منحرف ہو کر جو کوئی بھی اس کی موافقت کرے گا سخت نقصان میں پڑے گا۔ اس کے تمام وعدے اور امیدیں محض فریب ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس سے نکلنے کی کوئی صورت

نہ ہوگی۔[1]

مطلب یہ ہے کہ شیطان کی سب سے بڑی وسوسہ اندازی یہ ہے کہ طرح طرح کے وعدوں میں رکھتا اور آرزوؤں اور اُمیدوں میں ڈالتا ہے۔ وعدوں میں رکھنے اور آرزوؤں میں ڈالنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان حقیقت وعمل کی جگہ محض باطل آرزوؤں اور جھوٹی اُمیدوں کا بندہ ہو جاتا ہے۔ وہ نجات و سعادت کے لیے سعی وعمل کی راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنی جھوٹی اُمیدوں اور مغرورانہ آرزوؤں ہی میں مگن رہتا ہے۔ شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور اُمیدوں پر چلتا ہے وہ انسان کو انفرادی طور پر جب کسی غلط راستے پر ڈالتا ہے تو اس کے آگے اُمیدوں کا سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی لطف و لذت اور کامیابیوں کی اُمید، کسی کی قومی سربلندیوں کی توقع کسی کو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو صداقت تک پہنچ جانے کا اطمینان کسی کو یہ بھروسہ کہ نہ خدا ہے نہ آخرت بس مرکر مٹی ہو جانا ہے کسی کو یہ تسلی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ جائیں گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ دُنیا میں مادے کے سوا کچھ نہیں ہے حتیٰ کہ انسان بھی صرف برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے اسے اس دنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے۔ اس نے مصنفین اور اہلِ قلم کے روپ میں اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زورِ خطابت کے ذریعے نبوّت کے علم وعمل کے خلاف ایک عام بغاوت پیدا کر دی۔ اس نے دُنیا پرستی کو نہایت دلفریب اور دلکش بنا کر پیش کیا جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی اس کے خلاف غیظ و غضب کو بھڑکایا اور اس طرح شیطان نے اپنی فریب کاری سے طبیعتوں کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا۔ انسان کو زندگی سے بھرپور تمتع، مطالباتِ نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص ہوا کو اس زندگی کی اہمیت جتائی۔ نقد لذت اور ظاہری محسوس مادی کے سوا ہر چیز کو غلط کہا، جو کچھ ہے یہی مادی دُنیا ہے، آخرت کا حساب وکتاب کچھ نہیں، عقل ہی سب سے بڑا معیار اور آخری معیار ہے۔ وحیِ الٰہی محض وہم ہے۔ مادہ کی قوتیں اور قوانین ہی سب کچھ ہیں۔ ان کے اوپر کوئی مشیتِ اعلیٰ حاکم نہیں ہے اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پندرھویں پارے میں آئے گی۔

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ
مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ
مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ۝۱۲۳ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ
نَقِيْرًا ۝۱۲۴ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ
خَلِيْلًا ۝۱۲۵ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ
ع ۱۸ / ۱۱ / ۱۵ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝۱۲۶ ع

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے
ہم ان کو ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے

نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ
نے یہ پکا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ سے زیادہ بات میں سچا
کون ہے[۱۸۲]۔ دیکھو! نہ تو مدارِ نجات تمہاری آرزوئیں ہیں اور
اہلِ کتاب کی آرزوئیں، جو بھی کوئی بُرائی کرے گا اسے اس
کی جزا ملے گی اور اسے اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور
مددگار نہ ملے گا[۱۸۳]۔ اور جو بھی نیک عمل اختیار کریں گے بشرطیکہ
وہ مومن ہوں خواہ مرد ہوں یا عورت ان کو جنت میں داخلہ
ملے گا اور ذرہ برابر بھی ان پر ظلم نہ ہوگا[۱۸۴]۔ اس شخص سے
بہتر نظامِ حیات کس کا ہو سکتا ہے جس نے حسن کار ہو کر
اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور سب سے ہٹ کر ابراہیم
کے طریقہ کو اپنا لیا وہ ابراہیم جسے اللہ نے اپنا دوست
بنا لیا تھا[۱۸۵]۔ اور یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ
کا ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے[۱۸۶]۔

قانونِ نجات کا اعلان عام

اسلام سے مقصود ایمان و عمل صالح ہے۔ یہ کسی حلقہ بندی کا نام نہیں۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو۔ لیکن اگر نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی رہنمائی میں ایمان و عمل صالح رکھتا ہے تو اسلام پر چلنے والا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے نجات کے لیے ایمان و عمل سے ہٹ کر ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی فرقہ داریت کا قانون بنالیا تھا۔ یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام یہودیت رکھا، جو اس دائرے کے اندر ہے وہ سچائی پر ہے اس کے لیے نجات ہے جو اس سے باہر ہے وہ باطل پر ہے اور اس کے لیے نجات نہیں ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی ایک دائرہ کھینچ لیا اور اس کا نام مسیحیت رکھا، جو اس میں داخل ہے صرف وہ ہی سچائی ہے اور صرف اسی کے لیے نجات ہے جو اس سے باہر ہے اس کا سچائی میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نجات سے قطعاً محروم۔ باقی رہا نبوت کے علم و عمل کی رہنمائی میں ایمان و عمل صالح تو اس کا قانون یک قلم ختم کردیا گیا۔ نبوت کے علم کی جگہ اوہام و خرافات نے لے لی، اور عمل کی جگہ خواہشوں، ہوا و ہوسِ نفس اور میلانِ طبع نے لے لی۔ قرآن نے ان کے اسی اعتقاد کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے۔ کونوا ھودا و نصاریٰ

یعنی نجات کی راہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی روشنی میں اور ایمان و عمل صالح میں نہیں بلکہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی میں ہے۔ قرآن نے ان کا رد کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تلک امانیھم یہ ان کی خوش آئند آرزوئیں اور ان کے پرجوش ولولے ہیں ورنہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور پھر بتایا کہ نجات کا قانون تو بس اور صرف یہ ہے کہ

بلیٰ من اسلم وجھہ للّٰہ و ھو محسن فلہٗ اجرہ عند ربہ

یعنی جو نبوت کے علم و عمل کی روشنی میں اللہ سے فکر و علم میں مخلصانہ لگاؤ اور کردار و عمل میں محسنانہ طور اختیار کرے گا اور اس طرح اسلام و احسان کی تصویر بن کر رہے گا اس کے لیے نجات ہے آیت میں اسلام و احسان کی قید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے اور کوئی دین اللہ کے حضور اسلام کے سوا منظور شدہ اور قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس آیت میں نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو بلکہ سب کو مخاطب کر کے صاف صاف اعلان کردیا ہے۔ ایسا اعلان جس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۲۲۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے ہم ان کو ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ نے یہ پکا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ سے زیادہ بات میں سچا کون ہے۔ یعنی اور وہ لوگ جو شیطان کی خرابی سے محفوظ ہیں اور ارشادِ خداوندی کے موافق ایمان لائے اور اچھے عمل کیے وہ ہمیشہ کے لیے باغ و بہار میں رہیں گے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے جس سے سچی کسی کی بات نہیں ہو سکتی۔ پھر ایسے سچے وعدے کو چھوڑ کر شیطان کی جھوٹی باتوں میں آنا کس قدر گمراہی اور کتنی بڑی مضرت کو سر پر لینا ہے[1] اس آیت میں سمجھایا گیا ہے کہ آرزوئیں، ولولے، نعرے اور دعوے مدارِ نجات نہیں بلکہ مدارِ نجات ایمان و عمل صالح ہے جو لوگ اس کو اختیار کریں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ اس کے بعد قرآن نے جنت کا چہرہ پیش کیا ہے، اس چہرے میں سب سے اہم اور بنیادی بات جو کہی گئی ہے وہ جنت کا دوام اور ہمیشگی ہے۔ اس موجودہ زندگی میں بھی اگرچہ لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی پر مسرت آتی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹا، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر موجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے کے بعد ایک خوشی کا پیغام سنتا ہے مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی نوبت بھی نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر چیز آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں جہاں حیات ہے موت نہیں، راحت ہے تکلیف نہیں، لذت ہے الم نہیں، مسرت ہے غم نہیں، سکون ہے اضطراب نہیں۔ شادمانی ہے حزن و اندوہ نہیں۔ یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور لازوال اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ قرآن نے یہ چیز اس آیت میں جس انداز سے پیش کی ہے اس کے لیے آیت میں تاکید پر تاکید اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پُر زور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خالدین پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ وعد اللہ حقاً یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ ومن اصدق من اللہ قیلاً اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے؟

مدارِ نجات ولولے نہیں ایمان و عمل ہے

۱۴۳۔ نہ تو مدارِ نجات تمہاری آرزوئیں ہیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا ملے گی اور اسے اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ملے گا۔ امانی بروزنِ افاعیل امنیۃ کی جمع ہے جس کے معنے کسی ٹھہرائی ہوئی تمنا اور اندازہ کی ہوئی چیز کے ہیں۔ کتاب والوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں۔ جن گناہوں میں لوگ پکڑے جائیں گے ہم نہ پکڑے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر حمایت کرکے ہمیں بچالیں گے اور نادان اہلِ اسلام بھی اپنے حق میں بھی خیال کرتے ہیں سو فرما دیا کہ نجات اور ثواب کسی کے امید اور خیال پر موقوف نہیں، جو بُرا کرے گا پکڑا جائے گا کوئی ہو۔ اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی اللہ جس کو پکڑے وہی چھوڑے تو چھوٹے دنیا کی مصیبت اور بیماری کو دھیان کرلو۔[1]

دراصل پچھلی آیات میں انسانی گمراہی کی یہ حالت بتلائی تھی کہ ایمان و عمل کی جگہ باطل آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں میں مگن ہو جاتا ہے۔ یہاں بتلایا ہے کہ اسی گمراہی میں یہودی اور عیسائی مبتلا ہو گئے تھے، ایمان و عمل کی جگہ صرف آرزوئیں اور امیدیں ہی ان کا سرمایہ دین ہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ ہم خدا کی خاص امت ہیں، ہم پر آتشِ دوزخ حرام ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم کفارۂ مسیح پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے ہمارے لیے نجات ہی نجات ہے۔ قرآن مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ کہیں تم بھی اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ وہ کہتا ہے نہ تو تمہاری آرزوئیں سے کچھ بننے والا ہے نہ اہلِ کتاب کی۔ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جس کسی کا عمل بُرا ہوگا وہ اس کی سزا ضرور پائے گا خواہ تم ہو خواہ یہودی ہوں خواہ عیسائی ہوں، خواہ کوئی ہو۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مسلمانوں اور اہل کتاب میں بحث چھڑ گئی۔ یہودیوں نے کہا ہمارا دین سب سے بہتر ہے کہ نجات صرف ہمارے لیے ہی ہے۔ مسلمانوں نے کہا ہمارا دین سب سے بہتر ہے کیونکہ سب کے بعد آیا اور سب کی نجات اس پر موقوف ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن جریر) اس سے معلوم ہوا کہ محض اپنی بڑائی کرنے اور ڈینگیں مارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصلی چیز ایمان و عمل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نجات سے متعلق جھوٹی آرزوئیں خواہ مسلمانوں کی ہوں یا اہل کتاب کی، ان میں سے کوئی بھی پوری ہونے والی نہیں ہے جو بھی بُرائی کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

یہاں مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کرکے قرآن نے یہ واضح کردیا کہ شرک اور خاندانی بزرگی کے بل بوتے پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی دام فریب کے گرفتار ہیں اور ان سب کی نامرادی ایک ہی طرح کی ہے۔

اچھی زندگی ایمان بغیر اچھی نہیں

۱۲۴۔ اور جو بھی نیک عملی کی زندگی اختیار کریں گے بشرطیکہ وہ مومن ہوں خواہ مرد ہوں یا عورتیں ان کو جنت میں داخلہ ملے گا اور ذرہ برابر ان پر ظلم نہ ہوگا۔ یعنی جو کوئی نیک عمل کرے گا بشرطیکہ ایمان رکھتا ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ثواب و عقاب کا تعلق اعمال سے ہے کسی کی اُمید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُمیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں کی ہمت کرو۔[1]

مطلب ہے کہ آخرت میں کامیابی ان لوگوں کو ہوگی جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں، جس کے پاس یہ دولت ہوگی وہ فائز المرام ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسرائیلی ہو یا اسماعیلی، عربی ہو یا عجمی، اس کی کسی نسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔ علامہ آلوسی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ آخرت میں کامیابی کے لیے عمل صالح کے ساتھ ایمان کی قید بتانے کے لیے ہے کہ عمل کا ایمان کے بغیر کوئی اعتبار نہیں ہے۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے کہ یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی ہے اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دارومدار رکھا۔ چنانچہ حواریوں کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان پر اور نہ تنہا عمل پر بلکہ ایمان اور عمل صالح کی ایسی جامعیت پر موقوف ہے جن میں درخت اور پھل کی نسبت ہو، دوسری بات یہ ہے کہ وھو مومن کو جملہ حالیہ کی صورت میں لاکر اشارہ کر دیا کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت اور سبب ہے یعنی عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ اگر حال ذوالحال کی قید ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا جب کہ نحو و بلاغت کے علماء تصریح کر رہے ہیں تو یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایسا کوئی شخص نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس کے ایمان کے مطابق کوئی تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو یا ایہا الذین آمنوا کی ندا سے خطاب کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہ ہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، کئی جگہ ہے ان کنتم مومنین صحابہ تو صحابہ علماء تابعین تک ایمان کے بارے میں جو تاثر رکھتے ہیں اس کا اندازہ امام حسن بصری کے اس بیان سے ہوتا ہے جو ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے آلوسی نے نقل کیا ہے:

> ایمان آرزوؤں اور تمناؤں کا نام نہیں ہے۔ ایمان وہ ہے جو دل میں بیٹھ جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے۔ بہت سے لوگوں کو مغفرت کی امیدوں اور تمناؤں نے تب تک غافل بنائے رکھا وہ دنیا سے نیکی کے بغیر یہی کہتے گئے کہ ہم تو اللہ سے حسن ظن رکھتے ہیں، یہ لوگ جھوٹے تھے۔ اگر ان کو اللہ سے حسن ظن ہوتا تو ضرور حسن عملی کی مایہ لے جاتے۔

قرآن نے محبت الٰہی، اللہ و رسول کی طاعت اور فرمانبرداری کو ایمان کا لازمی تقاضا بتایا ہے والذین امنوا اشد حبا للہ اور انما کان قول المؤمنین جیسی آیات کا بغور مطالعہ کیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انقیاد باطن، التزام طاعت، عہد وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری

نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔

سید رشید رضا نے یہاں یہ بات بڑی دردانگیز لکھی ہے کہ:

ان دونوں آیتوں میں ان مسلمانوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو اسلام کو ایک سیاسی قومیت بناتے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا معاملہ مسلمان قوم سے محض مسلمان ہونے کی بنا پر ہوگا فیصلہ کا مدار علم و عمل نہیں بلکہ قومی تشخص ہوگا۔ خبر نہیں یہ لوگ کتاب الٰہی کی رہنمائی کب حاصل کریں گے؟ تاحال تو محض دعووں نعروں اور تمناؤں میں پل رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تمناؤں کی پوری تفصیل دیکھنا چاہتے ہو تو امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین میں کتاب الغرور کا مطالعہ کرو۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو ساری نیکیوں کی عمارت بے بنیاد ہے اور اگر ایمان ہو تو عمل موجود نہ ہو تو بنیاد بغیر عمارت کے ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اپنے بلیغ انداز من یعمل من الصلحٰت وھو مؤمن سے یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے اسی لیے امنوا کے ساتھ وعملوا الصلحٰت پر اس نے ہمیشہ زور دیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے۔ ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے۔ جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم وجود برابر ہے

اسلامی نظام حیات کا تاریخی چہرہ

۱۲۵۔ اور اس شخص سے بہتر نظام حیات کس کا ہو سکتا ہے جس نے حسن کار ہو کر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور سب سے ہٹ کر ابراہیم کے طریقہ کو اپنایا وہ ابراہیم جسے اللہ نے دوست بنا لیا تھا۔ پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ کے نزدیک اعمال کا اعتبار ہے بیہودہ آرزو کا کوئی نتیجہ نہیں، اہل کتاب وغیرہ سب کے لیے یہی قاعدہ مقرر ہے جس میں اشارہ تھا اہل اسلام یعنی حضرات صحابہ کی تعریف اور فضیلت کی طرف اور اہل کتاب کی مذمت اور برائی کی طرف اشارہ کر کے اب فرماتے ہیں کہ دینداری میں ایسے شخص کا مقابلہ کون کر سکتا ہے کہ جو شخص اللہ کے حکم پر سر رکھے ہوئے ہو اور نیک کاموں میں دل سے لگا ہوا ہو اور حضرت ابراہیم کے دین کی سچی پیروی کرتا ہو

جو سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو گیا تھا اور اس کو اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں خوبیاں حضرات صحابہ میں علی وجہ الکمال تھیں نہ کہ اہلِ کتاب میں۔ اب اس سے اہلِ کتاب کی وہ آرزو جو پہلے گزری لغو محض اور باطل ہو گئی۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ حیات سے بڑھ کر کون سا نظام ہو سکتا ہے جس میں یک قلم اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی اور ہر حکم کی تعمیل میں پوری پوری حسن کاری ہے۔ اسلام کے معنے اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت و بندگی کے لیے جھکا دینا ہیں اور احسان کے معنے حسن کاری کے ہیں یعنی ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرنا جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے اور یہی وہ ملت ہے جو حضرت ابراہیم لے کر آئے تھے۔ تورات و قرآن سے ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیم کی اصلی بنیاد قربانی اور راہِ خدا میں سرفروشی ہے۔ اور یہی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی کمال کی اصلی خصوصیت تھی۔ یہ قربانی کیا تھی یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی۔ یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی۔ یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی۔ یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا۔ یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کیے بغیر دنیا کی پیشوائی اور آخرت کی نیکی نہیں مل سکتی۔ یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں، اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا۔ یہی ملتِ ابراہیمی ہے جس کی پیروی کا مطالبہ ہے اور اسی سے اسلامی نظامِ حیات کا تاریخی چہرہ وابستہ ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اسلامی نظامِ حیات کی مخالفت اور اس سے انحراف کے کیا معنے؟ یہی ھدی اللہ ہے۔

ان دو لفظوں اسلام، احسان سے ملتِ ابراہیمی کا حقیقی چہرہ پیش کر دیا ہے۔ اب ملت کا چہرہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابراہیم کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے کہ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا پیارا بنا لیا۔

حضرت ابراہیم کا مقامِ خلت

خلیل وہ دوست جس کی محبت دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہو۔ خلال سے جس کے معنے کسی سے

[1] افادات شیخ الاسلام

دوستی کرنے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

خلیل بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے ، خلۃ بالضم سے ماخوذ ہے جس کے معنے اس دوستی اور محبت کے ہیں جو دل کے اندر گھس کر اس کے وسط میں پہنچ جائے۔ حضرت ابراہیم کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا جو اثر تھا اس کے اعتبار سے یہ بالکل صحیح ہے اور کچھ کی رائے میں خلت بمعنے اصطفا ہے یعنی برگزیدگی۔ حضرت ابراہیم خلیل کے لقب سے اس لیے ملقب ہوئے کہ آپ کی دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے تھی۔ اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خلت کا مطلب ان کی مدد کرنا اور ان کو پیشوا بنانا تھا اور کچھ کا خیال ہے کہ خلیل خلۃ بفتح خاء سے مشتق ہے جس کے معنے حاجت کے ہیں اور ان کا نام خلیل اس لیے ہوا کہ وہ اپنے رب کے ہی ہو گئے تھے اور ساری حاجتیں اسی کے سپرد کر دی تھیں۔

خازن بغدادی لکھتے ہیں:

اللہ کا بندے کو خلیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی فرمانبرداری اور طاعت پر قابو دے دے ، عصمت سے سرفراز فرمائے توفیق عنایت کرے ، اس کے خلل کو چھپائے اور اس کی مدد کرے۔

حافظ ابن القیم نے دس مراتب محبت بیان کیے ہیں ان کی فہرست خود ان کے بیان کے مطابق یہ ہے۔ علاقہ ، ارادہ ، غرام ، وداد ، شغاف ، عشق ، تیتم ، تعبد اور خلت فرماتے ہیں :

مرتبہ خلت کی حامل صرف دو ہستیاں ہیں ابراہیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ صحیح حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان اللہ اتخذ نی خلیلا کما اتخذ ابراھیم خلیلا۔ اللہ نے مجھے ایسے ہی خلیل بنالیا ہے جیسے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا تھا اور ایک دوسری حدیث میں ہے اگر میں روئے زمین کے باشندوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن تمہارا ساتھی خلیل الرحمان ہے۔ دونوں ارشاد صحیح ہیں اور یہ ارشاد نبوت اس خیال کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں کہ خلت حضرت ابراہیم کے لیے ہے اور محبت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے لہٰذا حضرت ابراہیم خلیل اور حضور انور حبیب ہیں۔ خلت در اصل وہ محبت ہے جو عاشق کی روح اور اس کے دل میں اس طرح جاگزین ہوتی ہے کہ اس میں غیر محبوب

کے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی ہے۔

اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ حضرت ابراہیم کا خلیل اللہ ہونا تمام نبیوں میں اور اُمتوں میں مانا ہوا ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم کے خلیل اللہ ہونے کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے۔ یہاں لفظ حنیف پہلے لاکر اشارہ کر دیا کہ ان کے خلیل اللہ ہونے کی وجہ، ان کا ہر طرف سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے رب کے بالکلیہ حوالہ کر دینا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے :

اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین

ان کی ملت اسلام، احسان اور حنیفیت یعنی توحید ہے اور وہ اس کے اوّلین قائد ہیں۔ محمد رسول اللہ جو نظام لے کر آئے ہیں اس کی حقیقت بھی یہی تین چیزیں ہیں اور بس اس لیے محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے نظامِ حیات سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے اور اسلامی نظامِ حیات کے سوا کوئی نظام اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہے۔

اس فقرے کا اندازِ استفہام انکاری ہے اور مقصد یہ بتانا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ نظامِ حیات سے بہتر کوئی نظامِ حیات نہیں ہے۔ اس استفہام انکاری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام دین منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ جب اس دین سے بہتر کوئی دین نہیں ہے تو اب کسی اور دین کا وجود نہیں ہے۔ آپ کے دین کے مقابلہ میں کسی دین کا اچھا نہ ہونا اس بات کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی کرے۔ اگر کوئی آپ کو نہیں مانتا اور آپ کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ کے نہیں بلکہ اس فرمانروائے کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ کو پوری کائنات کا ہادی بنا کر روانہ کیا ہے۔

اسلام کو اپنانے کی علت

۱۲۶۔ اور یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کے بندے اور اس کی

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے میں خود بخل کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی روکتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جو تورات میں مذکور تھے اور اسلام کی حقانیت پر مبنی جو آیات موجود تھیں ان کو چھپاتے تھے سو مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیے۔ [1]

پہلی آیت میں اکڑنے اور فخر کرنے والوں کا تذکرہ تھا اس آیت میں ان کا خصوصی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہیں اور دوسروں کو بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ بخیل اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کی پاسداری میں تنگ دل ہو۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو بجائے خدا کے دین سمجھنے کے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع و خاکساری اور شکر گزاری کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے جو فیاضی و جود کا اصلی محرک ہوتا ہے۔ بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دباتے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی دباتے رہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ اس کی بزدلی کا راز نہ نکلے۔

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دیا ہوا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کی ایک پوشیدہ نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی ایک طرف تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی بالادستی قائم رہے دوسری طرف وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کوئی شخص ادائے حقوق کے معاملے میں ان پر تنقید نہ کرے۔ ہر شخص کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروباری نقصانات کا ذکر کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ ہیں تو یہ دریا دل لیکن مجبور ہیں [2]

اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور نہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے نہ بندگان خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے، لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اللہ اذا انعم نعمۃ علی عبد احب ان یظھر اثرھا علیہ اللہ جب کسی بندے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو یعنی اس نعمت کا اثر کھانے پینے پہننے پہنے لباس اور اس کی داد و دہش ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا ہے۔[1]

بہرحال اللہ کے دیے ہوئے فضل سے مراد دولتِ مالی ہے اور اس کے ساتھ دولتِ علم بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس سے منقول ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ نعمت کا اظہار بطورِ تحدیثِ نعمت کرنا جائز ہے۔

نمائشی خرچ کاروباری خرچ ہے

۷۵۔ اللہ سبحانہٗ ان لوگوں کو بھی دوست نہیں رکھتا جو صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر اور آخرت والے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور خود پسند متکبر وہ لوگ ہیں کہ اپنا مال لوگوں کو دکھاوے کی خاطر خرچ کرتے ہیں یعنی اللہ کے لیے خرچ کرنے میں تو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں لیکن لوگوں کے دکھانے کو اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کا نہ اللہ پر ایمان ہے نہ قیامت کے دن پر کہ حصول رضائے حق تعالیٰ اور تحصیل ثواب اخروی ان کو مقصود ہو اور اللہ کے یہاں مقبول اور پسندیدہ یہ ہے کہ ان حقداروں کو دیا جاتے جن کا اوّل ذکر ہو چکا ہے اور دینے میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی توقع ہو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جیسے بخل کرنا بُرا ہے ویسا ہی لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرنا بُرا ہے۔

اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا تعلق ان سے تھا جو مال کے ساتھ بخل کا تعلق رکھتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ ان ہی سرمایہ داروں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اچانک بخیل ہونے کے باوجود کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ ظاہر محسوس ہوتا ہے کہ بہت بڑے "دیالو" ہیں مثلاً کسی تقریب کے موقعہ پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گزاری کہ کسی غریب کے لیے بھی دشوار ہو لیکن یہی بخیل اور غریب ہوتے غریب تر زندگی رکھنے والا اچانک شہر کے کسی موڑ یا چوراہے پر کسی پڑاؤ یا اسٹیشن کے سامنے کسی بلند و بالا عمارت کے بنانے میں اس لیے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو اس میں آرام ملے مسافر اس میں ٹھہرائے جائیں گے یا ازیں قبل خیراتی کاموں میں چندہ کا اعلان اس احساس سے دب کر کرتا ہے کہ یہ پریشان حال لوگوں کے لیے پریشان ہے۔ کبھی ہسپتال بناتا ہے، کبھی ختم دلاتا ہے اور

---

[1] تفہیم القرآن ۲ افاداتِ شیخ الاسلام

کبھی کسی مجلس میں غریبوں میں غلہ کی تقسیم کا اعلان کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا وہ اس لیے کرتا ہے کہ خدا کو خوش کرتا ہے۔ کیا واقعی غریبوں کی غربت پر اس کا دل دکھا ہے۔ انسانی برادری کے متعلق اس کے دل میں کیا واقعی رحم کا کوئی جذبہ متلاطم ہوا ہے جن کی مالی فربہی سراسر غریبوں کا خون چوسنے سے ہوئی ہے کیا اس کا دل غریبوں کی غربت پر تڑپ سکتا ہے؟ یقیناً ان بخلاء کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے کہ خرچ کرنے والے اس لیے خرچ نہیں کرتے کہ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں یا خدا کی مخلوق کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں بلکہ ریاءالناس یعنی لوگوں کو دکھانا ان کے اخراجات کا پس منظر ہے۔ یعنی جن کو غریب بنا کر وہ اپنے کو امیر بنا رہا ہے ان ہی غریبوں کی آنکھ میں اپنی مسجدوں، اپنے ہسپتالوں سے خاک جھونک رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ بخل و کنجوسی سے پیدا ہونے والی لعنت کو اس طرح وہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسروں پر ان کی دولت مندی کا رُعب قائم ہو۔ ان کی برائیوں کا دُنیا میں چرچا ہو۔ محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

اس ارشاد گرامی نے یہ بات کھول دی ہے کہ جیسے بخل کرنا قرآن کی نظر میں بُرائی ہے ایسے ہی لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرنا بھی بُرائی ہے۔ ارشادِ نبوت میں دکھاوے کو بھی شرک فرمایا ہے۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے کہ شرک سے بالکل میں بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

شیطان کی رفاقت

۷۶۔ اور جس شخص کو شیطان کی رفاقت مل جاتی ہے تو یہ بہت بُری رفاقت ہے۔ یعنی بخل کرنے اور دکھاوے کے لیے خرچ کرنے کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کا شیطان رفیق ہو جو ان کو ایسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ ان متکبرین کو بخل اور ریاءالناس کے اعمال پر ابھارنے والا شیطان ہے۔ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہو، الشیطان یعدکم الفقر ویأمرکم بالفحشاء

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں غنا بخشی کی قوت نہیں ہے وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے۔ خلود بخشی کی قوت سے جو محروم ہے وہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہی خلود بخش ہے اور جن اعمال و افعال کا آخرت میں کوئی نتیجہ نہیں ہے وہ یقین دلاتا ہے کہ یہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا وہ سکھاتا رہتا ہے سب کچھ اسی میں ملتا ہے۔ الغرض شیطانی رفاقت کے بعد جو ہے وہ نہیں نظر آتا ہے اور جو نہیں ہے آدمی کو وہ ہے نظر آتا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کا یہ استنباط لطیف ہے کہ ارشاد میں خبردار کیا گیا ہے کہ صحبت بد موثر ہوتی ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیے۔ رفاقت کے لیے ہمیشہ نیک رفیق تلاش کرنا چاہیے۔

یہاں بخیلوں اور ریاکاروں کو شیطان کا رفیق ایسا ہی کہا ہے جیسا کہ دوسرے موقعہ پر فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن نے اخوان الشیاطین کہا ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے، شیطانی رفاقت کی حقیقت سمجھ لیجیے، حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہیں ان ہی چیزوں کو بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لیے خدا نے نبوت اور وحی کی رہنمائی عطا فرمائی لیکن اگر عقل والوں کا اصرار بھی ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم جانتے ہیں تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی اختلاط کے مریضوں کے لیے انبیاء کی نبوت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

قرآن میں ان ہی ذہنی اختلاط کے لیے ایک مخفی سزا کا ذکر ہے۔

ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین

اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمان کی یاد سے تو ہم پیچھے لگا دیتے ہیں اس کے شیطان، پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں؟ وہ ہی کہتے ہیں کہ شیطان کیا ہے کچھ بھی نہیں صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے۔ اللہ سبحانہ نے انسان کو جس مقصد کی تکمیل کے لیے زمین کے اس کرے پر بسایا ہے جو جس حد تک اس نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رکنے والے کوڑے کی صورت میں وہ ان پر برستا ہے۔ جیسے بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے۔ اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے اس کو اسی لیے بنایا گیا ہے یہی اس کا کام ہے ایک جگہ نہیں قرآن میں کئی بار ان عبادی لیس لک علیھم سلطان[1] کے اعلان کے ساتھ اس کی ڈیوٹی یہ لگائی گئی ہے۔

اجلب علیھم بخیلک ورجلک وشارکھم فی الاموال والاولاد

---

[1] میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں ہے۔

اس کا مطلب نہ یہ ہے کہ اس سے یہ کام نہ کرایا جائے اور نہ یہ کہ خواہ حالات کچھ ہوں پھر بھی اسی سے کام لیا جائے بلکہ اصل حل یہ ہے کہ کارکن کی مدد مزید قوت سے کی جائے۔

محنت اور سرمایہ کا جھگڑا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں یہی سمجھتا ہوں کہ محنت اور سرمایہ کے نام پر جس قدر آویزشیں اس زمانہ میں رونما ہو رہی ہیں۔ اس ارشادِ نبوت کی روشنی میں اس کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر عملی واقعات کی طویل فہرست بھی ہے۔ اسی حدیث کے راوی حضرت ابوذر غفاری کا یہ معمول تھا اور حضرت عمر کا سفرِ بیت المقدس میں آدھے راستہ خود سوار ہونا اور آدھے راستہ میں غلام کو سوار کرانا مشہور ہے۔

صحیح بخاری میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت میں تین آدمیوں کا فریق مخالف ہوں گا۔ ایک شخص وہ جس نے میرے نام سے کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی، دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرا وہ جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔

ایک اور ارشاد مسندِ ابی یعلیٰ میں ابوہریرہ کے حوالہ سے آیا ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری ادا کر دو قبل اس کے کہ پسینہ خشک ہو۔

ایک اور ارشاد مسند احمد میں آیا ہے:

مزدور کو اس کے کام میں سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ کا عامل و مزدور نامراد نہیں کیا جا سکتا۔

اس ارشادِ نبوت کا کیا مطلب ہے؟ کیا علاوہ مزدوری کے منافع میں بھی مزدور کا حصہ ہے۔ افسوس ہے کہ فقہاءِ اسلام کی کتابوں میں مجھے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ملی ہے لیکن ایک اور حدیث ہے جس سے اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی مصیبں کو اس نے برداشت کیا تھا تو چاہیے کہ اپنے ساتھ بٹھا لو اور کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر

خادم کے ہاتھ میں کھانے میں سے کچھ چیز اٹھا کر ایک لقمہ یا دو لقمے دے دو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو قرآن کے مطالبہ حسن سلوک ہی کا اس کو اثر سمجھتا ہوں۔ کیا مزدور کو بھی اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے؟ غلاموں، ملازموں اور مزدوروں سے مالکوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے اور حسن سلوک کی حد کیا ہے؟ ارشاد نبوت سے یہ بات تو پہلے گوش گزار ہو چکی ہے کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ اسی حسن سلوک کے سلسلے کی ایک وہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور دریافت کیا، میں اپنے نوکر کو کتنی بار معاف کروں؟ راوی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اسی سوال کو دہرایا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا روزانہ ستر بار معاف کرو۔ اسی بنا پر فقہاء اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ نوکر جو تنخواہ پر رکھا جاتے اس پر چیزوں کے نقصان کرنے کا تاوان نہ ہوگا جب تک وہ قصداً نقصان نہ کرے۔ علامہ مقدسی نے اس جزئیہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہی امام مالک اور ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔

اسی سلسلے میں وہ حدیثیں بھی ہیں جن کا تعلق اگرچہ غلاموں سے ہے مگر میرے نزدیک یہ احکام ہر شخص کے لیے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابو مسعود بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے پیچھے سے حضور انور نے آواز دی خبردار ابو مسعود، ابو مسعود کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون آواز دے رہا ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں ابو مسعود خبردار اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے غلام سے زیادہ قادر ہے۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ فتای میرا جوان کہے۔ اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت آخری بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ نماز کا خیال رکھو اور جو تمہارے غلام ہیں ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

حسن سلوک کے بارے میں ان تعلیمات پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی۔ ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ

ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا تھا کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے موالی میں شمار ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم خاندانوں میں شمار کرو جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو۔ اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنا لیں [1]

ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار، مملکتوں کا بادشاہ اور روحانی قیادت کا عظیم منصب عطا کر دیا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے۔

اخلاقی رذائل میں فخر و غرور کا مقام

۳۷ ۔ اللہ سبحانہ' ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا ہے جو اکڑ فوں اور گھمنڈی ہوں۔ یعنی جس کے مزاج میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھے اپنے مال پر مغرور اور عیش میں مشغول ہو وہ ان حقوق کو ادا نہیں کرتا سو اس سے احتراز رکھو اور جدا رہو [2] اصل ارشاد میں مختال و فخور کے الفاظ آئے ہیں۔ مختال کا مادہ خیل ہے۔ اسی سے خیلاً بنا ہے جس کے معنے تکبر کے ہیں۔ اسی سے حدیث میں آتا ہے من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہ دیکھے گا اور مختال وہ مالدار ہے جو بڑا بنتا ہے۔

فخور فخر سے بنا ہے جس کے معنے گھمنڈ کے ہیں یعنی ان چیزوں میں اپنی بڑائی ظاہر کرنا جو انسان سے باہر ہیں مثلاً سرمایہ اور جاہ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مختال وہ ہے جو اپنی ذات کی بڑائی چاہتا ہے اور عزیزوں قریبیوں اور پڑوسیوں سے ملنے میں کسر شان سمجھتا ہے اور فخور وہ ہے جو دوسروں کے سامنے اپنی بڑائی زبان سے کرتا ہے۔ یا یوں کہو کہ مختال اپنے آپ کو فضیلت دینے والا ہے اور فخور مال و مرتبہ سے بڑائی ظاہر کرنے والا ہے یا مختصر لفظوں میں یوں کہہ دو کہ مختال اپنے کردار سے بنتا ہے اور فخور اپنی گفتار سے ہوتا ہے۔

اس فقرے کے ذریعے یہ بات بتائی گئی ہے کہ عبادت میں اللہ کا حق ادا کرنے اور مخلوق سے برتاؤ میں حسن کاری سے وہ لوگ گریز کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر تواضع اور شکرگزاری کے جذبے کی جگہ غرور اور فخر پیدا ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی جگہ ان پر اپنی دھونس اور رعب جمانے کی فکر کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ' ایسے ناشکروں اور ناقدروں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید [2] افادات شیخ الاسلام

دراصل انسان میں جب کوئی وصف باکمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں ہے لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں۔

فخر و غرور ایک اضافی چیز ہے جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں بلکہ اس تصور کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھا۔ آپ نے قرآن کی یہی آیت ان اللہ لا یحب کل مختال فخور تلاوت فرمائی اور تکبر کی برائی کا تذکرہ کیا مجھے رونا آگیا۔ حضور نے مجھ سے دریافت کیا کہ ثابت کیوں روتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی مجھے بھاتی ہے یہاں تک کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے چپل کے تسمے بھی خوبصورت ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تم اہل جنت میں سے ہو تم اپنی سواری اور پالان کو اگر خوبصورت بناتے ہو تو یہ کبر نہیں بلکہ کبر یہ ہے کہ حق کو ہلکا سمجھو اور لوگوں کو حقیر مانو۔ ابو داؤد نے کتاب اللباس میں ابو ہریرہ کی یہ حدیث لکھی ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے فرمایا یہ تکبر نہیں ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنادیا تکبر ہی جب انسانی طبیعت کا تقاضا اور ملکہ بن جاتے اور عادات و کردار میں اس کا ظہور ہو اس کا نام اختیال ہے اور جب بھی زبان پر نمایاں ہو تو اس کا نام فخر ہے۔

دنیا کی زندگی میں اللہ سے لگاؤ اور مخلوق سے برتاؤ تمام بداخلاقیوں کا سرچشمہ اختیال و فخر ہے۔

فخر و غرور کی خصوصیات

۳۷۔ جو بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا حکم دیتے ہوں اور خدا کے دیے ہوئے فضل کو چھپاتے ہوں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خود پسند اور تکبر کرنے والوں کو جو کہ بخل کرتے ہیں اور اپنے مال اور علم خداداد کو لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اور قولاً و عملاً دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں اور ان کافروں کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔
دوسری یہ کہ ذرہ برابر کی ہوئی نیکی بھی اللہ کے یہاں بے حد قیمتی ہو جائے گی
ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مادی علت و معلول اور عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے ان ہی دو اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنے پیچھے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے نکلا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنے میں بولا گیا ہے۔
قرآن میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی ہے کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل کا نام ہے۔ ارشاد ہے لتجزی کل نفس بما تسعی یعنی جزا و سزا ہمارے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کے آثار و لوازم ہیں۔
غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں اس اصول کی اس طرح تشریح فرمائی ہے کہ روزِ قیامت اللہ سبحانہ فرمائے گا اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر دے رہا ہوں، جو کوئی اچھا بدلہ پائے وہ خدا کا شکر کرے اور جو برائی دیکھے وہ خود کو ہی ملامت کرے۔ ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کا عامل کی ذات پر جیسا اثر ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق اس میں بلندی اور پستی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کی جزا میں کوئی کمی نہ کرے گا خواہ وہ عمل ذرے کی مقدار میں ہو اور کسی کو بغیر جرم کے قطعاً سزا نہ دے گا۔

نیکیوں میں تضعیف کا قانون

یہاں ارشاد ہوا ہے کہ اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے اور بڑا ثواب دیتا ہے۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اس کا دس گنا ملنا تو اس امت کے حق میں عام ضابطہ ہے۔ ارشاد نبوت ہے کہ؛

> جب تم میں کوئی اپنے اسلام میں حسن کار ہو جائے تو پھر جو نیکی کرتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے اور جو برائی کرتا ہے وہ صرف اتنی ہی لکھی جاتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

یہ گویا زبان نبوت سے تضاعف کی تشریح ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دس گنا تو ایک ضابطہ عام ہے

اور اس کے لیے ہے جو ایمان و اسلام میں حسن کاری پیدا کرے لیکن اللہ کی رحمت کا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بھی بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے کھلا رکھتی ہے جیسے جیسے مومن کی حسن کاری اور اللہ سبحانہ کی رویت کا جتنا تصور غالب ہوتا جائے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح بعض وقت خود عمل کی برتری و فضیلت اور کبھی ضرورت کا بروقت احساس بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا تو عام مسلمانوں کے بارے میں ضابطہ ہے بتائیے مہاجرین کے لیے کیا قانون ہے۔ انہوں نے جواباً فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی وان تک حسنۃ یضاعفھا ویؤت من لدنہ اجراً عظیماً۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ اللہ سبحانہ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھ دیتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ اللہ اپنے پاس سے بڑا ثواب اور دیتا ہے اللہ اکبر اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

بہر حال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سو گنا ہی پر جا کر ختم نہیں ہوتا۔ اس سے بھی کہیں اوپر پہنچتا ہے بے شک جس کی رحمت غیر متناہی ہو اس کے انعامات کو بھی لامتناہی ہونا چاہیئے لیکن اللہ کی یہ داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان ہے۔ اسلام، ایمان اور احسان کے بر سہ ارتقائی مراتب کی تفصیلات انشاءاللہ اسی پارے کے پانچویں رکوع میں آ رہی ہیں۔

روز قیامت انبیاء کی شہادت

۷۹۔ اے پیغمبر پھر کیسے گزرے گی جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے بلائیں گے۔ یعنی ان کافروں کا کیا برا حال ہوگا جس وقت بلائیں گے ہم ہر امت اور ہر قوم میں سے گواہ ان کے حالات بیان کرنے والا اور ان کے واقعی معاملات ظاہر کرنے والا اس سے مراد ہر امت کا نبی اور دور کے صالح اور معتبر لوگ ہیں کہ وہ قیامت کو نافرمانوں کی نافرمانی اور فرمانبرداروں کی فرمانبرداری بیان کریں گے اور سب کے حالات کی گواہی دیں گے اور تم کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر یعنی تمہاری امت پر مثل دیگر انبیاء علیہم السلام کے احوال بتانے والا اور گواہ بنا کر لاویں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ھؤلاء کا اشارہ انبیاء سابقین یا کفار مذکورہ بالا کی طرف ہو اول صورت میں انبیاء مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء سابقین کی صداقت پر گواہی دیں گے جبکہ ان کی امتیں ان کی تکذیب کریں گے اور دوسرے احتمال سے کفار مراد ہوں

مطلب یہ ہے کہ انبیاءؑ سابقین جیسا اپنی اپنی اُمت کے کفار فساق کے کفر و فسق کی گواہی دیں گے تم بھی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کی بد اعمالی پر گواہ ہو گے جس سے ان کی خرابی اور بُرائی خوب محقق ہو گی لے

اس سے پہلی آیت میں وعید اور وعدہ تھا اب یہاں حرف فا کے ذریعہ فقرہ لا کر کہا جا رہا ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ کسی عامل کے عمل کو ذرہ برابر بھی ضائع نہ ہونے دے گا تو پھر اس روز جب پوری انسانیت اللہ کے حضور پیش ہو گی اور انبیاءؑ شہادت کے لیے آئیں گے ان پر کیا بیتے گی۔ یعنی ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جب میدان حشر میں ہر اُمت کا نبی اپنی اُمت کے نیک و بداعمال پر بطور گواہ پیش ہوں گے حضور انور بھی اپنی اُمت پر گواہ بن کر حاضر ہوں گے۔ جیسے ہر دور کا پیغمبر اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی اسے میں نے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا پھر بھی شہادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کے لوگوں پر دیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دور آپ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے لے

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسُول کے ذریعے سے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس اتمام حجت کے بعد اگر یہ لوگ اللہ و رسُول سے منحرف رہے ہے تو آج تو اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو کیا کریں گے جب میدان حشر میں اللہ تعالیٰ تمام اُمتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوائے گا کہ انہوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی آپ بھی اس امت کے لوگوں پر دینے کے لیے کھڑے کیے جائیں گے۔

گواہی دینے کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ انبیاء کہیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو دین پہنچایا تھا لیکن اس صورت میں انبیاءؑ کی شہادت اپنے معاصر مخاطبین تک محدود رہے گی اس لیے کچھ علماء نے شہادت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہر اُمت کے اعمال و افکار کو نبوت کے پیش کیے ہوئے علم و عمل سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے گا۔ اس مقابلہ میں جو صحیح ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو صحیح نہ ہوں گے وہ ناکام ہوں گے۔

لے افادات شیخ الاسلام لے تفہیم القرآن

اگرچہ آیت میں ھٰؤلاء کا اشارہ انبیاء سابقین کی طرف بتایا ہے لیکن قرآن کی دوسری آیت اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار سے ہم آہنگ بھی ہے کہ ھٰؤلاء کا مشار الیہ آپ کی اُمت ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح دوسری اُمتوں کے رسُول اپنی اُمتوں پر گواہ ہوں گے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی امت پر گواہ ہوں گے۔ قرآن میں دوسری جگہ صراحۃً آیا ہے لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ اور صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مجھ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبد اللہ مجھے قرآن سناؤ تو میں نے کہا کہ یا رسُول اللہ میں آپ کو قرآن سناؤں۔ قرآن تو آپ پر ہی نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں مجھے یہ پسند ہے کہ میں قرآن دوسرے سے سنوں۔ حضرت عبد اللہ نے سورۃ نساء کی تلاوت شروع کی جب اس زیر تشریح آیت پر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابن ابی حاتم کے حوالہ سے یہی روایت دوسرے صحابی محمد بن فضالہ کے حوالہ سے اس طرح لکھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بنی ظفر قبیلہ میں تشریف لائے اور آپ کی ہمرکابی میں عبد اللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ تھے۔ آپ نے قرآن پڑھنے کا حکم دیا۔ آپ سن رہے تھے جب قاری اس آیت پر پہنچا فکیف اذا جئنا تو آپ رو پڑے اور شدت تاثر میں آپ نے فرمایا کہ:

یارب ھذا علی من انا بین ظھریہ فکیف بمن لم ارہ۔

یا اللہ ان پر تو میں گواہی دوں گا جن میں موجود ہوں مگر ان میں گواہی کیسے دوں گا جن کو میں نے دیکھا نہیں ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ھٰؤلاء سے مراد آپ کی اُمت ہے۔ سوچئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت سن کر شدت تاثر سے کیوں آبدیدہ ہو گئے؟ قسطلانی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آپ کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہو گیا۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ رونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو قیامت کی ہولناکیاں یاد آئیں۔ پھر وہاں اُمت کے لیے اپنی شہادت اور شفاعت کے لیے جناب الٰہی میں درخواست کے مناظر یاد آ گئے۔ لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ آپ کا رونا اپنی اُمت پر رحمت و شفقت کے تقاضے سے تھا۔ آپ کو یہ احساس ہوا کہ اُمت کے اعمال و افکار پر آپ کو گواہی دینی ہو گی اور اُمت کے افکار و اعمال جادۂ اعتدال پر نہ ہوں گے۔ اور اس کے نتیجہ میں اُمت کو سزا ملے گی۔

گویا آیت میں اشارہ کر دیا کہ اُمت کی تباہی و بربادی یہاں ہو یا وہاں ہمیشہ رسُول کے لائے ہوئے علم و عمل سے انحراف کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وعدھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا

چڑھ جا ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ اور ساجھی بن جا ان کے اموال اور اولاد میں اور ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کا وعدہ سرتاسر دھوکا اور فریب ہے۔

اولاد کے ساتھ الاموال میں جب وہ ساجھی بن جاتا ہے تو یقین مانیے کہ اور خرچ کی تمام راہوں پر وہ قبضہ جمالیتا ہے اور فردا کی فکر میں ڈال کر امروز کی لذت کو بے مزہ کر دیتا ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ پندرہ میں آئے گی۔

ایمان صحیح نہ ہونے پر افسوس

۳۹۔ ان لوگوں کا کیا نقصان ہو جاتا اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لے آتے اور اللہ کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرتے اور اللہ ان کی حالت سے خوب باخبر ہے۔ یعنی ان کافروں کا کچھ نقصان نہ ہوتا اگر وہ بجائے کفر کے اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان لے آتے اور بجائے ریاکاری کے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے بلکہ ان کا سراسر نفع تھا۔ ضرر تو اس میں ہے جس کو وہ اختیار کر رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا اور کس نیت سے کر رہے ہیں۔ اسی کا عوض ان کو ملے گا۔ پہلی آیت میں ینفقون اموالھم فرمایا تھا یعنی مال کو ان کی طرف منسوب کیا تھا اب اس آیت میں وانفقوا مما رزقھم اللہ فرمایا یعنی مال کی اپنی طرف نسبت کی۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنا مال سمجھ کر خرچ کرتے ہیں ان کو چاہیے تھا کہ اللہ کا مال سمجھ کر اس کے حکم کے موافق خرچ کرتے رہتے[1]

یہ ان تنگ دلوں، بخیلوں اور ریاکاروں کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور اللہ کی بخشی ہوئی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سرتاسر نفع ہی نفع ہے اللہ تعالیٰ کسی کے عمل سے بے خبر نہیں[2]

یہ آیت کن لوگوں کے حالات کی عکاسی کر رہی ہے، مشرکین کی، یہود و نصاریٰ کی۔ قرآن کے یہی تین مخاطب ہیں۔ سید رشید رضا کہتے ہیں کہ روئے سخن سب کی طرف ہے۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود خدا کو مانتے تھے، اس کی خالقیت، مالکیت اور ربوبیت کے قائل تھے۔ البتہ کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

بھی مانتے تھے مگر اس میں خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے یہودی اور عیسائی ایمان باللہ والیوم الآخر کے مدعی تھے لیکن شرک کے دھبوں سے ان کا دامن ایمان بھی محفوظ نہ تھا اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ سب ایمان صحیح کو اپنالیں۔ اور اگر خود مسلمانوں کا ذکر ہے تو مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ایمان کامل کو اپنالیں۔ دونوں صورتوں میں حیرت و تعجب اپنی جگہ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کردار لوگوں کے لیے کس قدر حیرت زا ہے کیونکہ اگر یہ لوگ ایمان میں اخلاص کو اپنالیتے تو دنیا کے فوائد سے تو بہرہ ور ہوتے ہی آخرت کی کامرانیاں بھی ہاتھ سے نہ جاتیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَ
يُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٤٠﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ
أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ
يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ ط
وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا ﴿٤٢﴾ ع ۶

بلاشبہ اللہ سبحانہٗ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے، اگر ایک ذرہ بھی نیکی ہو گی تو وہ اسے دگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا بدلہ بھی مرحمت فرمائے گا۔ اے پیغمبر پھر کیسی گزرے گی جب ہر امت میں سے ہم ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے بلائیں گے۔ اس روز کفر کی راہ پر چلنے والے اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش زمین کو ان پر برابر کر دیا جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

جزاء و سزا اعمال کے نتائج ہیں

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام قائم کیا ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار چلتا ہے۔ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح عالم مادہ میں یہ قانونِ خداوندی ہے کہ زہر کھانے سے آدمی کا جسم مر جاتا ہے اسی طرح یہ اللہ سبحانہ کا قانون ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصول حفظان صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیہ قلب کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح دوا اور اصول حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعے بھی وہ شفایاب ہوتا ہے۔ غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے آثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری بخل اور فیاضی، تقویٰ اور فسق ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعی اشیاء میں ہے انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے لیکن جناب الٰہی اس سے اپنے قانون مجازات میں پاک ہے وہ جو کچھ ہے وہ سرتاسر عدل ہے۔

۴۸۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ، کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے اگر ذرہ برابر بھی نیکی ہوگی تو وہ اسے دگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا بدلہ بھی مرحمت فرمائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ کے برابر بھی ضائع نہیں کرتا لہٰذا ان کافروں پر جو عذاب ہوگا وہ عین انصاف اور ان کی بداعمالی کا بدلہ ہے اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی تو اضعاف مضاعف اس کو اجر دے گا اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام اس کو عنایت کرے گا۔[1]

اس آیت کے ذریعے دو اہم باتیں سمجھائی گئی ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا
حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰی
بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ
بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَ
ع ۱۹ ۱۶ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

اور مسلمانو! یاد رکھو آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے[۱۹۵]۔ ہم نے یقیناً اُن لوگوں کو جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور خود تم کو بھی یہ حکم دیا کہ اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو اور اگر نہ مانو گے تو پھر یقین کرو

کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے وہ بے نیاز ہے اور ستودہ صفات ہے[199]۔ اور بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کارسازی کے لیے اللہ ہی کافی ہے[200]۔ لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے وہ بلاشبہ ایسا کرنے پر قادر ہے[201]۔ جو شخص دُنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس دُنیا و آخرت کا دونوں کا ثواب ہے[202]۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے[203]۔

احکامِ حق کی تعمیل اور استقامت و اخلاص

بیانِ احکام کے بعد ان آیات میں تذکیر و موعظت کے پہلو پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اصل چیز حق کی پابجائی اور استقامت و اخلاص ہے۔ بالعموم قانونی احکام بیان کر دینے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے ان پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے پُراثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور

فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔
اس سے پہلے چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے
لہٰذا اس کے بعد ضرور سمجھا گیا کہ اہل ایمان کی حس ایمانی کو قانون کی پاسداری کے لیے بیدار کیا جائے۔
اور بتایا جائے کہ جب تک ضمیر میں بیداری نہ ہوگی اور قانون کے لیے مخلصانہ طاعت کا جذبہ نہ ہو
گا محض قانون کا ڈھانچہ اصلاح حال کا ضامن نہیں ہے اور اسی سلسلے میں اس اجتماعی قانون کی
طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اصل چیز تقوی ہے۔ اور اس میں مسلمان اور پہلی امتیں اللہ کی یکساں مخاطب
ہیں۔ جس قدر حق کی مخلصانہ طاعت کا جذبہ اور قانون کی نافرمانی سے بچنے کا جوش ہوگا اس قدر کامیابی
سے ہم دوش ہوگا۔

۱۹۸۔ اور مسلمانو! یاد رکھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ قوانین
بیان فرمانے کے بعد قرآن نے یہاں ملکت اور اس کی اساس و بنیاد کے متعلق قرآنی نظریہ پیش
کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ملکی زندگی ہو یا تمدنی زندگی ہر شعبہ حیات میں بنیادی نظریات
اور اساسی اصولوں کا ماخذ انسان کے وہ تصورات ہیں جو وہ خود اپنی ذات اپنے آغاز و انجام
اور کائنات خلقت سے اپنے تعلق کی نسبت قائم کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر بالآخر
دیگر نظریات و تصورات قائم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان اپنی تقدیر اپنے مرتبہ اور کائنات سے
اپنے تعلق کی بابت جو تصور تعمیر کرے گا وہی اس کے جملہ اعمال و افکار کی تشکیل پر موثر ہوگا۔
بالفاظ دیگر خدا کا تصور ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے اعمال و افکار کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں کسی
جماعت کے سیاسی اور عمرانی نظریات و عقائد کی حقیقت معلوم کرنی ہو تو سب سے پہلے اس بات پر
غور کرنا چاہیے کہ اس کے افراد اپنی تقدیر اپنی ابتدا و انتہا اور کائنات سے اپنے تعلق کی نسبت
بالفاظ دیگر ذات ایزدی کے متعلق کیا تصور رکھتے ہیں کیونکہ خدا کے تصور میں یہ جملہ تصورات
شامل ہیں۔ خدا کا تصور بیک وقت انسان کے آغاز و انجام اور اس کی تقدیر کا تصور بھی ہے
اور یہی تصور اس کے مرتبہ اور حیثیت اور کائنات سے اس کے تعلق کو بھی معین کرتا ہے۔
اس اعتبار سے قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن کے نقطہ نظر سے سارا
ملک اور اقتدار اللہ کے لیے ہے۔ انسان کی حیثیت یہاں مالک کی نہیں مملوک کی ہے۔ یہ بات
ان آیات میں تین بار دہرائی گئی ہے اس طرح یہ یاد دہانی کی گئی ہے کہ انسان یہاں آزاد خود مختار
کی حیثیت سے کر نہیں آیا بلکہ اس لیے آیا ہے کہ مملوک ہونے کی حیثیت میں مالک کی مرضی کر خود اپنی

زندگی اور اس کے معاملات میں نافذ کرے اور دوسروں کو بھی مالک کی مرضی پر چلانے کی کوشش کرے

سب کے لیے حکم میں یکسانی

۱۹۹۔ ہم نے یقیناً ان لوگوں کو جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور خود تم کو یہ حکم دیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اگر نہ مانو گے تو پھر یقین کر لو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے وہ بے نیاز ستودہ صفات ہے۔ اوپر سے ترغیب و ترہیب کا ذکر چلا آ رہا تھا یعنی حکم خداوندی کی اطاعت کرنا اور اس کی مخالفت سے بچنا سب کے لیے ضروری ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کی طرف دھیان رکھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو یہ حکم سنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اس کی نافرمانی نہ کرو تو اب اگر کوئی رب کے حکم کو نہ مانے گا تو اسے پرواہ نہیں وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔ اپنا ہی کچھ بگاڑے گا اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں اور تمہاری طرح پچھلی تمام امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے کام کرو۔ اس کی ہدایت کی پیروی میں تمہاری اپنی فلاح ہے۔ خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی تمام امتوں نے اس کی نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پرواہ تھی نہ اب تمہاری پرواہ ہے۔ وہ چونکہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ اس وجہ سے اس نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اپنے احکام و حدود سے آگاہ کر دیا اور اب تمہیں بھی اس سے آگاہ کر دیا۔ اہل کتاب نے نافرمانی کی تو انہوں نے خود اپنی شامت بلائی، خدا کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اسی طرح اگر تم بھی کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں ہے بلکہ بے نیاز ستودہ صفات ہے وہ تمہارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو اس کی احتیاج ہے بلکہ اس لیے کہ وہ حمید ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود ساری مخلوق کو اپنے جود و کرم سے نوازے۔ وہ بالذات محمود ہے اسے اپنی ذات کی تکمیل کی خاطر نہ تمہارے شکر کی ضرورت ہے اور نہ اپنے محمود ہونے کے لیے تمہاری حمد کا محتاج ہے۔ ابوذر کی طویل حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سبحانہ کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تم سب محتاج ہو مگر وہ جسے میں بے نیاز کر دوں تم مجھ سے مانگو میں تمہیں

بے نیاز کر دوں گا اگر تمہارے اگلے پچھلے، انسان، جن، چھوٹے بڑے مرد و عورت، زندہ مردہ، تر اور خشک سب مل کر میرے بندوں میں سب سے زیادہ شقی القلب بندہ کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر بھی کوئی کمی نہیں آسکتی اور اگر سب کا دل متقی سے متقی انسان کی طرح ہو جائے تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کی برابر زیادتی نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن ترمذی میں آتی ہے۔

اللہ کی ذات کمالات کا مرکز ہے

۲۰۰- اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور کارسازی اللہ ہی کے لیے ہے یعنی اگر اللہ کی فرمانبرداری کرو گے تو سمجھ لو کہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے۔ تمہارے سارے کام بنا سکتا ہے۔" تین دفعہ فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اول سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، دوسری سے بے پروائی اور بے نیازی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پروا نہیں ہے اگر نافرمان ہو جاؤ، تیسری دفعہ میں رحمت اور کارسازی کا اظہار ہے بشرطیکہ تقویٰ اختیار کرو۔ [1]

دراصل ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اس معنے کر کے سب سے زیادہ مکمل ہے کہ وہ کائنات کا مالک ہے اور اس پر پورا اختیار رکھتا ہے اور کائنات پوری کی پوری اس کی محکوم ہے اور اس کے باوجود اس میں غنائے مطلق ہے اس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا ہے اور نہ اب کسی کی، وہ سرتاسر محمود ہے جلال و جمال اور حسن و کمال کا کوئی گوشہ نہیں جو موجود نہ ہو۔ اور پھر ان بے پروائیوں اور کمالوں کے ساتھ سب کا کارساز ہے۔

جس طرح قرآن نے جابجا خلقت اور ربوبیت سے استدلال کیا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز خدا کی مخلوق اور مربوب ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی خالق بھی ہو رب بھی ہو، اسی سے وہ مملوکیت سے بھی استدلال کرتا ہے یعنی اس کائنات میں اس حسن و جمال کے ساتھ جو کچھ موجود ہے وہ سب مملوک ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی مالک بھی ہو اور کائنات میں اللہ کی ملکیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کامل اور بے داغ ہے اس لیے ضروری ہے کہ مالک میں اس درجہ حسن و کمال ہو کہ کائنات کی ہر چیز اس کی ستائش کے ترانے گائے۔

قانون استبدال اقوام

۲۰۱ - لوگو! اگر اللہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے وہ بلاشبہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دُنیا سے اٹھا لے اور دوسرے لوگ مطیع و فرمانبردار پیدا کر دے۔ اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغنا اور بے نیازی ظاہر ہو گئی اور نافرمانوں کو پوری تہدید و تخویف ہو گئی[1] مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے حکم سے تم انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سر بلند کر دے گا۔ اور تمہارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ فرمایا کیا تم اللہ کی شان مالکیت اور استغنا پر غور نہیں کرتے ہو، یعنی اس بات پر غور نہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی ملک ہے اور ہر چیز اپنے وجود و بقا میں اللہ کی محتاج ہے اور ہر چیز اپنی خلقت میں کسی خاص مقصد و مصلحت کے لیے بنائی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی سوچے ہوئے مقصد کے اور ٹھہرائی ہوئی مصلحت کے ویسے ہی ظہور میں آ گئی ہو۔ پھر اگر تم دیکھ رہے ہو کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اس کی ملک ہے اور اپنی ملکیت میں مالک ہی کی کارسازی کام کر رہی ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ تمہارے وجود میں کوئی خاص مصلحت پوشیدہ نہ ہو اور اللہ نے تمہیں ویسے ہی تمام مخلوقات میں سے چن لیا ہو۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں چھانٹ دے اور ایک نئی قوم کی تخلیق کا سامان کر دے۔ کیونکہ اس کا ٹھہرایا ہوا قانون یہی ہے کہ جو جماعت غیر نافع ہو جائے اسے مٹ جانا چاہیے اور اس کی جگہ نافع و اصلح جماعت کو ظہور میں آنا چاہیے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

تاریخ کا مطالعہ کرو تو اس اذہاب اور اتیان باٰخرین کے مناظر تمہارے سامنے آ جائیں گے اور قرآن پر تدبر کرو تو اس کے سنن و نوامیس واضح ہو جائیں گے۔ حکمتِ الٰہی نے افراد کی طرح قوموں کی زندگی کے لیے بھی ایک خاص نظام مقرر کیا ہے اور اسی کے مطابق ایک قوم کی جگہ دوسری قوم سے اور ایک جماعت کی زندگی دوسری جماعت کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ قرآن نے اس

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ارشاد میں بتایا ہے کہ افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعتوں اور قوموں کا نظامِ حیات بھی جدوجہد سعی وطلب اور فکر وعمل کی صلاحیت کا نظام ہے اور یہاں بھی بقاء انفع کا قانون کام کر رہا ہے یعنی وہ قوم کشمکشِ حیات میں باقی رہتی ہے جو دُنیا کے لیے انفع ہو، جو انفع نہیں چھانٹ دی جاتی ہے لہٰذا جو قوم اس قانونِ فطرت کے مطابق اپنے زندگی و بقاء کا اہل ثابت نہیں کرے گی، ضروری ہے کہ اس کی جگہ کسی دوسری جماعت کو مل جاتے یہی اتیان لقوم آخرین ہے۔

دُنیا وآخرت کی فلاح کی ضمانت

۲۰۲۔ جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس دُنیا وآخرت دونوں کا ثواب ہے۔ یعنی اگر اس کی تابعداری کرو تو تم کو دنیا بھی دے اور آخرت بھی، پھر صرف دُنیا کے پیچھے لڑنا اور اس کی نافرمانی کر کے آخرت سے محروم رہنا بڑی نادانی ہے[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے پاس دُنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، پائدار اور دائمی فائدے عارضی اور وقتی فائدے بھی، اب یہ تمہارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو، اگر تم محض دُنیا کے چند روزہ فائدے ہی چاہتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا بھی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں رہے گا۔ دریا تو تمہاری کھیتی کو ابد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہ تمہارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلہ کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو، کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصہ میں آئیں۔

یہ آیت بتارہی ہے کہ قرآن دُنیا کو انسان کی دینی زندگی کے لیے قابلِ اجتناب نہیں سمجھتا بالفاظِ دیگر قرآن نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو کر اس دنیا کو چھوڑ دیں اور اللہ کو پالینے کے لیے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جانے کی وہ روش اختیار کرلیں جسے رہبانیت کہا گیا۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان مسائلِ حیات سے پوری طرح متعلق

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

رہے متاہل اور متمدن زندگی گزارے۔ اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے، اپنے جبلی مطالبات کو مناسب حدود کے اندر پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔ قرآن نے اسی کے لیے یہ دُعا بتائی ہے ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ اور اسی کا قرآن نے وعدہ کیا ہے فَاٰتٰهُمُ اللّٰہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ۔

اللہ کی ذات باخبر ہے

۲۰۳۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ تمہارے سب کام دیکھ رہا ہے اور سب باتیں سنتا ہے جس کے طالب ہوگے وہی کچھ ملے گا[1] مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے سارے اعمال اور ساری گفتار کے وقت یہ بات دھیان میں رکھے کہ اللہ سبحانہ سُن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس سے چھپ کر ہم کچھ کریں یا کہیں اور اسے کچھ خبر نہ ہو۔ یہ دھیان ہی انسان کی زندگی میں تزکیہ کا سامان ہے اور اسے عدل و فضل سے ہمدوش کرتا ہے اس سے ایک طرف انسان کی دنیوی زندگی میں استقامت آتی ہے اور دوسری طرف انسان میں آخرت کی زندگی کے لیے صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نافرمانی اور بدعملی سے بچو اور راہِ حق میں استقامت و اخلاص کو اپناؤ کیونکہ اللہ کی ذات سمیع و بصیر ہے وہ پوری باخبری کے ساتھ اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کی ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ
عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا
فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا
أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

اے اہل ایمان ! تم انصاف پر خوب قائم ہونے والے اللہ کی خاطر گواہی دیتے ہوئے ہو جاؤ خواہ تمہیں یہ گواہی خود اپنے خلاف ، اپنے والدین کے خلاف ، اپنے رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے۔[۲۰۴] اگر کوئی مالدار یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش کے پیچھے پڑ کر عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ دو۔[۲۰۵] اور اگر بات کو لپیٹ کر کہو گے یا صاف گوئی سے روگردانی کرو گے تو یاد رکھو اللہ تمہارے کردار سے خوب باخبر ہے۔[۲۰۶]

انسان اور راست بازی

اس سے پہلے معاشرتی زندگی کے سلسلہ میں خانگی زندگی میں افراد کو انصاف برتنے کی ہدایت کی تھی اب اس آیت میں اجتماعی زندگی میں انصاف برتنے اور راست بازی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قسط کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف، راست بازی وغیرہ الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔

انسان کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سچ پر قائم و استوار رہے، انصاف قائم کرنے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے۔ اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے، اس کے والدین اور قرابت داروں کو نقصان پہنچے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مالدار کے مال کا لالچ یا اثر و رسوخ کا خوف سچ کہنے سے تمہیں باز رکھے یا کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھا کر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کر لی جائے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہو گی۔ غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیر اپھیری کا طریقہ اختیار کیا جائے یا گواہی نہ دینے سے گریز کو پناہ گاہ بنا لیا جائے۔ اس طرح انسانوں کو چکما دیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی رشتہ داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیوں کر رکھی جا سکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہمارے موافقوں پر تو زد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھالیں گے۔ اس کا نام ان کے ہاں سیاست دانی اور تدبر ہے۔ امنِ عالم کے ضامن وہ ہی ہو سکتے ہیں جو حق و انصاف کے معاملے میں استقامت کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔ یہ قرآن عزیز کا ایک انقلاب انگیز اصول ہے اور سچ یہ ہے کہ انصاف کے معاملہ میں سب سے بڑی کٹھن منزل یہی ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں انقلاب کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ قرآن عزیز نے اس کٹھن منزل کی رہنمائی اس آیت میں کی ہے۔

۲۰۴۔ اے اہلِ ایمان! تم انصاف پر خوب قائم ہونے والے اللہ کی خاطر گواہی دینے والے ہو

جاؤ۔ خواہ یہ گواہی اپنے خلاف، اپنے والدین کے خلاف، اپنے رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے۔ یعنی گواہی سچی اور اللہ کے حکم کے مطابق دینی چاہیے اگرچہ اس میں تمہارا، تمہارے کسی عزیز کا نقصان ہوتا ہو جو حق وانصاف ہو اس کو صاف ظاہر کر دینا چاہیے۔ دُنیوی نفع کے لیے آخرت کا نقصان مول نہ لو۔ [1]

اصل ارشاد میں کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ کی تعبیر آئی ہے۔ ہماری رائے میں شہداء للہ قوامین کی ضمیر سے حال ہے۔ قوام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ دوسری تعبیرات کو چھوڑ کر یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ صرف یہ نہیں کہ قسط کو قائم کرو بلکہ یہ جس عدل وانصاف کو نبوت علم وعمل کی صورت میں لے کر آئی ہے اس کو بہت زیادہ قائم کرنے والے ہو جاؤ اور یہ کام وقتی طور پر نہیں بلکہ دائمی طور پر کرو۔ اور نبوت کے اس علم وعمل پر صرف قائم ہونا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں بلکہ تم دُنیا کے سامنے تاقیام قیامت اس کے علمبردار اور اس کے داعی بن کر رہو۔ اسی بلیغ معنویت کی خاطر یہ نہیں فرمایا کہ قوموا بالقسط انصاف کو قائم کرو نہ یہ فرمایا کہ کونوا قائمین بالقسط یعنی زندگی کی ساری شاخوں میں عدل وانصاف کے علمبردار ہو جاؤ اور اس میں خوب محنت کرو اور جانیں کھپا دو اور یہ کام اس طرح انجام دو کہ یہ تمہارا قومی نشان بن جائے گویا قسط کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

اس ارشاد کا مدلول یہ بھی ہے کہ اس میں حاکموں، گواہوں، عالموں اور درویشوں اور بادشاہوں سب سے خطاب ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق انصاف کرے۔ قوامین مبالغہ فرما کر یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان کی ہر بات، ہر عمل زندگی کا ہر شعبہ انصاف پر مبنی ہو۔ اپنے گناہوں کا اقرار، نیکیوں میں قصور کا اعتراف، غرض کہ ہزارہا چیزیں انصاف میں داخل ہیں۔ [2]

اور یہ بھی آیت کا منشا ہے کہ یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بن جاؤ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ دُنیا میں انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل وراستی قائم ہو۔ [3]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] نور العرفان [3] تفہیم القرآن

دراصل اس ارشاد میں انصاف وراستی کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال پھینک دیا گیا ہے کہا گیا ہے کہ معاملات میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو۔ جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو۔ عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے نہ عزیزوں، قرابت داروں کا۔ پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں قرابت نہ دیکھو جو حق ہو وہ کر دیا کہو اور بس۔

امیر اور غریب کے لیے قانونی مساوات

۲۰۵۔ اگر کوئی مالدار یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش کے پیچھے پڑ کر عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ دو جو حق ہو سو کہو۔ اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح سے واقف ہے اور اس کے یہاں کس چیز کی کمی ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی رعایت کی جائے یا غریب پر ترس کھا کر فیصلہ میں ردّ و بدل کیا جائے۔ غریب پر مہربان ہو کر فیصلہ یا گواہی میں ردّ و بدل کرنا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے۔ ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر داری میں یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے۔ منشا یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا ذریعہ نہ بنے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہ گواہوں کو اس لیے طرفداری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ سے اپنی نفع اندوزی کا خیال دل میں لانا چاہیے بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ سبحانہٗ کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لوگ عدل وانصاف کے فیصلے یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے تو ارشاد ہوا کہ فاللہ اولی بھما اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کچھ کرتا ہے جس میں اُن کی بھلائی ہو۔ غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا۔ حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے مفید ٹھہرے گی۔ پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ اگر بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرفداری سے فائدہ پہنچا بھی دو تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

عدل وانصاف میں مساوات کی عملی تشریح

عدل وانصاف کے قانون میں مساوات کی عملی تشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہے۔ اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں آپ کو عدل وانصاف کی حکمرانی نظر آئے گی۔ اس عدل وانصاف میں چھوٹے بڑے، امیر وفقیر، مسلم وکافر اور سلطان وگدا کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے الگ قانون ہو اور کمزور وبے اثر کے لیے الگ فتویٰ ہو بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانون عدل کے تحت ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر اور با اثر ہے تو اس وجہ سے وہ خدا کے حق سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لیے حضور کے اس ارشاد کو سامنے رکھیے جو حضرت عائشہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں:

جب ایک فخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی، لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ ابن زید کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہ نے حضور سے اس کی سفارش کی۔ حضور نے فرمایا۔ اسامہ تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملہ میں سفارش کرنے آئے ہو پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

عدل وانصاف اور شہادت کا مسئلہ صرف اخلاق سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اخلاق کے ساتھ سیاست سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جو شخص عدل وانصاف کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اس آیت میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں ہے تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو۔ قوت نطق سے محروم نہ ہو صاحب علم ہو چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وضرب اللہ مثلاً رجلین احدھما ابکم لا یقدر علی شیئ و ھو کل علی مولاہ اینما یوجھہ لا یات بخیر۔ ھل یستوی ھو ومن یأمر بالعدل و ھو علی صراط مستقیم

اور اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے دو آدمی ہیں ایک گونگا ہے کسی بات کے کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اپنے آقا پر بوجھ ہے جہاں بھی روانہ کرے کوئی خوبی کی بات اس سے بن نہ آئے، دوسرا ایسا ہے کہ لوگوں کو عدل وانصاف کی باتوں کا حکم دیتا ہے اور خود بھی عدل و انصاف کے سیدھے راستہ پر ہے کیا پہلا آدمی اور یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

امام رازی نے اس آیت کی تشریح میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہیئے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہیئے کیونکہ حکم سے بالادستی کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وہ قادر نہ ہو بالادستی حاصل نہیں ہو سکتی اور عالم ہونا چاہیئے تاکہ عدل و ظلم میں تمیز کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عادل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قادر بھی ہو اور عالم بھی ہو۔ پہلا گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیئے۔ پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیئے۔ پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک نہیں بنتا اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیئے تاکہ وہ کام سلیقہ سے کر سکے۔

آخر میں فرمایا ہے کہ لا تتبعوا الهوىٰ ان تعدلوا اس کے معنے دو طرح سے کیے گئے ہیں ایک یہ کہ انصاف کرنے میں اتباع ہویٰ نہ کرو۔ اس صورت میں تعدلوا عدل سے بنا ہے اس کے معنے انصاف کرنے کے ہیں۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ تم الھویٰ کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اس صورت میں تعدلوا عدول سے بنا ہے اس کے معنے ہٹ جانے کے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے یہی معنے لیے ہیں۔ ھویٰ ہماری رائے میں یہاں الھدیٰ کی ضد ہے۔ یعنی تم نے اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اگر اپنی خواہشوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر قائم رہنے کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے اور جس کی دعوت اور شہادت پر تم مامور ہو کر آئے ہو۔

نظامِ حق کو بگاڑنے کی دو صورتیں

۲۰۶ - اور اگر بات کو لپیٹ کر کہو گے یا صاف گوئی سے روگردانی کرو گے تو یاد رکھو اللہ تمہارے کردار سے باخبر ہے۔ بات کو لپیٹ کر کہنا یہ کہ سچی بات تو کہی مگر زبان داب کر اور پیچ سے کہ سننے والے کو شبہ پڑ جائے یعنی صاف صاف سچ نہ بولا اور روگردانی یہ کہ پوری بات نہ کہی بلکہ کچھ کام کی رکھ لی سو ان دونوں صورتوں میں گو جھوٹ تو نہ بولا مگر بوجہ عدمِ اظہارِ حق گنہ گار ہو گا گواہی سچی اور صاف اور پوری دینی چاہیئے[1]

شیخ الاسلام نے جو تشریح فرمائی ہے یہ عام شارحین قرآن کی ترجمانی ہے۔ ہمارے رائے میں یہ اس آیت کا مدلول ہے موقعہ و محل کے اعتبار سے آیت قرآنی کا منطوق یہ ہے کہ اس میں نظامِ حق

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کو بگاڑنے کی دو شکلوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے ایک یہ کہ نبوت جو علم وعمل پر مبنی نظام حق لے کر آئی ہے اس کو کج کرنے، بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ یہود نے کیا اور جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۸، یلوون السنتھم بالکتاب میں ہوا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسے بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے اس کی شکل باقی رہے لیکن زندگی کے معاملات میں اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ مدلول کی حد تک تشریح وہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی نے اس آیت کی جو تفسیر فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔

اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادا کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے، اور اقرار یا شہادت کی نوبت آئے تو اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی اور اظہار دینے والے رہو۔ اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ہی ذات پر ہو جس کو اقرار کہتے ہیں یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچنا چاہیے تاکہ اس سے بے مروتی نہ ہو، یا یہ کہ غریب ہے، اس کا کیسے نقصان کر دیں، تم کسی کی امیری غریبی کو نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔ اگر امیر ہے تو، اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے۔ اتنا تعلق تم کو نہیں کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہیں کا دیا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں۔ پھر جب باوجود تعلق قوی کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی کہ اظہار حق کیا جائے تو تم تعلق ضعیف پر ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو سو تم اس شہادت میں خواہش نفس کا اتباع مت کرنا کہ کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ اگر تم کج بیانی کرو گے یعنی غلط اظہار دو گے، پہلو تہی کرو گے، یعنی شہادت کو ٹال دو گے تو یاد رکھنا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ [1]

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے قوامون بالقسط ہوں یعنی حق وانصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے کہ کوئی بات بھی انہیں ان کی جگہ سے نہ ہلا سکے اور چاہیے کہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں دنیا کی کوئی چیز انہیں سچ کہنے سے نہ روک سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور عزیز واقربا کے خلاف ہو جب بھی

---

[1] بیان القرآن

انہیں سچی ہی بات کہنی چاہیے وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل وزبان رکھتے ہوں۔
سچی گواہی دینے میں نہ تو کسی کی دولت کا پاس کرو نہ کسی کی محتاجی کا۔ اگر کسی معاملہ میں گواہی دے سکتے ہو تو اس سے پہلو تہی نہ کرو اور جب گواہی دو تو صاف صاف بات کہو، گھما پھرا کر نہ کہو کہ حقیقت اس سے مشتبہ ہو جائے[1]
مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ، یہ آیت بتاتی ہے کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مکلف ہے کہ وہ خود انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لیے کوشش کرے۔ انصاف کا صرف ایک درجہ حکومت کا فریضہ ہے وہ یہ کہ سرکش انسان جب انصاف کی شاہراہ سے ہٹ جائیں تو حاکمانہ تعزیر کے ذریعے ان کو انصاف پر قائم رکھے[2]
اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورہ مائدہ میں آرہی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ [2] معارف م ۳۳

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ۝

اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ اللہ پر، اللہ کے رسُول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسُول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری ہے اور دیکھو جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسُولوں اور روزِ آخرت کے بارے میں راہِ کفر اختیار کرے گا تو وہ بھٹک کر سیدھے راستہ سے دُور جا پڑے گا۔[۲۰۷] بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر

میں پڑ گئے پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کو بخشنے والا نہیں ہے اور نہ اللہ ان کو کامیابی کی راہ دکھائے گا۔[2]

مسلمانوں کو ایمان میں اخلاص کی دعوت

اعمال و خصائل اور احکام و قوانین بیان کرنے کے بعد اہل ایمان سے ایمان میں اخلاص پیدا کرنے کا مطالبہ، سب جانتے ہیں کہ ایمان علم ہے اور باقی ساری چیزیں عمل ہیں اور علم، ہمیشہ عمل پر مقدم ہوتا ہے۔ عمل کی حیثیت ایک درخت کی سی اور علم کی حیثیت بیج کی سی، جس طرح بیج کے بغیر درخت کا وجود ممکن نہیں ٹھیک اسی طرح ایمان کے بغیر عمل بھی وجود میں نہیں آسکتا اس لیے جب تک ایمان وجود میں نہ آئے عمل کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایمان جس قدر صحیح ہوگا اچھا ہوگا۔ عمل میں اسی قدر پذیرائی کی قوت ہوگی۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایمان کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک سیاسی ایمان، دوسرے واقعی ایمان۔ سیاسی ایمان یہ کہ مردم شماری کے رجسٹر میں اس کا نام مسلمان ہو، اس سے اس کو جان و مال اور آبرو کا تحفظ حاصل ہو جاتے گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اسی ایمان کے چہرہ سے نقاب کشائی فرمائی ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ و یقیموا الصلاۃ و یوتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ اللہ ہی کے معبود ہونے اور محمد کے رسول خدا ہونے کی گواہی دے دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، جب وہ ایسا کر لیں گے تو اسی وقت مجھ سے

اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ پاسکیں گے اور اس کے بعد ان کا حساب لینا اللہ کا کام ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان)

دوسرا ایمان واقعی وہ ہے جس پر نجاتِ آخرت موقوف ہے۔ پہلے ایمان کا متابل کفر ہے اور اس دوسرے ایمان کا متابل نفاق ہے۔ اس آیت میں پہلے آمنوا سے ایمان کے پہلے معنے اور دوسرے آمنوا سے ایمان کے دوسرے معنے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایمان والے فرمایا ہے ان کو جو ظاہر میں مسلمان ہیں سو ان کو تقید ہے کہ جب تک دل سے یقین نہ لاویں گے ان سب چیزوں کا تو خدا کے ہاں مسلمان نہیں۔

۲۰۷۔ اے اہلِ ایمان، ایمان لاؤ اللہ پر، اللہ کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری، اور دیکھو جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کے بارے میں راہ کفر اختیار کرے گا وہ بھٹک کر سیدھی راہ سے دُور جا پڑے گا۔

یعنی جو اسلام قبول کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں پر دل سے یقین لائے اس کے ارشادات میں سے اگر کسی ایک ارشاد پر بھی یقین نہ لائے گا تو وہ مسلمان نہیں۔ صرف ظاہری اور زبانی بات کا اعتبار نہیں ہے[۱] شیخ الاسلام بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس آیت میں ایمان والوں سے جو یہ کہا گیا ہے کہ ایمان لاؤ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکموں پر دل سے یقین لاؤ۔ یعنی یہاں لفظ ایمان دو الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ الذین آمنوا میں ایمان ماننے کے معنے میں ہے اور آمنوا میں لفظ ایمان یقین کرنے سچے دل سے ماننے پوری سنجیدگی اور خلوص سے ماننے۔ اپنے فکر کو اپنے مذاق کو اپنی پسند کو اپنے رقیے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو اس یقین کے مطابق بنا لینے کے معنے میں ہے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی پر یقین کے ساتھ اس کے اختیارات کو اسی

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

کے لیے مخصوص سمجھا جائے جو اس کی صفات کے لازمی تقاضے ہیں اور ان حقوق کو بھی اسی کے لیے مخصوص سمجھا جائے جو اس کی صفات سے فطری طور پر وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ صفات میں سب سے اہم اور بنیادی الوہیت ہے۔ قرآن و سنت بتاتے ہیں کہ الوہیت کے اہم اور بنیادی تقاضے یہ ہیں۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضاجوئی کی انسان کو فکر ہونی چاہیے۔ یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک ہونا چاہیے اور سارے اعمال و حرکات صرف اللہ کے لیے مخصوص رکھنے چاہئیں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی قسم کے ہوں۔ وہ جذبات و احساسات بھی اللہ ہی کے لیے خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی رُوح پائی جاتی ہو۔ توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں، تقویٰ صرف اسی کا اختیار کیا جائے۔ خوف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اس سے کی جائے اور یہ بھی اللہ کی الوہیت کا تقاضا ہے کہ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دُنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ مقتدرِ اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے، منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرنے کا اصل مستحق صرف وہی ہے، حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا وظیفہ متعین کرنے اس کے معاملے کا فیصلہ کرنے اسے معاف کرنے، سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ الوہیت کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا انکار بھی ایمان باللہ کے دعوے کو بے معنے کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں ایمان باللہ کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ یہ عقیدہ اپنے پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں نہ اتر چکا ہو۔

رسُول پر ایمان لانے کا مطلب

رسالت کے لفظی معنے سفارت اور پیغامبری کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے اور انھیں اپنی مرضی کی راہ بتلانے کے لیے قائم کیا ہے۔ اس کا دوسرا نام نبوت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ نبی کی مکمل طاعت اور پیروی کی جائے اور ایسا سمجھنا شرطِ ایمان ہے دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں نہ کرے اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ بہرصورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہی ہے اور پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہونی چاہیے بلکہ

دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے عقل ایک نبی کے لیے کسی دوسری حیثیت کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس بندگی کرنے کا طریقہ معلوم کرنے اور ان احکام کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے تو نبی کی ساری باتوں کو مانے بغیر اور اس کے پیچھے چلے بغیر اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتے وقت لوگوں سے مطالبہ کرتا ہے فاتقوا اللہ واطیعون۔ قرآن حکیم جگہ جگہ انبیاء کی طاعت، ان کی اتباع، ان کی سیرت کو اپنانے پر زور دیتا ہے اور وہ مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ یہ دعا برابر مانگتے رہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

ایمان بالرسالت کے تقاضے میں قرآن نبوت کے لیے اس اعزاز و احترام اور توقیر و اکرام کا مطالبہ کرتا ہے جو قلب کی گہرائیوں کی پیداوار ہو اور ان سے جذباتی لگاؤ اور محبت پیدا کرنا چاہتا ہے اور صرف ان کی اس طاعت پر راضی نہیں ہے جو جذبات محبت اور تعظیم سے خالی ہو جیسے کہ رعایا کا بادشاہ کے ساتھ اور دوسرے فوجی و سیاسی لیڈروں کے ساتھ عوام کا ایک رسمی تعلق ہوتا ہے۔ قرآن مومن سے زکوٰۃ و صدقات کے محض فرائض کی ادائیگی اور احکام کی ضابطہ کی تعمیل کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اس کا مطالبہ یہ بھی ہے و تعزروہ و توقروہ اس کی مدد کرو اس کی عزت و تکریم کرو، رسول کی مخلصانہ طاعت۔ نبوی اخلاق کو اپنانا، شریعت کو خواہشات نفس اور رسم و رواج و عادات پر ترجیح دینا اور دعوت نبوت کی راہ میں جانی مالی فداکاری بغیر اس دلی محبت کے جو دل کی گہرائیوں میں موجود ہو اور انسان کے عقل و دماغ پر محیط و مستولی ہو ممکن نہیں ہے۔

اللہ کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب

اللہ کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو اللہ کی کتاب مان کر انسان احکام الٰہی کے حق میں اپنے اختیارات سے کلیتہً دستبردار ہو جائے، اپنی عقل اپنی رائے، اپنے افکار، اپنے اعمال، اپنے احساسات اور اپنے جذبات، اپنے رجحان طبع اور اپنے ذوق سب کی گردنوں پر اس کی

بے قید غلامی کا قلادہ ڈال دے۔ تمام آسمانی کتابوں میں قرآن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ جوں کا توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اس میں ایک لفظ کیا ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکے گی۔ یہ عقیدت نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ قرآن اب تک محفوظ چلا آرہا ہے اور حفظ و تلاوت ہی نہیں تمدنی حالات بھی کہتے ہیں کہ اب مستقبل کے آخری لمحے تک اس کی اس صفت میں داغ لگنے کا کوئی امکان نہیں۔

پھر یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو ایک زندہ زبان ہے کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جو ان صفتوں کی مالک ہو اور جو ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ و عبارات میں موجود ہو جن میں وہ اپنے لانے والے رسول پر اتری تھی اور جس کی زبان آج دنیا کی کوئی زندہ زبان ہو۔

آخر میں یہ جو فرمایا کہ جو اللہ کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور آخرت کے بارے میں راہِ کفر اختیار کرے گا تو وہ بھٹک کر سیدھی راہ سے دور جا پڑے گا تو اس میں کفر دونوں معنے کا احتمال رکھتا ہے۔ اگر کفر ایمان بمعنے تصدیق کا مقابل ہے تو یہ واقعی اور حقیقی کفر ہے اور اگر کفر ایمان بمعنے اخلاص کا مقابل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے دعوے، نعرے، اقرار کی حد تک سب کچھ مانتا ہے لیکن اپنے رویے سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ صحابہ کی زبان میں یہ نفاقِ عمل ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں اس کا نام فسق ہے اور قرآن و سنت میں اس پر بھی لفظ کفر بولا جاتا ہے۔ بہر حال اسلام کے ان بنیادی عقائد میں سے جس عقیدے کے ساتھ کفر کی ان دونوں قسموں میں سے جس قسم کو اپنائے گا نتیجہ بہر حال یہی ہوگا کہ حق سے دوری ہو گی اور صراطِ مستقیم سے اتنی دوری ہو جائے گی کہ پھر ان کے لیے اس کا پانا مشکل ہو جائے گا۔

ایمان و کفر کا تقابلی مطالعہ

۲۰۸۔ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر میں پڑ گئے، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کو بخشنے والا نہیں۔ اور نہ اللہ ان کو کامیابی کی راہ دکھائے گا۔ یعنی ظاہر میں تو مسلمان ہوتے اور دل میں مذبذب رہے اور آخر کو بے یقین لاتے ہی مر گئے

ان کو نجات کا راستہ نہیں ملے گا۔ وہ کافر ہیں ظاہری مسلمانی کچھ کام نہ آئے گی۔ اس سے مراد منافقین ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اول ایمان لائے پھر گوسالہ کی عبادت کر کے کافر ہو گئے۔ پھر توبہ کر کے مومن ہوتے پھر عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر کافر ہوئے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے۔[1]

اہل ایمان کا صحیح موقف واضح کرنے کے بعد یہاں سے روئے سخن منافقین کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ اور بتایا کہ جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں ترقی کرتے گئے۔ یہ ان کے تذبذب کے لیے ایک بیان واقعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین زیادہ تر اہل کتاب بالخصوص یہود میں سے اور انہی کے زیر اثر بھی تھے۔ اس پہلو سے دیکھئے تو ان کے ایمان و کفر کا ایک کھیل تو وہ ہے جو وہ تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں۔ اور دوسرا کھیل یہ ہے جو اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ پھر اپنے کفر میں بڑھتے گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے۔ اور اپنی قوت اس سعی و جہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلہ میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے یہ کفر میں مزید ترقی اور ایک جرم میں پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔ خود سیاق قرآنی بھی یہی چاہتا ہے کہ ذکر منافقین کا ہو رہا ہے اگرچہ انہوں نے بظاہر ایمان کی راہ اختیار کر لی تھی مگر فی الحقیقت ایمان سے محروم تھے۔ چنانچہ بار بار آئے اور بار بار الٹے پاؤں پھر گئے۔ سو ایسا ایمان، ایمان نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ خدا کی مغفرت ہوگی اور نہ ایسوں پر سعادت و کامیابی کی راہ کھلے گی۔

بلاشبہ ایسے لوگ جو دین کو کھیل اور تماشا بنا لیتے ہیں عادۃً ان کا دل مسخ ہو جاتا ہے پھر ان کو ایمان کی توفیق نہیں ہوتی ہے کہ اس پر مغفرت مرتب ہو سکے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اگر یہ لوگ اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتے تو ان کا ایمان اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کی توبہ قبول نہ ہوتی، ہزار بار کفر کے بعد بھی اگر صدق دل سے صحیح توبہ کرے تو وہ قبول ہے سید رشید رضا رقمطراز ہیں :

آیت یہ نہیں بتا رہی ہے کہ ایمان صحیح کے باوجود بھی مغفرت نہ ہو گی بلکہ آیت سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے دین کو کھیل و تماشہ بنا لیا ہے ایسے لوگ اللہ کی مغفرت اور ہدایت سے محروم کر دیے گئے ۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ
الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ
اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا
مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝ الَّذِيْنَ
يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ
وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ
نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝

ان منافقوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو جو اہل ایمان
کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور مددگار بناتے ہیں۔ کیا

یہ لوگ ان کافروں کے پاس عزت کے متلاشی ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھو کہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے[۲۰۹]۔ اور اللہ اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو، جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں، اگر بیٹھا کرو گے تو تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے، یقین مانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے[۲۱۰]۔ یہ منافقین تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا ہے[۲۱۱]۔

بس اللہ ہی تمہارے درمیان روزِ قیامت فیصلہ کرے گا، اور اللہ کافروں کے لیے اہلِ ایمان پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں بنائے گا۔[212]

ایمان و نفاق کا تقابلی مطالعہ

پہلے ایمان بمعنے اخلاص کی دعوت دی تھی۔ اب یہاں اسی ایمان کے مقابل نفاق کے کچھ خدو خال بیان ہو رہے ہیں۔ قرآن نے کفر کی طرح نفاق کا بھی جابجا ذکر کیا ہے اور منافقوں کے اعمال و خصائل پر البقرہ کے آغاز میں، پھر آلِ عمران کے درمیان میں اور اب نساء کے مختلف ابواب میں ان کا چہرہ پیش کیا ہے۔ ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں یکساں نہیں ہوتیں اور نہیں تھیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے۔ اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار قطعی ہی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں کسی میں کم، کسی میں زیادہ جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ کسی کے نفاق کا رخ زیادہ اس طرف تھا کہ ہجرت ہی سے جی چراتے تھے۔ کسی پر انفاق مال دشوار تھا، کوئی جہاد سے جان چراتا تھا، کسی پر نماز کا قیام سخت گزرتا تھا، کوئی ایسا بھی تھا کہ احکامِ الٰہی اور آیاتِ قرآنی کی ہنسی اڑاتا تھا۔ اور اس تاک میں تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی آفت پڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ ہو جائے۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ان سب نے اسلام بطور اپنے دین و طریقہ کے قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں ہی میں سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سازشی گروہ بھیس بدل کر مسلمانوں میں آملا ہو اور مسلمانوں میں سے نہ ہو۔ یہاں منافقوں کے یہ اعمال و خصائص بتلائے گئے ہیں کہ چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کی کامیابی پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے دشمنوں کو اپنا دوست بناتے ہیں تاکہ جب مسلمانوں کے دشمن فتح مند ہوں تو وہ عزت و کامرانی حاصل کریں۔ وہ الگ تھلگ رہ کر واقعات کی رفتار

دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو فتح ہوتی ہے تو فتح کے فائدوں میں حصے دار بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔ اگر دشمنوں کا پلہ بھاری رہتا ہے تو ان سے جا ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر لڑائی میں ہم دل سے تمہارے ساتھ نہ ہوتے اور تمہیں نہ بچاتے تو مسلمانوں نے تمہارا خاتمہ ہی کر دیا ہوتا۔ اللہ کی آیات سنتے ہیں تو ان کا مذاق اڑاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۲۰۹۔ ان منافقوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو جو اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور مددگار بناتے ہیں، کیا یہ لوگ ان کافروں کے پاس عزت کے متلاشی ہیں اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھو کہ عزت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ یعنی منافق لوگ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا یہ خیال کہ کافروں کے پاس بیٹھ کر ہم کو دنیا میں عزت ملے گی۔ بالکل غلط ہے سب عزت اللہ کے واسطے ہے جو اس کی اطاعت کرے گا اس کو عزت ملے گی خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے لوگ دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ہوں گے۔[1]

اس آیت میں منافقین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار یعنی یہود کو اپنا دوست اور کارساز بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے آرزومند ہیں حالانکہ عزت و ذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ عزت کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اردو میں عزت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنے میں آتا ہے مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزت ناقابل ہتک حرمت کا ہم معنے ہے۔[2]

فان العزۃ للہ جمیعا یعنی اعزاز تو تمام تر اللہ کی ملک اور اس کے قبضے میں ہے وہ جسے چاہے معزز بنا دے۔ جیسے دنیا میں ارباب اقتدار اور اساطین حکومت سے تعلق اور ان کی وفاداری اور اطاعت شعاری سے عزت حاصل ہوتی ہے اور سربراہ مملکت کی نافرمانی اور باغیان حکومت سے دوستی ذلیل و خوار بناتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح رب العالمین سے وفاداری اور اس کے وزراء اور سفراء یعنی انبیاؑ کی اطاعت شعاری بقدر وفاداری و اطاعت شعاری بارگاہ خداوندی میں معزز بناتی ہے اور خداوند قدوس کی بغاوت اور اس کے رسولوں کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

انکار و نافرمانی بارگاہِ خدا میں انسان کو ذلیل و خوار کرتی ہے۔ دراصل عزت نام ہے کسی کی محبت اور عظمت کی بنا پر محض اس کے حکم پر جان و مال اور آبرو قربان کر دینے کا۔ یہ شرف انبیاء و مرسلین اور ان کے متبعین کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو اللہ نے ثواب الدنیا و حسن ثواب الاخرہ عطا فرمایا ہے۔

دُنیا کی زندگی کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ دُنیا اور دُنیا کی زندگی کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر کیا ہے قرآن کی روشنی میں نبوت نے ایسا معاشرہ تیار کیا تھا کہ اس کے سائے اور اس کی حکومت میں نوعِ انسانی کو پوری کامیابی و سعادت ہو اور اس کی قیادت میں اس کا جو قدم پڑے وہ صحیح پڑے اور صحیح منزل کی طرف اُٹھے۔ دُنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہو، انسانوں کی مصلحتوں کا ان سے زیادہ جاننے والا اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھنے والا، دُنیا کے لیے ان سے بہتر نگران و محافظ اور انسانوں کا ان سے بڑھ کر خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بعض اہلِ مذاہب کی طرح دُنیا کی زندگی کو لعنت کا طوق نہیں سمجھتے تھے اسی کے ساتھ وہ اس کو عیش و عشرت کی آخری فرصت و مہلت بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی سمجھتے، اور اس کے لذائذ اور نعم کو کسی طرح دن کے لیے نہ اُٹھا رکھتے اسی طرح سے وہ اس زندگی کو کسی سابق قدیم گناہ کی سزا بھی نہیں سمجھتے تھے جو ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ نیز مادہ پرست اقوام کی طرح وہ دُنیا کو خوانِ یغما بھی نہیں سمجھتے تھے جس پر وہ بھوکوں کی طرح گریں اور زمین کی دولتوں اور خزانوں کا پڑا ہوا لاوارثی مال نہیں سمجھتے تھے جس کے لوٹنے کے لیے وہ ٹوٹ پڑیں۔ وہ کمزور قوموں کو شکار نہیں سمجھتے تھے جس کے شکار کرنے کے لیے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ زندگی اللہ کی ایک نعمت ہے جس میں اللہ سے قرب حاصل کرنے اور اپنے کمالِ انسانی تک پہنچنے کا ان کو موقعہ دیا گیا ہے اور عمل اور جدوجہد کی ایک مہلت ہے۔ جس کے بعد اس کے لیے کوئی مہلت نہیں۔

ان کو دُنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگران اور اتالیق مقرر کیا ہے اور وہ ان پر مامور ہیں کہ وہ رفتار سیرت و اخلاق اور رُجحانات کا جائزہ لیتے رہیں جو راہِ راست سے منحرف ہو جائے اس کو صراطِ مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دور کرتے

رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں کمزور کو طاقت سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں۔

كنتم خير أمة أخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله

تم سب اُمتوں سے بہتر ہو جو بھیجی گئی عالم میں، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

(آل عمران - ۱۱۰)

يا ايها الذين آمنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ط

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو، اللہ کی طرف سے گواہ بنو۔

(النساء ۱۳۵)

ایک یورپین نومسلم عالم نے مسلمانوں کے اس امتیاز کو اور دُنیا کی زندگی کے بارے میں اس معتدل نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کو بڑی خوبی سے بیان کیا اس کا اقتباس نامناسب نہ ہوگا۔

اسلام عیسائیت کی طرح دُنیا کے متعلق بُری رائے نہیں رکھتا اس کی تعلیم ہے کہ ہم دُنیا وی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دُنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے۔ موجودہ یورپ رُوحِ عیسائیت کے خلاف زندگی پر ایسا گرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر، وہ اس کو نگلتا تو ہے لیکن اس کی عزت کرنا نہیں جانتا، اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا، بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک ضروری منزل سمجھتا ہے جس سے گزر جانا ہے اس بنا پر انسان کو اس کی تحقیر اور اپنی اس دُنیاوی زندگی کی بے وقعتی نہیں کرنی چاہیے، زندگی کے سفر میں ہمارا اس دُنیا سے گزرنا ضروری اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے۔ پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے، لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ محض ایک واسطہ اور آلہ ہے اور اس کی قیمت اس سے زائد نہیں جو واسطوں اور آلات کی ہوتی ہے، اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا قول ہے کہ میری سلطنت یہی دُنیا ہے اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دُنیا میری سلطنت نہیں اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ قرآن ہم کو اس جامع دُعا کی تعلیم دیتا ہے ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة

(اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی) اس دنیا اور اس کی چیزوں کی قدر شناسی ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں سنگ گراں نہیں مادی ترقی اور خوشحالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ پسندیدہ شے، ہماری ساری کوششوں اور جدوجہد کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات و اسباب پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے، اور اگر موجود ہے تو ہم اس کو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو، اس اصول کے مطابق اسلام مسلمان میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقع پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو۔ اس لیے کہ اسلام ہماری زندگی کی ضروریات کو اخلاقی اور عملی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں، اس کے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے اور وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کرے یا باطل کو، اس کے نزدیک کوئی درمیانی چیز نہیں اس لیے وہ عمل پر زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے ہر فرد مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اس کے گرد و پیش کے واقعات کا شخصی طور پر جوابدہ سمجھنا چاہیے اور اپنے تئیں دینی جدوجہد کے لیے مامور اور ہر وقت اور ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصور کرنا چاہیے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تومنون بالله۔

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یہی بات اسلام کی جارحانہ کارروائی، ابتدائی اسلامی فتوحات اور اسلامی ملوکیت کو اخلاقی طور پر حق بجانب ثابت کرتی ہے، پس اسلام استعماری (IMPERIALIST) ہے۔ اگر یہ مفہوم انہی الفاظ سے ادا ہو سکتا لیکن استعمار (IMPERIALIST) کی اس قسم کی محرک حکومت اور غلبہ کی محبت بالکل نہیں اور نہ اقتصادی اور خود غرضی کو اس میں کچھ دخل ہے۔ مجاہدین اولین کو جو چیز میدان جنگ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لے جاتی تھی وہ دوسروں کی دولت و محنت کے ذریعہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی لالچ نہ تھی، اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا دنیاوی ڈھانچہ بنا دیا جائے جس میں انسان کے لیے بہتر سے بہتر روحانی ترقی ممکن ہو اسلامی تعلیمات کی رو سے اخلاق و فضیلت کا علم انسان سے اخلاقی ذمہ داری کا

مطالبہ کرتا ہے یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان نظری طور پر حق و باطل میں امتیاز کرے۔ پھر حق کی ترقی اور باطل کے زوال کے لیے جدوجہد نہ کرے، اسلام کی رُو سے اگر انسان حق اور نیکی کے غلبہ اور حکومت کے لیے سعی و جانفشانی کرتا ہے تو وہ زندہ رہتی ہے اور پھیلتی پھولتی ہے اور اگر اس کی مدد اور تقویت میں دریغ کرتا ہے اور اس کی حمایت و نصرت سے دست کشی کرتا ہے تو اس کو زوال ہو جاتے اور وہ بالکل مغلوب ہو جاتے گی۔[1]

مستدرک حاکم میں فاروق اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے :

شام کے گورنر کو آپ نے مخاطب کر کے فرمایا لوگوں میں تم اقلیت میں تھے اللہ نے تمہیں اسلام کے ذریعے بہتات عطا فرمائی، اور تم لوگوں میں ذلیل ترین تھے اللہ نے اسلام کے ذریعے عزیز بنایا جب بھی تم عزت اسلام کے سوا کسی دوسری راہ سے تلاش کرو گے اللہ تم کو ذلیل کر دے گا۔

ابوبکر الجصاص نے لکھا ہے کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ کفر و فجور کی راہ سے عزت تلاش نہ کرو بلکہ ایمان و اسلام کی راہ سے عزت تلاش کرو۔ رشید رضا فرماتے ہیں کہ :

مسلمانوں نے جب سے اس راہ کو چھوڑا ہے جس سے ان کے اسلاف نے دُنیا میں عزت و رفعت حاصل کی تھی، وہ دُنیا میں ذلیل ہو گئے اور ان میں ایسے منافق رونما ہو گئے جو کفر و فجور سے موالات کے ذریعے عزت کے متلاشی ہیں۔ اللہ کرے کہ مسلمان پھر اسی ہدایت کی طرف پلٹ آئیں اور و للّٰہ العزۃ جمیعًا کی آغوش میں آجائیں۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں آج ایسے مسلمان بھی ہیں جن کی جدوجہد اور کوشش ملازمتیں اور عہدے حاصل کرنا ہے۔ یہ لوگ ہر ظالم حکومت اور ہر باطل نظام سے تعاون کرتے ہیں۔ ہر حکومت کے سائے میں اہم عہدے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کے خلاف قوانین وضع کرتے ہیں اور حکومت کے زور سے انہیں نافذ کرتے ہیں۔ غیر اسلامی حکومتوں کی جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیوں میں شریک رہتے ہیں بلکہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی فوج میں رضاکارانہ طور پر شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال

علم کے نیچے جنگ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں خواہ انہیں کتنے ہی وزنی دلائل سے سمجھا دیا جائے کہ یہ کھلا تعاون علی الاثم اور موالات کفر ہے۔

اس روش کی وجہ سے دُنیا کے نزدیک مسلمانوں کی ساکھ اٹھ گئی۔ انہوں نے اپنا امتیاز و شرف کھو دیا۔ ان کی شہرت پر بٹہ لگ گیا۔ صاحب رسالت اور صاحب دین قوم کی حیثیت سے ان کی کوئی وقعت نہ رہی وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ وہ مسلمان جن کو عدل و انصاف قائم کرنے کا شریف ترین منصب سپرد کیا گیا تھا جن کو ظالموں اور بے انصافوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، جن کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ وہی مسلمان اب ظالم حکومتوں سے تعاون کرنے لگے، ظلم و بے انصافی میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے اور اسے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت سمجھنے لگے۔ انہیں فخر ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی انہیں سرکاری ملازمتیں اور عہدے دلوائے وہ اپنی اس کامیابی کو اسلام کے لیے شرف و عزت کا سامان سمجھتے ہیں۔ مفتی احمد یار خاں نے یہ بات بالکل بجا فرمائی ہے کہ "اس آیت سے معلوم ہوا کہ دینی قومی غدار نہ اپنی قوم میں عزت پائے نہ دوسری قوموں میں عزت دین پر قائم رہنے میں ہے" [1]

قرآن کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں سے بچو

۲۱۰۔ اور اللہ اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی کتاب کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں اگر بیٹھو گے تو تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے، یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یعنی اے مسلمانو! خدا تعالیٰ پہلے قرآن شریف میں تم پر حکم روانہ کر چکا ہے کہ جس مجلس میں احکام خداوندی کا انکار و تمسخر کیا جاتا ہو، وہاں ہرگز نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ویسے ہی سمجھے جاؤ گے، البتہ جس وقت دوسری باتوں میں مشغول ہوں تو اس وقت ان کے پاس بیٹھنے کی ممانعت نہیں۔ منافقوں کی مجالس میں آیات و احکام الٰہی پر انکار و استہزاء ہوتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ جو فرمایا کہ حکم نازل ہو چکا ہے

---

[1] نور العرفان

تم پر" یہ اشارہ ہے آیت و اذا رایت الذین یخوضون فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ کی طرف جو پہلے نازل ہو چکی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مجلس میں اپنے دین پر طعنہ اور عیب سنے اور پھر انہی میں بیٹھا سنا کرے اگرچہ آپ کچھ نہ کہے وہ منافق ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود کافروں کی ان صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیات الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہوئے سنتا ہے تو اس میں اور کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔[2]

جو بات اس آیت میں بتائی گئی ہے یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھو جو اللہ کی آیات کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ یہ بات پہلے سورۃ انعام میں کہی گئی تھی اب یہاں مکرر فرمائی گئی ہے۔ حکم کا یہ تکرار کہ ایک بار مکہ میں نزول دوبارہ مدینہ میں حکم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ یہ کفر اور تمسخر کرنے والے کون لوگ تھے؟ مکہ میں مشرکین تھے اور مدینہ میں یہود و منافقین تفصیل تو انشاء اللہ ساتویں پارے میں آئے گی۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ بے دینی کا ہر مشغلہ کفر و انکار کا ہر مظاہرہ اس آیت کا مصداق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بروایت ضحاک منقول ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو قرآن کی تفسیر غلط کرتے ہوں۔ قرآن میں تحریف کرتے ہوں اور دین میں نت نئی باتیں نکالتے ہوں۔ دارمی کی ایک طویل حدیث میں ابو الدرداء سے روایت ہے کہ جو چیزیں اسلام کو فنا کرنے والی ہیں ان میں ایک بات منافق کا قرآن میں جھگڑا ڈالنا بھی ہے۔ امام احمد، ابو داؤد، اور حاکم حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں المراء فی القرآن کفر قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔ اس آیت سے فقہاء نے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ کفر و فسق، معصیت کی مجالس میں شرکت ممنوع ہے، ہاں کافروں، فاسقوں اور گنہگاروں سے اس وقت ملنے میں کوئی حرج نہیں جب وہ کفر و فسق میں مشغول نہ ہوں انکم اذا مثلھم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریک مجلس ہو کر تم بھی کافر ہو گئے بلکہ مثلیت اور یکسانی نفس معصیت میں ہو گی۔ منکرین کا استہزاء کفر اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کی مجلسوں میں مسلمانوں کی شرکت فسق کا نتیجہ ہے۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ مطلق شرکت سے تو گناہ میں مماثلت ہو گی لیکن شرکت کے بعد ان کے کردار پر راضی ہوا تو پھر کفر میں مماثلت ہو گی۔

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کسی کے کفر پر پسندیدگی کا اظہار بھی کفر ہے۔ جیسا کہ صاحب ذخیرہ نے اما اعظم سے نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف بھی ہے لیکن پائدار اور مضبوط قانونی موقف یہی ہے کہ کفر پر پسندیدگی کا اظہار بھی کفر ہے۔

ابن الوقتی بھی منافقت ہے

۱۴۱- یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے۔ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے۔ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا ہے۔ یعنی یہ منافق وہ ہیں جو برابر تمہاری تاک اور انتظار میں لگے رہتے ہیں، پھر اگر تمہاری فتح ہو تو تم سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں، مال غنیمت میں ہم کو بھی شریک کرو۔ اور اگر کافروں کو لڑائی میں کچھ حصہ مل گیا۔ یعنی وہ غالب ہوئے تو ان سے کہتے ہیں۔ کہ کیا ہم نے تم کو گھیر نہیں لیا تھا تم کو اور تمہاری حفاظت نہیں کی اور ہم نے کیا تم کو مسلمانوں کے ضرر سے نہیں بچایا لوٹ میں ہم کو بھی حصہ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین حق پر ہو کر گمراہوں سے بھی بنائے رکھنا یہ بھی نفاق کی بات ہے[1]

یہ انہی منافقین کے کردار کی مزید تفصیل ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے نہایت بدخواہ ہیں۔ یہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہیں کوئی افتاد پیش آتے۔ کوئی ٹھوکر لگے، تم شکست کھاؤ۔ تمہیں فتح حاصل ہو تو کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے اور اگر کہیں دشمن کا پلہ بھاری ہو جائے تو ان کے پاس پہنچیں گے اور ان کو یقین دلائیں گے کہ یہ تو ہماری تدبیر تھی کہ تم مسلمانوں سے محفوظ رہے، ہم اس طرح تمہیں بچاتے رہے کہ مسلمان تم پر کھل کر حملہ نہ کر سکے اور ان کا پورا دباؤ تم پر نہ پڑ سکا[2]

ہر زمانے کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرہ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں اور جو فائدے کافر ہونے کی حیثیت میں حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

یہ کفار سے جاکر ملتے ہیں اور ہر طریقہ سے ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی متعصب مسلمان نہیں ہیں۔ نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تمہارے ساتھ ہیں۔ فکر و تہذیب اور مذاق کے لحاظ سے ہر طرح کی موافقت تمہارے ساتھ ہے اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمہارے ہی پلڑے میں پڑے گا [1]

اصول و اخلاق پر منافع اور مصالح کی ترجیح

یہ آیتِ قرآنی ایمان و اخلاص کے مقابلے میں نفاق کی عکاسی کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ نفاق کے نتیجہ کے طور پر ان میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح، آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض رونما ہو جاتا ہے۔ جب یہ بیماری عام ہو جاتی ہے تو اجتماعی زندگی ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آجاتی ہے جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور مغربی معیاروں کو قبول کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مغرب کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ افادیت اور مصلحت بینی اس نظامِ زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ اس نظام سے تعاون کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی نظر آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں میں معدوم ہو گئی ہے۔ دنیوی ترقی، مادی فوائد اور منافع منتہائے نظر بن گئے۔ اصولی و اخلاقی معیار فوائد اور منافع کے مقابلے میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبردار نے ترقی پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلا ارادہ اسلام، قرآن اور رسالت کی اہمیت کم ہو گئی بلکہ بعض نے اسلامی نظامِ حیات کی تضحیک کی جس میں دنیا کے مقابلے میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی۔ اُن جملوں اُن تقریروں کا مذاق اڑایا گیا جن میں دُنیا کو متاعِ قلیل اور متاعِ غرور کہا گیا تھا۔ دُنیا پرست، مادہ پرست اور مُنکرِ آخرت قوموں، ملکوں کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید

---

[1] تفہیم القرآن

سے بالا تھا، پھر جو نظام تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی رُوح بسی ہوئی تھی۔ اس کی اساس اخلاق کے مقابلے میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی ہے۔ اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلہ میں خواہش نفس اور لذت کا عنصر غالب ہے وہ تمام ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار ہے جو سرتاپا منکرِ آخرت ہے۔ دراصل یہ کسی مجرد نظام کی دعوت نہیں اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفہ اجتماع کی دعوت ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا،

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اہلِ کفر اہلِ ایمان پر غالب نہ ہوں گے

۲۱۲۔ بس اللہ ہی تمہارے درمیان روزِ قیامت فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کے لیے اہلِ ایمان پر غالب آنے کی کوئی سبیل نہیں بنائے گا۔ یعنی اللہ تم میں اور ان میں حکم فیصل فرما دے گا کہ تم کو جنت دے گا اور ان کو جہنم میں ڈالے گا۔ دُنیا میں جو کچھ ان سے ہو سکے کر دیکھیں مگر اہلِ ایمان کی بیخ کنی ہرگز نہ کر سکیں گے جو ان کی دلی تمنا ہے۔[1]

اس آیت کی تشریح میں شارحینِ قرآن مختلف ہیں۔ علامہ قرطبی نے پانچ خیال نقل کیے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کافروں کو ایسا غلبہ ہرگز نہ دے گا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہی کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ:

نہ شود کہ اسلام را استاصل کردانند۔ واللہ اعلم

اور یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان جب تک اسلام پر قائم رہیں گے اس وقت تک ان پر کافر غلبہ نہیں پا سکتے۔ گویا یہ آیت قرآن کی دوسری آیت کے ہم معنے ہے۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین

ابن العربی نے اس کو سراہا ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ کافروں کو اہلِ ایمان پر اس وقت تک غلبہ نہ ہوگا جب تک اہلِ ایمان، ایمان کے حقوق ادا کرتے رہیں گے اور راہِ ایمان پر گامزن رہیں گے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ایک اہم حقیقت کا انکشاف

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنگ اور سیاست میں مسلمانوں کے مقابلے میں کفر کے غلبہ کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ مسلمانوں کی مغلوبیت کا باعث یہ اور صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی زندگی میں انقلاب آگیا اور وہ اُس مقصد کو بھول گئے جس کے لیے اللہ نے بے شمار قوموں کی موجودگی میں ان کو منتخب کیا تھا یعنی امر بالمعروف، نہی عن المنکر، وہ جو مقصد لے کر چلے تھے کہ انسانوں کو انسانوں کی خدائی سے نکال کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں اسے فراموش کر دیا۔ لوگوں پر الٰہی قوانین کی جگہ اپنے وضع کردہ قوانین نافذ کرنے لگے۔ قید و بند سے آزاد ایک اباحی زندگی گزارنے لگے۔ گویا وہ نبی کی اُمت ہیں اور نہ ان کا وحی و رسالت پر ایمان ہے، نہ حساب کا ڈر ہے اور نہ آخرت کا خوف، وہ ان جاہلی قوموں سے پورے طور پر مشابہ ہو گئے جن سے وہ کل تک جنگ کرتے رہے تھے۔ اب وہ تمدن و اجتماع، سیاست، اخلاق، اور معاشرت میں ان ہی مغضوبین وضالین کی تقلید کرنے لگے جن کی وجہ سے اللہ ان سے ناراض ہوا تھا اور اپنا غضب نازل کیا تھا۔

مسلمانوں کے پیش نظر کوئی صحیح اور اعلیٰ مقصد نہ رہا اور ان کی تگ و دو اور جدوجہد کھانے پینے اور عیش و عشرت تک محدود ہو گئی۔ دُنیا کی قوموں میں ان کا کوئی امتیاز اور خصوصیت باقی نہ رہی بلکہ ان کے بعض بادشاہ، صدر مملکت اور وزیر اعظم دوسری قوموں کے جابرہ اور فراعنہ سے بھی بازی لے گئے ان کے دولت مندوں میں تکبر پیدا ہو گیا۔ ان کے سردار اور اکابر قوم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے، یہاں تک کہ جب اس اُمت کے فساق و فجار، بغض و حسد، جاہ طلبی، دُنیا پرستی، عیش پسندی، آخرت سے غفلت، خون ریزی، بے حیائی، حق تلفی، بدعہدی، بے وفائی، حدود اللہ سے تجاوز، ظلم و بے انصافی، اسراف و تبذیر اور فواحش و منکرات وغیرہ مختلف جرائم میں دوسری قوموں سے بھی سبقت لے گئے باوجود اس کے کہ ان کے ملک میں کچھ دینی شعائر کا رواج تھا اور ان کے نام اسلامی قسم کے تھے وہ خدا کی نظروں میں حقیر ہو گئے اور باوجود اپنی وسیع سلطنت، لاتعداد افواج، بے شمار خزانوں اور اپنی شاندار تہذیب کے وہ لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت ہو گئے۔ لوگوں کے دلوں سے ان کی ہیبت اور عظمت جاتی رہی اور وہ ان پر جری ہو گئے اور دُنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایمان کا کفر سے نہیں بلکہ کفر عملی کا کفر حقیقی سے مقابلہ ہوا اور نتیجۃً وہ غالب رہا جس کے پاس طاقت تھی۔ قرآن نے یہاں جس غلبہ کے نہ ہونے کا اعلان کیا ہے وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کا غلبہ ہے۔

کفر کے مقابلہ کفر کے غلبہ نہ ہونے کا ثبت اعلان نہیں کر رہی ہے۔

آیت قرآنی کا مطلب صاف ہے کہ قیامت کے روز اللہ سبحانہ تمہارا فیصلہ فرمائے گا فاللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ یہ آخرت کے بارے میں ہے اور آیت لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا میں دُنیا کے متعلق حکم مذکور ہے کہ دُنیا میں کافروں کو یہ قدرت نہ ہوگی کہ اہل ایمان کا قلع قمع کر دیں اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام ونشان مٹا دیں۔ شیخ جلال الدین السیوطی نے تفسیر جلالین میں اسی کو اپنایا ہے اور شاہ ولی اللہ نے بھی یہی مطلب بتایا ہے اور جو مطلب میں نے بتایا ہے اسے ابن العربی نے اپنایا ہے۔ باقی کچھ اکابر کا یہ کہنا کہ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمہارا فیصلہ کریں گے اور اس فیصلہ میں کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غلبہ نہیں دیں گے اسے محققین نے قبول نہیں کیا ہے۔ مفتی احمد یار نے آیت سے یہ نتیجہ خوب نکالا ہے کہ:

> اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا کے تمام کافر و منافق متفق ہو کر اسلام اور مسلمانوں کو نہیں مٹا سکتے۔ مسلمان جہاں کہیں نقصان اٹھاتے ہیں اپنی غداری اور شامتِ اعمال کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔

مولانا کا یہ نتیجہ بالکل درست ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہماری ہر شکست خود ہمارے اعمالِ بد کا نتیجہ ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا
اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا
یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝١٤٢ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ
ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ۝١٤٣ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ۝١٤٤
اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۝١٤٥ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ اَجْرًا
عَظِیْمًا ۝١٤٦ مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا ۝١٤٧

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں، حالانکہ در حقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے [۲۱۳]۔ جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں [۲۱۴]۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں، نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف، جسے اللہ بھٹکا دیتا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے [۲۱۵]۔ اے اہلِ ایمان! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق و مددگار نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو، بلاشبہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے [۲۱۶]۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، ایسے

لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔[146] آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور ایمان کی راہ پر گامزن رہو اللہ بڑا قدر شناس اور علم والا ہے۔[147]

نفاق کے اور خصائص

ان آیات میں منافقین کے اعمال وخصائل کی مزید تفصیل پیش کی گئی ہے۔ انسانی عقائد و اعمال کی یہ تین حالتیں ایمان کفر اور نفاق کوئی نئی حالتیں نہیں ہیں۔ دنیا کے تمام گوشوں میں بھی تین حالتیں ہیں تکوین کی حالت، افساد کی حالت، یا پھر ان دونوں کی درمیانی حالت، خود ہمارے وجود کا بھی یہی حال ہے، زندگی ہے یا موت اور یا بیماری۔ بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی موت قرار دے سکتے ہیں، دونوں کے بین بین ہے۔ اسی طرح علم معنے میں ایمان زندگی ہے کفر موت ہے اور نفاق بیماری ہے اسی لیے قرآن نے اسے مرض سے تعبیر کیا ہے یہ ظاہر کے اعتبار سے خوشنما لیکن باطن کے اعتبار سے گندگی کا سنڈاس، ان کے چہرے نہایت شاندار ان کا لباس نہایت دیدہ زیب، ان کی زبان نہایت شیریں، ان کے ذہن نہایت روشن لیکن ان کی روح نہایت تاریک، ان کے دل نہایت کھوکھلے، یقین سے قطعی خالی، ان کے افکار تذبذب۔ صبر و برداشت سے بالکل نامانوس۔ اخلاق و ارادے کے نہایت کمزور، دین کو دنیا کے بدلے فروخت کرنے والے، آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے والے، قوم اور ملک کو شخصی اغراض اور منافع اور نام نہاد عزت وجاہ کے عوض میں فروخت کر دینے والے، اپنی ذات اور قوم سے بدگمان رہنے والے، دوسروں پر بھروسہ کرنے والے۔ یہی لوگ آج کل نمائندے ہیں، ان ہی کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور ہے، انہیں کو اسلامی ممالک کی بہار اور رونق کہنا چاہیے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے

مخاطبوں کو روباہی فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، ان میں بزدلی اور کم ہمتی کا پرچار کرتے ہیں، یہ طبقہ ہی جسم قوم کا وہ ناسور ہے جو ہمیشہ نت نئی صورتوں میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ وطنیت، قومیت، لادینیت، عقلیت اور اشتراکیت اسی کے پستانوں سے دودھ پی کر پلتے اور جوان ہوتے ہیں۔

۲۱۳- یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ یعنی دل سے کافر ہیں اور ظاہر میں مسلمان ہیں تاکہ دونوں طرف کی مضرت اور ایذا سے محفوظ رہیں اور دونوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کی اس دغابازی کی یہ سزا دی کہ ان کی تمام شرارتوں اور مخفی خباثتوں کو اپنے نبی پر ظاہر کر دیا، ایسا ذلیل کیا کہ کسی قابل نہ رہے اور سب دغابازی مسلمانوں پر کھل گئی اور آخرت میں جو اس کی سزا ملے گی وہ بھی ظاہر کر دی چنانچہ آئندہ آیتوں میں ذکر آ رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی دھوکہ بازی سے تو کچھ نہ ہوا اور اللہ نے ان کو ایسا دھوکہ میں ڈال دیا کہ دنیا و آخرت دونوں میں غارت ہو گئے۔[1]

خدع کی نسبت جب اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے خداع کی مجازات مراد ہوتی ہے۔ قرطبی، الجصاص، رازی، اور ابن کثیر نے یہی معنے بتاتے ہیں۔ خادعھم کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے یعنی ان کو دھوکہ دینے میں ہرا رہا ہے اور مغلوب کر رہا ہے۔ خدا کے ہرانے اور مغلوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے دنیا میں اچھوں کی طرح بُروں کو بھی مہلت عمل دے رکھی ہے مگر یہ مہلت اس لیے نہیں ہے کہ خدا کا قانون ان کی طرف سے غافل ہے بلکہ اس لیے ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ اپنے مقررہ وقت ہی پر ظاہر ہوا کرتا ہے لیکن شریر آدمی اس مہلت سے نڈر ہو جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ بھی کیے جاؤں میرے لیے کچھ ہونے والا نہیں ہے، حالانکہ اس کے لیے سب کچھ ہونے والا ہے مگر اپنے مقررہ وقت پر۔[2] اور خدا کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اسلامی زندگی کے بارے میں خدا کے رسول اور مسلمانوں کو دھوکہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ البقرہ کے آغاز میں یہ اضافہ بھی گزرا ہے وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کے لیے مفید ہو گی حالانکہ دراصل یہ ان کو دنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں ایک منافق چند روز کے لیے تو دھوکا دے سکتا ہے مگر ہمیشہ اس کا دھوکا نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن۔

چل سکتا۔ آخر کار اس کی منافقت کا راز فاش ہو کر رہتا ہے اور پھر معاشرے میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دھوکہ اور فریب بھی منافق کی ایک علامت ہوتی ہے اس کی فریب کاری کی داستان اسلامی تاریخ میں ایک المناک کہانی ہے یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

دھوکہ بازی کی ایک مثال

۱۴۲۔ جب یہ نماز کو اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ یعنی نماز جو نہایت ضروری اور خالص عبادت ہے اور اس کے ادا کرنے میں جانی، مالی کسی مضرت کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔ منافق اس سے بھی جان چراتے ہیں۔ مجبوری لوگوں کے دکھانے اور دھوکہ دینے کو پڑھ لیتے ہیں کہ ان کے کفر کی کسی کو اطلاع نہ ہو اور مسلمان سمجھے جاویں پھر ایسوں سے اور کسی بات کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور وہ کیسے مسلمان ہو سکتے ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین کی دھوکہ بازی کی ایک مثال ہے یعنی نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکساتے ہوئے، مارے باندھے محض اس ڈر سے کہ اگر نماز میں نہ گئے تو مسلمانوں کی مردم شماری کے جسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل رکھیں اس وجہ سے اس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکہ بازی ہے۔

اس آیت قرآنی سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو، جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عذر شرکت نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محمول کرتی ہیں۔ اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں۔ اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اس زمانے میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی

---

[1] معارف شیخ الاسلام

دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہل ایمان سے ممیز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے۔ وقت سے پہلے مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھہرتے تھے اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے، بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آ نہیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے۔ جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔[1]

نفاق کی علامات

یہاں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جن احادیث میں نفاق کی علامات بتائی گئی ہیں ان کا کیا مطلب ہے اور وہ قرآن ہی سے لی گئی ہیں۔ مثلاً ابن کثیرؒ نے مسند احمد کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ:

منافقوں کی چند علامتیں ہیں جن کے ذریعے ان کی شناخت ہو سکتی ہے۔ اول سلام کی بجائے ان کی زبانوں پر لعنت ہوتی ہے، دوم لوٹ مار کا مال ان کی خوراک ہوتا ہے، سوم خیانت کا مال ان کا مال غنیمت ہوتا ہے، سوم مسجدوں کے قریب نہیں آتے بجز بکواس کرتے ہوئے، چہارم نمازوں میں شریک نہیں ہوتے مگر سب سے آخر میں اتراتے ہوئے، پنجم خود کسی سے محبت نہیں کرتے، ششم ان سے کوئی محبت نہیں کرتا، ہفتم رات کو شہتیر کی طرح بستروں پر دراز رہتے ہیں اور دن کو شور مچاتے پھرتے ہیں۔

صحیحین میں عبداللہ بن عمروؓ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے:

جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ کورا منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں

[1] تفہیم القرآن

سے ایک ہو گی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہو گی۔ امانت میں خیانت، وعدہ خلافی، جھوٹ بولنا، غصے میں آکر بے قابو ہو جانا، عہد کر کے توڑ ڈالنا۔
صحیح مسلم میں یہ اضافہ بھی ہے :
اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اس خیال میں مگن ہو کہ وہ مسلمان ہے ۔
اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کوئی ایسی حالت نہ تھی جو صرف حضور اقدس کے زمانہ ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اور نہ منافقوں کا گروہ کوئی ایسا گروہ تھا جو محض چھپے کافروں کا ایک سازشی گروہ ہو۔ یہ ایمان و عمل کی کمزوری کی ایک زیادہ سخت حالت ہے جس طرح اس زمانے میں تھی اسی طرح ہر زمانے میں ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے ۔
ان ارشادات میں جن اعمال کو نفاق کی علامات بنایا گیا ہے ان کا خلاصہ بداخلاقی، مطلب پرستی، خیانت اور دین سے بیزاری ہے ۔ جب انسانی اخلاق بگڑ جاتا ہے تو اس کی زبان گندی اور اس کی حرکات خفیف ہو جاتی ہیں۔ جب اس میں مادۂ امانت نہیں رہتا تو لوٹ کا مال اس کو مال طیب نظر آنے لگتا ہے اور خیانت اس کی نظر میں مال غنیمت کی طرح محبوب بن جاتی ہے۔ جب اس میں مطلب پرستی اور شقت کوشی سرایت کر جاتی ہے تو اس کے پیش نظر بجز اپنے مطلب اور غرض کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں کسی سے اُلفت نہیں رہتی اس لیے لوگوں کے دل بھی اس کی محبت سے خالی ہو جاتے ہیں۔ خود غرض انسانوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا ہے اور جب قلب میں دین بیزاری آتی ہے تو نماز میں چستی باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ منافقین کی معاشی اور معادی زندگی کا اتنا سچا نقشہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کا اس سے زیادہ نقشہ کھینچنا چاہے تو کھینچ نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک ایک عمل تقاضائے ایمان کے منافی ہے ۔
اگر آج مسلمانوں کی اکثریت اپنے ایمان و عمل کا احتساب کرے تو اسے معلوم ہو جائے کہ نفاق کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ اپنے ہی وجود میں اسے دیکھ لے سکتی ہے۔

منافق کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہوتا ہے

۲۱۵۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف، جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ یعنی منافقین نرا بالکل حیرت اور تردد

میں گرفتار ہیں، نہ ان کو اسلام پر اطمینان ہے نہ کفر پر، سخت پریشانی میں مبتلا ہیں، کبھی ایک طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف - اور اللہ جس کو بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے اس کو نجات کا راستہ کہاں مل سکتا ہے۔ [1]

اسلامی قوت کا اصلی منبع ایمان ہے - اسلامی زندگی میں معجزات اور خوارق ایمان ہی کا کارنامہ ہیں ایمان کی طاقت کا دشمن صرف شک و تذبذب ہے - شک اور تذبذب سے زیادہ ایمان کو پامال کرنے والی کوئی چیز نہیں - ایمان نام ہے ماوراء محسوسات عالم غیب کی باتوں پر نبوت کی زبان سے سن کر مان لینے کا - وہ لوگ ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتے ہیں جو عالم غیب کے حقائق کا صرف اپنی فکری نارسائیوں کی بنیاد پر انکار کرتے ہیں - وہ ہمیشہ کفر و ایمان کے دوراہے پر کھڑے رہتے ہیں - اس سلسلے میں تاریخ اسلام کی عظیم شخصیت بلکہ فلسفہ و تاریخ اور علوم عمرانیات کے امام علامہ ابن خلدون کی بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

تم فکر کی اس خام خیالی پر ہرگز اعتماد نہ کرو کہ وہ کائنات اور اس کے اسباب و عوامل کا احاطہ کر سکتی ہے اور اس کے وجود کی ساری تفصیلات سے واقف ہو سکتی ہے - اس معاملہ میں فکر کی خود رائی حماقت پر مبنی سمجھو اور یہ سمجھ لو کہ ہر صاحب ادراک انسان ابتداء میں یہی سمجھتا ہے کہ سارے موجودات اس کے علم و ادراک کے احاطہ میں آگئے ہیں، کوئی چیز اس سے باہر نہیں رہی لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، تم بہرے کو دیکھتے ہو کہ اس کے نزدیک موجودات صرف چار محسوسات میں منحصر ہیں، مسموعات کی قسم سرے سے اس کے دائرہ سے خارج ہے، اسی طرح اندھا، اس کی شمار سے مرئیات کی قسم بالکل خارج ہو جاتی ہے اور غیر محسوس اشیاء میں اگر ان کے آباؤ اجداد اور ان کے زمانہ کے بزرگوں اور دوسرے تمام لوگوں کا تقلیدی علم نہ ہو تو ان کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیں، لیکن وہ ان غیر محسوس اصناف کی اثبات میں عام لوگوں کی اتباع کرتے ہیں - اور ان کو اپنی فطرت اور طبیعت اور اکیہ کی مدد سے قبول نہیں کرتے، اگر بے زبان بولنے لگے اور ان سے پوچھا جائے تو ہم ان کو معقولات کا منکر ہی پائیں گے اور ان کے نزدیک معقولات کا پورا خزانہ ساقط الاعتبار ہو گا اور جب یہ بات واضح ہو گئی تو بہت ممکن ہے ایسے مدرکات بھی عالم میں موجود ہوں جو ہمارے ادراک سے باہر ہوں، کیونکہ

[1] وفادات شیخ الاسلام

ہمارے ادراکات مخلوق اور حادث ہیں اور اللہ کی مخلوقات انسان کی معلومات سے کہیں زیادہ ہیں اور موجودات کا حصر ممکن ہی نہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اللہ ہی ان کا احاطہ کر سکتا ہے لہٰذا موجودات کے احاطہ کے بارے میں اپنی ادراک اور اپنی مدرکات کی تردید کر دو اور شارع علیہ السلام کے بتاتے ہوتے عقیدہ اور عمل پر قائم رہو کیونکہ وہ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں اور تمہارے لیے نفع بخش چیزوں کو وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں اور ان کے ادراکات تمہارے ادراکات سے بلند ہیں۔ اور ان کی عقل کا دائرہ تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع ہے اور یہ عقل اور اس کے ادراکات کے لیے کوئی عیب کی بات نہیں کیونکہ عقل ایک صحیح ترازو کی طرح ہے اور اس کے احکام قطعی اور یقینی ہیں ان میں غلطی یا جھوٹ کا شائبہ نہیں، لیکن تم کو یہ اُمید نہیں کرنا چاہیے کہ اسی ترازو سے اُمورِ توحید و آخرت اور صفاتِ الٰہیہ کی حقیقت بھی تول سکو گے۔ کیونکہ یہ امید محال ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص سونا تولنے والا کانٹا دیکھے تو یہ اُمید وابستہ کرے کہ اسی سے پہاڑ بھی تول سکتا ہے لیکن اس سے یہ بات تو ثابت نہیں ہوتی کہ کانٹا اپنی تول میں سچا نہیں، اسی طرح عقل کے بھی حدود ہیں جہاں اس کو ٹھہرنا پڑتا ہے۔ ان سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی کہ وہ اللہ کی ذات و صفات کو بھی اپنی ادراکات کے دائرہ میں داخل کرے بلکہ وہ اس کے پیدا کیے ہوتے بے شمار ذرات میں سے ایک حقیر ذرہ ہے۔

اضلال و ہدایت کا قانون

اور یہ جو فرمایا ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دیتا ہے اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے تو اللہ کا یہ فعل اضلال اس کی سنت تکوینی کے تحت ہے جس کے مطابق وہ ہر عزم عمل پر عمل کا ترتب فرماتا ہے ہدایت اور ضلالت اللہ سبحانہٗ کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا بُرے کام کے جواب میں اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہدایت کی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کن کے لیے بتصریح فرمایا وما یضل بہ الا الفاسقین اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی بدعملی پہلے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اضلال فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کی بدعملی پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں اضلال بعد میں ہوتا ہے اور یہی طبعی اصول ہے انسان

جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے نکلتے ہیں۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسُول کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت کے راستے کھول دیے ہوں۔ ایسے شخص کو راہِ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملہ کو رزق کی مثال سے سمجھئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے مگر اللہ ہر شخص کو رزق اس راستہ سے دیتا ہے جس راہ سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستہ سے تلاش کرے اور اسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستہ کھول دیتا ہے، اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے اسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے بخلاف اس کے جو شخص حرام خوری پر تلا ہوا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے۔ اس کو خدا کے اذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے۔ اور پھر یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس کے نصیب میں رزق حلال لکھ دے۔ بالکل اسی طرح یہ حقیقت بھی ہے کہ دُنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر چل نہیں سکتا۔ رہی یہ بات کہ کس شخص کو کون سے راستے پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی راہ روی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں تو اس کا دارومدار آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے سچائی کا طالب ہے اور خالص نیت سے خدا کے راستہ پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توفیق ارزانی فرما دیتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے ہموار کر دیتا ہے بخلاف اس شخص کے جو خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راہوں پر چلنے کی سعی کرتا ہے اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ سے ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں پر اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہِ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اسے محروم کر دیا اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈ نے سے نہیں مل سکتی ہے۔ [1]

---

[1] تفہیم القرآن

کفر سے عدمِ موالات

۲۱۶ - اے اہلِ ایمان! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق و مددگار بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو، بلاشبہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرنا دلیل ہے نفاق کی۔ جیسا کہ منافقین کرتے ہیں لہٰذا اے مسلمانو! تم ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ کا صریح الزام اور پوری حجت تم پر قائم ہو جائے گی کہ تم بھی منافق ہو اور منافقوں کے لیے دوزخ کا سب سے نیچا طبقہ ہے اور کوئی ان کا مددگار نہیں ہو سکتا کہ اس طبقہ سے ان کو نکالے یا عذاب میں کچھ تخفیف کرا دے، مسلمانوں کو ایسی بات سے دور رہنا چاہیے۔[۱]

کافرین سے مراد یہاں اہلِ کتاب خاص طور پر یہود ہیں جن سے منافقین کی سازباز تھی جیسا کہ آیت ۶۰، ۶۱ میں گزر چکا ہے، اولیا جمع ولی کی ہے اس کے معنے کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا محبت و حمایت کے جذبہ سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ من دون المومنین کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو، اسلام کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لیے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوعِ انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں۔

ترکِ موالات کا مطلب یہ ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف و دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں ان سے تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا جو محبت، خدمت اور اعانت پر مبنی ہوں اگر

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کوئی مسلمان ایسے تعلقات رکھے گا تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انہی غیر مسلموں میں ہوگا مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کردی ہے۔ تمام غیر مسلم اقوام و افراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں اور نہ ان پر حملہ آور ہیں نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں، دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی و محبت اور ہر طرح کے احسان و خیر خواہی اور حسن معاملات کا سلوک کرنا چاہیے۔ اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں ہے۔ عالمگیر محبت اس کی دعوت حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے قرآن چشم پوشی کر سکتا ہے لیکن اگر دوسری قسم کے غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ صرف گناہ نہیں بلکہ نفاق ہے۔ مسلمانوں کو اس سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔ یہ جرم کوئی معمولی جرم نہیں ہے اس جرم کا ارتکاب کر کے مسلمان اپنے خلاف اللہ کو ایسی حجت قاطعہ فراہم کر دیتا ہے کہ پھر کسی عذر کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس کی سزا دوزخ ہونا بالکل مبرہن ہو جائے گا اور دوزخ میں سزا بھی ایسی سنگین ہے کہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے یعنی ان کا درجہ کٹر اور معاند کفار سے بھی نیچے ہے جس کا عذاب جہنم کے تمام طبقوں سے بڑا ہوا ہے۔ دوزخ کے سات طبقے ہیں سب سے نیچے طبقہ میں سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

منافقین کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے

۱۴۷ - البتہ ان میں سے جو تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر لیں ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو اجر عظیم مرحمت فرمائے گا۔ یعنی جو منافق اپنے نفاق سے توبہ کرے اور اپنے اعمال کی درستی کرے اور اللہ کے پسندیدہ دین کو خوب مضبوط پکڑے اور اللہ پر توکل کرے اور ریا وغیرہ خرابیوں سے دین کو پاک و صاف رکھے تو وہ خالص مسلمان ہے۔ دین و دنیا میں ایمان والوں کے ساتھ ہوگا اور ایمان والوں کو بڑا ثواب ملنے والا ہے ان کے ساتھ ان کو بھی ملے گا جب وہ

نے نفاق سے سچی توبہ کی۔[1]

یہاں منافق کی توبہ کے صحیح ہونے کے لیے تین شرطیں بتائی ہیں۔ اصلاح۔ اعتصام باللہ اور اخلاص للہ۔

اصلاح یہ ہے کہ فکر و عمل میں درستگی آجائے۔ کہیں بھی بگاڑ نہ ہو۔ اور پورے طرزِ عمل کی بنا اچھائی اور راستی پر ہو۔

اعتصام یہ ہے کہ اپنے فکر و عمل میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہو جائیں۔

اخلاص یہ ہے کہ اپنی وفاداریاں نبوت کے نظامِ حیات کے علاوہ کسی اور سے وابستہ نہ ہوں۔ اپنی ساری دلچسپیوں، محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے۔ کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا لگاؤ ایسا باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔ فقہاء نے آیت سے یہ مسئلہ خوب نکالا ہے کہ اعمالِ تقرب و عبادت ہر قسم کے شائبہ ریا سے اور ہر قسم کے دنیوی معاوضے سے پاک ہونا چاہیے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اذان و حج وغیرہ پر معاوضہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ متاخرین نے ضرورت کی بنا پر بعد کو جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ پوری آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین جو اس قدر شدید وعیدوں کے مستحق ہیں۔ وہ بھی اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس نہ ہوں۔ توبہ اور اصلاحِ حال تو ان کی اپنی اختیاری چیز ہے۔ جب اور جس وقت چاہیں کر سکتے ہیں اور سیدھی راہ اختیار کر کے مومنین کی معیت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان و شکر عذاب سے مانع ہے

۱۴۸۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور ایمان کی راہ پر گامزن رہو اللہ بڑا قدر شناس اور علم والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نیک کاموں کا قدر دان ہے اور بندوں کی سب باتوں کو خوب جانتا ہے لہٰذا جو شخص اس کے حکم کو ممنونیت اور شکر گزاری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اللہ عادل رحیم کو ایسے شخص پر عذاب کرنے سے کوئی تعلق نہیں یعنی ایسے شخص کو ہرگز عذاب نہ دے گا وہ تو سرکش اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔[2]

---

[1] [2] افاداتِ شیخ الاسلام

اس آیت میں منافقین کو مخاطب کر کے بانداز التفات فرمایا کہ خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کوئی فائدہ ہے اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور ایمان اختیار کر لو تو اللہ بڑا قدر دان اور ہر ایک کے ایمان و عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔ اپنے محسن کے مقابلہ میں صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے، ان کے مجموعہ کا نام شکر ہے اور اس شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اولاً احسان کی اس کی طرف نسبت کرے، ثانیاً محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبات سے آدمی کا دل سرشار ہو، ثالثاً، اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو، اور بس۔

الحمد للہ معالم العرفان کی پانچویں جلد آج مورخہ ۳۰، جمادی الاول ۱۳۹۷ھ، ۱۹ رمئی ۱۹۷۷ء، جمعرات کے دن بوقت ۱۱ بج کر ۵۵ منٹ پر اللہ کی توفیق سے مکمل ہوئی۔

ربّ تقبل منی انک انت السمیع العلیم